صلاح الدین ناسک کا تعلق لدھیانہ (مشرقی پنجاب)
کی مردم خیز سرزمین سے ہے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ شملہ سے ہجرت کر کے
پاکستان میں آئے۔ زمیندار کالج گجرات اور پھر لاہور میں تعلیم حاصل
کی۔ بعد ازاں اخبارات سے منسلک ہو گئے۔ روزنامہ احسان، آفاق،
نوائے وقت اور مشرق سے بطور رپورٹر، نیوز ایڈیٹر اور ریذیڈنٹ
ایڈیٹر منسلک رہے۔ علاوہ ازیں متعدد غیر ملکی رسائل کے پاکستان
میں بیورو چیف رہے۔ چند سال سے تصنیف و تالیف میں
مصروف ہیں۔ ان کی پہلی کتاب "افکارِ سیاسی" تھی بعد ازاں
"تحریکِ آزادی" "جدید عالمِ اسلام" "دورِ مغلیہ" اور "عہدِ سلاطینِ دہلی"
منظرِ عام پر آئیں۔ ان کتب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
تحریکِ آزادی کا یہ نیا ایڈیشن بھی قارئین و طلبہ میں ان کی تحریروں کی
مقبولیت کی دلیل ہے۔ ان دنوں وہ بعض نادر دستاویزات کا
انگریزی اور ہندی سے اردو ترجمہ کر رہے ہیں۔ عنقریب ان کا شعری
مجموعہ بھی طبع ہو کر قارئین تک پہنچ جائے گا۔ تصنیف و تالیف کے ساتھ
ساتھ وہ اعلیٰ و ثانوی بورڈ لاہور کے ساتھ بطور ناظر تعلقاتِ عامہ بھی منسلک ہیں۔

زیرِ نظر کتاب تحریکِ آزادی میں انہوں نے نہایت تحقیق و جستجو
سے کام لیا ہے جس پر قارئین و دانشوروں نے انہیں بھرپور خراجِ
تحسین پیش کیا ہے۔ طلبہ میں بھی اس کتاب کو مقبولیت حاصل ہوئی۔
زیرِ طبع ایڈیشن ترمیم و اضافے کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ توقع ہے کہ
صلاح الدین ناسک کی اس سعی کو مزید قبولِ عام حاصل ہوگا۔ ناشر

صلاح الدین ناسک

عزیز پبلشرز ــــ چوک اردو بازار ــــ لاہور

اشاعت اول ——— جون ۱۹۷۲ء
اشاعت دوم ——— نومبر ۱۹۷۵ء
طابع ——— عزیز پبلشرز
مطبع ——— علی پرنٹر پریس
قیمت ——— روپے

عزیز پبلشرز ——— چوک اردو بازار ——— لاہور

انتساب

والد مرحوم

سیّد خلیل شاہ

کے

نام

جن کی تربیت اور عزم راسخ

نے

مجھے اس قابل بنایا

فہرست

ارتقاء کے کسی بھی نقطہ نظر سے زندگی کا کُل سرسبد یا مکمل و آخری کڑی انسان ہے۔ قرآن کریم میں اس حیاتیاتی ظہور کو خلیفہ کا لقب دیا گیا ہے۔ یعنی مخلوقات میں سب سے آخر میں آنے والا۔ (LATEST) تخلیق کی مکمل تر اور آخری کڑی لیکن یہ انسان کی جسمانی تکمیل اور اس کا جسمانی ظہور تھا جس کے فوراً بعد اس کے ذہنی ارتقاء لہٰذا قانونی ارتقاء کا آغاز ہو گیا۔ اسی لئے

جب ہم قرآن کریم کے مطابق کہتے ہیں کہ قوم نوحؑ کے بعد خلافت (جانشینی) قوم عاد کو ملی اور عاد کے بعد قوم ثمود کو، تو اس سے دراصل قرآن کا اشارہ ذہنی و قانونی ارتقاء کی طرف ہی ہے کہ جب ایک قوم آگے بڑھنے اور بلند تر قوانین کو قبول کرنے کے قابل نہیں رہی تو دوسری قوم نے جو اس سے بہتر تھی اس کی جگہ لے لی اور قانون کے اتباع و تعمیل سے انسان کو اگلی منزل تک پہنچا دیا۔

نزول قوانین کا سلسلہ انبیاء و رسل کے ذریعہ جاری رہا اور انسان ذہنی ارتقاء کے مدارج طے کرتا ہوا اس منزل تک پہنچ گیا جہاں انسانیت کے کُل سرسبد رسول آخر الزماںؐ اور قانون کے کُل سرسبد قرآن کا ظہور ہوا اور خلافت ——— یا قرآنی حکومت ——— امت محمدیہ کے ہاتھ میں آ گئی۔ لیکن خلافت کے ضمن میں اب قصہ ذہنی اور قانونی ارتقاء کا بھی نہیں رہا تھا ——— کیونکہ ذہن بالغ اور قانون مکمل ہو چکا تھا ——— بلکہ انسانی زندگی کے بڑھتے ہوئے مدنی و معاشرتی تقاضوں کے مطابق اس قانون کے استعمال کا تھا جس کا حق امت محمدیہ نے بے شک ایک حد تک ہی ادا کیا مگر خود رسول اللہؐ اور اولین خلفاء رسول اللہؐ نے بہرحال یہ ثابت کر دیا کہ ایک مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے کسی بھی شعبۂ حیات میں ان قوانین کی تعمیلی و تشکیلی استعداد کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ نیز یہ کہ خلافت اس حکومت اور قوت کا نام ہے جو خود ان قوانین کی مطیع نیز عامل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی مقتدر ترین[1] حکومت ہو۔

---

[1] "مقتدر ترین" میں "ترین" کا مفہوم خود لفظ خلیفہ یا خلافت میں مضمر ہے (باقی آئندہ صفحہ پر)

مقتدر ترین ان معنوں میں کہ دنیا بھر کے لئے خدائی قوانین کی تعمیل کے لحاظ سے مثالی راہنما، سلوک اور تعلقات کے لحاظ سے امن کی ضامن اور طاقت کے لحاظ سے نوع انسانی کے امن میں مخل ہونے والوں کے غیر جانبدارانہ محاسبہ اور سرکوبی کے قابل ہو اور یہ قابلیت موثر ہو۔

اس قابلیت کی سطح تک پہنچنے کے لئے ظاہر ہے پہلے مسلمان معاشرے قرآنی قوانین کے مطابق اپنی اصلاح کریں، اپنی تنظیم اور اپنی حکومت قائم کریں اور جب بحیثیت جماعت اور بحیثیت حکومت نمونۂ عمل بننے کے قابل ہو جائیں تو انہی قوانین کے بل پر جن سے خود مسلمان معاشروں کی تربیت اور نشوونما ہوئی تھی۔ نوع انسانی کی خدمت اور فلاح کا فرض، مقتدر اور با اثر عنصر کی حیثیت سے انجام دیں تاکہ قرآنی مقصد آگے بڑھے۔ قرآنی مقصد یہ کہ زیادہ سے زیادہ انسان خدائی ضابطۂ حیات کو ایماناً و عملاً قبول کر کے زیادہ سے زیادہ وحدت، یکجائی، ہم نظری لہذا بے خوفی، امن و اطمینان اور فارغ البالی کی زندگی سے ہم کنار ہوں تاکہ رُوح کا جوہر اُبھرے اور نکھرے اور ہر فرد اپنے رب سے قریب ہوتا چلا جائے۔

برصغیر ہند کے مسلمانوں کے پیش نظر یہی مقصد تھا!

جو فرد بشر یہ ضابطۂ حیات جسے خدا نے اسلام کا نام دیا ہے بضا و رغبت اختیار کریگا وہ مذکورہ لائحہ عمل کا پابند ہوگا۔ ذاتی، اجتماعی، حکومتی، ہر حیثیت میں، ہر مخالفت کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۳) جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہے کہ اوّلاً تو تخلیقی ارتقاء کی آخری کڑی کی حیثیت سے انسان کو خلیفہ کہا گیا ہے۔ پھر ذہنی وقانونی ارتقاء کی ہر آخری (LATEST) کڑی یعنی اپنے دور کی ترقی یافتہ تر قوم خلافت کی مستحق ہوئی اور پھر ذہنی بلوغ وقانونی تکمیل کے بعد اس قانون کا بہترین استعمال کرنے والی قوم کو شرف خلافت کا مژدہ سنایا گیا۔ رہا اس لفظ میں اقتدار کا مفہوم تو وہ ترقی یافتہ تر عنصر کا قدرتی لازمہ نیز قوانین الٰہی کے اتباع و تعمیل کا ناگزیر نتیجہ ہے۔

[1] قرآن کریم نے امن کی ضمانت کے لئے مومن، غیر جانبداری کیلئے اُمّۃً وَّ سَطًا، محاسبہ کے لئے شھداء علی الناس اور سرکوبی کے لئے اشدّاء علی الکفار کا منشور دیا ہے۔

[2] اس اصلاح میں سرپرستی، نگرانی اور تعمیل قوانین کی ذمہ داری حکومت پر ہوگی بمطابق یکون الرسول علیکم شھیداً۔

علی ایرنم ، ہر آشیانے کو پھونک کر اور ہر وقتی سکون کو اجاڑ کر اس دستور کو انبیائے کرام اور ان کے رفقاء نے ، رسول آخر الزماں اور آپ کے اصحاب نے اور ہر دور کے سچے مسلمانوں نے اپنایا ہے اور خدائی قانون کی آبرو کے یہ محافظ خدا کے دست و بازو اور خدا کی آیات بن کر متعارف ہوئے ہیں اور اس وقت تک متعارف ہوتے رہیں گے جب تک " یہ دین تمام ادیان پر غالب نہ آجائے "۔ (۹/۳۳ القرآن)

ہاں ! " برصغیر کے مسلمانوں کے پیش نظر یہی مقصد تھا " جس کے لئے بے پناہ جانی مالی اور جذباتی قربانیوں اور مدتوں کی مسلسل جنگ کے بعد پاکستان وجود میں آیا۔

یہ مطالبہ علیحدگی یا مطالبہ آزادی دوسری اقوام کے مطالبہ آزادی کی طرح نہیں تھا۔ بلکہ اپنی منفرد حیثیت میں قوانین خداوندی کی غلامی کے لئے آزادی کا مطالبہ تھا ، جس کا سب سے جامع اور سب سے مختصر نعرہ تھا " پاکستان کا مطلب کیا ہے ! لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ " اور اگر بہ فرض محال ایسا ہوتا بھی کہ برصغیر کے مسلمان اپنی آزادی اور علیحدگی کی بنیاد قرآنی غلامی کے دعوے پر نہ رکھتے اور دوسری عام قوموں کی طرح مطالبہ آزادی کرتے تب بھی اپنی آزاد ریاست مل جانے کے بعد مومنین و مسلمین کی حیثیت سے ان پر یہ فرض عائد ہوتا کہ جس ذات اور جس کتاب کے ساتھ وہ انفرادی حیثیت میں وفاداری کے دعوے دار ہیں اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے معاشرتی ، ریاستی اور عالمی کردار کی تعمیر کے لئے تن من دھن سے جُت جائیں ورنہ اسلام کے ساتھ نام نہاد یقین ہیں وفاداری کو ختم کر دیں جسے اس نے فسق ، شرک ، ظلم اور منافقت کا نام دیا ہے مگر ہم لوگوں نے دونوں میں سے کوئی قدم بھی نہیں اٹھایا اور ۲۵ برس گزر چکے اسے دم تک دورُخی کی حکمت عملی پر گامزن ہیں۔

جس معاشرے اور جس حکومت کا نصب العین عالمی سطح پر " انسانوں کے درمیان اختلافات مٹانا " (۲/۲۱۳) اور انسانوں کو ایک وحدت کی طرف بڑھانا ہو خود اس معاشرے میں کسی بھی شعبۂ حیات میں اختلافات کی موجودگی غیر منطقی اور مضحکہ خیز ہے۔ اسی لئے قرآن نے اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست میں کسی بھی شعبۂ حیات میں ، کسی بھی سطح پر فرقہ اور پارٹی سازی کی اجازت نہیں دی ۔ اس نے برملا اور واضح الفاظ میں تاکید کی ہے " ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے گروہ بندیاں کیں اور اختلافات کو ہوا دی حالانکہ

ئے پاس واضح دلائل آ چکے تھے نتیجتاً وہ عذاب عظیم میں گھر گئے" (۳/۱۰۵) مشرکین میں سے
جاؤ جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ ہو گئے۔ ہر گروہ اپنے نظریات
مگن اور خوش تھا" (۳۰/۳۲) "جن لوگوں نے اپنے دین کے ٹکڑے کئے، تفرقہ بازی کی
پارٹیاں بنا لیں ان سے آپ کا (یعنی حکومت خداوندی کا) کوئی واسطہ نہیں" (۶/۱۵۹)
کھلے احکام کی موجودگی میں پاکستان کے ابتدائی بحرانی دور کے فوراً بعد مذہبی فرقوں کی
ں کا خاتمہ سب سے پہلے کرنے کا کام تھا۔ اسلامی حکومت کے دعوے داروں کا فرض تھا کہ
نی حکم کے حوالے سے تمام فرقوں سے اپنا رشتہ توڑ کر (۶/۱۵۹) ان کی بیخ کنی کا اہتمام کرتے
یوں اسلامی آئین کی بنیاد رکھ دیتے۔

اسی طرح سیاسی ڈھانچہ مشترک قرآنی اصولوں کی بنیاد پر تیار ہوتا نہ کہ ان قوموں کی
لی اور گداگری پر جو خود مشترک اصولوں اور مستقل قدروں سے محروم اور حالات کی
کروں سے زخمی ہیں۔ مروجہ مغربی جمہوریت کے اصولوں اور محرکات کے بارے میں یہ قطعی
کہ یہ اصول مخصوص احوال و نظریات کا انسانی ردّ عمل ہیں، ان کی پرورش خالص "مادی
ی" ماحول میں ہوئی ہے اور ان کا ارتقاء محض سائنسی پس منظر کے پیچ و تاب اور تغیرات
ظہور میں آیا ہے۔ انسان نے گزشتہ چند صدیوں میں اس مسئلہ کے حل میں جس قدر
ت کا مظاہرہ کیا ہے وہ قابل ستائش سہی مگر کیا کیا جائے کہ یہ محض انسانی کوششیں تھیں
تنی ہی ناکام ثابت ہوئیں جتنا عقلِ محض کو ہونا چاہیئے۔

مغربی جمہوریت کے اصولوں اور ہمارے عقائد و احکام میں سب سے پہلا بنیادی
ق یہ ہے کہ ان کے ہاں اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ عوام ہیں اور ہمارے ہاں اللہ تعالیٰ ہے
ہمارے ہاں قانون کا سرچشمہ انسانوں کا بنایا ہوا آئین نہیں، قرآن کی پیش کردہ مستقل اور
سی اقدار ہیں۔ ان اقدار کے سرچشمہ سے قانون و آئین کی تدوین ہوتی ہے اور اس تدوین
ستقل اقدار سے ایک انچ بھی انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ مغربی تصورِ جمہوریت کی رو سے
طرح قانون کی تدوین و تنفیذ کے لئے فوراً اقتدارِ اعلیٰ کے سرچشمہ (یعنی عوام) کی طرف

مسلم لیگ حصولِ پاکستان کے لئے غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمین ہند کی نمائندہ
عت تھی نہ کہ مسلم معاشرے میں اپنوں کے مقابلے میں۔

نظرِ استیاج اٹھتی ہے بالکل اُسی طرح اسلامی تصورِ حکومت میں تشکیل آئین کے لئے اقتدارِ اعلیٰ کے سرچشمہ (یعنی اللہ تعالیٰ) اور قانون کے سرچشمہ (یعنی قرآنی مستقل اقدار) پر جاکر نگاہیں رُک جاتی ہیں۔ یہاں سے دوسرا فرق شروع ہوتا ہے۔ جدید مغربی جمہوریت میں عوام اپنے معتمد علیہ نمائندے (یعنی اقتدارِ اعلیٰ کے سرچشمہ کے معتمد علیہ نمائندے) اسمبلیوں میں بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ تشکیل و تنفیذِ قانون کا کام سرانجام دیں اور وہ بغیر کسی مستقل اعلیٰ وابدی بنیادوں کے اپنی اور روایات کی صوابدید کے مطابق انسانی فکر کے ساختہ آئین کے تحت اپنا قانون مرتب اور مدون کر لیتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی حکومت میں چونکہ اقتدارِ اعلیٰ عوام کو حاصل نہیں نیز قانون کا سرچشمہ قرآنی اقدار ہیں۔ اس لئے ایسے قانون کی تدوین اور تنفیذ کے لئے ان مخصوص افراد کی (پارٹیوں کی نہیں) احتیاج ہوتی ہے جو اس سرچشمہ کی روح سے واقف اور مشروط صلاحیتوں کے حامل ہوں۔ ان افراد کو حکومت میں لانے کے لئے کسی طریق کار کی پابندی نہیں لیکن نمائندہ افراد پر بہرحال ایسی پابندیاں عائد ہیں جو ان کی پوری زندگی کو محیط ہیں اور اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں ان سے تزکیہ اور دوسری متعلق صلاحیتوں کی ضمانت مانگتا ہے۔ اس ضمانت کے بغیر کوئی فرد قانون سازی اور تنفیذِ قانون کے مقدس دائروں میں قدم رکھنے کا مجاز[1] نہیں۔ اسی وجہ سے طریقِ انتخاب کوئی بھی ہو

---

[1] مخصوص اور مشروط امیدوار کی پابندی سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انتخاب میں شرکت کے لئے جن امیدواروں کو حکومت اجازت دے ان کی متعلقہ و مطلوبہ صلاحیتوں کی آخر کس معیار پر اور کس طریق سے جانچ پڑتال ہو۔

اسلامی مملکت میں جہاں تک اس نازک ذمہ داری کا تعلق ہے یہ بات بالکل عیاں اور صاف ہے کہ قرآن کے مطابق قوانین سازی کوئی بازیچۂ اطفال نہیں کہ ہر کس و ناکس اس سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اس کے لئے قرآنی تعلیمات پر مکمل عبور کے علاوہ اجتہادی استعداد اور استخراجی فراست سے کماحقہٗ بہرہ ور ہونا ضروری ہے اور اس تعلیم و تربیت کا انتظام اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اس مقصد کے لئے یونیورسٹی سطح پر ایک تدریسی نصاب کے مطابق تیاری اور امتحان کا اہتمام ہونا چاہئے جس میں داخلہ کے لئے:

۱۔ کسی بھی تعلیمی سند کی پابندی نہ ہو بلکہ قابلیت کے ثبوت کے لئے (باقی آئندہ صفحہ پر)

رائے عامہ ثانوی حیثیت میں چلی جاتی ہے کیونکہ جب سب ہی امیدوار مشروط صلاحیتوں کے حامل ہوں گے تو آراء شماری کا کردار محض تبدیلی حکومت کے طریق کار تک مؤثر رہے گا جس سے مراد یہ ہے کہ رائے دہی میں کوئی بدعنوانی (اگر ہو جائے تو) خطرناک نہیں ہوگی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۳) آزمائشی وقفہ دیا جائے۔

۲۔ داخلہ کے لئے عمر کی کوئی قید نہ ہو۔

۳۔ تعلیمی فیس بالکل نہ ہو۔

۴۔ امتحانات پرچوں اور زبانی لکچرز پر مشتمل ہوں۔

۵۔ ڈگری کی توثیق صدر مملکت کی طرف سے ہو۔

۶۔ صدرِ مملکت کے لئے بھی یہ ڈگری حاصل کرنا لازمی ہو۔

۷۔ امیدوار کی امتحان میں ناکامی پر تاوان وصول کیا جائے۔

یہ نصاب قرآنی تحقیقات کے علاوہ تمام ضروری متعلقہ علوم پر حاوی ہو چونکہ اسلامی مملکت کی اسمبلی دوسری اقوام کی اسمبلیوں سے مختلف اور سرچشمۂ قوانین کے تقدس کی نسبت سے مقدس ہے اس لئے نصاب کا ایک جزو اس اجتماع کے شایانِ شان آداب پر مشتمل ہو اور اس سرچشمہ قوانین کی کما حقہٗ اور براہِ راست تفہیم کے لئے اس کی زبان یعنی عربی کے لئے دو پرچے مختص ہوں۔ مضامین کی وسعت اور گہرائی کی نسبت سے نصاب کم از کم تین سال کا ہو اور پہلے سے خصوصی قابلیت رکھنے والوں کے لئے کم مدت میں نصاب مکمل کروانے کی علیحدہ کلاسیں ہوں۔ دیگر امتحانات کی شرائط نیز ملازمتوں کی شرائط میں اس اعزاز کو جہاں جس نسبت سے موزوں ہو ملحوظ رکھا جائے۔

میری ناقص رائے میں اگر اس پروگرام پر عمل شروع ہو جائے تو مطلوبہ مقصد کے حصول کے علاوہ یہ ادارہ عام تربیت میں بھی نتیجہ خیز کردار ادا کرے گا اور معاشرہ بڑی سرعت اور متانت سے بلند مقاصد کی طرف بڑھے گا۔

اس قومِ رسولِ ہاشمیؐ کے لئے جو اپنی ترکیب میں خاص اور اقوامِ مغرب سے مختلف ہے موجودہ صورتِ حال جو بے مقصد، طفلانہ اور غیر ذمہ دارانہ ہے محض تباہی اور رسوائی کا راستہ ہے جس میں آدھا گھر اور عزت لٹ جانے کے بعد کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا۔

مغربی جمہوریت میں انتخاب کا فلسفہ یہ ہے کہ عوام تدوینِ قانون میں بالواسطہ شامل ہوں اور کسی خاص فکر کے حاملین کا قانون اور مخصوص افراد یا گروہ کا اقتدار عوام پر مسلط نہ ہو جبکہ اسلامی تصورِ حکومت میں یہ چیزیں (یعنی قانون کا بنیادی فکر اور مقتدرِ اعلیٰ کا تصور) پہلے ہی موجود ہیں کہ ارکانِ حکومت کے پاس عوام کا ووٹ بالفرض کسی وقت نہ بھی ہو تب بھی قانون سازی کا سرچشمہ مسلّم و متفقہ بلکہ معتقد علیہ ہونے کی وجہ سے قانون ساز اور قانون کا نافذ ہر شہری کی اس مشترک سرچشمے کے واسطے سے نمائندگی کرتا ہے اور عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ اس سرچشمے میں کوئی منتخب یا غیر منتخب رکن ردّ و بدل کا مجاز نہیں ہوتا نیز اقتدارِ اعلیٰ مخصوص افراد یا طبقہ کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی تصورِ حکومت میں انتخاب کا فلسفہ صرف اس قدر ہے کہ کسی وقت بھی ملوکیت کا غلبہ نہ ہونے پائے اور عنانِ حکومت کسی خاندان یا کسی طبقے کی طرف منتقل ہو کر نہ رہ جائے جس سے اکرمکم عند اللہ اتقٰکم ؎ کا قرآنی نظریہ متاثر ہو۔ اسلام میں فلسفہ انتخاب کو نفسِ نمائندگی سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔

اس تمام تجزیئے سے بخود بخود ثابت ہو گیا کہ مغربی جمہوریت میں پارٹی بازی جس تقاضے اور ضرورت کے تحت ہوتی ہے وہ تقاضا اور ضرورت ہی ہمارے ہاں موجود نہیں وہاں عوام مقتدرِ اعلیٰ ہونے کی وجہ سے خود قانون سازی کے حقدار ہوتے ہیں اور لاکھوں کروڑوں تک پہنچنے والی قانون ساز آراء کو سمیٹنے کے لئے پارٹیاں بنتی ہیں ہمارے ہاں سو فیصد عوام اور سو فیصد نمائندے مشترک، مستقل قانون و اقدار کی وساطت سے ایک دوسرے سے سا سا متفق ہوتے ہیں اور انسانوں کے ہاتھوں میں قانون سازی محض ذیلی اور جزوی و فروعی ہوتی ہے جس میں کوئی قانون ساز ان مشترک اور مستقل اقدار کے منافی قانون سازی کا حق نہ رکھنے کی وجہ سے کسی ایک بھی فردِ مملکت کی بنیادی تمناؤں سے تجاوز نہیں کر سکتا، جبکہ اُدھر ــ مغرب میں ــ اکثریتی پارٹی، اقلیتی پارٹی پر اور اس کے تمام رائے دہندگان اور ہمنواؤں پر ان کی مرضی اور منشور کے خلاف حکومت کرتی ہے۔ گویا جمہوریت کے پردے میں آمریت کا دور دورہ ہوتا ہے اور اختلافات بجائے مٹنے کے پنپتے ہیں اور عملاً حزبِ مخالف اور حزبِ اقتدار کی کشمکش سے تعمیری کاموں میں

؎ خدا کی نظر میں تم میں سب سے زیادہ قابلِ تکریم وہ ہے جو قوانینِ خداوندی کا سب سے زیادہ پابند ہے۔ (القرآن)

الجھاؤ اور رکاوٹ اور دلوں میں نفرت وعداوت اور تعصبات کی آبیاری ہوتی رہتی ہے۔ اور حزب مخالف کی حریص نگاہیں ہر وقت اقتدار کی کرسیاں الٹنے اور اپنا اختلافی منشور زیرعمل لانے پر لگی رہتی ہیں جبکہ اسلامی تصورِ حکومت میں حزب مخالف لفظاً اور اپنے کردار کے لحاظ سے بھی کافی سے بڑھ کر ہے، جسے قرآن نے مُفسد ——— FIFTH COLUMNIST ——— لہٰذا مستوجب سزا گردانا ہے۔ اسلامی حکومت میں اسے حزب معاون کہا جائے گا اور یہی اس کا عملی کردار بھی ہوگا۔ "قرآن اختلافات کو مٹانے کے لئے آیا ہے اس لئے جس کا اس کی تعلیمات پر یقین ہے اس کے لئے رحمت اور رہبر حیات ہے" (١٦/٦٤) اور "اختلافات کا مٹ جانا رحمتِ خداوندی ہے" (١١/١١٨-١١٩) گویا قرآن کی رُو سے حزب اختلاف مع اپنے کردار اور مقاصد کے عذاب خداوندی ہے۔

ان احکامِ خداوندی کی روشنی میں جو براہِ راست ہمارے سامنے ہیں ہمارا گزشتہ ٢٥ سالہ کردار ردعملی اور بر ملا منافقت کا وہ شاہکار ہے جس کی مثال تاریخ کے صفحات میں کہیں بھی موجود نہیں۔ اسلامی جمہوریہ، اسلامی آئین اور اسلامی مملکت کے نام سے ہم نے اسلام کی اور اپنی رسوائی کا جو سامان کیا تھا اس کی تکمیل کا آخری منظر دسمبر ١٩٧١ء میں دنیا کے سامنے آگیا۔ قرآن کے مطابق "یہ وہ عذاب عظیم ہے جو پارٹی بندی اور اختلافات کا لازمی نتیجہ ہے" (٣/١٠٥) یہ ہماری مذہبی فرقہ واریت اور سیاسی پارٹی بندی ہی کا انجام ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی مسلمان مملکت ربع صدی میں اپنا ایک متفقہ آئین تیار نہیں کر سکی اور جب تک یہ اختلافات اور گروہ بندیاں نہیں مٹیں گی اس وقت تک مشترک آئین نہیں بنے گا یا جب تک کوئی آئین ان فرقوں اور پارٹیوں کی لعنت سے امت مسلمہ کو نجات نہیں دلائے گا اس قوم کا حقیقی اور مشترک آئین کہلانے کا مستحق نہیں ہوگا۔

ہماری اس طویل لامرکزیت اور بے آئینی ہی کی وجہ سے ہمارا کوئی بھی شعبۂ حیات ،، افتراق اور تفاوت کی مہلک زد سے بچ نہیں سکا اور ہماری معیشت بھی طبقہ داری کی لعنت سے ملوث ہوگئی حالانکہ قرآنی آئین کی تشکیل وتنفیذ کی صورت میں قرآنی معیشتی خطوط پر چل کر ہماری قوم افلاس کے شرمناک داغ سے بچ سکتی تھی اور سرمایہ دار بھی اس رُسوا کن داغ سے بچ سکتا تھا جو اس کی دولت کو آگ میں تپا کر اسے لگایا جائے گا۔

اب ڈھاکہ کی حکومت نے لادینی حکومت کا اعلان کر کے قرآن کی حاکمانہ استعداد کو کھلا

چیلنج کیا ہے اور ہم نے اسلام کے بارے میں دنیا کو پھر ایک بار دھوکہ دینے کی کوشش کی ہے حالانکہ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے (۱۲/۴۰) جو قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان کو اس نے ظالم (۵/۴۵) اور فاسق (۵/۴۷) کہا ہے۔ یہ تو مشرقی بازو کا نوحہ ہوا

اور مغربی پاکستان میں:

شبِ ہجراں کے جاگنے والو
کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی!

گجرات

۱۹ اپریل ۱۹۷۲ء

صلاح الدین ناسک

زہے نصیب ۔۔ کہ ایک آزاد اور نظریاتی مملکت کے حصول کی جد و جہد پر قلم اٹھا ۔۔ نہ جانے کب سے یہ خواہش کروٹیں لے رہی تھی ۔ مگر صد ہزار افسوس کہ یہ "شرف" حاصل بھی ہوا تو کس موڑ پر ۔۔ !

۔۔ اسلام اور پاکستان کی تاریخ کے اندوہناک موڑ پر ، جب پاکستان ایک بازو سے محروم ، ایک لاکھ پاکستانی سرفروش بد ترین دشمن کی قید میں ، ان کے اندازاً ۵ لاکھ افرادِ خانہ گریہ کناں ، مغربی پاکستان کا وجود اندرونی اور بیرونی سازشوں کے باعث شدید خطرات سے دوچار اور عالمِ اسلام اپنی سب سے زیادہ معتمد علیہ مملکت کی اس حالت پر غم زدہ ۔۔ !

ہمت اور حوصلہ کے باوجود شدتِ احساس کا عالم یہ کہ ہونٹوں پہ مسکراہٹ کا تصور بھی عنقا ۔۔ !

اولاد بڑی پیاری ہوتی ہے ۔ مگر یہ کون جانتا ہے کہ والدین کا نام روشن کرے یا ۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن تصنیف ۔۔ ؟ یہ مصنف کی وہ اولاد ہوتی ہے جو نام روشن نہ کر سکے تو یقیناً چرکہ بھی نہیں لگاتی ۔۔ اس اولاد کی پیدائش پر مصنف کی خوشی کا اندازہ کچھ اسی کا دل کر سکتا ہے ۔۔ مگر اس کے باوجود ۔۔ آج دکھ غالب ہے ، مسرت کوسوں دور ہے ۔۔ اور سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد اِن کانوں میں ہر لمحہ جو زہر گھولا جا رہا ہے ۔ اس کا اثر روح کی گہرائیوں تک ہے ۔ یہی زہر کہ :

" مشرقی پاکستان کی شکست نے ثابت کر دیا کہ نظریۂ پاکستان بھی شکستہ و بے بنیاد تھا "

پاکستان خالصتاً اسلامی نظریئے کے تحت معرضِ وجود میں آیا ۔۔ لیکن آج اسی اسلامی نظریئے کو کتنی آسانی کے ساتھ چیلنج کیا جا رہا ہے ، اسے شکستہ ، فرسودہ اور بے بنیاد قرار دیا جا رہا ہے ۔۔ !

سوچتا ہوں کہ ڈھاکہ کا بیت المکرم تو ہندوؤں اور لادینوں کے تسلط میں گیا ۔۔۔۔۔ لیکن پاکستان کے مسلمانوں کے روح و قلب کا بیت المکرم کیوں زمیں بوس ہوا جاتا ہے ؟ وہ کس کے تسلط میں ہے ؟ اس کی بنیادوں پر کدال چلانے والے نہایت تندہی سے اپنا مشن پورا کر رہے ہیں اور ہم حالات کی چال سمجھنے اور ہواؤں کا رُخ جاننے کی بجائے " ناسمجھی " میں ۔۔ " غیر ارادی " طور پہ

باب ۱

طلوعِ اسلام و ظہورِ عرب

پانچویں صدی عیسوی میں قبیلہ قریش میں قُصیٰ بن کلاب نے جو چار واسطوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا تھے، اپنے بکھرے ہوئے خاندانوں کو یکجا کر کے مکہ کی حکومت اور کعبہ کی تولیت دونوں پر قبضہ کر لیا۔ اس سے پہلے کعبہ پر بنو خزاعہ کا قبضہ تھا مگر ان کے متولی کعبہ نے صرف ایک مشکیزۂ شراب کے عوض قُصیٰ کے ہاتھ کعبہ کی تولیت فروخت کر دی۔ حجاز و مکہ، عرب و اکنافِ عرب اور یورپ اور ایشیا غرضیکہ کہیں بھی تخت و تاج کے دلآویز لوازمات مثالی تو تھے مگر انسانی روح کا بیش قیمت موتی بے آبرو تھا۔

قُصیٰ نے جس نظام کی بنیاد ڈالی تھی وہ ان کے جانشین بیٹے عبدالدار کی وفات کے بعد خطرہ میں پڑ گیا۔ مصالحت ہوئی اور مناصب خاندان قریش کی دو شاخوں میں تقسیم ہو گئے۔ عبدالمطلب کو اپنی مؤثر شخصیت کے باعث امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ انہیں اپنے آٹھ بچوں میں عبداللہ سب سے پیارے تھے۔ عبداللہ کی شادی بنی زہرہ کے سردار وہب کی لڑکی آمنہ سے ہوئی۔ مگر شادی کے کچھ عرصہ بعد ۲۴ سال کی عمر میں وہ وفات پا گئے اور پھر چند ماہ بعد آمنہؓ نے اس یتیم کو جنم دیا جسے **محمد** کے نام سے پکارا گیا۔ یہی انسان اول اور جمن انسانیت کا گل سرسبد ہے جسے ہم محمد رسول اللہ کہتے ہیں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپؐ کی

تاریخ ولادت بالعموم ۹ ربیع الاول (اتوار) مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء تسلیم کی جاتی ہے۔
ابھی آپؐ ۶ برس کے تھے کہ والدہ آمنہؓ وفات پاگئیں، عبدالمطلب کے زیر سایہ آئے مگر دو سال بعد اس سائے سے بھی محروم ہو گئے۔ پھر حضرت علیؓ کے والد اور اپنے چچا ابوطالب کے زیر سایہ آگئے۔ آپؐ کی دیانت کا یہ عالم تھا کہ "الامین" مشہور ہو گئے۔ یہی شہرت سن کر قریش کی متمول ترین خاتون خدیجہؓ نے جو پاکیزگئ اخلاق کے باعث "طاہرہ" کے لقب سے جانی جاتی تھیں، آپؐ کو اپنا سامان تجارت شام پہنچانے کی پیش کش کی۔ پھر آپؐ کی دیانت سے اتنی متاثر ہوئیں کہ شادی کا پیغام بھجوایا۔ وہ بیوہ تھیں اور دو شوہروں سے ان کے تین بچے تھے۔
وقت آیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی رہنمائی کی۔ حضور اکرمؐ پر یہ انکشاف حقیقت ۴۰ سال کی عمر میں رمضان المبارک میں ہوا۔ آپؐ کے دعوئ نبوت پر سب سے پہلے آپؐ کے قریبی دوست حضرت ابوبکر صدیقؓ اور تمام گھر والے ایمان لائے۔ جب تین سال کی کوشش سے تیس افراد حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تو اعلانیہ تبلیغ کا آغاز ہوا۔ دعوتِ اسلام سے جب کعبہ کے بت اور اہل مکہ کے آبائی عقائد پر زد پڑی تو حق و باطل میں جنگ شروع ہو گئی۔ قریش تشدد پہ اُتر آئے کوئی لالچ آپؐ کو اپنے مشن سے نہ ہٹا سکا۔ آخر آپؐ نے نبوت کے پانچویں سال مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنے کی دعوت دے دی۔
اس وقت مسلمانوں کی کل تعداد پچاس تھی۔ نبوت کے دسویں سال آپؐ کی زوجہ مطہرہ حضرت خدیجہؓ اور سرپرست ابوطالب بھی انتقال کر گئے۔ تبلیغ کے عوض طائف میں آپؐ کا استقبال پتھروں سے کیا گیا۔ مکہ میں تبلیغ کے امکانات ختم ہو چکے تھے لہٰذا وطن عزیز کو آخری سلام کہہ کر مسلمانوں کے ساتھ یثرب کو ہجرت کی۔ انہی دنوں یثرب کا نام بدل کر مدینۃ النبی رکھا گیا۔ جو بعد ازاں مدینہ رہ گیا۔ نبوت کی ساڑھے بارہ سالہ مکی زندگی میں قرآن پاک کا دو تہائی حصہ آپؐ پر نازل ہو چکا تھا۔ آپؐ نے مدینہ پہنچتے ہی اس حکومت کی بنیاد رکھی جس کے بغیر دینِ اسلام ادھورا بلکہ بے معنی بھی تھا۔ آپؐ نے مدینہ میں مسجد کی تعمیر، مواخات اور معاہدہ دفاع کے کام انجام دیئے۔ مکہ کے مہاجر غریب الوطن اور تہی دست تھے۔ لہٰذا آپؐ نے ایک ایک مہاجر کو ایک ایک مقامی (انصار) کا بھائی بنا دیا۔ مہاجر اُن کے گھروں میں رہنے لگے اور انصار نے انہیں اپنی ہر چیز کا نصف دیدیا۔ آپؐ نے یہودیوں سے ایک سیاسی معاہدہ بھی کیا۔ اطراف مدینہ کے عرب قبائل نے بھی اس پر دستخط کر دیئے۔ یہ دیکھ کر مکہ والوں نے مسلمانوں

پر پابندیاں مسلط کر دیں۔ ہجرت کے صرف ڈیڑھ سال بعد میدان بدر میں ۳۱۳ پیادہ مسلمانوں کی نیم مسلح فوج نے ساتھ کفار کے ایک ہزار مسلح سواروں سے مقابلہ ہوا پھر بھی فتح مسلمانوں کی ہوئی۔ اس کے ایک سال بعد پھر کفار سے جنگ ہوئی جو غزوۂ احد کہلائی۔ آخر کار ۵ ہجری میں ۲۴ ہزار کفار نے حملہ کر دیا۔ اس کے باوجود ناکام ہوئے۔ ۶ ہجری میں آپؐ کے اور قریش مکہ کے درمیان معاہدہ حدیبیہ ہوا۔ یہ دس برس تک جنگ بندی کا معاہدہ تھا مگر قریش نے صرف ۲ سال بعد معاہدہ توڑ دیا۔ آخر مکہ والوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور مکہ اور کعبہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

آپؐ نے مکہ میں داخل ہوتے ہی کعبہ کا طواف کیا پھر وہاں رکھے ہوئے ۳۶۰ بت گرا دیئے پھر امن عامہ کا اعلان فرمایا اور عام معافی کا اعلان کر دیا۔ صرف دو مجرموں کو سزائے موت دی گئی۔ فتح مکہ کے چند دن بعد جنگ حنین ہوئی اس میں بھی مسلمانوں کو فتح ہوئی اور کچھ عرصہ بعد آپ مکہ سے مدینہ تشریف لے آئے۔

مدنی زندگی کے چھٹے سال آپؐ نے دعوت اسلام کے خطوط مختلف سرداران قبائل اور بادشاہوں کے نام لکھے یوں ہزاروں کفار مسلمان ہو گئے۔ ساتویں ہجری میں آپؐ نے عمرہ کیا۔ آٹھویں ہجری میں جنگ موتہ پیش آئی اور مسلمانوں کو شاندار کامیابی نصیب ہوئی۔

آپؐ کو تکمیل دین کی آیت کے نزول کے بعد اپنے سفر آخرت کا علم ہو چکا تھا لہٰذا آپؐ نے ایک لشکر تیار کیا۔ اس کا مطلب رومی سرحدوں پر حملہ کر کے انہیں مرعوب کرنا تھا۔ اس لشکر کی قیادت بیس سالہ اسامہؓ (آپ کے آزاد کردہ غلام) کے ہاتھ میں تھی۔ لشکر کوچ کرنے کو تھا کہ آپؐ کی طبیعت ناساز ہو گئی مگر آپؐ کا مرض دراصل مرض الموت تھا۔ وفات سے پانچ روز قبل آپؐ نے ظہر کی نماز کے بعد زندگی کا آخری خطبہ دیا۔ چار دن بعد اضطراب پیدا ہوا۔ آپؐ نے ہاتھ اٹھا کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا "بس اب بڑا رفیق درکار ہے"۔

یہ کہتے کہتے ہاتھ ڈھلک گئے اور روح ...... صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ اس دن ربیع الاول ۱۱ھ اور اتوار کا دن تھا۔ دوسرے دن رسول خدا کے غسل اور تکفین کے بعد لوگ گروہ در گروہ نماز جنازہ پڑھتے رہے (امامت کسی نے نہیں کرائی) اور اس جگہ جہاں آپؐ نے وفات پائی حجرۂ حضرت عائشہ صدیقہؓ میں نصف شب کے بعد تدفین کر دی گئی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے منصب خلافت پر

کے متنفق ہو جانے ۔ کے اسباب میں واضح سبب یہ گردانا جاتا ہے کہ آپؐ نے مرض الموت میں نماز کی امامت کے لئے اپنی جگہ حضرت ابوبکرؓ ہی کو مقرر فرمایا تھا اور امامت کا یہ حکم جانشینی کی طرف نہایت روشن اشارہ تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کو زمام خلافت سنبھالتے ہی انتہائی سنگین مسئلہ یہ پیش آیا کہ فتح مکہ کے بعد جن عربوں نے اسلام کی محض شوکت وقوت دیکھ کر اسلام قبول کر لیا تھا انہوں نے حضورؐ کی وفات سے یہ اخذ کیا کہ یہ شوکت وقوت ٹوٹ گئی لہذا انہوں نے مرکزی حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ لہذا حضرت ابوبکرؓ نے اسامہؓ کو کمان دے کر رخصت کیا اور مدینہ کا بغیر فوج کے دفاع کا فیصلہ کر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ مسلسل ایک سال تک باغیوں کا مسلح مقابلہ کرنے کے بعد ان کی سرکوبی میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے دو سال حکومت کی اور حضرت عمرؓ کو اپنی جگہ نامزد کر دیا۔ حضرت عمرؓ کا دس سالہ دور خلافت بے پناہ قانون سازی اور انتظامی و انصرامی کمال کی وجہ سے تاریخ اسلام کا ممتاز ترین باب ہے۔ کثرت قانون سازی کی وجہ کثرت فتوحات تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے مرض وفات میں خلافت کے بارے میں جو وصیتی تحریر چھوڑی اس کے مطابق چھ افراد پر مشتمل کمیٹی نے اپنے میں سے حضرت عثمانؓ بن عفان کو خلیفہ منتخب کر لیا۔ کمیٹی میں حضرت عمرؓ کے صاحبزادے بھی شامل تھے مگر حضرت عمرؓ نے انہیں انتخاب کے لئے کالعدم قرار دے دیا تھا۔

حضرت عثمانؓ ۱۲ سال خلیفہ رہے۔ انہوں نے انتظامی نوعیت کی اہم تبدیلیاں کیں اور مملکت کا رقبہ غیر معمولی طور پر وسیع ہو گیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت مسلمانوں کے ایک سازشی عنصر کے ہاتھوں ہوئی۔ ان کے بعد مسلمانوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی ۔ حضرت علیؓ نے دار الخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل کر دیا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے وقت سے شام کے مفتوحہ ممالک میں تمام تر انتظام و انصرام معاویہ بن ابی سفیان کے ہاتھوں میں تھا۔ انہوں نے حضرت علیؓ کی خلافت کو چیلنج کیا اور اپنے علاقہ میں خود مختاری کو چیلنج کر دیا۔ حتیٰ کہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد وہ سب مملکت اسلامی کے امیر مطلق بن گئے۔ یوں دار الخلافہ یا دار الحکومت دمشق ہو گیا۔ امیر معاویہ اسلامی مملکت کے پہلے حکمران ہیں اور انہوں نے انتخاب کے بغیر قوت کے بل پر درپردہ کوششوں سے جانشینی کا انتظام کیا۔ یوں اسلام میں پہلی مرتبہ موروثی بادشاہت کی بنیاد پڑی۔

من گراں کی ضربوں کو دعوتِ برداشت کر رہے ہیں بلکہ منافقوں کا مشن بھی اپنائے جا رہے ہیں۔

سوال یہ ہے یہ "ناسمجھی" یہ "ناراضگی" کیوں —؟

اس لئے کہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے ڈیڑھ دو سال بعد ہی سے اقتدار و اختیار کی چھینا جھپٹی شروع ہوئی — وہ کرکٹ میچ ہوا کہ وکٹیں اڑتی رہیں — سیاسی کھلاڑی آؤٹ کئے جاتے رہے — اور دیگر تمام ذمہ داریوں سے آنکھیں موند لی گئیں۔ نئی نسل نہ سمجھ سکی کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے — نہ اُسے اپنی منزل کا علم ہو سکا۔ لسانی تنازعات بار بار پیدا ہوئے یا کئے گئے۔ مگر کوئی "مجاہدِ آزادی"، کوئی "مستند" محافظِ نظریہ پاکستان یہ نہ بتا سکا کہ یہاں ہر قوم آباد ہے، اس پر رنگ، نسل، ذات، علاقے اور زبان کی بنیاد پر تفریق حرام قرار دی گئی ہے۔ شاید اس لئے کہ پاکستان کا سیاستدان "ملّا" کہلانے کی بجائے "لیڈر" کہلانا پسند کرتا رہا، وہ 'لیڈر' — جس کے ایک ہاتھ میں مذہب کی اور دوسرے ہاتھ میں سیاست و مملکت کی تلوار رہی — (اور شاید دونوں تلواریں بڑھ جاتی ہیں تو اپنے ہی بازو کاٹ پھینکتی ہیں ورنہ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں انجیل کیوں نہ ہوں؟) اور وہ یہ دونوں تلواریں دو مختلف افراد کو تھما دیتا ہے۔ (شاید دست و گریباں ہونے کے لئے)

نئی نسل نے دو تلواروں والے 'لیڈر' ہی کو دیکھا — چنانچہ ۲۵ سال میں جب یہ نسل عنفوانِ شباب کو پہنچی تو وہ احتجاج، جلسہ، جلوس اور مظاہرے میں طاق تھی، اسے تہذیبِ مغرب و لسانِ مغرب کا علم تو تھا لیکن اُن بنیادی اقدار سے کلیتاً بے بہرہ — جن سے اس کا خمیر اٹھا تھا۔ 'ہاکس بے' ملت و مملکت کی پیشانیوں کا "چاند" بنا۔ جن ساحلوں سے ایک مسلمان عورت کی فریاد حجاج کے کانوں سے جا ٹکرائی تھی، اور جس فریاد پر ہندو کے نخوت و تکبر سے مسلمان ٹکرایا تھا، اُنہی ساحلوں پر مسلمان لڑکیاں 'مسلمانوں' کے ہاتھوں بے آبرو ہوئیں — مگر وہ کس 'حجاج' سے فریاد کرتیں؟ بحث اس سانحے سے ہے نہ اس سزا سے جو طلبہ کو ملی — رونا اس رستے زخم کا ہے جو ۲۳ سال تک پلنے کے بعد ناسور بن گیا، جس کا فاسد مادہ اس جسم کے دوسرے حصوں پر قطرہ قطرہ ٹپکا اور انہیں بھی معذور و ناکارہ کرتا چلا گیا — ماتم اسی معذوری کا ہے۔ مشرقی پاکستان، موقع پرستوں کی جھولی میں جا گرا۔ اس لئے ہرگز نہیں کہ ہمارے نظریئے کی اساس شکستہ تھی — یا تھی ہی نہیں — اس لئے کہ ہم نے اس اساس کے تحفظ کے لئے کیا کچھ نہیں — اب اس ناسور کا زہریلا مادہ سندھ، بلوچستان اور سرحد پر ٹپک رہا ہے۔

میں کمال دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ اس لمحہ تک اجتماعی یا کسی بھی پیمانے پر ایسی کسی مہم کی طرف توجہ نہیں دی گئی، جس کے ذریعہ اس مملکت کے حصول کے مقصد، اس کی نظریاتی اساس اور اس کے لئے جدوجہد کی وجوہات کو عوام بالخصوص طلبہ پر آشکار کیا جا سکتا اور ان کے عقائد کو راسخ کرنے کی کوشش کی جا سکتی۔ اگر پاکستان کا مطلب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ تھا۔ تو کیا پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد یہ مطلب ختم ہو گیا یا بدل گیا ۔؟

گھر میں سوگ ہو اور ہم جشن منائیں ۔؟ مشرقی پاکستان پر اغیار کا تسلط ہوا ۔ لاکھوں محبانِ وطن کے خون سے ہولی کھیلی گئی، لاکھوں عورتوں کے سہاگ لُٹ گئے، لاکھوں بیٹیاں بے آبرو اور یتیم ہوئیں، ایک لاکھ جیالے دشمن کے کیمپوں میں پہنچے ۔ دو بار اُن پر گولیاں برسیں، اُن کے لاکھوں افرادِ خانہ کے آنسو ہیں کہ تھم نہیں پاتے، سرحدوں پر دشمن کا اجتماع، پاکستان کے وجود کو ختم کرنے کے لئے سامراجیوں کی کارروائیاں ۔ مگر ہم نے جشن منائے، مشعل بردار جلوس نکالے، بھنگڑے ڈالے ۔ اس لئے کہ کچھ لوگوں سے زینیں چھن گئیں ۔ فرطِ مسرت کا یہ عالم۔ ملک کا ایک حصہ، ایک لاکھ مجاہد، بیویوں کے سہاگ، بیٹیوں کی آبرو ۔ چھن جانے کا غم غلط ہو گیا۔ یہ سب کیا ہے ۔ کیوں ہے؟ آنکھوں میں اِن ظلمتوں کو چیرنے کا دم ہے نہ دل میں اس زہر کے مقابلہ کی سکت ۔!

جب احساسِ زیاں جاتا رہے تو احساسِ حیات کی دھجیاں خود بخود فضا میں اُڑ جاتی ہیں۔ ہم نے قلب و روح کے جِلا اور استحکام کے اس اسلامی نظریئے سے انحراف کیا جو دنیا و آخرت کو محیط ہے۔ اس کی جگہ "رواقی نظریاتِ مسرت" کو دی ۔ نتیجہ ۔؟ کہ اس تنہ آور شجرِ سرسبز کو آندھیوں اور طوفانوں نے لُوٹ لیا ۔ جس کی فطرت میں لچک کا عالم یہ ہے کہ کوہِ گراں بھی ٹوٹے تو اس کی کونپلیں پھوٹتی رہیں، اس کی شادابی قائم رہی اور کوئی غلبہ اُسے تناور بننے سے نہ روک سکا۔

قلب و روح کی زندگی و شادابی کا یہ احساس کہاں گیا ۔؟

سیاستدان کا احساس ۔ اقتدار نے چھینا، تاجر و صنعت کار کا احساس دولت نے لُوٹا، قلم کی آبرو کا احساس سکوں میں تُل گیا، مُلّا کا احساس نزاعی مباحث اور جُبّہ و عمامہ میں اُلجھا، متوسط اور غریب طبقہ کا احساس بدعنوانیوں، رشوتوں اور معیشی ابتلاء نے مجروح کیا ۔ اس افراتفری میں نئی پود، نئی نسل کو پاکستان کی اساس اور اُن کے فرائض کا احساس کون دلاتا۔؟ رہا سنافر ۔ تو وہ میکاؤلی، مارکس اور لینن کے افکار میں گُم ۔ ان کا مدّاح اور شیدائی۔ اُسے

کیا تو کہ اس دنیا کا عظیم ترین منکر کون تھا؟ کون ہے اور کون رہے گا۔ اسے کیا علم مشرق کی ڈیمانڈیں اور ایڈمنسٹریشن کیسے کرتے ہیں۔ اس کی بلا جانے کہ قوتِ حیدری اور ایمانِ شبیری میں باہم تعلق تھا تو کیوں؟ وہ معاہدہ تاشقند کو سمجھتا ہے مگر صلح حدیبیہ کی بنیاد سے بے خبر ہے۔ اقوامِ متحدہ کا دستور از بر مگر قومی مرکز کعبۃ اللہ اور دنیا کے عظیم ترین آئین قرآن سے بیگانہ۔۔!

رونا اسی بات کا اور ماتم اسی بے خبری کا ہے۔ کوئی نیا غم ہوتے کوئی نیا زخم لگے تو ماضی کے کچھ واقعات بھی نگاہوں میں گھوم جاتے ہیں۔

تشکیلِ پاکستان سے چند ماہ قبل لدھیانہ گورنمنٹ ہائی سکول میں پانچویں کا طالب علم تھا۔ ایک ہم جماعت ہندو لڑکے کے لباس پر میرے قلم سے چند چھینٹے پڑ گئے۔ اس بدتمیز ہندو لڑکے نے میری طرف کمال حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا "مسلمان کتا" ۔۔۔ اور دوسرے لمحہ اس کے منہ پر میرے دو تھپڑ یوں پڑے کہ وہ اپنے سے بہت کمزور شخص کی اس جرأت پر سکتے میں آگیا۔ مقدمہ سکول ہیڈ ماسٹر کے سامنے پیش ہوا:

"تم نے اسے کیوں مارا۔۔؟"

"جی اس نے مجھے مسلمان کتا کہا تھا۔"

"کیا کتا کہہ دینے سے کوئی انسان کتا ہو جاتا ہے؟"

"جی نہیں ۔۔۔ اس نے مجھے نہیں ۔۔۔ مسلمان کو کتا کہا تھا۔"

بہ ہر حال ہیڈ ماسٹر نے مجھے "خطرناک ہو" کہہ کر "معاف" کر دیا۔ یہ خوبی کس کی تھی ۔۔؟ میری نہیں بلکہ اس کی جس کے احساس کی لو سے میرا احساس روشن ہوا تھا۔ کوئی ایک ماہ بعد میں شملہ چلا آیا۔ اندازہ کیجئے کہ ہندو کا جال کتنا مضبوط تھا۔ اس کی تنظیم کا عالم کیا تھا۔۔۔۔۔۔

ایک رات گھر لوٹتے ہوئے کمانڈر انچیف کی محل نما کوٹھی کے سامنے سے گزرا تو سڑک پر غلافِ ہوا تاریکی تھی۔ اچانک آٹھ دس افراد نے سر پر لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔ میرے کانوں میں ایک ہی آواز آ رہی تھی "مسلمان کتا ہے" سر کے زخموں میں بڑے زخم کا نشان آج بھی موجود ہے۔ یہ نشان آج بھی میرا سرمایہ ہے۔ یہ نشان میرے لئے جدوجہد پاکستان کی تاریخ کے اوراق کی طرح ہے ۔۔۔ مگر

۔۔۔ مگر وہ جو پاکستان میں پیدا ہوئے۔ اس جدوجہد کے مقصد اور اس کی اہمیت کو کیونکر سمجھتے؟ حادثے نہ مشاہدے ۔۔۔ تربیت نہ تدریس! انہیں تو کچھ سمجھایا ہی نہ گیا ۔۔۔ سوال

بتہ رسمجھاتا کون — ؟

—— اقتدار کے پجاری یا محراب و منبر کے اجارہ دار ؟

—— سرمایہ پرست والدین یا اعلیٰ ملازمتوں کے ذریعہ بدعنوانیوں کے دلدادہ ؟

—— بیروزگاری اور افلاس کی چکی میں پسنے والے لوگ یا صوبائی عصبیت کے عفریت؟

سوال پھر پیدا ہوتا ہے، کہ نالہ و فریاد کیجئے تو کس سے۔ — روئیے تو کس کے سامنے —— ؟

آنسو ریت پر ٹپکے تو جذب ہو کر رہ جاتا ہے —— صحرا کی پیاس نہیں بجھتی، آنسو دریا میں گرے تو اس کی بیکرانی میں اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے —— طوفان پیدا نہیں کرتا —— ہاں! دیدۂ دل اور قلبِ حساس کے سامنے ٹپکے تو گُہر کی قدر و قیمت پاتا ہے، بشرط اتنی ہے کہ اشک 'جوہرِ سیال' اور شاہد 'جوہر شناس' ہو۔ آج پاکستان کو اس 'جوہرِ سیال' اور 'جوہر شناس' بیک وقت دونوں کی ضرورت ہے —— تاکہ یہ صحرا میں جذب ہو نہ دریا کی بیکرانیوں میں گم —— بلکہ گُہر کی قیمت پائے مگر اس کے لئے احساس شکستہ نہیں احساسِ تازہ کی دولت درکار ہے۔ —— وہ دولت —— جس کی حفاظت 'قدرِ مشترک' 'نظریۂ مشترک' اور 'اساسِ مشترک' کے محافظ کرسکیں۔

۹۔ رحمان سٹریٹ۔ فلیمنگ روڈ

لاہور

عباسیوں نے ۷۴۹ء سے ۱۲۵۶ء تک اقتدار سنبھالے رکھا۔ ان کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد حکومت سے عربوں کا اثر و رسوخ کم ہونے لگا اور ایرانی اثر و رسوخ کا آغاز ہو گیا۔ بنو امیہ کے دور میں عرب و عجم کے درمیان جو امتیاز پایا جاتا تھا۔ بنو عباس کے دور میں اس امتیاز کو اسلامی احکامات کی تطبیق میں برتری حاصل نہیں۔ بنو عباس کے دور میں بہت سے ایرانیوں کو دربار میں اچھے عہدے ملے۔ بنو عباس کے دربار میں ایران کے درباروں ایسی تمکنت اور دبدبہ نظر آنے لگا۔ اس دور میں خلیفہ ہارون الرشید کو بہترین خلیفہ شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے دور میں پورے ایشیا کے لوگوں کو دربار میں ملازمت دی گئی۔ ترکوں کے ہاتھ میں فوجی قیادت جانے سے ان کا اثر و رسوخ بہت بڑھ گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بنو عباس کی حکومت بغداد کے صوبے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ وہ سیاسی اعتبار سے زوال پذیر ہو گئے تاہم انہیں مذہبی اور روحانی سربراہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا رہا۔ ۱۲۵۸ء میں چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کر دیا اور خلیفۂ وقت المستعصم کو ہلاک کر دیا۔ یوں خلافت بغداد کا خاتمہ ہو گیا۔

اسلام اور اسلامی اقتدار بڑی تیز رفتاری کے ساتھ دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلے۔ سب سے پہلے جن مسلمانوں نے ہندوستان کی سرحدوں پر قدم رکھا وہ عرب تھے۔ شام، فلسطین مصر اور ایران پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد یہ عرب مسلمان مشرق کی طرف بڑھے۔ یہ مسلمان تجارت کے ساتھ ساتھ تبلیغ اسلام میں بھی مصروف تھے۔ عبد اللہ بن عمرو بن رابی، مکران سے ہوتے ہوئے سیستان اور سوستان تک پہنچے۔ قیام امن کے بعد پھر مکران لوٹے۔ یہاں سندھ اور مکران کی مشترکہ طاقت نے ان کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ جو مسلمان جنوبی ہند میں تجارت کر رہے تھے۔ ہندو راجہ انہیں کسی رواداری کی بنا پر برداشت نہیں کر رہے تھے۔ بلکہ ان پر ٹیکس عائد تھا۔ ہندو راجہ اس سے خاصی دولت سمیٹ رہے تھے۔ سندھ کا راجہ آئے دن مسلمانوں کے خلاف شرارتوں میں مصروف رہتا۔ آخر جب اس نے خلیفہ ولید کے دور میں مسلمانوں کے ایک سمندری قافلے کو لوٹا اور عورتوں بچوں کو قیدی بنا لیا تو حجاج نے راجہ داہر کے خلاف فوج روانہ کروں۔ دو مہمات میں مسلمانوں کو شکست ہوئی مگر تیسری مہم جو محمد بن قاسم کی قیادت میں آئی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ آخر ۳ سال بعد محمد بن قاسم نے سندھ کا وہ تمام علاقہ قبضہ میں کر لیا جس کی سرحدیں اس وقت کشمیر کو چھوتی تھیں۔ اس موقع پر محمد بن قاسم نے

دیبل میں پہلی جامع مسجد تعمیر کرائی اور چار ہزار عرب تاجر آباد کیے۔ سندھ ۳۹ سال تک امویہ خلافت کے زیر انتظام رہا اور قریباً سو سال تک خلافت عباسیہ کے۔ بعد ازاں سندھ کی حکومت ایک مقامی عرب خاندان کے ہاتھ میں آگئی جو ڈیڑھ سو سال تک حکومت کرتا رہا۔ تین سو سال تک مسلمانوں کی حکومت کے بعد وہاں سومرو خاندان کا قبضہ ہو گیا اور اس سرزمین پر پھر کفر و الحاد کی تاریکیاں چھا گئیں۔

جب سبکتگین غزنی کا بادشاہ منتخب ہوا اور اس نے بست اور قزدار کے علاقے بھی فتح کر لیے تو اس کی سرحدیں راجہ جے پال کی سرحدوں سے جا ملیں۔ راجہ کی حکومت لاہور تک پھیلی ہوئی تھی۔ راجہ کی فوج نے سبکتگین کی فوج سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تو اس نے بھی جوابی کارروائی کی۔ شکست کے باوجود وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور سبکتگین نے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا لمغان سے پشاور تک اس کی حکومت وسیع ہو گئی۔ ۹۹۷ء میں سبکتگین کے انتقال کے بعد محمود غزنوی سلطان مقرر ہوا۔ راجہ جے پال نے موقعہ سے فائدہ اٹھا کر کچھ علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ لہٰذا محمود غزنوی نے کارروائی کی۔ راجہ جے پال کو اس بار اپنی شکست پہ اتنی شرم آئی کہ وہ زندہ جل مرا۔ اور اس کا بیٹا آنند پال تخت نشین ہوا۔ جنگوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخرکار ۱۰۲۲ء میں محمود غزنوی کی حکومت پنجاب تک پہنچ گئی۔ غزنوی خاندان کی حکومت ۱۹۰ سال تک رہی۔ اور اس خاندان کے کل ۱۶ بادشاہ ہوئے۔ غوریوں نے غزنی پر حملے کیے۔ اور بہرام غزنوی نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ پھر لاہور کا تخت محمد غوری کے قبضہ میں آ گیا۔ محمد غوری کی جنگ راجہ پرتھوی راج سے ہوئی اور مؤخر الذکر اس کو شکست ہوئی۔ سلطان معز الدین محمد بن سام ہندوستان سے غزنی لوٹتے ہوئے ہندو راجاؤں کی سازش سے پنجاب کے علاقے میں قتل کر دیا گیا۔ سلطان لاولد تھا۔ لہٰذا اس کے ایک غلام قطب الدین ایبک کو ہندوستان کی سلطنت ملی۔ وہ ۲۵ جولائی ۱۲۰۶ء کو دلی کے تخت پر براجمان ہو گیا۔ اس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کی بادشاہت کا آغاز ہو گیا۔ اس کے بعد ہندوستان پر خلجی، تغلق، سید لودھی، سوری اور پھر مغل حکمرانوں کے ادوار آتے رہے۔

باب ۲

تلوار نہیں اخلاق

اسلام پر الزام کیوں؟

اسلام پر غیر مسلم مغربی اور مستشرق مؤرخین کی طرف سے ہمیشہ سے یہ الزام عائد کیا جاتا رہا ہے۔ کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا اور مسلمانوں نے ہندوؤں کی آزادیاں سلب کیں۔ اُن پر جزیہ عائد کیا۔ اور ہندوؤں اور دیگر غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کو ترجیح دی ان تمام الزامات کو سمیٹ لیا جائے تو ایک بہت بڑا الزام وجود پاتا ہے اور وہ یہ کہ اسلام اور اس کے ماننے والوں نے انصاف کے تقاضوں کو ہمیشہ نظرانداز کیا۔ حالانکہ اسلام نے انصاف پر جتنا زور دیا ہے۔ اور جس طرح بار بار انصاف کے لئے تاکید کی ہے۔ کسی دوسرے مذہب میں اس کی مثال ملنا ممکن نہیں۔ اسلام کا یہ انصاف صرف اپنوں کے لئے نہیں بلکہ اس میں اپنے اور پرائے سبھی شامل ہیں۔ طلوع اسلام اور ہادیٔ برحق محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک سے خلفائے راشدین تک اور پھر ہندوستان اور دیگر دُنیا کے کونے کونے تک اسلام کے پھیلاؤ اور اسلامی حکومتوں کے قیام کے باوجود تاریخ اس امر پر شاہد ہے۔ کہ کسی صورت میں انصاف کے تقاضوں کو نظرانداز نہیں کیا گیا۔ مسلمان نہ کبھی بربر، منگول اور تاتاری بن کر بے گناہوں پر ٹوٹا۔ نہ ہی اس نے اپنے بدترین دشمنوں سے کبھی ظلم وستم روا رکھا۔

مسٹر ٹی آرنلڈ نے اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ یہ کہنا کہ مسلمان ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن لے کر غیر مسلموں کو دائرۂ اسلام میں شامل کرتا رہا۔ ایک بے بنیاد الزام ہے۔ کیونکہ تبلیغ اسلام ہر مسلمان کے لئے از روئے اسلام اچھی اور قابل ستائش ہے۔ لہٰذا مسلمان نے ہر جگہ اس نوع کی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ مگر اس نے جبر یا ظلم کو کبھی ذریعہ نہیں بنایا۔ اسلام کی تبلیغ میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ وہ یا تو صرف مبلّغ تھے یا وہ مسلمان تاجر جو دنیا کے ایک چوتھائی حصّے میں پہنچنے کے بعد تجارت کے ساتھ ساتھ تبلیغ بھی کر رہے تھے۔

اسلام پر یہ الزام لگاتے وقت متعصب لوگوں نے یہ کبھی نہیں سوچا۔ کہ عقیدہ نہ تو کوئی کھلونا ہے۔ نہ کوئی جنس تجارت! نہ ہی یہ پانی کا وہ بلبلہ ہے جو ہوا کے دباؤ یا ہلکے سے لمس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ عقیدہ تو وہ ہے۔ جو پھانسی کے تختے اور ظلم کی طویل ترین راتوں میں بھی نہیں بدلتا۔ عقیدہ اس آئینہ کی طرح ہے۔ جس میں لاکھوں چہرے جھانک جھانک کر اپنی صورت کی اصلیت تو معلوم کر سکتے ہیں۔ لیکن اس آئینے کے اپنے چہرے پر کبھی خراش نہیں آتی۔ بلالؓ حبشی کو نرم ریتوں پر لوٹایا گیا۔ لوہا تپا کر اُن کے جسم کو داغا گیا لیکن بلالؓ حبشی کی اذان کو کوئی طاقت نہ روک سکی۔ انقلابی آواز دبانے کے لئے صلیبوں کے اہتمام ہوئے کیا کچھ نہ ہوا لیکن عقیدہ اگر راسخ ہے ——— خواہ صحیح ہے یا غلط، اپنی جگہ اٹل رہا ہے۔

انسان مذہب کے دامن میں پناہ کیوں لیتا ہے؟ اگر اُسے صرف مادی زندگی ہی گذارنا ہے تو عزت اور ذلت جھوٹ اور سچ سے غرض کیوں ہو؟ کیا وہ صرف کھا پی کر مادی زندگی نہیں گذار سکتا۔ آخر حق اور ناحق کا تصوّر کس بنیاد پر جنم لیتا ہے؟

مذہب کے دامن میں انسان انہی وجوہات کی بنا پر پناہ ڈھونڈتا ہے۔ مذہب کے اندر اُسے ایک سکون نصیب ہوتا ہے۔ یہ سکون کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ عزت سے زندگی گذارے گا اُس کو انسان سمجھا جائے گا وہ دوسروں کو انسان سمجھے گا۔ انصاف ہوگا۔ ظلم وستم ناپید ہوں گے غرضیکہ اس کی مادی زندگی کے ساتھ اس کی رُوحانی اقدار بھی شامل ہوں گی۔ اس سے قطع نظر کہ اس کا مذہب کیا ہے اور وہ مذہب اُس کی ان توقعات اور خواہشات کا کہاں تک احترام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سوال یہ ہے۔ کہ اگر انسان کو مذہبی ہونے کے باوجود مذہب ہی کے دامن میں پناہ نہ مل سکے تو وہ کہاں جائے؟

یقینی اور قدرتی بات ہے کہ پھر وہ اپنے لئے کسی دوسرے دامن میں پناہ ڈھونڈے گا۔
اسطرح جیسے ایک بچہ اگر اپنی ماں کی مامتا سے محروم ہے، تو وہ ہر اُس عورت کے ساتھ پیار کرے گا۔
جس کے سینے سے اُسے مامتا اور پیار کی بُو آئے گی اس بُو میں اُس خون کی بُو دب جاتی ہے۔ جس
خون سے اس بچے نے جنم لیا ہوتا ہے۔ یعنی جب کوئی شخص اپنے مذہب کی گود کو چھوڑ دیتا ہے

تو اس کی دو ہی وجوہات ہوتی ہیں:
۱۔ کہ اُسے اُس کا مذہب انصاف اور وسیع تر مفہوم میں، نہیں دے سکا۔ ۲۔ یا اُس کا
عقیدہ راسخ نہیں تھا۔

جہاں تک عقیدے کے راسخ نہ ہونے کا سوال ہے تو اس میں بھی دو چیزیں کارفرما
ہوتی ہیں۔ ۱۔ اپنے مذہب سے پوری طرح واقفیت نہ تھی، اور عقیدے میں سطحیت تھی۔ ۲۔ یا کہیں
دوسرے مذہب میں کوئی ذاتی مفاد نظر آیا۔ لیکن بات یہیں پر ہی ختم ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے
مذہب پر ذاتی مفادات کی بنا پر ایمان لے آتا ہے۔ تو کسی دن بھی وہ کسی تیسرے مذہب میں بھی انہی
مفادات کی بنا پر شامل ہو سکتا ہے۔ سوال یہ ہے . . . ۔
کہ ایسے لوگوں کو اسلام تو کیا کوئی بھی مذہب اپنے دائرے میں اخلاق یا جبر سے گھسیٹ
کر کیا حاصل کرنا چاہتا ہے ؟ مذہب کا مقصد اپنے عقیدت مندوں کی تعداد میں محض اضافہ کرنا
ہے۔ یا انہیں سلامتی کی راہ دکھانا ہے ؟ اگر صرف تعداد میں اضافہ مقصود ہے۔ تو عقیدے
کبھی راسخ نہیں ہو سکتے اور اگر سلامتی کی راہ دکھانا ہے۔ تو عقیدہ ہمیشہ راسخ ہوگا۔
اِس تمہید کا مقصد صرف یہ ہے۔ کہ اگر اسلام نے تلوار کے بل پر ہی دنیا کے کروڑوں
اور ہندوستان کے لاکھوں افراد کو دائرۂ اسلام میں شامل کیا تو اسلام نے کیا مقصد حاصل کیا اور
جب ہندوستان میں مسلمان حکومتوں کا زوال آ گیا۔ انگریز کا تسلط ہوا۔ اور ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے
بعد ہندوستان کے تین چوتھائی حصے پر ہندو کی حکومت قائم ہو گئی۔ تو وہ لوگ جن کے عقیدے
اس لئے راسخ نہ تھے۔ کہ اُن کے آباؤ اجداد کو تلوار کے بل پر مسلمان کر لیا گیا تھا۔ دوبارہ
اپنے اصل مذہب پر واپس کیوں نہ آ گئے۔ یا ایک بار پھر انہوں نے ذاتی مفادات کی خاطر
اسلام کی "گرد" اپنے دامن سے کیوں نہ جھاڑ دی ؟

باب ۳

دورِ پُر آشوب

ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد ہندوؤں کے مذہبی خیالات پہ خاصے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ہندو مبلغوں اور مصلحین نے اسلام کی روشنی میں ہندومت میں اصلاحات کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے خدا کی ذاتِ وحید اور تمام مذہبوں میں یکسانیت کی تبلیغ شروع کردی۔ انہوں نے بھگتی پر زور دیا۔ اور یہ مؤقف اختیار کیا کہ ہندومت اور اسلام کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اس تحریک کو انہوں نے بھگتی تحریک کا نام دیا۔ ان نظریات نے ایسے ہندوؤں پہ جو برادری کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اسلام قبول کرنے میں قباحت محسوس کرتے تھے۔ فوراً اثر کیا۔ اور ہندو بڑی تعداد میں یا تو مسلمان ہونے لگے یا انہوں نے میانہ روی اختیار کرلی۔ اسی لیے شہنشاہ اکبر کو بھی دینِ الٰہی کی اختراع کی جرأت ہوئی۔ بھگتی تحریک کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مسلمانوں میں بھی ہندوؤں کے کچھ خیالات اور رسم و رواج نشوونما پانے لگے۔

جب صحیح العقیدہ مسلمانوں نے بھگتی تحریک اور دینِ الٰہی کی وجہ سے مسلمانوں کو ایک نئی انجانی منزل کی طرف جاتے دیکھا تو انہوں نے ردِ عمل کے طور پہ دیگر تحریکیں شروع کردیں۔

مہدوی تحریک

لیکن اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ ایسے لوگ بھی سر اٹھانے لگے جو اپنے

مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے جونپور کے ایک سید محمد نے مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیا اور یہ
دعویٰ بھی کیا کہ وہ لوگوں کو اسلامی فرائض ادا کرنے کی ترغیب دینے اور انہیں مختلف لعنتوں
سے نجات دلانے کے لئے آیا ہے۔ سوجھ بوجھ رکھنے والے مسلمانوں نے اُس کے اس دعویٰ
کو تسلیم نہ کیا لیکن بہ تحریک سید محمد کے ایک عقیدت مند شیخ اعلائی کی وجہ سے تقویت پاتی رہی
اور اُسی کی کوششوں کے باعث بہت سے لوگ سید محمد کے جال میں آ گئے۔ لیکن جلد ہی اس
مہدی کا خاتمہ شیخ مخدوم الملک کے فتوے کے بعد موت کی صورت میں ہو گیا۔ اس طرح
مہدویوں کا پھیلاؤ رُک گیا۔ اُس کی موت کے بعد بہت سے مہدوی اکبر کے ساتھ مل گئے صرف
اس لئے کہ وہ علماء کا زور توڑ سکیں کیونکہ خود اکبر ان علماء کے خلاف تھا۔

مجدد الف ثانیؒ

ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں۔ کہ اکبر نے ایک نئے مذہب دین الٰہی کی بنیاد ڈال دی تھی۔
اس مذہب میں ہندو ازم، تصوّف اور مقامی لاتعداد عقائد شامل تھے۔ لیکن ادھر اکبر نے
آنکھیں بند کیں اور اُدھر دین الٰہی کی موت واقع ہو گئی۔ اکبر کے دین الٰہی کے خلاف جس شخص
نے سب سے پہلے احتجاج کیا وہ سرہند کے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ وہ نقشبندی مدرسۂ
فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ اُنہوں نے سب سے پہلے جو کام کیا۔ وہ یہ تھا کہ اسلام اور ہندومت
میں واضح امتیاز کی تبلیغ کی۔ اور واضح طور پر یہ بات بھی کہی۔ کہ مذہب کے معاملے پر ہندومت
یا کسی دوسرے مذہب کا اسلام کے ساتھ بنیادی عقائد کے اختلاف کے باعث سمجھوتہ ہونے
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا انہوں نے اکبر کے دین الٰہی کے خلاف پُرزور تحریک چلائی۔ اور
اس کی شدید مذمت کی۔ جہانگیر کے دورِ حکومت میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن بعد میں چھوڑ
دیا گیا۔

شاہ ولی اللہؒ

شاہ ولی اللہؒ پہلے مذہبی و سیاسی مفکر تھے جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں میں بیداری
پیدا کرنے اور ان میں نئی رُوح پھونکنے کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔ اِن کا دور
۱۷۰۳ء سے ۱۷۶۲ء تک ہے۔ یہ مسلمانوں میں افراتفری کا دور تھا۔ مغل سلطنت کا زوال

ہو رہا تھا۔ اور مرہٹے اور سکھ مسلسل تخریبی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے ان حالات پر قابو پانے کے لئے، اور مسلمان معاشرے کو تباہی سے بچانے کے لئے ایک طرف تو احمد شاہ ابدالی کو بلایا اور دوسری طرف مسلمانوں سے دردمندانہ اپیل کی کہ وہ اسلام کے استحکام کے لئے جد و جہد کریں انہوں نے مسلمانوں میں اسلام کی رُوح کو سمجھنے پر زور دیا۔ اور سیاسی طور پر منظم ہونے کی ہدایت کی۔

شاہ ولی اللہؒ کا تعلق دِلّی کے ایک نہایت معزز خاندان سے تھا۔ اس خاندان کے لوگ نہ صرف اپنے علم و فضل اور زہد و ریاضت اور صداقت میں مشہور تھے۔ بلکہ اکثر سلاطین کے درباروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اسی خاندان سے مشہور عالم عبدالرحیم تھے جنہوں نے دِلّی میں مدرسہ رحیمیہ قائم کیا۔ شاہ ولی اللہؒ انہی کے صاحبزادے تھے اُن کا اصل نام تو قطب الدین تھا۔ جو بعد ازاں لوگوں میں ولی اللہؒ کے نام سے جاری ہو گیا۔ انہوں نے اپنے والد سے علم حاصل کیا۔ اس کے بعد وہ حج بیت اللہ کے لئے گئے اور جب ہندوستان واپس ہوئے تو مرہٹوں کی یورش سے ہندوستان کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو چکا تھا احمد شاہ ابدالی شاہ ولی اللہ کی دعوت پر ہی ہندوستان آیا اور پانی پت کی جنگ میں اُس نے ہمیشہ کے لئے مرہٹوں کی کمر توڑ دی۔ آپ نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے درمیان یگانگت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی گو اپنی زندگی میں وہ مغلوں اور مسلمان معاشرے کو زوال سے نہ بچا سکے لیکن اُن کی مساعی کا نتیجہ یہ ضرور نکلا۔ کہ مسلمانوں کے اتحاد (احمد شاہ ابدالی اور نجیب الدولہ) کی وجہ سے مرہٹوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ آپ کا انتقال ساٹھ سال کی عمر میں ۱۷۶۳ء میں ہوا۔ آپ کا دَور تاریخ ہند کا اتنا پُر آشوب دَور تھا کہ تاریخ ہند میں شاید ہی اس کی مثال ملتی ہو۔ آپ عہدِ عالمگیری کے آخری ایام میں پیدا ہوئے۔ اور دس سال سلاطین کا زمانہ پا کر شاہ عالم ثانی کے عہد میں انتقال کر گئے۔ آپ نے سادات کا دَور بھی دیکھا اور مرہٹوں کا عروج و زوال بھی، سکھوں کی سفاکیاں بھی دیکھیں اور دِلّی میں نادر شاہ کے حملے کے وقت قتلِ عام بھی ——— اس وقت ایرانی اور تورانی اُمراء کی رسہ کشی نے اور مذکورہ بالا حالات نے مسلمانوں کے عقیدے اور اُن کی اخلاقی حالت کو تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔

شاہ ولی اللہؒ نے مسلمانوں کو مستقبل میں جن مصائب سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ اُن کی وفات کے بعد صرف نصف صدی کی مدت میں انہی مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۸۰۳ء میں

دلی کی جنگ نے مرہٹوں کی شکست کے بعد برطانوی استعمار کے لئے گنجائش پیدا کی۔
انگریز نے نابینا تاجدار دلی پر اپنی گرفت رکھی ہوئی تھی اور جب فاتح انگریز جرنیل لیک نے زوالِ دلی کے بعد مقبوضہ علاقوں اور لوٹ مار کی فہرست مرتب کی تو اس نابینا تاجدار کا نام بھی فہرست میں شامل کر لیا۔ گویا یہ بدقسمت تاجدار بھی لوٹ مار کے سامان میں شامل تھا۔
اسی واقعہ کے بعد شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیزؒ نے تحریک چلائی تاکہ مسلمانوں کو ان کے زوال سے سبق دلایا جاسکے۔ شاہ عبدالعزیزؒ شاہ ولی اللہؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے۔ انہوں نے اپنی تحریک کو کامیاب کرنے کے لئے نہایت مخلص لوگوں پر مشتمل ٹیم بنائی۔ انہوں نے سب سے پہلے اس تمام علاقہ کو دارالحرب قرار دیا جس میں غیر مسلموں کی حکومت تھی۔ ساتھ ہی وہ اپنے والد کے خطوط پر دینی اور سیاسی فلسفے کی تبلیغ میں بھی مصروف رہے۔ انہوں نے اپنا پیغام نہ صرف معززین بلکہ عوام تک بھی پہنچایا۔ تاکہ ان کے شعور کو بیدار کیا جاسکے اور انہیں بتایا جاسکے کہ وہ کون ہیں۔ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اور ان کی عزتِ نفس کو کس کس طریق سے مجروح کیا جا رہا ہے۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ اور اس کی تکمیل کے لئے موت نے انہیں مہلت نہ دی۔ وہ ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء میں وفات پا گئے۔ لیکن اپنے بعد ایسے لوگ چھوڑ گئے جو ان کے مشن کو پورا کر سکتے تھے۔ ان میں شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، مولانا عبدالحئیؒ، سید احمد شہیدؒ، مولانا محمد اسحاقؒ اور ان کے بھائی مولانا محمد یعقوبؒ قابلِ ذکر ہیں۔
شاہ عبدالعزیزؒ نے پنجاب سے سکھوں کی حکومت کے خاتمہ کے لئے۔ جہاد کے لئے بھی تحریک شروع کی۔ اس وقت مسلمانوں پر سکھوں کے مظالم انتہا تک پہنچ چکے تھے۔ بعد ازاں اس تحریک کی قیادت ۱۸۲۶ء سے ۱۸۳۱ء تک سید احمد نے کی۔

سید احمد شہیدؒ

سید احمد شہیدؒ رائے بریلی میں پیدا ہوئے اور چھوٹی عمر میں ہی شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادے مولانا عبدالقادرؒ کے پاس تعلیم حاصل کرنے کے لئے دلی چلے آئے۔ اس کے بعد وہ شاہ عبدالعزیزؒ کی ہدایت پر دلی سے ٹانک چلے گئے جہاں انہوں نے امیر خان کی ملازمت اختیار کر لی۔ ۱۸۱۷ء کے بعد جب امیر خاں کی قوت منتشر ہو گئی تو سید احمد شہیدؒ دلی واپس آ گئے۔

سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اور شاہ عبدالعزیزؒ کے داماد مولوی عبدالحئی کے ساتھ مل کر کام شروع کر دیا
سکھوں کے خلاف سید احمد شہیدؒ کو اُتر پردیش، بنگال اور بہار کی طرف سے پیسہ اور مجاہد فراہم کئے گئے ۔
کچھ مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد وہ ۱۸۳۰ء میں پشاور پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔
لیکن کچھ عرصے بعد ہی وہ پشاور چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ۔
۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں سکھوں نے ان کی قوت کو زبردست نقصان پہنچایا اور سید
احمد شہید خود بھی لڑتے ہوئے شہادت پا گئے ۔ اس مہم کی ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے
اپنے لوگوں کی طرح پٹھانوں پر بھی قانونِ شریعت کا اطلاق کیا تھا لیکن پٹھان ایسے قوانین کے
عادی نہ ہونے کی وجہ سے اسے اپنی محکومیت تصور کرتے تھے لہٰذا انہیں پٹھانوں کی طرف سے
متوقع حمایت حاصل نہ ہو سکی ۔ لیکن اس تحریک کا ایک خوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ سید احمد شہیدؒ نے
انگریزوں کے خلاف جہاد کے جس شعلے کو ہوا دی تھی وہ آیندہ ساٹھ برس تک سلگتا رہا ۔

تیتومیر

اس تحریک کی کامیابی کی وجہ سے بنگال پر بھی اثر پڑا یہاں تیتومیر زمینداروں کے
ظلم و ستم اور حکومت کے خلاف کسانوں کی بغاوت کی قیادت کر رہا تھا یہ تحریک فرید پور، نادیا
اور چوبیس پرگنا میں ۳۲-۱۸۳۱ء کے دوران اپنے عروج پر تھی آخر کار یہ تحریک کچل دی گئی اور
تیتومیر کو شہید کر کے اس کے تقریباً ساڑھے تین سو ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا ۔
سید احمد شہید کی تحریک اور اس تحریک سے پیدا ہونے والی کچھ مزید تحریکوں کو بعض امور میں
مشابہت کے باعث وہابی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ یہ سبھی تحریکیں نجد کے عبدالوہاب
کی تعلیمات کی مطابقت میں تھیں یہ سب مکمل طور پر اسلامی تحریکیں تھیں جو ہندوستان میں مسلمانوں کے
سیاسی و مذہبی اتحاد و یگانگت کی بنیاد پر قائم تھیں ۔ مسلمانوں کو اپنے
کھوئے ہوئے اقتدار کا زبردست صدمہ تھا ۔ اور وہ اپنے علاقوں
پر غیر ملکی قبضے اور استبداد کی وجہ سے انگریزوں سے نفرت کرتے تھے علاوہ ازیں اُن کی معاشرتی
و اقتصادی حیثیت کو بھی شدید صدمہ پہنچایا گیا تھا ۔ لہٰذا وہ اپنے مقاصد کے لئے جانی خطر
بھی مول لینے کے لئے تیار تھے گو مسلمانوں کو ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا تھا لیکن برصغیر کی آزادی
کے لئے مختلف تحریکوں کی تعریف میں مسلمانوں کی زبردست اور پرعزم جدوجہد نے برطانوی استعمار

کو پوری طرح خوفزدہ کر دیا تھا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندو خود بھی غلامی کی زنجیریں پہنے ہوئے تھا اس کے باوجود وُہ سفید فام آقاؤں کی چاپلوسی اور اُن کے ساتھ مکمل تعاون میں مصروف تھا لہذا قدرتی طور پر نہ صرف انگریز مسلمانوں کے خلاف ہو گیا بلکہ ہندوؤں کا ساتھ بھی دینے لگا۔

مشہور ہندو اخبار "ہندو پیٹریاٹ" نے لکھا کہ مسلمانوں میں وہابی اور فرائضی سخت خطرناک لوگ ہیں اور وہ مختلف لوگوں میں نفرت اور عدم اطمینان کے بیج بو رہے ہیں ان کی وجہ سے اس ملک میں غیر ملکیوں کو قدم جمانے میں مدد ملے گی۔

فرائضی تحریک

سنہ ۱۸۰۴ء میں بنگال میں بھی اسی قسم کی ایک سیاسی و مذہبی تحریک ضلع فرید پور کے حاجی شریعت اللہ نے شروع کی اُنہوں نے سب سے پہلے نماز جمعہ ادا نہ کرنے اور دونوں عیدیں نہ منانے کی ہدایت اس بنیاد پر کی کہ برصغیر برطانوی حکومت کے ماتحت ہونے کی وجہ سے "دارالحرب" ہے۔ اِدھر ہندو زمیندار مسلمانوں میں اُس نئی نسل سے بے حد خوفزدہ نظر آتے تھے جس میں اسلام کی ایک نئی رُوح پھونکی گئی تھی۔ اور شہید تیتو میر کی وجہ سے جس نے ہندو زمینداروں کے ظلم و ستم کے خلاف نفرت پیدا کر دی تھی، مسلمان کسانوں میں اب اپنے وقار اور عزتِ نفس کا احساس پیدا ہو چکا تھا۔ لہذا جھگڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور شریعت اللہ کو ڈھاکہ کے موضع نوا باری میں بھیج دیا گیا مگر انہوں نے وہاں بھی اپنا مشن جاری رکھا جس میں وہ خاصے کامیاب ہوئے۔

حاجی شریعت اللہ کے صاحبزادے محمد محسن جنہیں عام طور پر دودھو میاں کے نام سے جانا جاتا تھا، گو عالم فاضل نہ تھے لیکن ان میں انتظامی صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں جب وہ حج سے واپس آئے تو اُنہوں نے اپنے والد کے عقائد کے مطابق اُن کی تحریک کو سنبھال لیا اور اس میں کچھ نئی باتیں بھی شامل کر لیں اُنہوں نے سب سے پہلے "فرائضین" کے نام سے ایک تنظیم کا اہتمام کیا۔ اُنہوں نے مشرقی بنگال کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر کے ہر حصّے کا ایک خلیفہ مقرر کر دیا۔ اس خلیفہ کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ مرکزی تحریک کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے رقوم جمع کرے۔ اسی تحریک کے ذریعے محمد محسن نے لاتعداد ہندو کسانوں کو دائرۂ اسلام میں شامل کر لیا کیونکہ خود ہندو کاشتکار نہ صرف بڑے زمینداروں کے مظالم سے تنگ آ چکے تھے بلکہ ذات

کی اُونچ نیچ کی وجہ سے بھی وہ ہندو مَت سے بیزار ہو چکے تھے زمینداروں کی طرف سے کاشتکاروں پر مختلف قسم کے ٹیکس عائد کر دیئے جاتے تھے محمد محسن نے کاشتکاروں کو ہدایت کی کہ وہ ایسے تمام ٹیکسوں کی ادائیگی بند کر دیں اِس کے بعد اُنہوں نے ایک قدم اور بڑھایا اور کہا کہ زمین خدا کی ہے اور کسی کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ زمین پر اجارہ داری قائم کرے یا اس پر ٹیکس عائد کرے۔ ۱۸۳۱ء میں محمد محسن پر مختلف مکانوں کی لُوٹ مار کا بے بنیاد اور جھوٹا الزام عائد کر کے مقدمہ چلایا گیا اور ۱۸۴۱ء میں اُنہیں اس الزام میں سیشن سپرد کر دیا گیا کہ اُنہوں نے بہت سے بے گناہ لوگوں کو قتل بھی کیا ہے۔ لیکن عدالت نے انہیں باعزت طور پر بری کر دیا۔

ہندوازم کا احیاء

برصغیر ہندو پاک میں اٹھارویں صدی مسلمانوں کے زوال اور اُن کی ثقافتی نشو ونما کے زوال کی صدی تھی۔ اور اب انگریز کی اعانت سے ہندو تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ علاوہ ازیں سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں کی فوجی تحریکوں نے بھی اسلام کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا تھا فوجی طاقت نہ ہونے کے باوجود اس پُر آشوب دَور میں بھی لاتعداد ہندو مشرف بہ اسلام ہوتے رہے مغربی اثر ورسوخ اور برطانیہ کی طاقت میں بتدریج وسعت کے باعث ہندوؤں میں اُمید کی نئی کرن پیدا ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس دَور میں بھی ہندوؤں نے اپنے مذہب کی طرف کوئی توجہ نہ دی بلکہ اُن کی تمام تر سرگرمیوں کا مرکز مسلمانوں کی مخالفت تھا۔ حتیٰ کہ ایسے بہت سے سُوجھ بُوجھ رکھنے والے ہندو جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ مسلمانوں کی طاقت سے محرومی کے بعد اور عیسائیوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے پیشِ نظر اب مسلمان سے عیسائی ہو رہے تھے۔

ہندو ڈھانچے کو جس چیز نے ہلا کر رکھ دیا وہ یورپین قوم کی صنعتی ورثاہی طاقت تھی یا ان مغربی فاتحین کی دنیاوی کامیابیاں —— صدیوں پہلے شہنشاہ اکبر نے لادینیت کا جو بیج بویا تھا وہ دوبارہ پھوٹنا شروع ہوا کیونکہ بنگال کی سرزمین اس کے لئے خاصی زرخیز ثابت ہوئی لالہ رام موہن رائے ایک بنگالی برہمن خاندان سے تعلق رکھتا تھا جسے مغلوں سے وفاداری کے باعث رائے کا خطاب ملا تھا ٹیگور خاندان بھی بنیادی طور پر برہمن نسل سے تعلق رکھتا تھا

اب جبکہ مسلمانوں کی طاقت کا مکمل زوال آچکا تھا لالہ رام موہن رائے اور ٹیگور خاندان اپنی

وفاداریاں مسلمانوں کے ساتھ ختم کر چکے تھے اور انہوں نے ہندومت اور عیسائیت کے درمیان سمجھوتہ بازی شروع کر دی تھی۔ ادھر دو ہندو تحریکوں برہمو سماج اور آریہ سماج نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی ہندوستان کے بنیاد ذہنیت رکھنے والے برہمن جلد ہی بنکوں تجارتوں صنعتوں اور حکومتوں کے مختلف عہدوں پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے اپنے تمام وسائل سے ہندو تحریکوں کو پورا پورا فائدہ پہنچانا شروع کر دیا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اس دورِ پُر آشوب کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ہے کہ اس دور میں ہندو اور شیعہ دونوں سُنّی اور دیگر فرقوں کے مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہو گئے تھے یہ بات قرینِ قیاس محسوس نہیں ہوتی یہ ٹھیک ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے دور کو شیعہ فرقہ اسلامی دور کے طور پہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں اور یہ بھی درست ہے کہ اس صدی میں ایرانی اور تورانی کا جھگڑا ابھی شروع پہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود کہ اٹھارویں صدی میں شیعہ سُنّی مخالفت بھی زوروں پہ تھی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ شیعہ فرقے نے عملی طور پہ ہندوؤں کا ساتھ دیا ہو۔

گو سیاسی طور پہ اٹھارویں صدی افراتفری پہ مشتمل تھی مگر ثقافتی اور مذہبی شعبوں میں یہ تعمیرِ نَو کا زمانہ تھا اسی دور میں مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کے لئے ایک معیار مقرر کیا گیا جسے فرقوں کے امتیاز کے بغیر پورے برِصغیر میں تسلیم کیا گیا اسی دور میں اُردو کو تعلیم و تربیّت اور عام استعمال میں اظہار کا ذریعہ بنایا گیا انہی وجوہات کی بنا پر مسلمان معاشرے میں استحکام اور اتحاد کی بنیاد پڑی ؀

باب ۲

ہندوستان میں قزاقوں کی آمد

پرتگالی، ولندیزی، جرمن

سپین اور پرتگال نے بالخصوص جغرافیائی دریافت کے ساتھ ہندوستان میں تجارت اور عیسائیت کی تبلیغ کو بھی اپنا مسلک بنایا۔ جہاں تک عیسائیت کی تبلیغ کا تعلق ہے۔ تو اس میں تبلیغ کم اور مسلمانوں پہ جبر و تشدد کے عناصر زیادہ شامل تھے۔

"ہم مشرق میں اور بالخصوص ہندوستان میں مسالے اور عیسائی قوم تلاش کرنے کے لئے آئے ہیں۔"

یہ تھے وہ الفاظ جو خطۂ ارض ہند و پاک میں قدم رکھنے والے اوّلین ملاح واسکوڈے گاما نے کہے۔

واسکوڈے گاما نے ہندوستان آنے کا نیا راستہ دریافت کیا۔ تو نہ صرف دنیا بھر کی تجارت اور ذرائع آمد و رفت میں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ بلکہ یورپی لوگوں کے لئے مشرق کے دروازے بھی کھل گئے۔

اب پرتگالی مشرق کے ساتھ براہِ راست تجارت میں مصروف ہو گئے تھے۔ واسکوڈے گاما

نے سب سے پہلے کالی کٹ کے ساحل پر قدم رکھا تھا۔ یہ علاقہ ایک ہندو حکمران زمورین کی ملکیت تھا۔ کالی کٹ میں عرب تاجروں نے واسکوڈے گاما کی شدید مخالفت کی اور اسے ۱۴۹۹ء میں واپس جانا پڑا۔ اس کے بعد شاہ پرتگال نے ایک بہت بڑا بحری بیڑا روانہ کیا۔ عرب تاجروں نے پرتگالیوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور انہیں کالی کٹ میں تجارتی نوآبادی قائم کرنے سے روک دیا۔ کچھ عرصے تک مصر کے مملوک سلطان اور گجرات کے لوگوں نے سمندروں میں پرتگالیوں کی شدید مزاحمت جاری رکھی۔ تاہم ۱۵۰۸ء میں پرتگالیوں نے ان کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ ۱۵۱۰ء میں الفانسو نے گوا پر قبضہ کر لیا۔ جو اس وقت سلطان بیجاپور کی ملکیت تھا۔ ۱۵۱۱ء میں اُس نے ملاکا کی بندرگاہ بھی ہتھیالی۔ اس طرح بیشتر جزائر پر پرتگالیوں کی گرفت ہو گئی۔ پرتگالی لنکا میں بھی آباد ہو گئے۔ اور پھر سولہویں صدی میں ان لوگوں نے چٹاگانگ ہگلی اور بنگال کے دوسرے علاقوں میں اپنے تجارتی کارخانے قائم کر لئے۔

پرتگالی، انگریز اور ڈچ تاجروں سے مقابلہ نہ کر سکے۔ رفتہ رفتہ ان کی تجارت کو زوال آنا شروع ہو گیا علاوہ ازیں لوگ بھی ان سے نفرت کرنے لگے تھے۔ کیونکہ تجارت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے ہندوستانیوں کو جبراً عیسائی بنانا شروع کر دیا تھا۔ مسلمانوں میں اُن کے خلاف نفرت کچھ زیادہ ہی تھی۔ کیونکہ پرتگالی اکثر اوقات عربوں کے تجارتی جہاز لوٹ لیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ حج کو جانے والے لوگوں کو بھی معاف نہ کرتے تھے۔ الفانسو۔ البوقرق نے گوا کے تمام مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ ان کی عورتیں اور بچے اٹھا کر لے گیا اور پھر انہیں فروخت کر دیا۔ مسلمانوں کے ساتھ اُس کا سلوک انتہائی پست تھا۔

۱۶۳۲ء میں بنگال کے صوبہ دار قاسم خان نے پرتگالیوں کی نوآبادی پر حملہ کیا۔ اور مقابلے کے بعد انہیں شکست دی۔ بہت سے پرتگالی اس مقابلے میں موت کے منہ میں پہنچے اور بہت سوں کو قیدی بنا کر آگرہ بھیج دیا گیا۔

ولندیزیوں نے ملاکا کی بندرگاہ سے پرتگالیوں کو نکال باہر کیا۔ پھر ۱۶۸۵ء میں انہوں نے لنکا سے بھی ان کا خاتمہ کر دیا۔ اس دوران انگریز جاوا اور بعض دوسری جزیروں میں اپنی نوآبادیاں قائم کر چکے تھے۔ لیکن چند سال کے اندر ہی ولندیزیوں نے بعض مقامات پر اپنے انگریز حریفوں کی تجارت پر قبضہ جما لیا۔ شہزادہ شاہ شجاع اور شاہ فرخ سیر نے انگریز تجارتی کمپنی کو جو مراعات دے رکھی تھیں ان کی وجہ سے ولندیزیوں کی تجارت بری طرح متاثر ہوئی۔

مشرق کے ساتھ تجارت میں جرمنوں نے بھی حصہ لیا۔ انہوں نے بنگال کے نوابی دور میں ہنگلی میں ایک کارخانہ قائم کرلیا آخرکار ۱۷۴۴ء کے اواخر میں جرمن شکست کھاکر بھاگ گئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی

سولہویں صدی میں انگریز تاجر برصغیر کے ساتھ براہِ راست تجارت کے لئے سر توڑ کوشش کرتے رہے۔ مگر وہ نئے سمندری راستے سے راس امید کے ذریعے پرتگالیوں کی فوجی طاقت کے باعث آنے سے خائف تھے۔ چنانچہ انہوں نے شمالی راستہ دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ابتدا میں ناکامی ہوئی۔ آخرکار ۱۵۸۰ء میں ایک بحری افسر سر فرانسس ڈریک نیا راستہ دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

انگریز تاجروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک ایسوسی ایشن قائم کرلی۔ ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو ملکہ الزبتھ نے اس کمپنی کو تجارتی مراعات کے لئے خاص حکم نامہ جاری کردیا ۱۶۰۸ء میں مغلوں کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کرنے کے لئے خاص طور پر کیپٹن ہاکنز کو بھیجا گیا۔ ۱۶۰۹ء میں شہنشاہ جہانگیر نے انگریزوں کو سورت میں آباد ہونے کی اجازت دے دی ۱۶۱۳ء میں جہانگیر نے ایک فرمانِ خاص کے ذریعے انگریزوں کو سورت میں کارخانہ قائم کرنے کی اجازت دے دی۔ ۱۶۱۵ء میں شاہِ انگلستان نے مغل دربار میں اپنا پہلا سفیر سر تھامس رو کو بنا کر بھیجا اور اس نے مزید تجارتی مراعات کی درخواست دی وہ تین سال تک دربار شاہی میں رہا اور اس نے شہنشاہ جہانگیر سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لئے زیادہ سے زیادہ تجارتی مراعات حاصل کرلیں۔ اور پھر ایک سال کے اندر اندر احمد آباد، آگرہ اور بڑودچ میں انگریزوں نے کارخانے قائم کر لئے۔

۱۶۶۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے نہایت دلچسپ طریق پر بمبئی کی پرتگالی نوآبادی کو بھی حاصل کرلیا۔ یہ نوآبادی شاہ چارلس دوئم کی پرتگالی بیوی کیتھرائن کو جہیز میں ملی۔ ۱۶۳۲ء میں انگریزوں نے گولکنڈا کے سلطان سے ایک "سنہری فرمان" کے ذریعے معمولی سی ادائیگی کے بعد مکمل تجارت کی اجازت حاصل کرلی۔ ۱۶۳۴ء میں انہوں نے مدراس میں ایک کارخانہ بھی قائم کرلیا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد یہیں پر سینٹ جارج قلعہ کی تعمیر کرلی ۱۶۵۱ء میں شاہجہان کی حکومت کے دوران انہیں ہنگلی میں کارخانہ قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔ بعد ازاں بنگال کے صوبہ دار شاہ شجاع کے دربار میں کام کرنے والے ایک انگریز معالج نے صرف تین ہزار روپے سالانہ کی ادائیگی پر بے شمار

تجارتی مراعات حاصل کرلیں۔ چنانچہ ۱۶۵۸ء میں کمپنی نے ڈھاکہ میں اور پھر ۱۶۷۶ء میں مالودہ اور قاسم بازار وغیرہ میں کارخانے قائم کر لئے۔ اس اثنا میں وہ پٹنہ اور مونگیر میں اپنے کارخانے قائم کر چکے تھے۔

۱۶۸۰ء میں شہنشاہ اورنگ زیب نے کمپنی سے تین ہزار روپے سالانہ کی ادائیگی پر تجارتی مراعات واپس لے لیں اور اُن پر ساڑھے تین فیصد ڈیوٹی عائد کر دی۔ یہ ڈیوٹی دوسرے تمام تاجر حتیٰ کہ مسلمان تاجر بھی ادا کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد انگریز تاجروں نے بھی وہی حرکتیں شروع کر دیں جو پرتگالی تاجروں کا خاصہ تھیں۔ انہوں نے لوٹ مار آتش زنی اور مسلمانوں پر مظالم کی وارداتیں شروع کر دیں۔ آخرکار جب ان کے خلاف سخت کاروائی کی گئی تو انہوں نے مغلوں سے معافی طلب کی۔ معافی نامہ کے الفاظ یہ تھے۔

"انگریز نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کرتے ہیں کہ وہ شہنشاہِ وقت کی خدمت میں ڈیڑھ لاکھ روپے بطور ہرجانہ پیش کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ وہ اپنے شرمناک رویے کا اعادہ نہ کریں گے۔ وہ حضور سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ حضور ہماری خطاؤں کو معاف فرما دیں اور ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ ہم نہایت شریفانہ طریق پر تجارت کریں گے"

اس کے بعد انگریزوں کو بنگال میں واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ ۱۶۹۸ء میں انگریزوں نے حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک کارخانے کی قلعہ بندی کر لی جس کا نام بعد میں فورٹ ولیم رکھا گیا۔ پھر یہی جگہ وسعت پا کر کلکتہ کی صورت اختیار کر گئی اور چند سال کے اندر اندر ایک بہت بڑا تجارتی مرکز بن گئی۔ حالات انگریزوں کے حق میں تھے۔ اتفاق یہ ہوا۔ کہ شاہ فرخ سیر بیمار ہو گیا اور ایک انگریز سرجن ہملٹن کے علاج سے صحت یاب ہوا۔ لہٰذا ۱۷۱۷ء میں فرخ سیر نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں صرف تین ہزار روپے سالانہ کے عوض تجارت جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

فرانسیسی

فرانسیسی بھی ایک عرصہ سے برصغیر ہند و پاک کے ساتھ براہِ راست تجارت کے لئے

تر ہو رہے تھے ۔ ۱۷ اویں صدی میں کوئی کوئی فرانسیسی تاجر ہندوستان میں آتا رہا ۔ ۱۶۶۴ء
میں ایک فرینچ ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کر دی ۔ ۱۶۶۸ء میں فرانسیسی تاجر سورت میں آباد ہو گئے
اور اس کے بعد پانڈی چری، چندر نگر، ماہی اور کریکل میں بھی اُن کی نوآبادیاں قائم ہو گئیں ۔
اسی کے بعد ہندوستان پر سیاسی تسلط جمانے کے لئے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان
کشمکش کا آغاز ہو گیا ۔ انگریزی اور فرانسیسی نوآبادیاں کیونکہ ساحلی علاقوں پہ واقع تھیں لہذا
اُن کی بحری طاقت بھی موجود تھی ۔ ان کے مقابلے میں کرناٹک کے نواب اور نظام، اور دکن کے
صوبے دار کے پاس کوئی بحری طاقت موجود نہ تھی ۔ لہذا وہ کمپنی کے موثر کنٹرول کو توڑ نہیں سکتے
تھے ۔ انگریز اور فرانسیسی دونوں ہی مسلمانوں کی اس کمزوری سے بخوبی واقف تھے ۔

یہ مغلوں کے زوال کا دور تھا ۔ کرناٹک کا نظام مغل سلطنت کے دائرے سے باہر تھا ۔
آرکوٹ کا نواب جو کرناٹک کا گورنر بھی تھا ۔ قریباً آزاد شخصیت کا مالک تھا اور اُس پر نظام
کرناٹک کا کوئی اثر ورسوخ نہ تھا ۔ آرکوٹ اور حیدر آباد کے درباروں میں جھگڑوں اور سازشوں
کی بھر مار تھی ۔ مرہٹے بھی ان جھگڑوں سے خوب فائدہ اُٹھا رہے تھے ۔ اور انہی سازشوں کی
وجہ سے انگریز اور فرانسیسی دونوں اپنے اپنے سیاسی اقتدار کے لئے کوشاں نظر آتے تھے ۔ آخر کار
۱۷۴۸ء میں ایک معاہدے کے تحت فرانس نے مدراس انگریزوں کو دے دیا ۔ اور اس کے
عوض شمالی امریکہ میں لوئی برگ کا علاقہ لے لیا ۔

کیونکہ انگریز اور فرانسیسی دونوں ہی کورومنڈل کے ساحل پہ نواب کرناٹک کی حفاظت
میں رہ رہے تھے لہذا اُن کی باہمی کشمکش سے نواب کرناٹک کا متاثر ہونا ضروری تھا ۔

۱۷۴۸ء میں ریاست حیدر آباد کے بانی نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد اُن
کے بیٹے ناصر جنگ اور نواسے مظفر جنگ کے درمیان اقتدار سنبھالنے کی کشمکش شروع ہو گئی ۔ اسی
قسم کی کشمکش کرناٹک کی مسند نشینی کے لئے شروع ہوئی ان حالات میں فرانسیسیوں کو بہت اچھا موقع
ہاتھ آ گیا اور انہوں نے مذکورہ بالا دونوں گدیوں کے لئے علی الترتیب مظفر جنگ اور چندا صاحب
کی حمایت کا فیصلہ کر لیا ۔ تاکہ اس طرح ان دونوں کی کامیابی کی صورت میں فرانسیسیوں کو بہتر مواقع
فراہم ہوں ——— اور فرانسیسی انگریزوں کے مقابلے میں سیاسی تسلط جمانے میں کامیاب ہو جائیں
——— چنانچہ کرناٹک اور حیدر آباد کی مشترکہ فوجیں فرانسیسی فوجی دستوں کے ساتھ اپنے مقصد میں کامیاب
ہو گئیں ۔ چندا صاحب کو آرکوٹ کی مسند دے دی گئی اور اس کے عوض فرانسیسیوں نے اُس سے

پانڈی چری کے نزدیک ۸۰ گاؤں حاصل کر لئے۔ انگریزوں نے یہ دیکھا تو انہوں نے ناصر جنگ اور محمد علی کے حق میں حیدرآباد اور آرکوٹ کی گدیوں پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی ناصر جنگ کو مظفر جنگ کے مقابلے میں تھوڑی بہت کامیابی نصیب ہوئی اور اسی طرح کرناٹک کے علاقے میں چندا صاحب کو۔ مگر ۱۷۵۰ء میں ناصر جنگ کو قتل کر دیا گیا اور مظفر جنگ کو رہا کرنے کے بعد پانڈی چری میں دکن کا صوبے دار مقرر کر دیا گیا۔ مظفر جنگ نے فرانسیسیوں کو انعام کے طور پر دوی اور مسولی پٹم کے علاقے دے دیئے۔ مگر ایک سال بعد مظفر جنگ بھی قتل کر دیا گیا۔ اور اُس کے بعد صلابت جنگ کو گدی پر بٹھا دیا گیا۔ اس طرح کرناٹک اور حیدرآباد میں فرانسیسیوں کو مسلمہ طور پر اقتدار حاصل ہو گیا۔ دو سال کے بعد فرانسیسیوں نے کرناٹک کا شمالی علاقہ بھی حاصل کر لیا۔ یہ علاقہ چھ سو میل پر مشتمل تھا۔

اب انگریزوں کو ہر طرف خطرہ ہی خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ انگریزوں نے ترچناپلی میں محمد علی کو محاصرے سے نکالنے کے لئے فوجی دستے اور ساز و سامان روانہ کیا۔ چندا صاحب نے فرانسیسیوں کے تعاون سے محاصرہ کیا ہوا تھا۔ اس موقع پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک کلرک رابرٹ کلائیو نے ترچناپلی کو آزاد کرانے کے لئے منصوبہ تیار کیا۔ اُس نے چندا صاحب کی توجہ ہٹانے کے لئے آرکوٹ کی طرف فوجیں روانہ کر دیں۔ کلائیو نے ہی اس مہم کی قیادت کی اگست ۱۷۵۱ء میں کلائیو نے آرکوٹ پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ چندا صاحب نے یہ خبر سنتے ہی فوری طور پر اپنی آدھی فوج آرکوٹ روانہ کر دی لیکن کلائیو نے ۵۳ دن تک محاصرہ جاری رکھا۔ میسور کے راجہ اور تنجور کے راجہ نے محمد علی اور انگریزوں کی حمایت کی۔ مرہٹوں نے بھی اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انگریزوں کی مدد شروع کر دی۔ اس طرح ہوا کا رُخ فرانسیسیوں کے خلاف ہو گیا۔ جون ۱۷۵۲ء میں چندا صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ اور محمد علی کرناٹک کا نواب مقرر ہوا۔ اس طرح کرناٹک میں فرانسیسیوں کی جگہ انگریزوں نے لے لی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں فیصلہ کن جنگ نہ ہو سکی۔ اور دربار میں بھی انگریزوں کا اثر و رسوخ قائم ہو گیا۔ کچھ عرصے تک انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان امن قائم رہا لیکن جب یورپ میں ان دونوں طاقتوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ تو ہندوستان میں بھی دونوں تجارتی کمپنیاں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہو گئیں۔ اور اس کے بعد سے ہی فرانسیسیوں کو مسلسل شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

باب ۵

ہندو اور انگریز کا متحدہ محاذ

جب ایک انگریز کرنل مل نے جرمنی کے شہنشاہ کو خط میں یہ رپورٹ بھیجی کہ "مغلوں کی پالیسی بہت خراب اور اُن کی فوج کی حالت ناگفتہ بہ ہے اُن کے پاس کوئی بحری طاقت بھی نہیں لہٰذا اس ملک کو آسانی کے ساتھ قبضے میں لیا جاسکتا ہے ایک باغی "علی وردی خاں" نے بہار، اڑیسہ اور بنگال کو مغل سلطنت سے الگ کر لیا ہے لہٰذا حالات ہمارے حق میں سازگار ہیں اس جگہ کو ہتھیانے کے لئے صرف تین جہاز، دو ہزار فوج کے ساتھ کافی ہوں گے۔ اس رپورٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بہت حوصلہ دیا اور کمپنی نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی نفرت سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے انگریز اور ہندو کو متحد کرنے کا پروگرام بنالیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے کرنل سکاٹ نے یہ رپورٹ پیش کی کہ اگر اس علاقے پر قبضہ کرنے کے لئے کوئی بھی اِقدام کیا گیا تو ہندو، انگریزوں کا پُورا پُورا ساتھ دیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ ہندوؤں کی باقاعدہ حوصلہ افزائی کی جائے اس کے علاوہ دو افراد اُومی چند اور نیمو گوسائیں ایسے ہیں جن کا اثر و رسوخ ہندو راجوں اور ہندو سپاہیوں میں بہت زیادہ ہے۔ یہ دونوں بھی انگریزوں کی کاروائی میں بہت معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔"

انگریزوں نے جہانگیر نگر کے نائب گورنر اور دیوان راج ولبھ اور نواب علی وردی خاں

کی بڑی لڑکی گھسیٹی بیگم سے اتحاد کر کے سراج الدولہ کی جگہ شوکت جنگ کو، جو اُس وقت پورنیا کا نائب گورنر تھا بنگال کی مسند پر بٹھانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

ہندو اثر و رسوخ میں اضافہ

مرشد آباد کے نوابوں اور دوسرے مسلمان حاکموں نے ہندوؤں کے ساتھ رواداری کی پالیسی اختیار کیے رکھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں کے سیاسی اثر و رسوخ میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہندو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے لہٰذا ہندوؤں کو فائدے پہنچانے میں اُنہیں کوئی دقت پیش نہ آتی تھی۔ بنگال کے مرشد قلی خاں، شجاع الدین، سرفراز خاں، علی وردی خاں، سراج الدولہ اور میر جعفر و میر قاسم سبھی نے ہندوؤں کو پوری آزادی دے رکھی تھی جس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو سیاسی اور اقتصادی میدان میں مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے اُن کے پاس اہم ترین سرکاری محکمے تھے۔ ہندو وزیر خزانہ نے اپنے اس محکمہ میں تمام ہندو افسر رکھے ہوئے تھے بہت سے ہندو نائب گورنر تھے۔ اور بہت سے جاسوسی کے محکمے میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے بھوپت رائے، دیپ نرائن، رگھونندن، کیشن رائے، عالم چند، لاہوری مل اور دلپت سنگھ ہزاری ایسے کتنے ہی لوگ موجود تھے جو نواب مرشد قلی خاں کے دور میں حکومت کے خفیہ امور کے سربراہ نواب سے خفیہ امور کے سکریٹری اور اہم فوجی دستوں یا فوج کے کمانڈر رہتے۔ اسی طرح چین رائے، بیرو دت، کرت چند اور امید رائے بنگال کے دیوان رہے راجہ جانکی رام اور رام نارائن، دیوان اور نائب گورنر کے عہدوں پر فائز رہے شام سندر پیادہ کا انچارج اور رام سنگھ خفیہ سروس کا سربراہ رہا غرضیکہ کوئی محکمہ ایسا نہ تھا جہاں ہندو اچھے عہدوں پر فائز نہ تھے بہت سے ہندو تو ایسے بھی تھے جنہوں نے بہت معمولی کاموں پر ملازمت کی تھی لیکن ہندو افسروں نے انہیں اعلیٰ عہدوں پر پہنچا دیا تھا۔ ہندو اس اعتبار سے بالکل بے فکر تھا کہ اعلیٰ عہدوں پر ہندو افسر ہونے کی وجہ سے کوئی شخص اُن کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ نواب علی وردی خاں نے تو سراج الدولہ اور اپنی بیوی شرف النساء کو خاص طور پر تاکید کی تھی کہ وہ ہندوؤں کے اعلیٰ عہدوں پر کام کرتے رہنے کی پالیسی ترک نہ کریں۔ لہٰذا سراج الدولہ نے اسی پالیسی کو قائم رکھا اور اُس کے دادا کے وقت سے جو ہندو اعلیٰ عہدوں

پر چلے آ رہے تھے انہیں بالکل نہ چھیڑا۔ اُس نے ایک کشمیری ہندو موہن لال کو وزیر اعظم بھی مقرر کیا۔ موہن لال کے چچا جانکی رائے کو دیوان کا عہدہ عطا کیا نیز مانک چند اور نند کمار کو کلکتے اور ہُگلی کی فوج داریوں کی کمان بھی دے دی۔

ان تمام چیزوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ عملی طور پر بنگال میں ہندوؤں کی حکومت قائم ہو گئی۔ ادھر ہندو زمینداروں کو بھی ایک طاقت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بنگال میں نوابوں کے دور حکومت میں ہندوؤں کے سیاسی اور اقتصادی عروج نے بعد ازاں جو اہم کردار ادا کیا وہ محتاج بیان نہیں۔ مرشد آباد اور امی چند کے ہندو سیٹھوں نے ۱۸ ویں صدی کے وسط میں بنگال کے اندر سیاست میں جو کردار ادا کیا وہ ناقابل بیان ہے۔ مرشد قلی خاں کے وقت میں سیٹھ فتح چند کے پاس سرکاری سکّے بنانے کی اجارہ داری تھی اور محمد شاہ نے اُسے جگت سیٹھ کا خطاب بھی عطا کیا تھا۔ جگت سیٹھ کی دولت کا عالم یہ تھا۔ کہ وہ صرف سرکاری کام کے ذریعے ہر سال چالیس لاکھ روپے کماتا تھا یورپین سوداگر اس شخص سے قرضے لیا کرتے تھے اور پھر یہ وہی جگت سیٹھ تھا۔ جس نے دولت کے بل پر سراج الدولہ کی حکومت کا تختہ اُلٹنے میں اہم کردار کیا۔

مسلمانوں سے نفرت

حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوؤں کے پاس بے پناہ دولت، اعلیٰ سرکاری عہدوں اور سیاسی اثر و رسوخ نے انہیں اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ جب چاہیں مسلمان حکومت کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیں ہل کے مطابق :

"دولت، سیاسی اثر اور اچھے عہدوں کی وجہ سے ہندو نہ صرف مسلمان حکومت کے خلاف ہو چکا تھا بلکہ اب وہ مسلمان سے نفرت بھی کرنے لگا تھا۔ ہندوؤں کے غرور اور تکبّر کا عالم یہ تھا کہ وہ انگریزوں کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے"

۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ سے ذرا پہلے کرنل سکاٹ نے اپنے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا کہ

"جنتو (ہندو) راجہ اور زمیندار مسلمان حکومت کو بالکل بے اثر بنا چکے ہیں اور اب وہ خفیہ طور پر ان کوششوں میں مصروف ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو سکے مسلمانوں کی غلامی کا جوا اُتار کر پھینک دیں۔ وہ مسلمان حکومت کو دن بدن کمزور کر رہے ہیں"

مشہور ہندو شاعر رامانند اس حملے مسلمانوں سے ہندوؤں کی نفرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے :

" ہمارا ملک ان ملیچھوں (مسلمانوں) کے باپ کی جائیداد بن چکا ہے اور قسمت کی دیوی لکشمی ایک معمولی اور کمینے خاندان میں ایک زرخرید لونڈی کی طرح پیدا ہو گئی ہے ۔ میں ان ملیچھوں سے ان کی حکومت زبردستی چھین لینا اپنا فرض سمجھتا ہوں تاکہ یہ حکومت برہمنوں کے حوالے کر دی جائے ۔"

نادیا کے راجہ کرشن چندر کے درباری شاعر بھارت چندر نے ان جذبات کا اظہار کیا کہ

" ہندو افسر، تاجر اور زمیندار نوابوں سے اپنے اندرونی جذبات کو ہمیشہ چھپا کر رکھتے کیونکہ مسلمان نواب ان ہندوؤں کی وفاداری پہ کبھی شک نہیں کرتے لیکن انگریز ہندو کے دل کی بات بڑی اچھی طرح جان گیا ہے اسی لئے انگریز کمپنی کے لوگوں نے بہت سے ہندوؤں کو اپنے یہاں ملازم رکھا ہوا ہے ۔ اور ہندو بھی یہ سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کی مدد کے بغیر مسلمان حکومت کا تختہ الٹنا ناممکن سی بات ہے "

(سکے دت)

مل کے مطابق ہندو اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ مسلمان کے خلاف ہندو اور انگریز میں جو خاموش نفرت پرورش پا رہی ہے ۔ اور مسلمان کے خلاف ہندو اور انگریز کے درمیان جو خاموش سمجھوتہ ہو چکا ہے اس کی وجہ سے اگر کبھی ضرورت پڑی تو ہندوؤں کو انگریزوں کی قلعہ نما کمپنیوں کے اندر آسانی کے ساتھ پناہ مل جائے گی ۔ لہٰذا انہوں نے اپنی دیرینہ روایات کو قائم رکھتے ہوئے انگریز کے ساتھ مل کر بنگال سے مسلمانوں کا تختہ الٹنے کی جدوجہد شروع کر دی ۔ ہندو مؤرخ کے کے دت تو اس حد تک تسلیم کرتا ہے کہ ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کے خلاف جو سازش ہوئی تھی اس میں ہندو کو انگریز کی پشت پناہی حاصل تھی ۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس تمام کارروائی میں ہندو اور انگریز کے کردار سے قطع نظر، خود مسلمان جرنیلوں اور بااثر لوگوں نے بھی مسلمان حکومت کو ختم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ۔

جب انگریزی کمپنی نے نواب سراج الدولہ کو مشکلات میں گھرا ہوا پایا تو اسے اپنے سیاسی مفادات حاصل کرنے کا سنہری موقع ہاتھ آگیا ۔

کک کے مطابق

"مشرق کی یہ پرانی رسم ہے کہ جب کوئی نیا شہزادہ مسند نشین ہوتا ہے تو اُسے مختلف غیر ملکی قوموں کے نمائیندوں کی طرف سے تحفے تحائف پیش کئے جاتے ہیں لیکن سراج الدولہ کے وقت میں پہلی بار اس رسم کو انگریز نے توڑ ڈالا جس کے نتیجہ یہ نکلا کہ سراج الدولہ کے دل میں انگریز کے خلاف شکوک و شبہات پیدا ہو گئے۔ اس کے علاوہ انگریزوں نے کلکتہ میں اور بہت سے قلعے بنا لئے اور اُن پہ توپیں بھی نصب کر دیں انہوں نے اس سلسلہ میں نواب سراج الدولہ سے اجازت حاصل کرنا ضروری نہ سمجھی۔ اس کے بعد انگریزوں نے سراج الدولہ کی جاری کردہ تجارتی راہ داریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی طرف سے راہ داریوں کا اجراء شروع کر دیا اور نواب کے خزانے کو خاصا نقصان پہنچایا۔ راج ولبھ جو جہانگیر نگر کا دیوان تھا، نواب کے خزانے میں غبن کرتا رہا۔ اور جب اُسے نواب کی طرف سے احتساب کا خطرہ پیدا ہوا تو اُس نے اپنے بیٹے کرشنا داس اور باقی کنبے کو کلکتے بھیج دیا۔ اور اُن کے ساتھ ہی سرکاری خزانے سے غبن کئے ہوئے پانچ کروڑ تین لاکھ روپے بھی روانہ کر دیئے۔ انگریزوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ کرشنا داس مجرم تھا اس کی پوری مدد کی سراج الدولہ نے کمپنی کو بار بار تاکید کی کہ وہ راہ داریاں جاری نہ کرے اور قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ کمپنی یا انگریز دونوں حاکم نہیں بلکہ رعایا ہیں۔ سراج الدولہ نے انگریزوں سے نئی قلعہ بندیاں بھی منہدم کرنے کو کہا مگر کمپنی نے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا نواب نے بار بار کمپنی سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ کرشنا داس کو نواب کے حوالے کر دیا جائے لیکن کمپنی کے گورنر (کلکتہ کے) ڈریک نے نہ صرف یہ کہ نواب کی بات پر کان نہ دھرا بلکہ نواب کے نمائیندے کے ساتھ بھی نہایت اہانت آمیز سلوک کیا۔"

لہٰذا ان تمام باتوں سے تنگ آکر نواب سراج الدولہ نے انگریزوں اور میر جعفر، شوکت جنگ اور اپنی خالہ سے نمٹنے کا عزم کر لیا۔ چار جون ۱۷۵۶ء کو سراج الدولہ نے قاسم بازار کی انگریزی فیکٹری کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ کلکتہ روانہ ہوا۔ ۱۶ جون کو کلکتہ کے اُس قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا جہاں انگریز گورنر ڈریک مقیم تھا۔ لیکن ڈریک اور اُس کے ساتھی بھاگ نکلے۔ ۲۰ جون کو سراج الدولہ نے فورٹ ولیم پر قبضہ کر لیا۔ اُس وقت انگریز شراب کے نشے میں دُھت تھے اُنہوں نے سراج الدولہ کی توہین کی اور جب ان سب کو گرفتار کر لیا گیا تو انگریزوں نے مسلمانوں کے ظلم و ستم کی داستان

گھڑی اور سانحہ بلیک ہول کا الزام لگایا، جس کی کوئی حقیقت ہی نہیں اس کے بعد سراج الدولہ نے لڑائی کے دوران شوکت جنگ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

انگریز کی مدد

اب سراج الدولہ کے خلاف سازشوں کا جال پھیل گیا سب سے پہلے انگریزوں نے اُومی چند، مانک چند اور جگت سیٹھ کو اپنی سازش میں شامل کر لیا۔ ان لوگوں کی وجہ سے انگریزوں کو بہت سے دُوسرے ہندو افسروں، تاجروں اور زمینداروں کی مدد بھی حاصل ہو گئی راجہ نبا کیشن نے ڈریک اور دُوسرے انگریزوں کو کلکتہ میں خوراک اور دُوسرا ضروری سامان فراہم کیا۔ یہاں ان لوگوں نے سراج الدولہ کے ڈر سے پناہ لی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ مانک چند نے بھی جسے سراج الدولہ نے کلکتے کا فوجی کمانڈر مقرر کر کے آیا تھا۔ ان انگریزوں کی پوری مدد کی۔ اور جب ۱۴ دسمبر کو انگریز فوجیں بنگال میں داخل ہوئیں تو مانک چند نے کوئی مزاحمت نہ کی اور انہیں کلکتہ پہنچنے کے لئے راستہ دے دیا جس کے جواب میں لارڈ کلائیو نے مانک چند کی تعریف ایک خط میں یوں کی:

> "جب میں مدراس کے علاقوں میں پہنچا تو مجھے یہ بتایا گیا کہ آپ نے انگریز کمپنی کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے ہوئے دوستی کا ثبوت دیا جس کے لئے میں آپ کا احسان مانتا ہوں اور شکریہ ادا کرتا ہوں آپ نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ آپ کو انگریز کمپنی کی ملازمت میں لے لیا جائے۔ مجھے آپ کی خواہش کا احترام ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فی الحال اگر آپ اسی حیثیت میں کام کرتے رہیں اور انگریز کمپنی کے مفادات کا خیال رکھتے رہیں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا"

اور اس کے جواب میں مانک چند نے یہ لکھا

> "جناب عالی! آپ کے بخیر بیت تمام ان علاقوں میں پہنچنے کی اطلاع پا کر مجھے بے پناہ مسرت ہوئی میں ایک شخص رادھا کرشنا ملک کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں جو آپ کو بعض نہایت اہم باتوں سے آگاہ کرے گا۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ان پر فوری توجہ مبذول فرمائیں۔"

غرضیکہ قدم قدم پر ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر سراج الدولہ کو نقصان پہنچایا اور انگریزوں کے دستِ راست بنے رہے۔

انگریزوں اور سراج الدولہ میں پلاسی کی جنگ کے بعد بنگال میں ہی نہیں بلکہ پورے برصغیر میں انگریزوں کو پوری طرح قدم جمانے کے مواقع نصیب ہوئے۔

۱۷۶۴ء کے بعد جب انگریزوں نے بنگال پر پوری طرح کنٹرول حاصل کر لیا۔ تو انہوں نے بنگال کے مسلمانوں کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مسلمان تو پلاسی کی جنگ کے بعد ہی سیاسی اور اقتصادی طور پر ختم ہو چکے تھے مگر انگریزی حکومت نے انہیں کہیں کا نہ چھوڑا انگریزوں نے مسلمانوں کی رہی سہی طاقت کو ختم کرنے کے لئے ہندوؤں کو آگے بڑھایا۔ اور ہندوؤں نے انگریزوں سے پورا تعاون کیا۔ ۱۸۱۳ء میں سرجان مالکم نے سلیکٹ کمیٹی میں کمیٹی کے اراکین کے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے کہا "ہندوستان کی ہندو آبادی ہی ہندوستان میں انگریزوں کے لئے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوئی"۔ اسی طرح تھامس منرو نے اس خیال کا اظہار کیا کہ "اگر ہندوستان کے مسلمان ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت سے مطمئن نہیں ہیں تو وہ انگریز کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ ہندو اس حکومت سے مطمئن ہیں اور مسلمان، انگریز اور ہندو کے دوہرے اثرات کو ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے"۔

برطانیہ کے لوگ مسلمانوں کے جذبات و احساسات سے پوری طرح باخبر تھے لہٰذا قدرتی طور پر وہ مسلمان کی وفاداری کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا تو انہیں انگریزوں کی آمد سے کوئی فرق نہ پڑا تھا سوائے اس کے کہ مسلمانوں کی جگہ اب ان کا آقا انگریز ہو گیا تھا۔ اور اسی لئے ہندو نے مسلمانوں کے زوال کے بعد اپنی پست ذہنیت کی بنا پر اپنی وفاداریوں اور خوشامد کا مرکز انگریز کو بنا لیا تھا نئے برطانوی حکمرانوں نے مسلمانوں سے دشمنوں جیسا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو ایسے تمام عہدوں سے ہٹا دیا جو ان کے آباؤ اجداد کے وقتوں سے ان کے پاس چلے آرہے تھے کمپنی کی حکومت نے مسلمانوں کو نئی ملازمت بھی نہ دی۔ مسلمان جن کے پاس فوج، عدلیہ اور خزانے کے محکموں میں اعلیٰ عہدے تھے اور جن کی وجہ سے مسلمان اقتصادی، ثقافتی اور سماجی ترقی اور استحکام کے راستے پر گامزن تھے، اب یہ عہدے چھن جانے کی وجہ سے پسماندہ لوگوں میں شمار ہونے لگے صرف بنگال میں سینکڑوں مسلمان فوجی افسر اور ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان سپاہی ملازمت سے محروم کر دیئے گئے ان سپاہیوں کو دو وقت پیٹ بھرنے کے لئے کاشت کاری کا سہارا لینا پڑا لیکن یہاں بھی انگریز اور ہندو دشمنی نے مسلمانوں کے لئے لاتعداد مشکلات اور مصائب پیدا کر دیئے۔ انگریز نے بہت سے

ہندؤوں کو معمولی عہدوں سے ہٹا کر کلکٹر بنا دیا تھا اور ساتھ ہی اُنہیں اراضی بھی دے دی لہذا ہندؤوں نے ان عہدوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ انتظامیہ میں اتنی بدعنوانیاں پیدا ہو گئیں کہ "بابوؤں کی جو نئی قوم انگریزوں نے پیدا کی تھی وہ رشوت کے ذریعے عوام اور بالخصوص مسلمان کا خون چوسنے میں مصروف ہو گئی۔ غرضیکہ مسلمان ہر معاملے میں ہندو اور انگریز کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتا رہا۔ خود ہنٹر اعتراف کرتا ہے کہ

"انگریز افسروں اور تربیت یافتہ ہندو بابوؤں کے پاس رحم قسم کی کوئی چیز نہ تھی انگریز خاموشی کے ساتھ کسی قانون کا نفاذ کر دیتا اور رعایا اُسے ماننے پر مجبور ہو جاتی اُن دنوں جو سراسیمگی پھیلی اُسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا اور یہی وجہ ہے اُس دور میں انگریز کے خلاف جو نفرت پیدا ہوئی وہی نفرت آج تک موجود ہے اور انگریزوں کی آئندہ نسلوں کے خلاف بھی اس نفرت کو کوئی طاقت ختم نہیں کر سکتی لاتعداد باوقار اور معزز کنبوں کو تباہ کر کے رکھ دیا گیا اور تعلیمی میدان میں انگریز کی پالیسی کی وجہ سے مسلمان کو شدید صدمہ پہنچا"

تعلیمی پالیسی

۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے مسلمانوں کو مزید صدمہ یوں پہنچایا۔ کہ انگریزی اور مقامی زبانوں کو فارسی کی جگہ عدالتی زبان قرار دے دیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس اچانک تبدیلی سے ہزاروں مسلمان بے روزگار ہو گئے بلکہ یوں کہئے کہ عالم فاضل مسلمان بھی راتوں رات جاہل بن کر رہ گیا۔ ہندو نے کیونکہ سفید فام آقاؤں کو فوراً تسلیم کر لیا تھا لہذا اُس نے ان آقاؤں کی زبان پہلے ہی دن سے سیکھنا شروع کر دی تھی چنانچہ جہاں ایک طرف مسلمان ملازمتوں سے محروم ہوا وہاں ہندو نے اُس کی جگہ لے لی۔ انگریز نے اس حد تک تعصب سے کام لیا کہ اگر کوئی مسلمان کسی اچھی ملازمت کے لیے اپنی صلاحیت کے بل پر منتخب ہو بھی جاتا تب بھی اُس کی جگہ کسی ہندو کو ملازم رکھ لیا جاتا۔ یہاں تک بھی ہوا کہ جب کسی سرکاری ملازمت کے لئے اخبارات میں اشتہار دیئے جاتے تو ان اشتہارات میں خاص طور پر لکھا ہوتا کہ یہ اسامیاں صرف ہندوؤں کے لئے ہیں۔ لہذا اب مسلمان سرکاری دفتروں میں صرف چپڑاسیوں، قلیوں کے طور پر کام کر رہے تھے۔

باب ۶

برطانوی سامراج اور اس کی وسعت

اودھ کے ساتھ برطانیہ کے تعلق کا آغاز ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ سے ہوا۔ اتفاقیہ اس جنگ میں شجاع الدولہ اور شاہ عالم ثانی انگریزوں کے خلاف میر قاسم کی حمایت میں نبرد آزما ہوئے تھے۔ لیکن شجاع الدولہ کے اپنے وزیروں اور فوجی جرنیلوں کی غداری ہی کی وجہ سے انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ وزیر اعلیٰ بینی بہادر نے خفیہ طور پہ انگریزوں کو تمام نقل و حرکت کا منصوبہ بتا دیا تھا۔ ایک جرنیل اسد خاں جنگ سے ذرا پہلے انگریزوں کے ساتھ جا ملا۔ بنارس کے راجہ بلونت سنگھ نے انگریز فوجوں کو اپنی چوکیوں سے شجاع الدولہ کی فوج پہ حملہ کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ بینی بہادر، جنگ کے دوران خاموش تماشائی بنا رہا۔ لہٰذا انگریز فوجوں کو ریاست میں داخل ہونے سے روکنا ناممکن ہو گیا۔ شجاع الدولہ نے روہیلہ سردار حافظ رحمت خان، بنگش حکمران اور نجیب الدولہ کو انگریزوں کے خلاف اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔ صرف ملہار راؤ ہلکر نے شجاع الدولہ کا ساتھ دیا۔ مئی ۱۷۶۵ء میں اودھ کا خاصا علاقہ انگریزوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ اسی سال اگست میں شجاع الدولہ انگریزوں کو تاوانِ جنگ ادا کرنے اور دو اضلاع انگریزوں کے سپرد کرنے پہ مجبور ہو گیا۔ بکسر کی جنگ کے بعد اودھ پر عملاً انگریز فوجوں کا غلبہ تھا۔ ۱۷۹۷ء میں اودھ کے نواب آصف الدولہ کی وفات کے بعد انگریز گورنر جنرل سر جان شور نے تخت نشینی کے معاملہ میں مداخلت شروع کر دی۔ مرزا وزیر علی خاں کی جگہ برطانیہ کے ایک کٹھ پتلی سعادت علی خاں کو تخت نشین کر دیا گیا۔ آخر کار ۱۸۵۶ء میں برطانیہ نے پوری ریاست پہ مکمل قبضہ کر لیا۔ الزام یہ لگایا گیا کہ ریاست میں انتظام بگڑ چکا ہے۔ اور مختلف قسم کی بدعنوانیاں پرورش پا رہی ہیں۔ اسی سال لارڈ ڈلہوزی نے ایک اعلان

کے ذریعے اودھ کو برطانوی حکومت میں شامل کر لیا اور نواب واجد علی شاہ کو کلکتہ بھیج دیا گیا۔

پنجاب

پانی پت کی تیسری جنگ کے بعد کچھ سکھ سرداروں نے صوبہ پنجاب کے مختلف علاقوں میں اپنے حکمران کی عدم موجودگی فائدہ اٹھاتے ہوئے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ احمد شاہ ابدالی کے وارث زمان شاہ نے ۱۷۹۹ء میں خدمات سرانجام دینے کے عوض رنجیت سنگھ کو گورنر مقرر کر دیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے جلد ہی یہاں اپنی حکومت قائم کر لی اور ۱۸۱۸ء میں افغان حکومت کی اطاعت ترک کر دی رنجیت سنگھ نے کشمیر کو بھی زیر اقتدار کر لیا۔ اور انگریزوں کی حاشیہ برداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ مر گیا تو ریاست کے حکمران کارروائی تنازعہ شروع ہو گیا۔ فوجی جرنیلوں نے اس کے شیر خوار بچے دلیپ سنگھ کو تخت پر بٹھا دیا۔ اس طرح پنجاب کی حکومت فوج کے زیر اثر آ گئی۔ ۱۸۴۵ء میں افغانستان میں انگریزوں کی ناگفتہ بہ حالت نے سکھوں کو حوصلہ دیا کہ وہ برطانوی علاقوں پر حملہ کر سکیں۔ تاہم انہیں شکست ہوئی۔ برطانوی فوجی دستے لاہور میں داخل ہو گئے اور انہوں نے سکھوں کو معاہدہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس معاہدے کے تحت سکھوں کو نہ صرف بھاری تاوان ادا کرنا پڑا بلکہ جالندھر دوآب کا علاقہ بھی ان کے سپرد کرنا پڑا۔ کشمیر بھی سکھوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جسے بعد ازاں انگریزوں نے صرف ۷۵ لاکھ روپے کے عوض ڈوگرہ نسل کے گلاب سنگھ کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ علامہ اقبالؒ نے اسی سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ:

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

پنجاب میں کمسن راجہ دلیپ سنگھ کی طرف سے انتظام و انصرام کی نگرانی کے لئے ایک انگریز کو مقرر کر دیا گیا۔ خالصہ فوج کو ختم کر کے لاہور میں انگریزی فوج مقرر کر دی گئی۔ ۱۸۴۸ء میں ملتان کے سکھ گورنر نے دو برطانوی افسروں کو قتل کر دیا ساتھ ہی وہاں انگریزوں کے خلاف ہنگامے شروع ہو گئے۔ آخر کار ۱۸۴۹ء میں سکھوں کو گجرات کے مقام پر ذلت آمیز شکست ہوئی۔ سکھ فوجیوں کا تعاقب پشاور اور افغانستان کی سرحدوں تک کیا گیا، مارچ ۱۸۴۹ء میں لارڈ ڈلہوزی نے پنجاب کو بھی انگریز حکومت میں شامل کر دیا۔

اس کے علاوہ انگریزوں نے سندھ اور میسور وغیرہ کے علاقوں کو اپنی حکومت میں شامل

کرنے کے لیئے زبردست جد و جہد کی جہاں انہیں مسلمانوں کی طرف سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا یہاں آزادی کے ان چند عظیم مجاہدین کا ذکر بہت ضروری ہے جنہوں نے تلوار سے انگریز کے خلاف جہاد کیا۔ اور جو آج تک تاریخ اسلام کے اوراق پہ زندہ و تابندہ ہیں۔

حیدر علی (۱۷۱۷ء–۸۲ء)

ان مجاہدین میں ایک حیدر علی تھا۔ جو برصغیر میں انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے برسرپیکار تھا۔ حیدر علی نے اس بات کا عزم کر رکھا تھا۔ کہ وہ انگریزوں کو اپنی سرزمین سے نکال کر دم لے گا۔ اسی دور میں مرہٹے اپنی حکومت کو وسعت دینے کے لیئے بے تاب نظر آتے تھے۔ حیدر علی دو طرف سے خطرے میں گھرا ہوا تھا۔ حیدر علی نے انگریز اور مرہٹوں دونوں سے اپنی جنگ جاری رکھی۔

حیدر علی قریشی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد میں ایک ولی محمد مکہ سے بغداد چلے آئے تھے۔ بعد ازاں وہ بغداد سے ایران کے راستے دلّی پہنچے۔ چند سال تک دِلّی میں قیام کے بعد ولی محمد بہتر روزگار کی تلاش میں گلبرگہ پہنچ گئے۔ موت کے بعد ان کے لڑکے محمد علی دکولر میں آباد ہو گئے۔ محمد علی کے چار بیٹے تھے ان میں ایک فتح محمد تھا۔ فوج میں اعلیٰ کارنامے انجام دینے پر اُسے نائک بنا دیا گیا۔ اور ایک دن وہ بھی آیا جب اُسے دس ہزار گھوڑ سوار فوج کا جرنیل بنا دیا گیا۔ فتح محمد کی شادی مجیدن بیگم سے ہوئی۔ وہ ایک عرب نژاد خاتون تھی۔ مجیدن بیگم اولاد نہ ہونے کے لیئے خاصی پریشان رہتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق وہ حیدر علی درویش کے پاس گئی۔ انہوں نے مجیدن بیگم کو یقین دلایا۔ کہ اس کی دعا ضرور سُنی جائے گی۔ اور اُس کا لڑکا نمایاں حیثیت اور شہرت کا مالک ہوگا۔ اس درویش کی ہدایت پر ہی اس بچّے کی پیدائش کے بعد اُس کا نام درویش کے نام پر حیدر علی رکھا گیا۔ حیدر علی کی پیدائش ۱۷۱۷ء میں بنگلور کے قریب ہوئی۔ بعد ازاں وہ اپنے چچا کے ساتھ بنگلور چلا آیا۔ میسور کے نجاراج نے حیدر علی کے فوجی کارناموں سے متاثر ہو کر اُسے خان کا خطاب دیا۔ میسور کا کنٹرول نجاراج اور دیوراج دو بھائیوں کے ہاتھ میں تھا۔ لہذا اُن میں اَن بن رہنے لگی۔ اس لیئے نظام اور مرہٹوں نے ان کی چپقلش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ جب مالی اعتبار سے میسور کا دیوالہ نکل گیا تو اس نازک دور میں بھی حیدر علی ہی نے میسور کو بچایا۔

اس دَور میں ہندوستان کے مسلمان انگریزوں اور مرہٹوں کی طرف سے دو طرفہ خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ اور حیدر علی یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ اپنی زندگی آزادی کے ایک مجاہد کی طرح گذار دے گا خواہ اس مقصد کے لیے اُسے کتنے ہی مصائب کیوں نہ برداشت کرنا پڑیں۔ ۱۷۶۱ء میں میسور کے اندر بھی بہت سے غدار پیدا ہو چکے تھے۔ یہ وہ دَور تھا۔ جب حقیقی معنوں میں حیدر علی میسور کا ناقابل تسخیر حاکم بن چکا تھا۔ اُس نے مرہٹوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔

مشہور انگریز مؤرخ ہنٹر اُس وقت کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ

"یہ مدراس کی انگریز حکومت ہی تھی جس نے میسور کے حیدر علی اور دکن کے نظام کو لڑنے پر مجبور کر دیا اس وقت ہندوستان میں ان دونوں سے بڑی کوئی مسلمان طاقت موجود نہ تھی۔ انہی کی وجہ سے مرہٹوں کو مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے خلاف سمجھوتہ کرنا پڑا۔ ہیسٹنگز کی چال یہ تھی کہ وہ نظام اور ناگ پور کے مرہٹہ راجہ کی حمایت کرے لیکن حیدر علی کی فوج برطانوی مقبوضات پر (کرناٹک میں) بجلی کی طرح ٹوٹ پڑی۔"

حیدر علی نے انگریزوں کے بہت سے قلعے قبضہ میں کر لیے اور انہیں ذلت آمیز شکستیں دیں۔ اگر نظام دکن، حیدر علی کا دوست رہتا اور انگریزوں کا آلہ کار بن کر حیدر علی کے خلاف سازشوں میں مصروف نہ ہو جاتا تو حیدر علی یقیناً تاریخ کا رُخ بدل سکتا تھا۔ حیدر علی کے بارے میں کیمبل لکھتا ہے کہ

"حیدر علی کچھ اتنی زیادہ صلاحیتوں کا مالک تھا کہ تاریخ کے اوراق میں ایسی مثال کم ہی ملتی ہے وہ بالکل ناخواندہ تھا۔ لیکن اتنا ذہین کہ شاید ہی اتنی ذہانت کسی کو نصیب ہوئی ہو دلچسپ بات یہ ہے۔ کہ اپنوں کے لیے وہ لائق صد ستائش لیکن دشمن اس کے نام سے کانپ کانپ جاتے تھے۔"

حیدر علی کے بارے میں منرو کا کہنا ہے کہ

"ہر سول اور فوجی محکمہ حیدر علی کی ذہانت کی وجہ سے باہم اتنا مربوط تھا۔ کہ بڑے بڑے ایڈمنسٹریٹر بھی شاید ہی اس درجہ انتظامی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر سکیں۔ انصاف کا دَور دَورہ تھا اور کسی کی جرأت نہ تھی کہ وہ انصاف میں خلل پیدا کر سکے۔"

انصاف کا عالم یہ تھا۔ کہ جب حیدر علی اپنے برادرِ نسبتی مخدوم سے پانڈی چری کی مہم کے مسئلہ پر دل برداشتہ ہوا تو اُس نے مخدوم سے پانڈی چری کی مہم اور اس الزام میں کہ اس نے پانڈی چری کا محاصرہ اُٹھا دیا تھا، مخدوم کو جنرل کے عہدے سے گرا کر عام سپاہی بنا دیا۔ حالانکہ مخدوم نے

بڑی دلیری سے جنگ کی تھی لیکن حیدر علی نے اتنی قریبی رشتہ داری کے باوجود مخدوم کے اس
قدام کو معاف نہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد ہی جب پانڈی چری مہم کے دوسرے فوجی افسروں اور سپاہیوں
نے حیدر علی کو یقین دلایا کہ حالات کے تحت محاصرہ اُٹھا لینے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا
حیدر علی اپنے تمام مشیروں کے ساتھ مخدوم سے معافی مانگنے کے لئے اس کے گھر روانہ ہُوا
مخدوم اُسے بازار میں ایک عام سپاہی کی طرح گھومتا نظر آیا۔ حیدر علی ہاتھی سے اُترا اور اُس نے
دوبارہ مخدوم کو گلے لگایا۔ اور معافی طلب کی۔ یہ سب کچھ بھی عوام کے سامنے ہُوا۔ اس طرح مخدوم
دوبارہ جنرل بنا دیا گیا۔

جہاں تک انگریزوں کے خلاف جنگ کا تعلق تھا تو حیدر علی نے انگریزوں کو وہ سبق دیا
کہ وہ آج تک نہیں بھلا سکے۔ منگلور پر قبضہ کے آٹھ دن بعد حیدر علی نے اپنے لڑکے ٹیپو سلطان
مدد سے انگریزوں کے ناک چنے چبوا دیئے۔ پوری انگریزی فوج گرفتار کر لی گئی۔ جس میں ایک
رل، ۴۹ اعلیٰ افسر، ۵۰۰ دیگر فوجی عہدے دار اور کچھ ہزار سے زائد سپاہی شامل تھے۔ اُن کا
م اسلحہ اور دیگر ساز و سامان پر قبضہ کر لیا گیا۔ پرتگالیوں نے اس خیال کے تحت کہ جنگ میں
یزوں کو فتح حاصل ہوگی، ——— انگریزوں کا ساتھ دیا لیکن جب حالات کا رُخ پلٹ گیا
ر فتح حیدر علی کو ہوئی تو انہوں نے حیدر علی کے خلاف سازشوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔
در علی نے یہ سنتے ہی پرتگالیوں کو طلب کر لیا۔ ان میں تاجر بھی تھے اور عیسائی پادری بھی۔ حیدر علی
اُن سے پوچھا وہ خود ہی بتائیں اُن کی سزا کیا ہونا چاہیئے؟ اس پر ایک پرتگالی افسر نے جواب
" موت سے کم کیا ہو سکتی ہے" لیکن حیدر علی نے جواب دیا " یہ تمہارا قانون ہوگا، اسلام
نون اتنا سخت نہیں۔ تم لوگوں نے انگریزوں کی خدمت کر کے اپنے آپ کو بھی پرتگالی سے انگریز
ا ہے لہٰذا تمہاری تمام جائداد بھی انگریز کی جائداد تصور کی جانی چاہیئے۔ اور تمہیں اس وقت تک
میں رہنا چاہیئے۔ جب تک انگریزوں سے امن قائم نہ ہو جائے"

حیدر علی کے برادرِ نسبتی مرزا علی خاں کے ساتھ حیدر علی کے نہایت اچھے سلوک کے باوجود
علی خاں نے انگریزوں اور مرہٹوں کے آکسانے میں آکر غداری کی۔ آخر ایک دن مرزا علی خاں
ہو کر خود ہی حیدر علی سے معافی طلب کرنے کے لئے چلا گیا۔ اس نے حیدر علی سے کہا
" میرا سر آپ کے رحم و کرم پر ہے"
حیدر علی نے اُسے گلے لگا لیا۔ اور کہا " مجھے کوئی تعجب نہیں ہُوا" اور مرزا علی خاں کو

معاف کر دیا۔

حیدر علی کی تمام زندگی انگریزوں اور مرہٹوں سے لڑتے بھڑتے گذری۔ جنگ کے میدان میں وہ ایک عام سپاہی کی طرح لڑتا رہا جس کی وجہ سے اس کے جسم پر زخموں کے لاتعداد نشانات تھے شاید اسی بنا پر اُس کی کمر میں مستقل درد رہنے لگا۔ لیکن اس کے باوجود انگریزوں کے خلاف جنگِ آزادی جاری رہی۔ اُس نے موسم کی پروا کی نہ دشوار گذار راستوں کو خاطر میں لایا اور جب بھی اسے آرام کا مشورہ دیا گیا۔ تو اُس نے پلٹ کر ایک ہی جواب دیا۔"

"مسلمان اور مسلمان کی سرزمین کفار کے ہاتھوں خطرے میں ہے۔ میں نے آرام کیا۔ تو خدا کو کیا جواب دوں گا۔"

نومبر ۱۷۸۲ء میں اس کی صحت جواب دے گئی۔ اس وقت بھی وہ فوجی کیمپ میں تھا۔ اُسے خراب حالت میں آرکوٹ پہنچایا گیا۔ جہاں وہ یکم محرم ۱۱۹۷ھ (مطابق ۷۔ دسمبر ۱۷۸۲ء) انتقال کر گیا۔

ٹیپو سلطان (۱۷۵۰ء تا ۱۷۹۹ء)

۷۔ دسمبر ۱۷۸۲ء کو حیدر علی وفات پا گیا، ۱۱ دسمبر کو ٹیپو سلطان کو اطلاع ملی۔ ٹیپو سلطان اُس وقت پنیانی میں انگریزوں کے خلاف برسرپیکار تھا یہ جگہ کالی کٹ سے تقریباً چار میل دور تھی ٹیپو سلطان فوراً سرنگاپٹم کی طرف روانہ ہو گیا اور ۲۰ تاریخ کو وہاں پہنچ گیا۔ یہاں حیدر علی کی وفات کی بنا پر پوری آبادی غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی تھی گو ٹیپو سلطان کا ایک اور بھائی کریم شاہ موجود تھا لیکن وہ درویش صفت انسان تھا لہٰذا ٹیپو سلطان کو اپنے والد کے تخت اور فوج کی کمان سنبھالنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ جب فروری ۱۷۹۲ء میں انگریزوں نے سرنگاپٹم پر قبضہ کر لیا اور لال باغ کی پُرشکوہ عمارتوں کو منہدم کر دیا تو ٹیپو سلطان کو سخت غصہ آیا انگریزوں نے دیکھتے دیکھتے نہ صرف تمام خوبصورت درختوں کو کاٹ ڈالا بلکہ محلات کو بھی ہسپتالوں میں تبدیل کر دیا۔ ٹیپو سلطان نے اپنے توپ خانے کو حکم دیا کہ وہ انگریزی چوکیوں پر گولے برسائے۔ سلطان کو سب سے زیادہ رنج اور غصہ اس بات کا تھا کہ انگریزوں نے جنہیں وہ اپنا بدترین دشمن خیال کرتا تھا اُس کے باپ کے مقبرے کو بھی مسمار کر دیا تھا۔

۱۷۷۵ء سے ۱۷۷۹ء تک جب حیدر علی مرہٹوں کے خلاف مسلسل جنگ میں مصروف تھا

تو اُس وقت بھی ٹیپو سلطان اپنے والد کا دست و بازو بنا رہا۔ جولائی ۱۷۸۰ء میں جب حیدر علی کی فوج ایک طوفان کی طرح کرناٹک میں داخل ہوئی اُس وقت بھی ٹیپو سلطان ۲۴ ہزار سے زائد افراد پر مشتمل فوج کی کمان کر رہا تھا اپنے والد کی زندگی میں ٹیپو نے ہر جنگ میں امتیازی حیثیت قائم کی اور جب انگریز کرنل بالی کے ساتھ ٹیپو سلطان کی ٹکر ہوئی اور سلطان نے اُس کے دانت کھٹے کر دیئے تو اُسے ایک قابل ترین جرنیل تسلیم کر لیا گیا۔

اپنے والد کے جنازے میں شرکت اور آخری رسوم ادا کرنے کے بعد ٹیپو سلطان انگریزوں سے لڑنے کے لئے آرکوٹ روانہ ہو گیا پوری فوج کی کمان اُس کے ہاتھ میں تھی۔ ٹیپو سلطان نے باپ کی طرح اپنی زندگی آزادی اور وقار کی حفاظت کے لئے وقف کر دی تھی حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ وہ اپنی سلطنت کو بچانے کے لئے لڑیں بلکہ اُن کا بنیادی مقصد انگریزوں اور غیر ملکیوں سے سرزمینِ ہند کو پاک کرانا اور ایسے تمام عناصر کا قلع قمع کرنا تھا جو اسلام دشمن ہیں۔ اُنہیں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اگر انگریز نے سرزمینِ ہند پر قدم جمالئے تو یہاں کے لوگ صدیوں تک غلام ہو جائیں گے اور خاص طور پر مسلمان، اسلام کے ازلی دشمنوں یعنی انگریزوں اور ہندوؤں کے ظلم و ستم کا شکار ہو جائیں گے۔

اپریل ۱۷۸۳ء میں ٹیپو سلطان ایک لاکھ فوج کے ساتھ بدنور میں انگریزوں کے ساتھ نبرد آزما ہوا۔ انگریز فوجوں کا کمانڈر جنرل میتھیوز تھا۔ سلطان نے بدنور کے قلعے کا محاصرہ کر لیا اور انگریز توپ خانے کو بھی محاصرے میں لے لیا۔ اُس کے بعد انگریزوں کی طرف سے معاہدے کی درخواست کی گئی، جسے ٹیپو سلطان نے قبول کر لیا لیکن بعد میں جنرل میتھیوز کے فریب اور معاہدے کی عدم پابندی کے باعث ٹیپو سلطان نے بہت سے انگریز افسروں اور سپاہیوں کو جیل میں ڈال دیا۔

بدنور میں فتح حاصل کرنے کے بعد ٹیپو سلطان منگلور کو انگریزوں کے پنجے سے نجات دلانے کے لئے بڑھا یہاں انگریز فوج کی قیادت میجر کیمپبل کر رہا تھا اس جنگ میں ٹیپو سلطان کو فرانسیسی فوج کی حمایت بھی حاصل تھی لیکن عین اُس وقت جب جنگ اپنے عروج پر تھی تو فرانسیسیوں نے اُسے دھوکہ دیا۔ یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان اس وقت جو جنگ جاری تھی اُسے بند کرنے کا معاہدہ ہو گیا تھا لہٰذا ہندوستان میں فرانسیسی فوجوں نے اس معاہدے کی پابندی میں فوری طور پر ٹیپو سلطان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ فرانسیسیوں کے اس اقدام سے سلطان کو شدید دھچکا لگا لیکن وہ ایک حوصلہ مند اور بہادر انسان تھا، اُس نے بُرے سے بُرے وقت میں بھی دل نہ چھوڑا تھا

اس موقع پر ٹیپو سلطان کی مشکلات میں یوں بھی اضافہ ہو گیا کہ انگریز جرنیل میڈوڈ بمبئی سے سمندر میں ساتھ بھاری فوج لے کر پہنچ گیا اس کے بعد جنگ اور شدت اختیار کر گئی حتیٰ کہ مدراس سے سرجارج شانٹن پہنچ گیا اور اس طرح ٹیپو سلطان اور انگریزوں کے درمیان امن کا معاہدہ ہو گیا۔

جب ٹیپو سلطان اپنی سرحدوں سے بے فکر ہو گیا تو اُس نے مرہٹوں کی طرف توجہ دی مرہٹے اب تک مسلمانوں کے خلاف مسلسل کارروائیوں میں مصروف تھے ٹیپو سلطان نے بادامی اور دراوڑ کے قلعوں پر حملے کے بعد قبضہ کر لیا اس طرح مرہٹوں کے بیشتر صوبے فوجی اعتبار سے ٹیپو سلطان کی نگرانی میں آگئے۔

۱۷۸۸ء میں ٹیپو سلطان کرگ کی طرف بڑھا یہاں بغاوت ہو گئی تھی۔ تقریباً آٹھ مہینے کے عرصے میں ٹیپو سلطان نے باغیوں کے اسی ہزار افراد اور بہت سے سرداروں کو قیدی بنا لیا اور کئی شہروں اور فوجی اہمیت کے مقامات پر قبضہ کر لیا۔ جون ۱۷۸۹ء میں ٹیپو سلطان نے کوچین کے راجہ پر حملہ کر دیا اور اُس کے بہت سے سرداروں کو قیدی بنا لیا۔ راجہ نے فوراً انگریزوں سے مدد طلب کی انگریزوں نے اسلام دشمنی میں فوری طور پر ایک مضبوط فوج راجہ کی مدد کو روانہ کر دی اس فوج کی کمان کرنل ہاسٹنگ کر رہا تھا انگریز یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ ٹیپو سلطان کو کچل کر دم لیں گے کیونکہ انگریزوں کو پورے ہندوستان میں وہی شخص نظر آتا تھا جو انگریزوں کے سامراجی عزائم کے خلاف نبرد آزما تھا اور جس کی وجہ سے انگریزوں کو ہندوستان میں اپنے راج کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہ آتا تھا انگریزوں نے ٹیپو سلطان کے خلاف مرہٹوں اور نظام دکن کے اتحاد کی بھرپور حمایت کی۔ چنانچہ مرہٹوں، نظام دکن کے اتحاد اور انگریزوں کے خلاف ٹیپو سلطان تن تنہا رہ گیا۔ وہ ڈرادکول سے اپنی فوجیں لے کر سرنگا پٹم لوٹ آیا ٹیپو سلطان کے لئے ایک بڑی مشکل یہ بھی تھی کہ فرانسیسیوں کی طرف سے اُس کی حمایت ختم ہو گئی ۱۷۹۲ء میں ان تمام طاقتوں نے ٹیپو سلطان پر پورا دباؤ ڈالا اس شدید بحرانی دور میں اُس کے خلاف بلا امتیاز مذہب پوری قوم ٹیپو کے ساتھ رہی حالت یہ تھی کہ تین کروڑ روپے جمع کرنے کے لئے جب نئے ٹیکس لگائے گئے تو ٹیپو سلطان کو تین کی جگہ دس کروڑ روپے وصول ہوئے۔

ٹیپو نے انگریزوں کے ناپاک قدموں سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے فرانسیسیوں، ایرانیوں، افغانوں اور نیپالیوں کے علاوہ دیگر کئی حکومتوں سے بھی مدد کی درخواست کی مگر اُس کی کوشش بارآور ثابت نہ ہوئی۔ اُس کے باوجود ٹیپو سلطان یہ عزم کر چکا تھا کہ وہ اپنی جان کی

قیمت پہ بھی وطن کا دفاع کرے گا۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ انسان کو ایک ہی بار مرنا ہے لہذا موت سے خوف کس لئے؟ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی کہیں بہتر ہے۔ اپنے والد کی وفات کے وقت ٹیپو سلطان کی ریاست کا رقبہ اسی ہزار مربع میل تھا لیکن اس نے اس میں ادونی، سنورہ کرک، اناگوڈی، کرپہ، کرنول اور امتیاز گڑھ کے علاقے شامل کرلئے اس کے خزانے میں اسی کروڑ روپے تھے نیز سات سو ہاتھی، چھ ہزار اونٹ، گیارہ ہزار گھوڑے چار لاکھ بیل اور گائے، ایک لاکھ بھینسے، چھ لاکھ بھیڑیں، تین لاکھ آتشی گولے، تین لاکھ دستی بم، دو لاکھ تلواریں اور ۲۲ ہزار توپیں تھیں۔ اس نے پیادہ فوج میں اضافہ کیا اور فوجی احکام کے لئے فارسی اصطلاحات استعمال کیں۔ جو اس سے پہلے انگریزی اور فرانسیسی میں مروج تھیں، فوج کے ڈویژنوں کے مختلف نام رکھے اور فوج میں دیگر بہت سی اصلاحات کیں۔

ٹیپو سلطان سترہ سال سے ۵۰ سال کی عمر تک اسلام کے دشمنوں سے برسرپیکار رہا۔ ۱۷۹۸ء میں انگریز جرنیل ویلزلے کو اس مقصد کے لئے مقرر کیا گیا کہ وہ انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن ٹیپو سلطان کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردے کیونکہ انگریزوں کے دل میں ایک ہی خار کھٹک رہا تھا اور وہ ٹیپو سلطان تھا۔ ویلزلے نے ٹیپو سلطان کے نام کئی دھمکی آمیز خطوط روانہ کئے اور اس پر یہ الزام لگایا کہ اس نے فرانسیسیوں اور دوسری قوتوں کو انگریزوں کے خلاف لڑنے کی دعوت دے کر بہت بڑا جرم کیا ہے۔ تین فروری ۱۷۹۹ء کو ویلزلے نے برطانوی فوج اور اتحادیوں کو حکم دیا کہ ٹیپو سلطان پر حملہ کردیں۔ ۱۱ فروری کو برطانیہ کی فوج جنرل ہارس کی کمان میں ویلور سے روانہ ہوئی۔ اس کے ساتھ نظام دکن کی فوج بھی شامل تھی ان دونوں فوجوں نے سرنگاپٹم کی طرف بڑھنا شروع کردیا ۳ مارچ کو یہ فوج میسور کی سرحدوں پر جمع ہوگئی۔ ۵ مارچ کو ان فوجوں نے کاروائی شروع کردی۔ برطانوی فوج کے ساتھ مختلف ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کی فوج اتنی تعداد میں شامل تھی کہ سلطان کی فوج کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوگئی اس کے باوجود ٹیپو سلطان اپنی فوج کی کمان کرتا ہوا سب سے آگے نظر آیا وہ دشمن سے لڑنے کے لئے سرنگاپٹم سے مدور روانہ ہوا ابتدائی کامیابیوں کے بعد ٹیپو سلطان کی فوج کا زبردست جانی نقصان ہوا اس کے باوجود اس نے جنرل ہارس کی انگریز فوج سے بھی پنجہ لیا۔ ۲۷ تاریخ کو شدید جنگ کے بعد ٹیپو سلطان کے بہت سے افسر اور ایک ہزار بہترین سپاہی کام آئے۔

مسلسل ناکامیوں اور دشمن کے زبردست دباؤ کے بعد ٹیپو سلطان کو سرنگاپٹم کے قلعہ بند

شہر میں لوٹنا پڑا جس کا محاصرہ برطانوی فوج نے کر لیا تھا۔ ۹ اپریل کو ٹیپو سلطان نے برطانوی کمانڈر جنرل ہارس کو ایک خط میں لکھا کہ تمام معاہدوں کی پابندی کے باوجود وہ کیا چیز ہے جس نے انگریزی فوج کو جنگ کرنے اور پیش قدمی جاری رکھنے پر مجبور کر دیا۔؟

۱۴ اپریل کو جنرل ہارس کو بمبئی سے نئی کمک ملی اور ۲۰ اپریل کو انگریز فوج نے دریا کے جنوبی ساحل پر بھرپور حملہ کر دیا۔ ۲۲ اپریل کو جنرل ہارس نے ٹیپو سلطان کے نام ایک خط بھیجا جس میں امن کے لئے شرائط پیش کی گئی تھیں۔ ۲۸ اپریل کو ٹیپو سلطان نے جواب میں لکھا کہ معاملہ کیونکہ بہت اہم تھا اس لئے اس پر غور و فکر کی ضرورت تھی ٹیپو سلطان نے اس مقصد کے لئے اپنے دو نمائندے بھی انگریزوں کے پاس بھیجے تاکہ وہ انگریزوں سے بات چیت کر سکیں لیکن جنرل ہارس نے ان دونوں سے ملنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ سلطان غیر مشروط طور پر یا تو امن کا معاہدہ کرے یا سنگین نتائج کے لئے تیار ہو جائے۔

ٹیپو سلطان اس بات سے پوری طرح باخبر تھا کہ معاہدۂ امن باعزت نہیں اور جنگ سے بہتر ہے لہذا ایسے معاہدے سے بہتر ہے کہ جنگ جاری رکھی جائے خواہ موت کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ تین مئی ۱۷۹۹ء کو جنگ کے شعلے پھر بھڑک اٹھے اس وقت ٹیپو سلطان قلعہ بندی کے ایک دروازے کے محافظ رہائش پذیر تھا کیونکہ اُسے اسی دروازے پر حملے کا سب سے زیادہ خطرہ تھا ٹیپو سلطان نے اپنی فوج سے خطاب کرتے ہوئے کہا

”میں اُس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے جسم میں خون کا آخری قطرہ اور آخری سانس باقی ہے اگر انسان کو صرف ایک بار مرنا ہے تو پھر موت کا خوف کیوں؟ موت کا ایک دن مقرر ہے جو کبھی نہیں ٹل سکتا۔“

ٹیپو سلطان حالات کی سنگینی سے پوری طرح باخبر تھا لیکن وہ قطعی طور پر خوفزدہ نظر نہ آتا تھا اس دن برہمن نجومیوں کا ایک وفد اُس کے پاس آیا اور اُنہوں نے سلطان کو بتایا کہ انتہائی مصیبت کا وقت ہے اور ایک اندوہناک گھڑی سر پر کھڑی نظر آتی ہے اس گھڑی کو دعاؤں اور صدقوں سے ٹالا جا سکتا ہے ٹیپو سلطان نے کہا

”دعا خدا سے ہے اور صدقہ بھی خدا کے نام پر ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔“

دوپہر کے وقت ٹیپو سلطان اپنے کمرے سے نکلا اُس کی پیٹی کے ایک طرف تلوار تھی اور دوسری طرف کارتوس! اُس کے دائیں بازو پر قرآنی آیات پر مشتمل دعائیں بندھی تھیں اتنی دیر میں اُسے اطلاع

ملی کہ فوج کا ایک نہایت قابل جرنیل سید غفار شہید ہو گیا ہے۔ ٹیپو سلطان نے آہستگی سے کہا "وہ بہت بہادر انسان تھا۔ موت اُسے کبھی خوفزدہ نہیں کر سکی الحمدللہ کہ اُس نے شہادت کا تاج اپنے سر پر رکھ لیا۔"

رات کو وہ کھانا کھانے کے لئے واپس آیا۔ ابھی وہ فارغ بھی نہ ہوا تھا کہ کچھ خوفناک آوازیں کان میں پڑیں۔ اُسے علم ہو گیا کہ انگریز فوجوں نے تازہ حملہ کر دیا ہے۔ اُس نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور کمر سے تلوار باندھ کر تیار ہو گیا۔ میدانِ جنگ میں ٹیپو سلطان نے مسلسل بہادری کے جوہر دکھائے اور بہت سے انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کچھ دیر بعد انگریزوں کی پیش رو صف ٹیپو سلطان کے سر پر پہنچ گئی وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس دوران سلطان کے سینے کے دائیں اور بائیں گولیوں کی بوچھاڑ پڑی، گھوڑا گر گیا اور سلطان کی پگڑی زمین پر آ رہی، اب ٹیپو سلطان انتہائی زخمی حالت میں زمین پر پڑا تھا۔ اِس دوران کچھ لوگوں نے انگریزوں کو یہ بتانا چاہا کہ وہی ٹیپو سلطان ہے تاکہ اُس کی زندگی بچنے کی کوئی صورت نکل آئے لیکن غیور اور باوقار سلطان نے سختی کے ساتھ اپنے لوگوں کو ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ اس دوران کچھ اور انگریز سپاہی وہاں پہنچ گئے ان میں ایک نے سلطان کی ہیرے جڑی پیٹی اُتارنے کی کوشش کی لیکن سلطان نے، جس کے ہاتھ میں ابھی تلوار موجود تھی ایک ہی وار میں انگریز سپاہی کے گھٹنے کاٹ دیئے۔ جواباً سپاہی نے مشتعل ہو کر سلطان کی کنپٹی پر بے شمار گولیاں داغ دیں یوں سلطان نے جامِ شہادت نوش کیا۔

جنگ کے بعد انگریز کمانڈنگ آفیسر جنرل بیارڈ جب شام کے وقت سلطان کے کچھ ملازموں کے ہمراہ سلطان کی لاش تلاش کرنے پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سلطان کے چہرے پر کرب کے کوئی آثار نہ تھے۔ بلکہ شاہی دبدبہ اور اسلام کے ایک سپاہی کا عزم اور وقار موجود تھا سلطان کی تلوار، پگڑی اور پیٹی غائب ہو چکی تھی۔ ۵ مئی ۱۷۹۹ء کو جنازہ اُٹھا جس میں لاکھوں افراد نے شرکت کی۔ اس موقعے پر توپوں کی سلامی دی گئی اور سلطان کو اُس کے والد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

ہوش محمد قنبرانی (۱۸۰۱ء تا ۱۸۴۳ء)

میر فتح علی خان تالپور نے ۱۷۸۳ء میں سندھ فتح کیا۔ اس طرح سندھ میں کلہوڑہ نسل کا خاتمہ ہو گیا لیکن تالپور نسل کے بیشتر فرمانروا تن آسان اور عیاش تھے۔ جنگ سے کوئی دلچسپی نہ تھی

ا حکومت پر اُن کی گرفت کمزور ہوتی گئی۔ پھر وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے میں مصروف
ہو گئے اور اپنی سرحدوں کی حفاظت بھی نہ کر سکے چنانچہ سندھ میں تالپوروں کی حکومت صرف پچاس
سال کے بعد زوال پذیر ہو گئی۔

ہوش محمد قنبرانی کو عام طور پر ہوشو کہا جاتا تھا وہ ایک نہایت بہادر شخص تھا اور اُس نے
انگریزوں کے ساتھ مردانہ وار پنجہ لیا اسی لئے اُسے ممتاز مقام حاصل ہوا لیکن ہوش محمد کے بارے
میں تفصیلات بہت کم ملتی ہیں وہ غالباً ۱۸۰۱ء میں پیدا ہوا تھا یہ فتح علی خان تالپور کے لڑکے صوبدار
خان کا ہم عمر تھا اور دونوں میں بہت دوستی تھی۔ صوبدار خان اُس دن پیدا ہوا جس دن اُس کے والد
کا انتقال ہوا اُس کی تعلیم اور پرورش شاہی گھرانے میں ہوئی میر فتح علی خان کی وفات کے بعد
سندھ کی حکومت اس کے چچاؤں کے ہاتھ میں آ گئی۔ ۱۸۲۶ء میں صوبدار خان نے اپنے چچاؤں سے
باپ کے حصے کی ملکیت کا مطالبہ کیا، جب انکار ہوا تو اُس نے بغاوت کر دی اور قنبرانی اُس کے ساتھ
شامل ہو گیا۔ تاہم صوبدار خان کے ایک چچا نے صلح کرا دی لیکن اس کے باوجود صوبدار خان کو انتقام
کے سوا کوئی خیال نہ تھا اسی لئے صوبدار خان اس تاک میں رہنے لگا کہ وہ اپنے چچاؤں سے انتقام لے۔

یہ موقع اُس کے ہاتھ اُس وقت آیا جب انگریزوں نے سندھ پر حملہ کیا صوبدار خان کو
انگریزوں کی حمایت حاصل ہو گئی اور اسی موقعے پر یہ بات بھی کھل کر سامنے آئی کہ قنبرانی کس قدر
محب وطن تھا۔ اُس نے صوبدار خان سے مسلسل درخواست کی کہ وہ دشمنوں کے ہاتھ میں کھلونا
نہ بنے اور تمام باتیں بھلا کر انگریزوں کے خلاف اپنے چچاؤں کے ساتھ ہو جائے لیکن صوبدار
خان نہ مانا ـــ صوبدار خان میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ اپنے مقصد کے لئے قربانیاں دے سکے
وہ تو صرف یہ چاہتا تھا کہ حکومت اس کے ہاتھ آ جائے۔

صوبدار خان سر چارلس نیپیر کے ساتھ مسلسل خفیہ خط و کتابت میں مصروف تھا۔ صوبدار خان
نے انگریزوں کو یہ یقین بھی دلایا تھا۔ کہ وہ ان کی مخالفت نہیں کرے گا اور سندھ کے میروں کا
ساتھ نہیں دے گا۔ انگریز تو اپنے مفادات کی خاطر یہ چاہتا ہی تھا۔ کہ غدار پیدا ہوتے رہیں۔ اور
ان کی سرپرستی کی جاتی رہے۔

جب میروں کی طرف سے میانی میں انگریز فوج کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تو
صوبدار خان نے تمام میروں سے علیحدگی اختیار کئے رکھی نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۷ فروری ۱۸۴۳ء کو جب
میانی کی جنگ کا آغاز ہوا۔ تو صوبدار خان حیدرآباد کے قلعے میں محفوظ ہو کر بیٹھا رہا۔ جونہی اُسے

بھی اطلاع ملی کہ انگریزوں نے جنگ جیت لی ہے اور میروں کی افواج جان بچا رہی ہیں، اُس نے اپنے ایک معتمد مشیر منشی اَوت رائے کو سر چارلس کی خدمت میں قیمتی تحائف، پھل اور مٹھائیاں دے کر روانہ کیا۔ دراصل یہ اَوت رائے ہی تھا جس نے صوبدار خان کو غلط مشورے دیئے اور جنگ میں میروں سے علیحدگی رکھنے پر مجبور کیا۔ بہرحال صوبدار خان انگریزوں کی فتح کو اپنی فتح تصور کر رہا تھا۔ اس کے بعد صوبدار خان نے انگریزوں کی مزید خوشامد اور چاپلوسی کے لئے اَوت رائے اور موسیٰ ارمانی کو انگریز جنرل کے پاس بھیجا اور ملاقات کی اجازت طلب کی۔ جنرل چارلس نے صوبدار کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ حیدرآباد کے میروں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی پوری کوشش کرے کہ میر انگریزوں کی مکمل اطاعت قبول کرلیں۔ ان کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا جائے گا نیز ان کی شاہی حیثیت برقرار رکھی جائے گی۔

صوبدار خان کی ان تمام غداریوں کے وقت بھی ہوش محمد قنبرانی مسلسل درخواست کرتا رہا۔ کہ وہ اپنا رویہ ترک کرلے، حوصلے سے کام لے اور انگریز کے خلاف تلوار اُٹھائے۔ لیکن صوبدار خان میں تو حب وطن کے جراثیم ہی نہ تھے۔ کہ وہ ہوش محمد کی بات مان لیتا۔

آخر ایک دن جب ہوش محمد کا دل بھر آیا۔ اور اُس نے حب وطن، عزتِ نفس اور اسلامی عقائد کے ہاتھوں مجبور ہو کر صوبدار خان کو کھری کھری سنائیں تو صوبدار خان غصہ میں آگیا۔ اس نے ہوش محمد کی دوستی اور وفاداری اور اُس کے تمام گذشتہ احسانات کو فراموش کرتے ہوئے جلد ہی سزا دینے کا ارادہ ظاہر کیا اور اسے اپنی نظروں کے سامنے سے دُور ہو جانے کا حکم دیا۔

برطانوی افسر روزانہ کسی نہ کسی میر کو گرفتار کر لیتے تھے۔ میانی کی جنگ کے صرف چار دن کے بعد یعنی ۱۲ر فروری ۱۸۴۳ء کو برطانوی سپاہی فاتحانہ انداز میں حیدرآباد کے قلعہ میں داخل ہوگئے جہاں وفادار لیکن بدقسمت ہوش محمد بھی محبوس تھا۔ انگریزوں نے داخل ہوتے ہی اپنی روایات کو قائم رکھتے ہوئے پرلے درجہ کے لٹیرے ہونے کا ثبوت دیا اور وہ تمام نوادرات اور قیمتی اشیاء ہتھیا لیں۔ جو میروں کے آباؤ اجداد کی نشانی تھیں۔ پانچ دن کے بعد میر محمود خان اور غدار میر صوبدار خان کو زبردستی ایک پالکی میں بٹھا کر قلعہ سے باہر لے جا کر قید کر دیا گیا۔

ہوش محمد گو اپنے مالک صوبدار خان سے متفق نہ تھا اور اس کی بے عزتی بھی کی گئی تھی، اس کے باوجود ہوش محمد کو اپنے مالک کی توہین کا بے حد صدمہ تھا۔ وہ اپنے وطن پہ غلامی کے چھائے ہوئے گھٹا ٹوپ اندھیروں کو محسوس کر رہا تھا۔ اور غداروں کی وجہ سے اس روزِ سیاہ کی آمد پہ اشک فشاں

تھا۔ لیکن وہ ہمت ہارنے والا شخص نہیں تھا۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ شکست در شکست ہوتی ہی رہتی ہے لیکن کوئی شکست آخری اور حتمی نہیں ہوتی۔ اس نے تلوار سنبھال لی، اپنے تھوڑے سے وفادار سپاہیوں کو اکٹھا کیا اور انگریزوں کے خلاف آیندہ معرکہ میں شرکت کی غرض سے حیدرآباد روانہ ہوگیا تاکہ میر شیر محمد کا ساتھ دے سکے۔

میر شیر محمد کو ہوش محمد کی آمد سے بے پناہ مسرت اور حوصلہ ہوا۔ ۱۵ مارچ ۱۸۴۳ء کو سپاہیوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ حیدرآباد کی طرف روانہ ہوا۔ سر چارلس نے میروں کی طاقت کا اندازہ کرنے کے لئے اپنے گشتی دستے چھوڑے ہوئے تھے۔ ۲۳ مارچ کو سر چارلس نے اپنی افواج نہر پھلیلی کے دوسرے کنارے منتقل کر دیں۔ انگریزوں اور حریت پسندوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ ہوش محمد نے شیر محمد کو مشورہ دیا کہ وہ ایک دن کے لئے جنگ بند کر دے۔ تاکہ تھکی ہاری فوج اگلے دن تازہ دم ہو کر دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ شیر محمد خان نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔

دوسرے دن ہوش محمد شہادت کے نشے میں چور ہو کر بے جگری کے ساتھ انگریزوں سے لڑا۔ وہ اتنی بہادری سے لڑا کہ انگریز بھی اس کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔ کہتے ہیں کہ ہوش محمد فوج کے اُن آخری چند سپاہیوں میں تھا جو انگریز کا مقابلہ تعداد کی پروا کئے بغیر کر رہے تھے۔ ہوش محمد نے اسی میدان میں جامِ شہادت نوش کیا۔ اور مجاہدینِ آزادی کی صفِ اوّل میں شامل ہوگیا۔

حقیقت یہ ہے۔ کہ حیدر علی، ٹیپو سلطان اور ہوش محمد قنبرانی۔ ان مجاہدینِ آزادی میں سے ہیں جنہوں نے شمشیر بکف ہو کر جہاد کیا۔ اور تحریکِ آزادی کے لئے۔ اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دیا۔

باٹ

۱۸۵۷ء

انگریز استعمار کے خلاف جہاد

ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کو بغاوت اور غدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سر سید احمد خاں نے جب ۱۸۵۷ء کے واقعات قلمبند کئے تو انہوں نے بھی انہیں "اسباب بغاوتِ ہند" کا عنوان دیا۔ جبکہ اس کے برعکس یہ کوئی بغاوت نہ تھی نہ غدر۔ بلکہ یہ ہنگامہ آرائی کچھ فطری تقاضوں کا نتیجہ تھی۔

جب کسی آزاد اور حاکم قوم، فرد یا ذی حس کو قید کر لیا جائے یا اُس کے گھر پہ قبضہ جما لیا جائے تو اِس امر سے قطع نظر کہ انجام کیا ہوگا ——— دوبارہ آزادی کے لئے جدوجہد فطری ردِّ عمل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات اسی فطرتی ردِّ عمل کا نتیجہ تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس جد وجہد میں اور بہت سے عناصر شامل ہو گئے۔ انگریز نے اس کو بغاوت اور غدر کا نام دینا شروع کر دیا اور ہندو اور مسلمان مؤرخین نے بلا سوچے سمجھے گورے حاکموں اور اُن کے ہمنوا مؤرخوں کی تقلید میں یہی الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیئے۔

انگریز نے نہ صرف ایک آزاد قوم کو اپنی فریب کاریوں سے محکوم بنایا بلکہ ایسے طریقے بھی استعمال کئے کہ مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں اتنا پیچھے ڈال دیا کہ وہ دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ ہنٹر نے اس بات کا اعتراف واضح الفاظ میں یوں کیا ہے:

"ہم نے مسلمانوں اور اُن کے نمایاں لوگوں کو قوت کے بَل پر دبایا، اُنہیں اعلیٰ فوجی خدمات سے محروم کیا۔ کیونکہ ہم اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ہمارے اپنے تحفظ کے لئے مسلمانوں کا اخراج ضروری ہے۔ مسلمانوں کو اقتصادی اعتبار سے اس طرح تباہ کر دیا گیا کہ اُن کی سماجی اور ثقافتی زندگی بھی تباہ ہو کر رہ گئی۔"

بیشتر یورپی مؤرخین، سر جان لارنس کے اس خیال سے متفق نظر آتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات قطعی طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت کا نتیجہ تھے۔ اسی وجہ سے برصغیر ہند و پاک میں اُن عناصر کو بھی ہنگامہ کرنے کا موقع ملا جو برطانوی حکومت کے خلاف تھے۔ لیکن یہ بات کہتے ہوئے سر جان لارنس یا اُس کے مقلدین ان حقائق کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں جن کا تعلق ماضی میں انگریز کی کارروائیوں اور زیادتیوں اور ہندوستانیوں کے خلاف مختلف اقدامات سے ہے۔

انگریز نے ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کو وسعت دینے کے لئے جو اقدامات کئے اور جن ہتھکنڈوں سے کام لیا اُن کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف ہندوستان کے ہندوؤں اور بالخصوص مسلمانوں میں شدید نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ مسلمان کی طرف سے نفرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ حکومت اُس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ جبکہ ہندو کے لئے صرف اتنا فرق پڑا تھا کہ وہ ایک حاکم سے نکل کر دوسرے حاکم کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ انگریز کے خلاف مسلمان کی جدوجہد کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات اُس آتش فشاں کی مانند تھے۔ جس کا لاوا ۱۸۱۶ء سے اندر ہی اندر اُبل رہا تھا۔ مثلاً ۱۸۱۶ء میں بریلی، ۱۸۳۱ء اور ۱۸۳۲ء میں چھوٹا ناگپور اور پلاموں کے واقعات، بنگال میں فرائضی تحریک، میر نصیر، تیتومیر کے اقدامات، ۱۸۴۷ء میں بنگال میں دیدوید کی جدوجہد، ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۵ء تک موپلوں کی بغاوت اور ۱۸۵۵ء اور ۱۸۵۶ء میں سنتال کے واقعات۔!

اسباب

برطانوی سامراج کو ہندوستان میں وسعت دی جا رہی تھی اس مقصد کے لئے انگریز نے آنکھیں بند کر کے جو دل چاہا، سو کیا۔ اُس نے اپنے پنجے مضبوطی سے گاڑنے کے لئے سازشوں کا جال پھیلایا، ہر معاملے میں مداخلت کی اور اس طرح اُس نظام کار کو یکسر بدل ڈالا جو ہندوستان کے

لوگوں کے لئے مانوس تھا۔ سیاسی، اقتصادی، سماجی، مذہبی اور فوجی اعتبار سے ہندوستان کے لوگوں کی زندگی افراتفری کا شکار ہو گئی۔ لارڈ ڈلہوزی کی طرف سے مختلف ریاستوں کے فرمانرواؤں کو حق وراثت سے محروم، اور آخری تاجدار دلی بہادر شاہ ظفر کے ورثاء کو قلعہ سے مہرولی منتقل کرنے کے مجوزہ اقدام نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بیک وقت شکوک و شبہات میں مبتلا کر دیا یہی وجہ تھی کہ بہت سے ہندو اور مسلمان ریاستی حکمران کمپنی کی حکومت کے خلاف ہو چکے تھے مل جل کر انگریز کو شکست دینے پہ تلے ہوئے تھے۔ ان میں اودھ کے سابق حکمران کے ایک مشیر احمد اللہ، نانا صاحب اور نانا صاحب کا بھتیجا راؤ صاحب اور اس کے ساتھی تانتیا ٹوپی اور عظیم اللہ خاں، رانی جھانسی، کنور سنگھ اور بہادر شاہ کا رشتے دار فیروز شاہ نمایاں تھے۔

بہت سے بڑے زمینداروں کو ان کی اراضی اور متعدد ریاستی حکمرانوں کو ان کی حکومتوں سے محروم کرنے کے باعث لاتعداد لوگ بے روزگاری کا شکار ہو گئے تھے جس کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں میں حکومت کے خلاف بددلی اور بے اطمینانی پائی جاتی تھی۔ ۱۸۵۲ء میں لارڈ ڈلہوزی نے بمبئی میں زمینداروں کی اراضی اور جاگیروں کے سلسلے میں جو انعام کمیشن قائم کیا تھا، اس کی تحقیقات کے نتیجے میں دکن میں بیس ہزار جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ حکومت نے یہ تو سوچا کہ اس طرح اس کے خزانے میں بہت سی رقم اکٹھی ہو جائے گی لیکن اس بات پر ذرا بھی غور نہ کیا کہ ان اقدامات سے ملک کے اقتصادی حالات میں کتنی پیچیدگیاں پیدا ہوں گی۔ جن لوگوں کو اودھ کے حکمران کی طرف سے وظائف ملا کرتے تھے یا پنشن دی جاتی تھی، وہ بند کر دیئے گئے۔ ریاست کی فوج ختم کر دی گئی اور اس طرح ہزاروں پیشہ ور سپاہی بے روزگار ہو گئے۔

انگریزوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی تھی۔ مثلاً ہندوؤں کو یہ دکھ تھا کہ ستی کی رسم کیوں ممنوع قرار دی گئی، ہندو بیوہ عورتوں کو قانون کے ذریعے دوسری شادی کی اجازت بھی دے دی گئی اور لاتعداد ہندوؤں کو عیسائی بنا لیا گیا۔

انگریزوں نے ہندوستان میں رہنے والی قوموں کے بارے میں انتہائی توہین آمیز رویہ اختیار کیا۔ انگریز فوجی اور سول افسر کھلے بندوں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کا مذاق اڑاتے رہے۔ میکالے نے یہاں تک کہا کہ انگریزی کی ایک کتاب مشرق کی تمام کتابوں پہ بھاری ہے۔ اس نے اپنی ماں کو ایک خط میں لکھا کہ "میرا ایمان ہے کہ اگر ہندوستان میں ہماری تعلیمی

منصوبہ بندی کامیاب ہوگئی تو آئندہ ۳۰ سال میں کم از کم بنگال کے اندر کوئی شخص عیسائیت کے دائرے سے باہر نہ رہ سکے گا" انگریزوں نے ہندوستان میں جو تعلیمی نظام قائم کیا اُس کا مقصد سراسر یہ تھا کہ نئی نسل کے اندر عیسائی عقیدے کو راسخ کیا جائے۔ جابجا عیسائی مشنریاں قائم کردی گئیں اور انہوں نے لوگوں کو گمراہ کرکے عیسائی بنانا شروع کردیا۔ حالت یہ تھی کہ انگریز افسر تھے ہندوؤں مذہب کا مذاق اُڑاتے اور عیسائیت کی تبلیغ کرتے۔ بہت سے انگریزوں نے تو فوج میں صرف اس لئے ملازمت اختیار کرلی کہ وہ سپاہیوں کو ترقیوں کا لالچ دے کر عیسائی بنالیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب کے لئے غیر شائستہ حتیٰ کہ بیہودہ زبان استعمال کرتے۔ قدرتی طور پر اس کا شدید ردِ عمل ہوا انگریزوں کی طرف سے ستی کی رسم کو ختم کرنے اور ہندو بیواؤں کو دُوسری شادی کرنے کا حق دے کر ان کے دلوں میں یہ شبہ پیدا کردیا گیا کہ انگریز سماجی اصلاح کی آڑ لے کر اُنہیں عیسائیت کے دائرے میں شامل کرنے کی سازش کررہا ہے۔

اِن تمام باتوں کے ساتھ ساتھ فوج میں بھی بعض وجوہات کی بنا پر بددلی پیدا ہوئی۔ ہندوستانی سپاہیوں کو برما اور افغانستان کے خلاف جنگوں میں حصّہ لینے کے لئے دُور دراز علاقوں میں بھیج دیا جاتا۔ سپاہیوں کی اکثریت برہمنوں اور راجپوتوں پر مشتمل تھی۔ برہمنوں کا خیال یہ تھا کہ جب وہ اپنے وطن سے دُور سمندر پار جاتے ہیں تو اُن کی اُونچی ذات کا امتیاز قائم نہیں رہتا۔ ۱۸۵۶ء میں حکومت نے جنرل انلسٹمنٹ ایکٹ (GENERAL ENLISTMENT ACT) کا اطلاق کردیا۔ جس کے تحت حکومت فوج میں بھرتی ہونے والوں کو جہاں چاہے بھیج سکتی تھی۔ اس ایکٹ کی وجہ سے سپاہیوں میں مزید بے اطمینانی پیدا ہوگئی اور فوج میں تنظیم قائم نہ رہ سکی۔ جب ان سپاہیوں کو باہر جانے کے لئے کہا جاتا تو وہ انکار کردیتے یا زائد الاؤنس کا مطالبہ کرتے۔ حکومت قدرے پس وپیش کے بعد اُن کے مطالبات منظور کرلیتی لیکن اس بنا پر سپاہیوں میں اپنی اہمیّت کا خیال پیدا ہوجانے کے باعث فوجی نظم و ضبط میں خاصی کمی واقع ہوگئی۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اُنہوں نے افغانستان میں برطانیہ کو شکست سے بچایا اور سکھوں کو زیر کرکے پنجاب پر قبضہ کیا۔ علاوہ ازیں چین اور ایران میں زیادہ سے زیادہ انگریز سپاہیوں کی موجودگی کے باعث، ہندوستانی فوج میں انگریزوں کی تعداد تین کے مقابلے میں ایک رہ گئی ان میں بھی نصف انگریز سپاہی پنجاب میں تھے اور باقی

بنگال، بہار اور دوآب میں — جس وقت لارڈ ڈلہوزی ہندوستان سے واپس گیا تو ہندوستان میں انگریز سپاہیوں کی تعداد ۴۵،۳۲۲ ہزار اور ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد ۲،۳۳،۰۰۰ لاکھ تھی۔ لہٰذا قدرتی طور پر ہندوستان کی حفاظت صرف ہندوستانی سپاہی ہی کر سکتے تھے۔

کارتوسوں کے معاملے نے اس بددلی اور بے اطمینانی کو مزید ہوا دی۔ فوج میں ایک نئی قسم کی رائفل بھیجی گئی اس کے کارتوسوں پر کوئی چکنی چیز لگی ہوئی تھی۔ کارتوس کو استعمال کرتے وقت اس کے ایک سرے کو دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ فوجیوں میں یہ بات پھیل گئی کہ کارتوس پہ لگی ہوئی چکنی چیز گائے اور سؤر کی چربی سے تیار کی جاتی ہے۔ لہٰذا ہندو اور مسلمان سپاہیوں میں بیک وقت اس شبہ نے جنم لیا کہ انگریز جان بوجھ کر اُن کے عقیدے میں خلل ڈالنا چاہتا ہے۔ جنوری ۱۸۵۷ء میں یہ رائفل سپاہیوں کو دی گئی تھی — جنوری اور مارچ کے دوران کلکتہ کے قریب بہرام پور اور بارک پور کی چھاؤنیوں میں ہنگامہ شروع ہو گیا اُنہوں نے کلکتہ کے فورٹ ولیم پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ ۹ مئی کو میرٹھ میں اس بات پر ہنگامہ ہو گیا کہ سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا تھا۔ ان سارے سپاہیوں کا کورٹ مارشل کیا گیا، بعدازاں انہیں دس دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ دُوسرے روز ہی مختلف مقامات پر تین اور رجمنٹوں نے ایک جیل خانے کے دروازے کھول کر برطانوی افسروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا اور دِلی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ دِلّی میں مقامی فوجی دستے بھی ان کے ساتھ مِل گئے۔ اور اُنہوں نے مِل کر دلّی پر قبضہ کر لیا۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ ظفر کو شاہِ ہندوستان بنانے کا اعلان کر دیا گیا، کابینہ تشکیل کی گئی اور دستور العمل (آئین) تیار کر لیا گیا۔ بہادر شاہ کے صاحبزادے، مرزا مغل کو کمانڈر انچیف مقرر کر دیا گیا، کچھ شہزادے فوج کے کمانڈر مقرر ہوئے اس دوران اودھ، روہیلکھنڈ اور بجنور کے مسلمان سرداروں نے بہادر شاہ ظفر کی اطاعت قبول کر کے نذرانے بھیجے۔ بریلی کا بخت خاں چودہ ہزار سپاہی لے کر دلّی پہنچ گیا۔ اس طرح فوج کی کل تعداد ۱۹ ہزار ہو گئی لیکن مالی حالت اتنی خراب تھی کہ سپاہیوں کو تنخواہیں دینے کے لئے شاہی محل کی اشیاء نیلام کرنا پڑیں۔ انگریزوں نے کچھ شاہی مشیروں کو اپنے ساتھ ملا کر جاسوسی شروع کر دی۔ ان لوگوں نے مرزا مغل اور بخت خاں میں بھی کشیدگی پیدا کرائی۔ پٹیالہ اور جیند کے سکھ بھی بخت خاں کا ساتھ دے رہے تھے۔ آزاد فوجوں نے انگریز فوج کے خلاف بے جگری سے جنگ کی لیکن ۲۰ ستمبر کو شہر کی فصیل توڑ کر انگریز دلّی میں داخل ہو گئے۔ بہادر شاہ ظفر ہمایوں کے

مقبرے میں پناہ گزیں ہو گئے۔ بخت خاں فوج سے کر اودھ لوٹ گیا اور اُسے بھی نیپال کے پہاڑوں میں پناہ لینا پڑی۔ برطانوی فوج نے ہوڈسن کی کمان میں بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کیا اور اُن کے ساتھ انتہائی توہین آمیز سلوک کیا۔ پست ذہن ہوڈسن نے بہادر شاہ ظفر کی موجودگی میں اُن کے دو لڑکوں اور ایک پوتے کے سر قلم کرا دیئے بعدازاں بہادر شاہ پر غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ یہاں وہ ۱۸۶۲ء میں وفات پا گئے۔

اودھ میں ہندوستانی سپاہیوں سے مقابلے کے دوران ہنری لارنس ہلاک ہو گیا۔ وہاں حریت پسندوں کی قیادت مولوی احمد اللہ شاہ کر رہے تھے جو گذشتہ کئی ماہ سے انگریزوں کے خلاف فوجیوں میں خفیہ خطوط تقسیم کرنے میں مصروف تھے۔ بعدازاں انہیں گرفتار کر کے سزائے موت کا حکم سنایا گیا لیکن سزا ہونے سے پہلے ہی ہنگامہ ہوا اور وہ جیل سے بھاگ نکلے۔ بعد میں ایک ہندو سردار نے ان سے غداری کی اور گرفتار کرا دیا۔ انہیں جون ۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے گولی کا نشانہ بنا دیا۔ مولوی احمد اللہ کے بارے میں مَیَّے کا کہنا ہے:

> "اگر کوئی محبِ وطن جسے اُس کے وطن سے محروم کر کے ناجائز طریق پر تباہ کیا گیا ہو، آزادی کی خاطر جنگ کرتا ہے تو اس اعتبار سے مولوی احمد اللہ یقینی طور پر ایک سچا اور عظیم محبِ وطن تھا۔ مولوی احمد اللہ نے اپنی تلوار کو بلاوجہ قتل و غارت سے داغدار نہیں کیا۔"

نانا صاحب نے کانپور میں انگریز کے خلاف ۵ جون کو علمِ آزادی بلند کیا اور کانپور پر قبضہ کر کے انگریزوں کو نکال باہر کیا۔ بعدازاں نانا صاحب نے ۲۱۱ انگریز قیدیوں کو بی بی گڑھ میں قتل کر کے ایک کنوئیں میں ڈال دیا۔ جب انگریز دوبارہ کانپور میں داخل ہو گئے تو نانا صاحب اور تانتیا ٹوپی، اودھ اور گوالیار بھاگ گئے۔ تانتیا ٹوپی کو بعدازاں ہندو سردار مان سنگھ کی غداری کی وجہ سے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔

رانی جھانسی نے بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ برطانوی فوجوں کا زبردست مقابلہ کیا اور اور خود بھی اس جنگ میں ہلاک ہو گئیں۔ روہیلکھنڈ میں بھی خان بہادر خان نے برطانوی فوجی دستوں پر حملے کر دیئے۔ مرادآباد اور بجنور کے علاوہ سہارن پور اور مظفر نگر میں بھی علمِ آزادی بلند ہوا۔ علاوہ ازیں الہ آباد، بنگال، بہار اور سندھ میں بھی انگریزوں کے خلاف طاقت استعمال کی گئی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بارے میں میتھن نے اس رائے کا اظہار کیا کہ "انگریزوں

نے ہندوستانیوں اور بالخصوص بہادر شاہ کے ساتھ جو سلوک کیا۔ اُس سے زیادہ بہیمانہ اور کمینہ سلوک شاید ہی تاریخ میں ملتا ہو۔ یہ نہ صرف بہت بڑی غلطی تھی بلکہ ایک بہت بڑا جرم بھی تھا۔

ناکامی کے اسباب

۱۸۵۷ء میں انگریز کے خلاف جو جدوجہد کی گئی اس کی ناکامی کی بڑی وجہ حریت پسندوں کے پاس ناکارہ اسلحہ اور فوج میں نظم و ضبط کا فقدان تھا۔ جبکہ انگریزوں کے پاس بہتر قسم کا ساز و سامان موجود تھا انگریزوں نے ڈاک اور تار کے نئے نظام سے اُن دنوں میں پورا پورا فائدہ اٹھایا جبکہ حریت پسندوں کو اس سلسلے میں شدید دشواریاں پیش آ رہی تھیں۔ تیسری بات یہ تھی کہ انگریزوں کو رانی جھانسی، بیگم اودھ، حضرت محل اور کچھ دوسرے لوگوں کے سوا بہت سے ہندوستانیوں کو خرید لینے کے بعد فتح حاصل کرنے میں آسانی پیدا ہو گئی۔ انگریزوں کو گوالیار کے سر دینکر راؤ۔ حیدرآباد کے سر سالار جنگ، نیپال کے جنگ بہادر، مان سنگھ اور سکھوں کی حمایت بھی حاصل رہی۔

جنگ آزادی کی اہمیت

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی، جسے کچھ لوگ جنگِ آزادی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں، تاریخ ہند کا ایک اہم ترین باب ہے جس نے بعد ازاں تاریخ کا نیا رُخ متعین کیا۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی گرفت نہایت کمزور تھی اور انگریزوں نے اسی سے سبق حاصل کر کے آیندہ کے لئے ہندوستان میں برطانوی انتظام و انصرام کے لئے نئے خطوط کا تعین کیا۔ اسی بنا پر بعد میں ہندوستان کا کنٹرول ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ براہِ راست تاجدارِ برطانیہ کے ہاتھ میں چلا گیا اور ہندوستان پر تاجدارِ برطانیہ کی حکومت، ایک وائسرائے اور ۱۵ ارکین پر مشتمل ایک معاون کونسل کی وساطت سے قائم کی گئی۔ اس سلسلے میں ملکہ کے نام پر لارڈ کیننگ نے الہ آباد میں ایک دربار منعقد کیا اور یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ہندوستان، تاجدارِ برطانیہ کی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔ اس دربار میں ملکہ کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ حکومت پورا انصاف کرے گی، ہر مذہب اور نسل کے لوگوں کو سرکاری ملازمت دے گی، اور والیانِ ریاست کی عزت اور وقار کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ ایسے تمام لوگوں کو عام معافی دی جائے گی جو انگریزوں کے قتل میں ملوث نہ رہے ہوں یا آیندہ ملوث نہ ہوں۔

اس کے بعد انگریزوں نے فوج کی ازسرِ نو تنظیم کی۔ فوج میں انگریزوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شامل کیا گیا اور اعلیٰ فوجی عہدے صرف اُن کے لیے مخصوص کر دیئے گئے۔
— ہندوستانی ریاستوں کو تاجِ برطانیہ کی اطاعت قبول کرنے پہ مجبور کیا گیا۔

ان تمام باتوں کے باوجود انگریزوں نے ہندوستانیوں کو حقیر سمجھا۔ اور اُن سے جانوروں جیسا سلوک روا رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں کے خلاف نفرت پھیلتی رہی اور رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کو نیا عزم دے کر ایک نئی منزل کی طرف لے جاتی رہی یہی وہ منزل تھی جسے ہندوؤں اور مسلمانوں نے سنہ ۱۹۴۷ء میں آزادی کی صورت میں حاصل کیا۔

باب

مجاہدینِ آزادی

سرسیّد احمد خاں

۱۸۱۷ء ——— تا ——— ۱۸۹۸ء

سرسیّد احمد خاں ابھی ۲۱ سال کے تھے کہ اُن کے والد وفات پا گئے۔ ۲۲ سال کی عمر میں انہیں ایسٹ انڈیا کمپنی میں معمولی ملازمت مل گئی انہوں نے محنت سے کام کیا اور ترقی پا کر آگرہ آ گئے منصفی کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہیں مین پوری میں منصف مقرر کر دیا گیا۔ ۱۸۴۲ء میں ان کا تبادلہ فتح پور سیکری میں کر دیا گیا لیکن چار سال بعد تبدیل ہو کر پھر دلّی چلے گئے یہاں نو سال تک رہے۔ اس دوران انہوں نے اتنی کتابیں اور کتابچے لکھے کہ کل ہندوستان انہیں ایک ادیب اور مفکر کی حیثیت سے جاننے لگا۔ "تاریخ بجنور" اور "تاریخِ سرکشیٔ بجنور" اُن کی تصنیفات ہیں۔
سرسیّد کی اہم ترین تحریر "اسبابِ بغاوتِ ہند" کی صورت میں سامنے آئی جو سیاسیات پر اردو میں سب سے پہلی کتاب ہے اور جس میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے پر بحث کی گئی۔ ۱۸۵۵ء میں انہیں مزید ترقی دے کر "صدر امین" کے طور پر بجنور بھیج دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے دوران وہ بصد مشکل بجنور سے مراد آباد اور پھر میرٹھ پہنچے۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں جب وہ دلّی پہنچے تو اُن کے چچا اور رشتے کے ایک بھائی سکھوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے کیونکہ سکھ مسلمانوں کے برعکس انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ اُن کی والدہ اور خالاؤں کی حالت یہ تھی کہ وہ ایک اصطبل میں پناہ گزین تھیں اور کئی دن سے بھوکی اور پیاسی بھی! سرسیّد احمد ان سب کو میرٹھ لے آئے لیکن ان کی والدہ انسانوں کے انسانوں پر ظلم و ستم اور قتلِ عام سے ذہنی طور پر اتنی متاثر ہوئیں کہ کچھ عرصے بعد ہی

وفات پاگئیں۔

کچھ دنوں بعد سر سید احمد خاں کا تبادلہ صدر الصدر کی حیثیت سے مراد آباد ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب تمام عہدے ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھے اور مسلمانوں کو معاشی، اقتصادی و سیاسی اعتبار سے ختم کرنے کے لئے انگریزوں نے سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر علی الاعلان بند کر دیئے تھے۔ اخبارات میں سرکاری اسامیوں کے لئے جو اشتہارات دیئے جاتے تھے ان میں واضح طور پر ان اسامیوں کے لئے مسلمانوں کو نااہل قرار دے دیا جاتا۔ جن عہدوں پر مسلمان پہلے سے موجود تھے وہ بھی ان سے چھین کر ہندوؤں کی جھولی میں ڈال دیئے گئے

سر سید احمد خاں نے اُن حالات اور حقائق کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جن کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ دن دیکھنا پڑ رہا تھا انہوں نے اُن اقدامات پر بھی غور کیا جن کے ذریعے مسلمانوں کو اقتصادی خوشحالی، تعلیمی و سماجی حیثیت اور عزّ و وقار کے راستے پر گامزن کیا جا سکتا تھا اُن کے دل میں یہ تڑپ پیدا ہوئی کہ کسی طرح مسلمانوں کو ایک باعزت قوم کی حیثیت حاصل ہو جائے لہٰذا سید احمد خاں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی ترقی کی خاطر شب و روز کام شروع کر دیا۔ ۱۰ جولائی ۱۸۵۹ء کو انہوں نے پہلی بار عوام کے سامنے تقریر کی جس میں مسلمانوں کے مصائب و آلام پر روشنی ڈالی۔ اپنی تقریر کا اختتام مسلمانوں کے استحکام اور ترقی کی دُعا پر کیا۔

انہوں نے اپنی کتاب "اسباب بغاوت ہند" اس وقت لکھی جب ملک میں مارشل لاء نافذ تھا۔ نتائج کی پرواہ کئے بغیر اس رسالے میں نہایت جرأت کے ساتھ حالات پر تنقید کی گئی تھی۔ رسالے میں حکومت کی پالیسی پر بھی کڑی تنقید کی تھی۔ انہوں نے ہندوستانیوں کو سرکاری مشینری کی اُن کونسلوں میں شامل نہ کرنے کی بھی شدید مذمت کی جو ہر سطح پر پالیسیاں مرتب کرتی تھیں۔ انہوں نے یہ بات واضح کر دی کہ اگر حکومت نے ایسی کونسلوں میں ہندوستانیوں کو شامل نہ کیا تو حکومت کا استحکام خطرے میں پڑ جائے گا نیز ضابطوں اور قوانین کی تشکیل میں ہندوستانیوں کو جب تک شامل نہ کیا جائیگا حکومت یہ کیسے جان سکے گی کہ ہندوستانی کیا چاہتے ہیں اور کسی قانون یا ضابطے کے بارے میں ان کا ردِ عمل کیا ہے۔ انہوں نے کُھلے الفاظ میں کہا کہ حاکموں اور رعایا کے درمیان فی الوقت کوئی ربط موجود نہیں۔ سر سید احمد خاں کے اس رسالے کی اشاعت پر انگریزوں نے زبردست احتجاج کیا اور یہاں تک مطالبہ کیا کہ اس "توہین آمیز" رسالے کو ضبط کیا جائے نیز سر سید احمد خاں کو اس گستاخی کی سخت سزا دی جائے۔

ہندوستان میں جا بجا عیسائی مشنریاں کام کر رہی تھیں۔ جب ۱۸۶۰ء میں زبردست قحط پڑا تو ان مشنریوں نے لاتعداد مسلمان اور ہندو یتیم بچوں کو اپنی تحویل میں لے لیا ان کا مقصد رحم کرنا تھا' نہ انسانی ہمدردی؛ بلکہ مکروہ مقصد یہ تھا کہ ان بچوں کو مسلمان یا ہندو سے عیسائی بنا دیا جائے۔

سرسید احمد خاں نے خود چار یتیم بچوں کو لے کر پال لیا تھا جو بعد ازاں اُن سے چھین لئے گئے۔ سرسید نے مطالبہ کیا کہ ان یتیم بچوں کی پرورش ہندو یا مسلمان گھرانوں میں ہونی چاہیئے لیکن اقتدار کے نشے میں چُور انگریز نے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وائسرائے کی کونسل میں اسبابِ بغاوتِ ہند لکھنے پر سید احمد خاں کو سزا دینے کا مطالبہ تو پہلے ہی کیا جا چکا تھا لیکن یتیم بچوں کے بارے میں اُن کے طرزِ عمل نے انگریزوں کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ جہاں تک مسلمانوں اور ہندوؤں کو عیسائی بنانے کا تعلق تھا تو انگریزوں کی دیدہ دلیری کا اندازہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے چیئرمین میگنل کی پارلیمانی تقریر سے ہوتا ہے اس نے کہا:

> "خدا کے فضل و کرم سے انگلستان کی حکومت کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ پورے ہندوستان پر فتح کا پرچم لہرائے۔ یسوع مسیح کا پرچم آج ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لہرا رہا ہے لہٰذا ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہندوستان کے ایک ایک شخص کو عیسائی بنانے کے لئے پوری قوت صرف کر دیں۔"

۱۸۵۹ء میں جب سید احمد خاں مراد آباد تھے تو اُن کی شریکِ حیات انتقال کر گئیں۔ گو اس وقت سرسید کی عمر چالیس برس سے کچھ اُوپر تھی لیکن مسلمانوں کے لئے دن رات محنت نے اُن کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مسلمانوں کو بدلتے ہوئے دھاروں اور حالات کے نئے تقاضوں کا ساتھ دینا ہی پڑے گا اور اپنے منفی رویّہ کو ترک کرتے ہوئے جدید تعلیم حاصل کرنا پڑے گی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ جب تک مسلمان ایسا نہ کریں گے وہ ہندو کے مقابلے میں ایک مردہ قوم بن کر رہ جائیں گے۔ ۱۸۶۴ء میں جب اُن کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا تو انہوں نے سب سے پہلا نعرہ یہ لگایا "تعلیم، تعلیم اور تعلیم"! ایک بار انہوں نے معروف مصنف جی الانا سے کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی پسماندگی کو ختم کرنے کے لئے واحد علاج یہ ہے کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں۔ جب تک ہم جڑ کا علاج نہیں کریں گے درخت سرسبز نہیں ہو سکتا۔

۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ اردو کے فارسی رسم الخط کی جگہ ہندی میں

دیوناگری رسم الخط کو اپنایا جائے۔ اس کے بعد ہی سے لسانی تنازعہ زور پکڑ گیا۔ سر سید احمد خاں نے اردو کی پُرجوش حمایت شروع کر دی۔ اسی موقعہ پر انہوں نے اپنے ایک انگریز دوست شیکسپیئر کو واضح الفاظ میں کہا،

"مجھے یقین ہو چکا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ایک مقصد کے لئے کسی طور بھی مل جل کر کام نہیں کر سکتیں گو اس وقت ان دونوں میں کھلم کھلا عداوت نہیں، لیکن نام نہاد تعلیم یافتہ لوگوں کی وجہ سے مستقبل میں لاتعداد پیچیدگیاں پیدا ہونا لازمی ہیں۔"

ہندوؤں کے اس رویّہ پر ۱۹۔ اپریل ۱۸۷۰ء کو تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے نواب محسن الملک کو لکھا،

ہندوؤں کے لسانی مطالبے کی وجہ سے مسلم ہندو اتحاد ناممکن ہو گیا ہے۔ مسلمان ہندی کو اپنانے پر کبھی رضامند نہیں ہوگا اور اگر ہندوؤں کا یہ مطالبہ جاری رہا تو ایک دن ہندو اردو کو قطعی طور پر مسترد کر دے گا جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ایک دن ہندو اور مسلمان مکمل طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں گے۔"

۱۸۶۹ء میں سر سید احمد خاں انگلستان چلے گئے۔ آئندہ سال ہندوستان واپسی پر انہوں نے مسلمانوں کے لئے دن رات کام کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ اس رسالے کے ذریعے مسلمانوں کے اندر قبیح رسومات کے خلاف جہاد شروع کیا گیا تھا کچھ سر سید احمد خاں کا وہابی ہونا آڑے آیا اور کچھ نام نہاد مذہبی رہنماؤں اور مولویوں کو موقع ملا۔ انہوں نے سر سید پر کافر اور ملحد ہونے کا فتویٰ جاری کر دیا۔ ۱۸۷۸ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل اور تعلیمی کمیشن میں بطور رکن نامزدگی کے بعد ۱۸۸۴ء میں سر سید احمد خاں نے لدھیانہ میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"یاد رکھئے کہ مسلمان قوم جبھی قوم کہلانے کی مستحق ہے کہ تمام افراد متحد ہو کر اسلام کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لیں۔ جب تک وہ اپنے مذہب پر سختی سے عمل پیرا رہتے ہیں، ایک قوم ہیں۔ آپ کو اسلام کے لئے زندہ رہنا اور اسلام کے لئے مرنا ہے۔ جب تک ہم میں اسلامی عقائد راسخ نہیں ہو جاتے ہم قوم کہلانے کے مستحق قرار نہیں پاتے۔ کوئی کچھ بھی ہو، لیکن اگر وہ مسلمان نہیں تو ہمیں ان سے کیا؟ وہ ہماری قوم کا فرد تو نہیں ہے۔ لہٰذا یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ ہمارا

قوم کی فلاح اسلام کا پرچم بلند رکھنے ہی میں ہے۔"

۱۸۸۳ء میں سرسید احمد خاں نے لیجسلیٹو کونسل میں پُرجوش تقریر کرتے ہوئے کہا:

"اکثریت اور اقلیت کی بنیادوں پر انتخابات تو اسی ملک میں ممکن ہو سکتے ہیں جہاں ایک نسل کے ہم عقیدہ لوگ بستے ہوں۔ لیکن ہندوستان کی طرح جس ملک میں مختلف نسلیں آباد ہوں، جہاں مذہبی تخصیص عروج پر ہو، جہاں ذات پات کا امتیاز موجود ہو، جہاں جدید طرزِ تعلیم، آبادی کے مختلف طبقوں میں یکساں تناسب کا حامل نہ ہو، میں پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ لوکل بورڈوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں میں مختلف مفادات کے نمائندوں کی انتخاب کے اصولوں پر نمائندگی کا صرف یہی نتیجہ برآمد ہوگا کہ لاتعداد برائیاں اور بدعنوانیاں پیدا ہو جائیں گی جب تک ہندوستان کی سماجی اور سیاسی زندگی میں نسلی اختلاف اور ذات پات کے امتیاز کی اہمیت موجود ہے، انتخابات کا یہ عام اور سادہ طریق کار کسی طور بھی محفوظ انداز میں اپنایا نہیں جا سکتا۔"

اب سرسید احمد خاں نے اپنی تمام کوشش اس بات پر صرف کر دی کہ کس طرح مسلمانوں کو سیاسی طور پر منظم کر دیا جائے۔ جب ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی تنظیم ہوئی جو اس وقت ملک میں اپنی نوعیت کی واحد سیاسی جماعت تھی، تو کچھ مسلمانوں نے بھی اس کی رکنیت اختیار کر لی سرسید نے اسے مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی تصور کیا انہوں نے ایک تقریر میں کہا:

"ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ہندو اور بنگالی بھائی ہماری قوم کو کسی نہ کسی انداز میں نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہم یہ کیسے سوچ سکتے ہیں کہ ان کے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کئے رکھیں۔ ہمیں اپنے اس فرض کی ادائیگی میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہمیں اپنی قوم کو ہندوؤں اور بنگالیوں کی معاندانہ سرگرمیوں سے ہر قیمت پر بچانا ہے۔ کانگریس کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ وہ پورے ہندوستان کی نمائندہ سیاسی جماعت ہے ہم اسے 'قومی کانگریس' ماننے کے لئے تیار نہیں یہ تو جبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ کانگریس میں تمام قوموں کے مقاصد واضح طور پر شامل ہوں۔ جب کانگریسی رہنما اس بات کو خود تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے کچھ مقاصد نہ صرف مختلف ہیں بلکہ متضاد بھی ـــــ تو پھر کیا وجہ ہے

کہ ہم مسلمان ایک علیحدہ کانگریس کی تشکیل علیحدہ مقاصد کے لئے نہ کریں؛ لہٰذا ہمارے کانگریسی دوستوں کو خود ہی یہ فیصلہ اپنا نداری کے ساتھ کر لینا چاہئے کہ کیا ایسی اقوام جن کے مقاصد ایک دوسرے سے متحارب و متصادم ہوں، خواہ چند عام سی باتوں پر ان میں اتفاق بھی موجود ہو، ایک قومی کانگریس تشکیل کر سکتی ہیں؟ میری اس بات کو درست سمجھا جائے یا غلط، لیکن یہ کھلی حقیقت ہے کہ کوئی مسلمان خواہ وہ ایک معزز شخص ہو یا ایک پارچہ باف، وہ یہ بات کبھی پسند نہ کرے گا کہ اس کی ہمسایہ قوم اسے غلام بنا لے۔ اُسے اس بات کی بھی پروا نہیں ہوگی کہ وہ کمزور ہے یا اس کی حیثیت گر چکی ہے۔ وہ بہرحال آزادی کو ترجیح دے گا۔"

سرسید احمد خاں نے ۱۸۹۳ء میں اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان انڈین نیشنل کانگریس کے ذریعے کبھی سیاسی سلامتی حاصل نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کانگریس کو صاف طور پر بتا دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو سکھ، مدراسی اور مرہٹہ نہ سمجھیں ورنہ برہمن کے لئے یہ ایک خطرناک شگون ہوگا۔ کانگریس اگر یہ سمجھتی ہے کہ یہ مسلمان زبان، طرزِ زندگی، رسومات وغیرہ کے اعتبار سے وہی ہیں جو ہندو یا سکھ، مدراسی اور مرہٹہ — تو یہ اس کی بھول ہے کانگریس کے لئے مسلمانوں کی تاریخی روایات کو سمجھنا ضروری ہے۔ اسے یہ اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ ہندوستان میں دو بڑی قومیں آباد ہیں ان میں ایک ہندو اور دوسری مسلمان! آپ نے کہا،

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر کل انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو ہندوستان کا حاکم کون ہوگا؟ کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ مساوی اختیارات کے تحت ہندو اور مسلمان ایک ہی تختِ حکومت پر ساتھ ساتھ بیٹھ کر حکومت کریں گے؟ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ ضروری ہو جائے گا کہ ہندو یا مسلمان دونوں میں کوئی ایک، دوسرے پر غلبہ حاصل کرے۔"

۲۶ دسمبر ۱۸۷۰ء کو سرسید احمد خاں نے بنارس میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے

SOCIETY FOR EDUCATIONAL PROGRESS OF THE INDIAN MUSLIMS

کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی۔ بعد ازاں اسی انجمن نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج قائم کیا۔ سرکاری انتظامیہ نے اس سلسلے میں بہت سی رکاوٹیں پیدا کیں اور بڑی مشکل کے بعد اس کالج کے لئے زمین کا چھوٹا سا ٹکڑا حاصل کیا جا سکا۔ اس کالج نے جون ۱۸۷۵ء میں کام شروع

کر دیا۔ ایک سال بعد جب سر سید احمد خاں ریٹائر ہو گئے تو ... ترقی کے لئے صرف کرنا شروع کر دیا اور مستقل طور پر علی گڑھ ہی میں رہائش اختیار کر لی۔ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لٹن نے کالج کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا۔ برِ صغیر ہند و پاک میں مسلمانوں کے لئے یہ پہلا کالج تھا۔ اس کے قیام کے بعد مسلمانوں میں جدید تعلیم کا شوق پیدا ہوا۔ آخر کار سر سید احمد خاں نے ۱۸۸۶ء میں علی گڑھ کی آواز گھر گھر پہنچانے کے لئے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔

۱۸۹۳ء میں انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی تحفظ کی خاطر محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی۔

سر سید احمد خاں میں اتنی جرأت تھی کہ نہ صرف انہوں نے "اسباب بغاوت ہند" اس دور میں لکھا جب ملک میں مارشل لاء نافذ تھا بلکہ وہ آگرہ دربار سے بطور احتجاج اس وقت واک آؤٹ بھی کر گئے جب انہوں نے دربار میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے انگریزوں کے مقابلے میں نشستوں کا توہین آمیز اہتمام دیکھا۔

(سر سید احمد خاں ۲۴۔ مارچ ۱۸۹۸ء کو بیمار ہوئے، ۲۷۔ مارچ کو ان کی حالت بگڑ گئی اور اسی رات تحریکِ آزادی کے یہ عظیم مجاہد مالکِ حقیقی سے جا ملے۔)

نواب محسن الملک

۱۸۳۷ء تا ۱۹۰۷ء

نواب محسن الملک (سید مہدی علی) ۹۔ دسمبر ۱۸۳۷ء کو اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت نہایت اچھے ماحول میں ہوئی۔ لیکن وہ اپنی اس خواہش کے باوجود کہ زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں، مالی حالات کی خرابی کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔ حالات کا تقاضا یہی تھا کہ ملازمت اختیار کر لیں۔ ابتدا میں انہیں صرف پانچ روپے ماہانہ پر ملازمت ملی۔ ان دنوں سرکاری ملازمت کی ابتدا میں یہی تنخواہ ہوا کرتی تھی۔ کئی سال کے تجربہ کے بعد یہ مشاہرہ دس روپے کر دیا جاتا تھا۔ محسن الملک ایک انتھک، دیانت دار اور محنتی شخص تھے۔ وہ دفتری اوقات کے بعد بھی اکثر کام کرتے رہتے۔ ان کی محنت سے متاثر ہو کر کلکٹر نے تنخواہ بڑھا دی۔ کچھ عرصہ بعد انگریز کلکٹر نے ان کے کام سے خوش ہو کر انہیں "سر شتہ دار" کے عہدہ پر ترقی دے دی۔ ۲۴ سال کی

[illegible] کو اونچا سرکاری عہدہ شمار کیا جاتا تھا۔ اسی دوران
[illegible] سول سروس کے امتحان کی تیاری کرتے رہے۔ ۱۸۶۷ء میں انہوں نے اس امتحان
[illegible] حاصل کی اور انہیں مرزاپور کا ڈپٹی کلکٹر بنا دیا گیا۔ انہیں ۳۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ
[illegible] سال بعد جب قحط پڑا تو انہوں نے سرسید احمد خاں کی طرح قحط زدگان اور یتیم بچوں کی
[illegible] خدمات سرانجام دیں۔ اپنے اعلیٰ عہدے کی وجہ سے نواب محسن الملک غائبانہ طور پر
[illegible] خاں سے متعارف ہو چکے تھے۔ سرسید احمد خاں نے حیدرآباد دکن کے نواب
[illegible] جنگ سے محسن الملک کی سفارش کی۔ اس پر نواب سالار جنگ نے سرسید احمد خاں کو
[illegible] ایک شخص بیک وقت دو ملازمتیں کیسے کر سکے گا؟ یوں وہ دو حکومتوں کا وفادار بھی نہیں
رہ سکتا۔ لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ محسن الملک برطانوی ملازمت سے استعفیٰ دے کر ہماری ملازمت میں
چلے آئیں۔ ۱۸۷۴ء میں محسن الملک نے استعفیٰ دے دیا اور نظام کی ملازمت میں چلے گئے،
جہاں انہوں نے ۱۲ سال تک خدمات سرانجام دیں۔ اسی ملازمت کے دوران انہیں منیر نواز جنگ
اور نواب محسن الدولہ، محسن الملک کے خطابات سے نوازا گیا۔ ۱۸۸۸ء میں انہوں نے ریاستی
امور کے سلسلہ میں انگلستان کا دورہ کیا جہاں انہوں نے جدید طرزِ تعلیم کا جائزہ بنظرِ غائر لیا اور یہ
فیصلہ کر لیا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیم کے ذریعے باعزت مقام دلائیں گے۔ ۱۸۹۳ء میں
وہ ریاست حیدرآباد کی ملازمت سے ریٹائر ہو گئے اور علی گڑھ کی درس گاہ کی خدمت کر کے
سرسید احمد کے مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر مستقل طور پر علی گڑھ میں قیام کر لیا۔

پانچ سال بعد سرسید احمد خاں وفات پا گئے۔ ان کے صاحبزادے سید محمود نے
محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا انتظام و انصرام سنبھالا۔ نواب محسن الملک نے ان کی بھرپور اعانت
کی۔ سرسید کے بعد انہیں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سیکرٹری چن لیا گیا۔ چنانچہ محسن الملک ہندوستان
کے طوفانی دوروں پر نکل گئے۔ یہ انہی کی مساعی تھیں کہ یہ کانفرنس تعلیم کے میدان میں ہندوستان
کے مسلمانوں کی ترجمان بن گئی۔ ۱۸۹۹ء میں جب کانفرنس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا تو
یہ فیصلہ کیا گیا کہ ملک بھر کے تمام بڑے شہروں میں مسلمان مدارس قائم کئے جائیں۔ اس فیصلے کے
نتیجہ میں بہت سے سکول کھول دیئے گئے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مختلف صوبوں میں اردو اور ہندی کے مسئلہ پر شدید بحث کا
آغاز ہو گیا۔ اس جھگڑے میں بہت سے متعصب انگریزوں نے بھی اردو کے خلاف اور ہندی

کے حق میں بات کرنا شروع کر دی۔ اس موقع پر نواب محسن الملک نتائج و عواقب کی پرواہ کئے بغیر اردو کے حق میں میدانِ عمل میں اُتر آئے۔ ۱۸۔ اگست ۱۹۰۰ء میں اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام لکھنؤ میں کانفرنس کا انعقاد ہُوا۔ محسن الملک نے اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"ہم یہ مانتے ہیں کہ ناخواندگی کی وجہ سے ہمارے قلم میں طاقت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ سرکاری دفاتر میں کہیں کہیں نظر آتے ہیں لیکن ہمارے پاس تلوار کی طاقت موجود ہے اور ہمارے دلوں میں ملکہ کے لئے محبت بھی موجود ہے..... ہم ایک منٹ کے لئے بھی یہ تصور کرنا پسند نہیں کرتے کہ حکومت ہمیں نظرانداز کر دے اور ہمارے لئے ایسے حالات پیدا کر دے کہ ہماری زندگی حزن و ملال سے دوچار ہو جائے۔ مجھے امید نہیں کہ حکومت ہماری زبان کو مرنے کی اجازت دے گی۔ میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری زبان کبھی نہیں مر سکتی۔ اگر کسی نے ہمارے لئے ایسی لسانی مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کی تو مستقبل میں اس کے نتائج خوشگوار نہ ہوں گے۔ یہی وہ خوف ہے جس کے باعث ہم نے اپنی زبان کو زندہ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور اگر خدانخواستہ ہمیں ایسا کرنے میں ناکامی ہوئی تو ہم اُردو کا جنازہ خاموشی کے ساتھ اٹھا کر نہیں لے جائیں گے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ جب کسی قوم پر غم کا کوئی پہاڑ ٹوٹتا ہو تو اس قوم کے افراد کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے کسی کوشش کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

علی گڑھ کالج کے حالات دن بدن خراب ہو رہے تھے۔ طلبا کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس نازک موقع پر محسن الملک سے درخواست کی گئی کہ وہ کالج کے سیکریٹری کا عہدہ سنبھال لیں۔ کالج کے ایک ہندو اکاؤنٹنٹ نے کالج کے فنڈ میں غبن کر کے مالی حالت کو شدید صدمہ پہنچایا تھا۔ محسن الملک نے یہ اعزازی عہدہ قبول تو کر لیا لیکن اب ان پر بھاری ذمہ داریاں آن پڑی تھیں۔ انہوں نے پورے ہندوستان کا طوفانی دورہ کیا اور علی گڑھ کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس کام میں انہیں قدم قدم پر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد انہوں نے ان علماء اور

اور مولویوں کو قابو کرنا شروع کیا جنہوں نے سرسید احمد خاں پر کفر اور الحاد کے فتوے صادر کر کے علی گڑھ کے مدرسہ کو ایک لادینی درس گاہ قرار دیا تھا۔ محسن الملک نے چوٹی کے علماء کو علی گڑھ مدعو کیا اور انہیں کالج کے طرزِ تعلیم کا مشاہدہ بہ نفسِ نفیس کرنے کی دعوت دی۔ ان کے اس اقدام سے

علماء کی حمایت محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے وقف ہو کر رہ گئی۔ تنگ نظری کی جگہ ورسن گاہ کی حمایت نے حاصل کر لئے۔ محسن الملک نے پرنس آف ویلز (بعد ازاں کنگ جارج پنجم) کو ۱۹۰۶ء میں ان کے دورۂ ہندوستان کے وقت علی گڑھ مدعو کیا۔ پرنس آف ویلز کی آمد سے تین دن پہلے پرنس آغا خان علی گڑھ پہنچ گئے تھے تاکہ تمام انتظامات بطریقِ احسن کئے جا سکیں۔ اس کے بعد پرنس آف ویلز کے نام پر ایک سائنس سکول بھی قائم کر دیا گیا۔ اس سکول کی عمارت کے لئے بمبئی کے سر آدم جی پیر بھائی نے ایک لاکھ روپے اور ہز ہائی نس آغا خاں اور راجہ محمود آباد نے ۵۰ ہزار روپے دیئے۔ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء کو امیر حبیب اللہ خاں شاہ افغانستان نے علی گڑھ کالج کا معائنہ کیا۔ اس موقع پر حکیم اجمل خاں اور مولانا حالی بھی موجود تھے۔ نجی گفتگو کے دوران شاہ افغانستان نے نواب محسن الملک کو بتایا کہ انہوں نے کالج کے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔ اس میں کچھ اچھی اور کچھ بری باتیں شامل ہیں۔ لیکن حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ سچ اور جھوٹ کے درمیان صرف چار انگلیوں کا فاصلہ ہے۔ یعنی وہ فاصلہ جو کانوں اور آنکھوں کے درمیان ہے۔ میں نے صرف سنا ہے اور اب میں آنکھوں سے دیکھوں گا۔ اس کے بعد شاہ افغانستان نے کالج، لائبریری اور ہوسٹل کا معائنہ کیا۔ انہوں نے طلبہ سے بہت سے مشکل سوالات پوچھے جو اسلامیات سے متعلق تھے۔ لڑکوں کے جواب سن کر شاہ کو سخت حیرت ہوئی۔ اپنے دورے کے اختتام پر شاہ افغانستان نے بلاجھجک اس خیال کا اظہار کیا کہ انہوں نے جو کچھ سنا تھا وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو انہوں نے دیکھا علی گڑھ کے بارے میں انہیں جو کچھ بتایا گیا تھا وہ جھوٹ اور صرف جھوٹ تھا۔

کالج کے لئے روپے کی فراہمی کی غرض سے محسن الملک رنگون بھی گئے۔ انہوں نے وہاں رہنے والے ہندوستانی مسلمانوں سے اپیل کی۔ تقریباً ایک ماہ قیام کے دوران رنگون کے مسلمان اور دولت مند تاجروں سے انہوں نے بھاری رقم اکٹھی کر لی۔

جس سال سرسید احمد خاں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں مسلمانوں سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ انڈین نیشنل کانگریس میں شریک نہ ہوں، اسی سال کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت جسٹس بدرالدین طیب جی نے کی تھی۔ طیب جی نے سرسید کی اپیل کو نہ صرف کانگریس کے رکن مسلمانوں بلکہ اپنی توہین بھی قرار دیا۔ اُس دن کے بعد سے طیب جی نے علی گڑھ پر کڑوی کسیلی تنقید کی مہم چلا دی تھی۔ سرسید کی وفات کے بعد محسن الملک بمبئی گئے اور جسٹس طیب جی سے اس معاملے پر طویل بات چیت کی۔ وہ کامیاب رہے اور طیب جی کو ہم نوا بنا لیا۔ نتیجہ

پہ نکلا کہ ۱۹۰۲ء میں طیب جی نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی۔ اس موقعہ پہ انہوں نے کہا کہ بمبئی میں یقینی طور پہ اور پورے ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا مسلمان ہو جو علی گڑھ کے استحکام اور کامیابی کا خواہاں نہ ہو۔

سر اینتھونی میکڈانل، جو صوبہ ہائے متحدہ کا گورنر، ہندی کا طرف دار اور اردو کا بدنام ترین اور بدترین مخالف تھا۔ اپنے دور میں اردو کے خلاف بھرپور مہم چلا رہا تھا۔ اس نے سرکاری طور پہ ۱۸۔ اپریل ۱۹۰۰ء کو یہ حکم جاری کیا کہ صوبہ میں اردو کو جو حیثیت حاصل ہے اسے ختم کر دیا جائے۔ ہندو یہ خبریں سن کر بغلیں بجا رہے تھے۔ اسی لئے ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کے اعتماد کو مزید صدمہ پہنچا۔ محسن الملک نے فوری طور پہ اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی تاکہ اردو کو تباہ ہونے سے بچایا جا سکے۔ ۱۳۔ مئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ میں نواب آف چھتاری کی زیر صدارت پہلا احتجاجی اجلاس ہوا۔ متعصب اور کمینہ صفت گورنر نے اسے بھی اپنی توہین سمجھا اور چھوٹے ہتھکنڈوں کے ذریعے مسلمان رہنماؤں پہ دباؤ ڈالا کہ وہ ایسوسی ایشن سے علیحدگی اختیار کر لیں۔ کچھ مسلمان تو گورنر کے دباؤ میں آ گئے۔ لیکن نواب محسن الملک جیسے جرأت مند مسلمان رہنما اُردو کی حمایت میں اور زیادہ سرگرم عمل ہو گئے۔ احتجاجی جلسوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہا آخر کار گورنر نے علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں کا فوری اجلاس طلب کیا۔ اس نے خطاب کرتے ہوئے دھمکی دی کہ اگر احتجاجی جلسوں کا سلسلہ فوراً ختم نہ کیا گیا تو مسلمان رہنما سنگین نتائج کے لئے تیار ہو جائیں۔ کالج کے لئے سرکاری مالی امداد بھی بند کر دی جائے گی۔ اس کے بعد بھی گورنر نے بہت سے اوچھے ہتھیار استعمال کئے۔ محسن الملک سے ملاقات سے انکار کر دیا اور یہ کہلا بھیجا کہ وہ جو بات مل کر کرنا چاہتے ہیں، لکھ کر بھیج دیں۔ انگریز گورنر نے خط و کتابت میں اس حد تک پست ذہنیت کا مظاہرہ کیا کہ خط کا آغاز ان کے خطابات کی بجائے "مولوی مہدی علی" سے کیا۔ ان حالات میں محسن الملک نے یہی مناسب خیال کیا کہ وہ اس گورنر کے تبدیل ہو جانے تک خاموش رہیں۔ اس کے بعد انہوں نے انجمن ترقی اُردو کی بنیاد ڈالی اور نہایت ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے سر تھامس آرنلڈ کو انجمن کا پہلا چیئرمین چن لیا۔

مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب

۱۹۰۶ء میں سیاسی شعور رکھنے والا ہر رہنما یہ جانتا تھا کہ انڈین لیجسلیٹو کونسلوں کے انتخابات

مخلوط صورت میں ہوں گے۔ محسن الملک نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہا اور یہ کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح وائسرائے کو مسلمانوں کے لئے لوکل باڈیوں اور کونسلوں میں جداگانہ نشستوں پہ آمادہ کیا جائے۔ اس سے پہلے مسلمانوں کے لئے علیحدہ نشستیں مخصوص نہ تھیں۔ انہیں عام حلقہ ہائے انتخابات میں ہی مقابلہ کرنا ہوتا تھا جہاں ہندوؤں کا غلبہ تھا جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ہر صوبہ میں اور مجموعی طور پر پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو تعداد کے اعتبار سے نمائندگی نہ ملتی اور ان میں بھی اکثر ہندوؤں کے دباؤ اور اثر و رسوخ میں آجاتے لہذا محسن الملک نے وائسرائے کے پرائیویٹ سیکریٹری کے ساتھ علی گڑھ کالج کے پرنسپل آرچی بولڈ کی وساطت سے اس مسئلے پر خط و کتابت شروع کر دی۔ وائسرائے نے مسلمانوں کے ایک وفد سے شملہ میں ملاقات کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ مسلمانوں نے جداگانہ انتخابات کے مطالبات کے سلسلہ میں ایک یادداشت تیار کی جسے ۱۶ ستمبر ۱۹۰۶ء کو مسلم رہنماؤں نے لکھنؤ کے ایک اجلاس میں سر عبدالرحیم کی زیرِ صدارت قرارداد کی صورت میں منظور کیا۔ سر آغا خاں کی قیادت میں ۳۶ مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد تشکیل کیا گیا۔ یہی وفد بعد ازاں شملہ وفد (SIMLA DEPUTATION) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس وفد کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور پھر مارلے منٹو اصلاحات کے ذریعے مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کا اصول منظور کیا گیا۔

اب مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ سیاسی تنظیم کا وقت نزدیک آگیا تھا۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو اس موقع پر جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہو رہا تھا۔ مسلمان رہنماؤں کا ایک خاص اجلاس منعقد کیا گیا اور نئی سیاسی جماعت کے قیام کی تجویز منظور کر لی گئی پھر محسن الملک اور وقار الملک سے نئی مسلمان سیاسی جماعت کا مسودہ آئین تیار کرنے کی درخواست کی گئی۔ ہز ہائی نس آغا خاں کو اس کا مستقل صدر منتخب کر لیا گیا۔

مسلم لیگ کا قیام

پھر اس جماعت کا قیام عمل میں آیا جسے مسلم لیگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جو ہندوستان کے مجبور اور بے بس مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور حصولِ پاکستان کی بنیاد بنی۔

۱۹۰۶ء میں نواب محسن الملک کی صحت خاصی گر چکی تھی۔ وہ علاج کے لئے انگلستان بھی گئے لیکن صحت یاب نہ ہو سکے۔ ستمبر ۱۹۰۶ء میں وہ اس غرض سے شملہ چلے گئے کہ ان دنوں ہندوستان کے لئے

نیا آئین زیر غور اور زیر بحث تھا۔ اسی آئین پر ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کا انحصار تھا۔ لہذا یہ ضروری تھا کہ اس موقع پر ایک ایک لمحہ پر کڑی نظر رکھی جاتی۔ وہاں نواب محسن الملک نے اعلیٰ افسروں اور وائسرائے کو ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نظر سمجھانے کے لئے انتھک کام کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انہی دنوں کی محنت شاقہ کے باعث ان کی صحت مزید گر گئی۔ اوائل اکتوبر میں وہ صاحبِ فراش ہو گئے۔ آخر تحریک آزادی کا یہ انتھک مجاہد ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو ۹ بجے شام معبودِ حقیقی سے جا ملا۔ وہ مجاہد جس نے اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک مسلمانوں کی بہبود کے لئے کام کیا اور ان کے لئے ایک علیحدہ آزاد وطن کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ان کی خواہش تھی کہ انہیں اٹاوا کے آبائی قبرستان میں دفن کیا جائے مگر ان کے لاکھوں مداحوں کے اصرار پر انہیں علی گڑھ میں سپردِ خاک کیا گیا۔

جمال الدین افغانیؒ

۱۸۳۸ء تا ۱۸۹۷ء

یہ انیسویں صدی کے اس دور کی بات ہے جب یورپی ممالک مسلمانوں کے خلاف اپنے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے تھے۔ وہ اسلامی ممالک پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے طاقت کے علاوہ دیگر طریقے بھی استعمال کر رہے تھے۔ انہوں نے افغانستان، ایران، ہندوستان، مصر وغیرہ کو سیاسی اور معاشی اعتبار سے اپنا غلام بنایا ہوا تھا۔ ترکی بھی اپنے بہت سے علاقوں سے محروم ہو چکا تھا۔ دراصل مغرب کے سیاست دانوں نے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات پیدا کر دی تھی کہ قوموں کا وجود وطن سے ہوتا ہے لہذا مسلمان اسلامی وحدت سے ہٹ کر وطن کی بنا پر قومیت کا تصور لے کر چل رہے تھے، اسی لئے ان کا شیرازہ بکھرتا جا رہا تھا۔ مغربی طاقتیں چاہتی بھی یہی تھیں۔ انہیں مسلمان ممالک کو اپنی غلامی میں لینے کے مواقع حاصل ہو گئے اور مسلمان وطن پرستی کے جذبے کے تحت اصل مرکز سے ہٹ کر ایک دوسرے کی مدد کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے دور دور رہے۔ اس دور میں افغانستان میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا جس نے مسلمانوں کے عالمی اتحاد کی خاطر پوری زندگی مشکلات اور مصائب میں گزار دی۔ مغربی طاقتیں اسے اپنا بدترین دشمن سمجھنے لگیں لیکن اس کے باوجود اسی شخص نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کی اور بہت سے اسلامی ممالک میں ایسی تحریکوں کی بنا ڈال دی جو بعد میں آزادی پر منتج ہوئیں۔

یہ شخصیت جمال الدین افغانی کی تھی۔ آپ ۱۸۳۸ء میں جلال آباد کے قریب کونڑ نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ نسباً سید حسینی تھے۔ آپ کے والد سید صفدر مشہور عالم اور عوام میں بے حد مقبول تھے۔ امیر افغانستان دوست محمد خاں ان کی مقبولیت سے خائف تھا۔ اسی بنا پر انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ اس وقت جمال الدین افغانی کی عمر صرف ۸ سال تھی۔ کابل میں انہوں نے فلسفہ، ریاضی، تاریخ، نجوم اور علوم شرعی کی تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے والد وفات پا گئے۔ جب امیر محمد اعظم خاں تخت نشین ہوا تو اس نے افغانی کو اپنا مشیر خاص مقرر کر لیا۔ مگر کچھ عرصے بعد شیر علی خاں نے تخت پر قبضہ کر لیا۔

ان حالات میں افغانی نے نئے فرمانروا سے حجاز جانے کی اجازت طلب کی لیکن افغانستان میں ایران کے سفیر نے حکومت پر دباؤ ڈالا کہ افغانی کو ایران جانے یا ایران کے راستے سے گزرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اسی شرط پر افغانی کو جانے کی اجازت بھی ملی۔ وہ ہندوستان کے راستے حجاز پہنچے۔ انگریزوں نے ہندوستان میں ان کے قیام کے دوران ان کی انقلابی سرگرمیوں کے پیش نظر ہندوستانی مسلمانوں یا رہنماؤں سے تنہائی میں ملاقات کی اجازت نہ دی اور اگر کبھی اجازت مل جاتی تو ان پر ہندوستانی خفیہ تنظیم کی کڑی نظر رہتی۔ کچھ عرصے بعد انہیں مصر جانے والے ایک سرکاری بحری جہاز میں سفر کرنے کی اجازت مل گئی۔ قاہرہ پہنچتے ہی انہوں نے مسلمان علماً سے رابطہ قائم کیا اور عالم اسلامی کے بحران پر تبادلۂ خیال شروع کر دیا۔ قاہرہ سے وہ حجاز چلے آئے وہاں بھی انہوں نے اسی قسم کی سرگرمیاں جاری رکھیں اور مسلمان رہنماؤں کو سمجھایا کہ وہ مغربی سامراجیت کے پنجے سے عالم اسلام کو نجات دلانے کے لئے تدابیر کریں۔ وہاں سے وہ ترکی پہنچ گئے جہاں انہیں وزیر اعظم ترکی علی پاشا نے خوش آمدید کہا۔ چھ مہینے قیام کے دوران انہوں نے اسلامی اتحاد کے سلسلے میں متعدد رہنماؤں سے مسلسل تبادلۂ خیال کیا لیکن نئی نسل کے دانشوروں میں بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باعث بہت سے ترکی علماء ان کے خلاف ہو گئے۔ ان علماء نے ایک متحدہ محاذ بنا کر افغانی کو ترکی سے نکلوانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ انہوں نے افغانی پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا۔ ترکی کے اخباروں نے علماء کا ساتھ دیا۔ آخر کار افغانی کو ترکی سے فوری طور پر نکل جانے کا حکم مل گیا۔ وہ ۱۲۔ مارچ ۱۸۷۱ء کو قاہرہ پہنچ گئے۔

اتفاق کی بات ہے کہ جاتے ہی ان کی ملاقات قاہرہ کے ایک وزیر ریاض پاشا سے ہوئی اسی وزیر کی کوشش سے جمال الدین افغانی کو الازہر یونیورسٹی میں رکھ لیا گیا اور ان کے لئے مناسب

الاؤنس بھی مقرر کر دیا گیا۔ افغانی نے تعلیم و تدریس کے ساتھ مصر کے تعلیم یافتہ لوگوں کو دشمنوں کے پنجے سے نجات حاصل کرنے پر بھی اکسایا۔ انہوں نے اپنے طلبہ کو بتایا کہ وہ اپنے دور کے تقاضوں کے اعتبار سے اسلام کی تعریف کریں تاکہ مغرب پرستوں کے ذہنوں سے یہ بات نکل جائے کہ اسلام کوئی فرسودہ مذہب ہے جو نئے تقاضوں کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔ افغانی کی اس بات نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے کان کھڑے کر دیئے وہ کب چاہتے تھے کہ مصر کے مسلمان مذہب سے قریب ہوں اور ان کے خلاف برسرپیکار ہونے کے لئے مصری مسلمانوں کو کوئی موقع فراہم ہو۔ چنانچہ لندن سے ہدایات کے تحت قاہرہ میں برطانوی قونصل جنرل نے مصر کے توفیق پاشا کے ذریعے جمال الدین افغانی کو مصر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ لاتھراپ سٹوڈرڈ کے مطابق:

"جمال الدین افغانی پہلے مسلمان تھے جنہوں نے عالم اسلام پر مغربی استعمار کی گرفت ختم کرنے کے لئے بے خوف ہو کر کام کیا۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ کے وسعت پسندوں کے لئے وہ ایک بہت بڑا خطرہ بن گئے۔ خاص طور پر انگریز ان سے بے حد خائف تھا۔ ہندوستان میں ایک عرصہ نظر بند رہنے کے بعد وہ ۱۸۸۰ء میں مصر گئے جہاں انہوں نے یورپیوں کے خلاف اعرابی پاشا کے ساتھ مل کر مغربی سامراجیوں کے خلاف مہم چلانے کی کوشش کی لیکن جب ۱۸۸۲ء میں مصر پر انگریزوں کو غلبہ حاصل ہو گیا تو انہوں نے افغانی کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔"

جمال الدین افغانی پھر ہندوستان آ گئے۔ انہوں نے حیدر آباد دکن سے ایک رسالے کی اشاعت کا آغاز کیا جس میں مغربی سامراجیت کے خلاف بہت کچھ لکھا جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد ہی افغانی کو پولیس کی نگرانی میں حیدر آباد سے کلکتہ پہنچا دیا گیا۔ برطانیہ اور مصر کی جنگ ختم ہونے تک انہیں نظر بند رکھا گیا۔ اس کے بعد افغانی نے سر سالار جنگ بہادر اور سید حسن بلگرامی کو اپنے دائرۂ عقیدت میں شامل کر لیا۔ یہ لوگ برطانوی سامراج کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے حیدر آباد، کلکتہ، بمبئی اور پٹنہ بھی گئے۔

اس کے بعد جمال الدین افغانی امریکہ چلے گئے۔ دو ماہ قیام کے بعد لندن پہنچے، پھر پیرس آ گئے۔ یہاں ان کی ملاقات مشہور انگریز سیاست دان اور مصنف ولفرڈ بلنٹ سے ہو گئی اور اس کے بعد سے دونوں میں زندگی بھر دوستی رہی۔ جمال الدین افغانی کا خیال تھا کہ اگر ہندو اور

مسلمان کا اتحاد ہو جائے تو وہ مل کر ہندوستان میں برطانوی سامراج کو موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں
افغانی پیرس میں تقریباً تین سال رہے۔ وہاں سے انہوں نے فرانسیسی میں ایک رسالہ نکالا۔ یہ رسالہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں بے حد مقبول ہوا۔ اس رسالے کے ذریعہ افغانی نے انگریزوں کے خلاف بھرپور جہاد کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں اس پرچہ پر پابندی عائد کر دی۔ اس کے علاوہ فرانس کے اخبارات میں مسلمانوں کی حالتِ زار کے بارے میں بھی آئے دن مضامین لکھتے رہتے۔ مشہور فرانسیسی ارنسٹ رینان نے افغانی کے بارے میں لکھا:

"بلاشبہ افغانی کے دل میں اسلام کی سچی محبت اور وہ سچائی ہے جس نے افغانی کو بے خوف ہو کر سامراج کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور کر دیا...... مگر سائنسی سچائیوں کی تلاش اور تجسس کی وہ روح، جس کا اسلام مخالف ہے مسلمانوں کو پیچھے لے جا رہی ہے۔"

جمال الدین افغانی رینان کی اس بات پر مشتعل ہو گئے۔ انہوں نے رینان کو عوام کے سامنے مناظرے کی دعوت دی۔ مناظرہ ہوا اور جمال الدین افغانی نے آیاتِ قرآنی سے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام علم اور تحقیق کی مکمل حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

اس اثناء میں انگلستان کے وزیر اعظم گلیڈسٹون کی جگہ چرچل نے لے لی تھی۔ چرچل، افغانی کے دوست بلنٹ کے بھی دوست تھے۔ بلنٹ نے افغانی کو ذاتی مہمان کے طور پر انگلستان بلایا اور ان سے خواہش ظاہر کی کہ وہ چرچل سے ملاقات کر کے انہیں ان مسائل سے آگاہ کریں جن کی وجہ سے ہندوستان اور عالم اسلام کے ساتھ انگلستان کے تعلقات کو شدید نقصان پہنچا۔ چنانچہ اسی دوران افغانی اور چرچل میں بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ افغانی نے پوری کوشش کی کہ چرچل کو ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ بہتر رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کریں لیکن سامراجی پالیسیوں اور عوام نے خاص اثر قبول نہ کیا۔ یہاں سے افغانی ایران چلے آئے جہاں چھ ماہ قیام کیا۔ ایران میں شاہ کے ساتھ ان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے شاہ کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ عوام کو زیادہ سے زیادہ حقوق دیں اور ملک میں اصلاحات نافذ کریں لیکن شاہِ ایران کو یہ بات کیونکر پسند آ سکتی تھی۔ لہٰذا اس نے جمال الدین افغانی کو فوری طور پر ایران سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

جمال الدین افغانی وہاں سے ماسکو پہنچے۔ انہوں نے عالمِ اسلام کو برطانوی استعمار

سے نجات دلانے کے لئے روس کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ دو سال تک وہاں رہے۔ اُن دنوں زار، روس کا مطلق العنان فرمانروا تھا اور کسی مسلمان کو اس کی حکم عدولی کی جرأت نہ تھی۔ جمال الدین افغانی نے زارِ روس سے بہت سی ملاقاتیں کیں اور خواہش ظاہر کی کہ قرآنِ کریم کا روسی ترجمہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس سے پہلے زارِ روس نے اس کی ممانعت کر دی تھی۔ لیکن افغانی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ قرآنِ کریم کا ترجمہ روسی زبان میں ہوا اور شائع ہو گیا۔

اس کے بعد افغانی پھر تہران چلے آئے۔ انہوں نے عوام کے حقوق کی خاطر جد و جہد کا آغاز کر دیا مگر شاہِ ایران نے ان کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ انہیں گرفتار کرنے کے لئے پانچ سو سپاہی گئے۔ افغانی کو نکال دیا گیا۔ انہوں نے بصرہ میں پناہ لی۔ بعد ازاں لندن سے ایک پرچہ نکالا اور انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ وہ ہندوستان کو آزاد کر دیں۔ انہوں نے ایک مضمون میں لکھا کہ دنیا بھر کے عیسائی مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ عیسائیوں کے خلاف محاذ بنا لیں۔ انگریزوں نے اس رسالے کو بند کر دیا۔

۱۸۹۲ء میں ترکی کے سلطان عبدالحمید نے جمال الدین افغانی کو ترکی آنے کی دعوت دی۔ سلطان نے اُن سے بہت اچھا سلوک کیا اور ہر قسم کی آسائش مہیا کی۔ مگر جمال الدین افغانی اور سلطانِ ترکی میں بنیادی اختلاف یہ تھا کہ سلطان عالمی اسلامی اتحاد تو چاہتا تھا لیکن اپنی قیادت میں۔ اس کے برعکس جمال الدین افغانی، آزاد اور خود مختار مسلمان ریاستوں کی انجمن کے تحت اس اتحاد کے حامی تھے۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف چاپلوس درباریوں نے سلطانِ ترکی کے کان بھرے بلکہ سلطان نے افغانی کی رہائش گاہ پر بھی پہرہ لگا دیا اور بیرونی دنیا کے ساتھ ان کا تعلق ختم کر دیا۔

جمال الدین افغانی سینے میں اتحادِ اسلامی اور آزادی کی تڑپ لے کر زندگی بھر ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرتے رہے۔ کہیں نظر بند کئے گئے اور کہیں ان کو ملک سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ لیکن ان تمام مشکلات و مصائب اور سفر کی صعوبتوں کے باوجود افغانی جہاد میں مصروف رہے۔ آخر ان کی صحت گرنے لگی۔ وہ بسترِ مرگ پر بھی مسلمانوں کی آزادی کے لئے منصوبے بناتے رہے۔ ۸ مارچ ۱۸۹۷ء کو ۶۰ سال کی عمر میں افغانی وفات پا گئے۔

نواب وقار الملک

۱۸۴۱ء تا ۱۹۱۷ء

نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین مراد آباد کے چھوٹے سے گاؤں میں ۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء کو پیدا ہوئے۔ ابھی ان کی عمر صرف چھ ماہ تھی کہ والد انتقال کر گئے۔ ان کی تعلیم و تربیت کی تمام ذمہ داری والدہ پر آ پڑی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم ایک مقامی مکتب میں حاصل کی۔ کچھ مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہیں گورنمنٹ سکول میں دس روپے ماہانہ پر استاد کی ملازمت مل گئی۔ ۱۸۶۱ء میں جب ہندوستان میں قحط پڑا تو مراد آباد میں امدادی کاموں کا چارج سرسید احمد خاں کے پاس تھا انہوں نے ہی نواب وقار الملک کو [illegible] مہ میں امدادی کاموں پر لگایا۔ ترقی کرتے کرتے وہ علی گڑھ میں سرسید احمد کے ماتحت کام کرنے لگے۔ اسی دوران انہوں نے تحصیلداری کا امتحان پاس کر لیا اور ۱۸۶۲ء میں تحصیل دار مقرر کر دیئے گئے۔ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین انتہائی آزاد طبع رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے انگریز افسروں کا رعب یا دباؤ کبھی برداشت نہیں کیا۔ جب انگریز افسروں نے انہیں سرکاری اوقاتِ کار میں نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں جانے کی ممانعت کر دی تو نہ صرف انگریز افسروں کو کھری کھری سنائیں بلکہ استعفیٰ بھی دے دیا اس وقت ان کی تنخواہ صرف ۱۰۰ روپیہ ماہانہ تھی لیکن اس دور میں اتنی تنخواہ سے اچھی زندگی گزاری جا سکتی تھی۔ جلد ہی کچھ نیک طبع انگریز افسروں کی مداخلت سے انہیں نماز پڑھنے کی اجازت مل گئی اور انہوں نے اپنا استعفا واپس لے لیا۔

کچھ عرصے بعد سرسید احمد خاں کا تبادلہ علی گڑھ سے بنارس ہو گیا۔ ان کی جگہ علی گڑھ تحریک کے ایک اور سرگرم کارکن نواب سمیع اللہ ان کی جگہ سب جج مقرر ہوئے۔ اب نواب وقار الملک، نواب سمیع اللہ کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ اس طرح دونوں کو علی گڑھ تحریک کو ترقی دینے اور مسلمانوں کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا بہترین موقع نصیب ہوا۔ ۱۸۷۵ء میں نواب وقار الملک کو حیدر آباد دکن میں ملازمت مل گئی۔ ایک سال کے مختصر عرصے میں نواب سالار جنگ، نواب وقار الملک کے اتنے گرویدہ ہو گئے کہ انہوں نے نواب وقار الملک کو وزیرِ انصاف مقرر کر دیا۔ وقار الملک ریاست حیدر آباد دکن میں ۷ سال تک ملازم رہے لیکن سر سالار جنگ اور

انگریزوں کے درمیان تنازعہ کی وجہ سے مولوی مشتاق حسین (نواب وقار الملک) نے محسوس کیا کہ وہ مقامی لوگوں کی سازشوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان مقامی لوگوں کے پس پشت بھی انگریز کی مکاری کارفرما تھی۔ اسی ریاست میں انہیں نواب وقار الملک کا خطاب ملا۔ ان کی حالت یہ تھی کہ اپنی پوری ماہانہ تنخواہ غریبوں اور بیواؤں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے اس لئے عوام میں بیحد مقبول تھے۔ ریاست کی ملازمت سے انہوں نے ۱۸۹۲ء میں استعفا دے دیا اور ۸ سال تک امروہہ میں رہے۔

جب دونوں ہندی اور اُردو کا جھگڑا شروع ہوا، نواب وقار الملک بھی میدانِ عمل میں اُتر گئے انہوں نے اردو کے حق میں تمام کوششیں صرف کر دیں۔ متعصب انگریز اور ہندی کے حامی گورنر انتھونی میکڈانل سے ملاقات کی کوشش کی لیکن ہندو نواز گورنر نے ملاقات کے لئے وقت دینے سے بھی انکار کر دیا۔

نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک دونوں اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے کہ اگر ہندوستان میں ایک باعزت اور باوقار قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں نہ صرف جدید تعلیم حاصل کرنا ہوگی بلکہ سیاسی طور پر بھی پوری طرح منظم ہونا پڑے گا۔ ۱۸۸۵ء میں جب ہندوؤں نے انڈین نیشنل کانگریس قائم کی تو چند سال بعد ۱۸۹۳ء میں سرسید احمد خاں نے محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کر دی تاکہ مسلمانوں کے تعلیمی اور سیاسی حقوق کا بھرپور تحفظ کیا جا سکے۔ اس ایسوسی ایشن کی تنظیم میں مسلمانوں کو تھیوڈور بیک کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ محسن الملک نے ڈیفنس ایسوسی ایشن میں نئی رُوح پھونکنے کا عزم ظاہر کیا تو نواب وقار الملک نے ان کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کی۔

نواب محسن الملک بوڑھے ہو رہے تھے اور اب ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ زیادہ دیر تک کالج کی ذمہ داریاں اٹھا سکتے چنانچہ نواب وقار الملک نے کالج کے معاملات میں زیادہ سرگرمی کے ساتھ حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۱۹۰۷ء میں جب نواب محسن الملک انتقال فرما گئے تو نواب وقار الملک کو متفقہ طور پر بورڈ کا سیکریٹری چن لیا گیا لیکن جلد ہی لڑکوں کی ہڑتال کی وجہ سے کالج کے پرنسپل تھیوڈور بیک اور نواب محسن الملک کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ ادھر متعصب انگریز گورنر انتھونی نے دھمکیاں دینا شروع کر دیں کہ وہ کالج کی مالی امداد منسوخ کر دے گا۔

اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ایک مسلمان وفد نے ہندوستان کے وائسرے لارڈ منٹو سے ملاقات کی

تاکہ اسے مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب پر آمادہ کیا جا سکے۔ نواب وقار الملک بھی مسلمانوں کے وفد کے رکن تھے۔ ۲ ماہ بعد ۳۰ دسمبر کو ڈھاکہ کے نواب سرسلیم اللہ خاں کی صدارت میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا۔ نواب وقار الملک نے اس اجلاس میں تعارفی تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو فوری طور پر سیاسی تنظیم قائم کرنے کے لئے کہا اور یہ بات واضح کر دی کہ اگر اب بھی وہ سیاسی طور پر منظم نہ ہوئے تو نوشتۂ دیوار پڑھنے کے لئے تیار رہیں۔ انہوں نے کہا کہ آج سب لوگ جس مقصد کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں، وہ کوئی نیا مقصد نہیں ہندو انڈین نیشنل کانگریس قائم کر چکے ہیں اور مستقبل کے نقشے کی آڑ لے کر مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور ہمیشہ کے لئے ان پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ کانگریس کی قوت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ کانگریس سے الگ تھلگ رہ کر کانگریس کو مزید تقویت نہ پہنچائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی تحریکِ آزادی کی تاریخ کا یہ اولین اور اہم ترین باب تھا۔

نواب وقار الملک نے تقریر کے آخر میں مسلمانوں کو انتباہ کیا کہ اگر مسلمان سیاسی طور پر منظم نہ ہوئے تو انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندو ان پر حکومت شروع کر دیں گے جبکہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعداد پانچ گنا کم ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ اپنے مذہب، معاشرت، معیشت، جائداد، آبرو اور اپنے وقار کو بچانے کے لئے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہو جائیں اور جدوجہد کا آغاز کر دیں۔

مسلم لیگ کی تشکیل

اسی دن ڈھاکہ میں ممتاز مسلمانوں کا ایک اجلاس نواب وقار الملک کی صدارت میں منعقد ہوا اور مسلمانوں کے لئے ایک سیاسی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اس تنظیم کا نام " دی انڈیا مسلم لیگ" تجویز کیا گیا۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل قرار دادیں منظور کی گئیں۔

یہ اجلاس جو ڈھاکہ میں منعقد ہوا اور جس میں ہندوستان کے تمام حصوں سے مسلمان شرکت کر رہے ہیں، یہ فیصلہ کرتا ہے کہ " دی انڈیا مسلم لیگ " کے نام سے مسلمانوں کی ایک سیاسی تنظیم قائم کی جائے جس کے مقاصد یہ ہیں:

۱۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں برطانوی حکومت سے وفاداری کے جذبات پیدا کئے جائیں اور اگر مسلمانوں اور انگریز حکومت کے درمیان کوئی غلط فہمیاں ہیں تو انہیں

دور کیا جائے۔

ب۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کے تحفظ اور نشوونما کے بارے میں حکومت کے سامنے نمائندگی کی جائے۔

ج۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اگر کبھی غیر مسلموں کے خلاف عداوت کے جذبات پیدا ہوں تو ان کی روک تھام کی جائے۔

یہ قرارداد نواب ڈھاکہ سلیم اللہ خاں نے پیش کی اور حکیم اجمل خاں نے اس کی تائید کی۔

۱۹۱۲ء میں جب نواب وقار الملک کی عمر ۷۱ سال ہوگئی تو وہ خرابیٔ صحت کی بنا پر مزید کام کرنے اور علی گڑھ کالج کی خدمات سرانجام دینے کے قابل نہ رہے انہوں نے استعفا دے دیا لیکن اس کے باوجود کالج کی بہتری کے لئے آخر دم تک کچھ نہ کچھ کام کرتے رہے۔

جب ۱۹۱۳ء میں ایک مسجد کی دوبارہ تعمیر کرنے والے مسلمانوں پر انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ٹائلر نے پولیس سے فائرنگ کرائی تو ہنگامہ ہوگیا۔ نواب وقار الملک نے نہ صرف مسلمانوں کو بھرپور احتجاج کے لئے یکجا کیا بلکہ انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایک تقریر کے دوران کہا:

"اگر تم غرور اور تکبر میں آج مسلمانوں پر گولی چلوا سکتے ہو تو کل پولیس کا ایک معمولی تھانے دار بھی ٹائلر بن کر ایسے مکروہ اقدام کرسکے۔"

۱۹۱۵ء میں نواب وقار الملک کی صحت بہت خراب ہوگئی۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم اجمل خاں ان کی مسلسل دیکھ بھال کر رہے تھے لیکن مرض بڑھتا گیا۔ آخر ۲۷۔جنوری ۱۹۱۷ء کو یہ بطلِ حریت اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا۔ نواب وقار الملک کو امروہہ میں اُن کے آبائی قبرستان میں دفن کردیا گیا۔

سیّد امیر علی

۱۸۴۹ء تا ۱۹۲۸ء

سیّد امیر علی، سید جعفر علی خاں ڈپٹی کلکٹر کٹک کے صاحبزادے تھے۔ یہ کنبہ مستقل طور پر کٹک میں آباد تھا۔ امیر علی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ گھر پر انہوں نے اُردو اور فارسی سیکھی۔ اور اس کے بعد ہُگلی کالج میں داخل ہوگئے۔ یہ کالج اس وقت دو حصّوں میں تقسیم ہوچکا تھا۔

ایک حصہ اینگلو پرشین ڈیپارٹمنٹ کہلاتا تھا جو مسلمانوں کے لئے تھا اور دوسرا ہندو نوجوانوں کیلئے مخصوص تھا۔ انہی دنوں سید امیر علی کو ممتاز عالم سید کرامت علی اور پروفیسر عبید اللہ عبیدی سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ سید امیر علی نے اس کم عمری میں سید کرامت علی کی مشہور تصنیف "مرکز علوم" کا انگریزی ترجمہ کیا۔ یہ ان کی سب سے پہلی ادبی کوشش تھی۔ سید امیر علی کا کہنا تھا کہ اسلامی فلسفہ کے بارے میں ان کی تمام تر معلومات سید کرامت علی کی رہین منت ہیں۔ ۱۸۶۷ء میں سید امیر علی نے بی۔ اے کرنے کے بعد (وہ ہندوستان میں پہلے مسلمان گریجویٹ تھے) تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ اس طرح وہ ایم۔ اے کی ڈگری لینے والے پہلے بنگالی مسلمان تھے۔ ۱۸۶۸ء میں انہوں نے قانون کا امتحان پاس کیا اور اسی سال مزید مطالعہ کے لئے سرکاری وظیفہ پر انگلستان چلے گئے جہاں وہ چار سال تک ایک خاتون جینیز کے پاس مقیم رہے۔ انگلستان میں ان کے تعلقات بہت سے ممتاز انگریزوں کے ساتھ ہو گئے۔ اسی وجہ سے سید امیر علی کو ۱۸۷۱ء میں وہاں نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کی تشکیل میں کامیابی حاصل ہوئی۔ اس ایسوسی ایشن میں ہندوستانی بھی شامل تھے اور وہ انگریز بھی جنہیں ہندوستان کے امور سے دلچسپی تھی۔ ۱۸۷۳ء میں ان کی تصنیف "تعلیمات محمدؐ کا تنقیدی جائزہ" شائع ہوئی۔ یہ کتاب لاتعداد انگریزوں نے پڑھی اور اس کا گہرا اثر قبول کیا۔

سید امیر علی بہت رحمدل اور غریب پرور شخص تھے۔ ان کی اس خوبی سے متاثر ہو کر ارنسٹ گرفن نے اس رائے کا اظہار کیا تھا:

"سید امیر علی کی کوششوں سے بھوکوں کو روٹی مل جاتی ہے۔ ننگے لوگوں کو لباس میسر آجاتا ہے۔ بیمار صحت یاب ہوتے ہیں اور زخمیوں کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ امیر علی کی کوششوں ہی سے بہت سی ماؤں کے لال دم توڑنے سے بچ گئے۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے بعد مایوس اور نامراد کسانوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی اور انہیں زمین اور بیج نصیب ہوا۔"

یہی وہ سطور ہیں جو سید امیر علی کے مزار پر آج تک موجود ہیں۔ سید امیر علی نے بلقان کی جنگوں کی تباہ کاری کے بعد مجبور اور بے بس افراد کی بے پناہ خدمت کی اور خدمت انسانی میں کبھی مذہب کا امتیاز نہ برتا۔ ترکی اور اٹلی کی جنگ کے دوران ریڈ کراس سوسائٹی بہت خدمات سرانجام دے رہی تھی لیکن امیر علی نے محسوس کیا کہ امدادی کام کی زیادہ سے زیادہ ضرورت ہے۔ انہوں نے برٹش ریڈ کریسنٹ سوسائٹی کی بنیاد ڈالی اور جنگی زخمیوں کی اتنی خدمت کی کہ بہت

سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس سلسلہ میں آغا خان نے بھی ان کا بہت ساتھ دیا۔

"انگریزوں میں اسلام کو واضح طور پر متعارف کرانے اور اسلام کے بارے میں انگریزوں کے دلوں سے غلط فہمیاں دُور کرنے میں ان کی سطح پر اور کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ ایک مسلمان مصنف کی حیثیت سے ان کی نظیر نہیں ملتی۔ اسلامی قوانین کے ترجمان کے طور پر عالم اسلام انہیں حرفِ آخر تسلیم کرتا ہے اور مسلمانوں کے مفادات کے محافظ کی حیثیت میں ساری دنیا انہیں جانتی ہے" ان خیالات کا اظہار سید مرتضیٰ علی نے اپنے ایک مضمون میں کیا۔

۱۸۶۹ء میں سرسید احمد انگلستان گئے تو وہاں سیّد امیر علی کے ساتھ ان کی مسلسل ملاقاتیں ہُوئیں۔ ہر ملاقات میں علی گڑھ اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل زیرِ بحث آتے رہے۔ سید احمد خاں کا خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کے لئے جدید تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی پنپنا ممکن ہوگا جبکہ امیر علی کا خیال یہ تھا کہ بلاشبہ جدید تعلیم ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی سیاسی تربیت بھی لازم ہے تاکہ وہ ہندوؤں کے مقابلہ پر آکر نئی قومیت کی لہر پیدا کر دیں۔

۲۷۔ جنوری ۱۸۷۳ء کو سید امیر علی کو بار میں بلایا گیا۔ شرکت کے بعد وہ ہندوستان لوٹ آئے اور کلکتہ ہائی کورٹ کے وکلاء میں شامل ہو گئے۔ ان کی پریکٹس جلد ہی چل نکلی۔ ساتھ ہی انہیں کلکتہ یونیورسٹی میں مسلم قوانین کی تعلیم کے لئے لیکچرر رکھ لیا گیا۔ ۱۸۷۸ء میں انہیں قائم مقام پریذیڈنسی مجسٹریٹ کلکتہ مقرر کر دیا گیا۔ سیّد امیر علی نے آتنی سخت سزائیں دیں کہ شریف شہریوں کو ایک بار پھر امن وسکون کے ساتھ اور کسی کی طرف سے بلیک میل کئے جانے کے خطرے کے بغیر کاروبار جاری رکھنے کا موقع ملا۔ وہی کلکتہ جو انکی آمد سے پہلے غیر قانونی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا اور جہاں حالات دن بدن خراب ہوتے جارہے تھے اب امن کی آغوش میں تھا۔ یہ امیر علی ہی کی مساعی کا نتیجہ تھا کہ نابالغ مجرموں کے لئے جیل خانوں کی جگہ اصلاح خانے کھولے گئے جو آج تک موجود ہیں۔ پہلا اصلاح خانہ علی پور میں کھولا گیا۔ ۱۸۷۸ء سے ۱۸۷۹ء اور پھر ۱۸۸۱ء سے ۱۸۸۳ء تک وہ بنگال لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے۔ بنگال اسمبلی میں انہوں نے جو کام کیا وہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ ۱۸۸۳ء میں انہیں قومی لیجسلیٹو کونسل کا

رُکن بنا دیا گیا ۔ اس وقت اس کونسل میں صرف دو ہندوستانی رکن تھے اور وہ دونوں ہی ہندو تھے۔ امپیریل کونسل کے رکن کی حیثیت سے سید امیر علی نے قانونی اصلاحات کے لئے بہت کام کیا۔ بنگال ٹیننسی ایکٹ مجریہ ۱۸۸۵ء (BENGAL TENANCY ACT - 1885) کی منظوری کا سہرا انہی کے سر ہے ۔

۱۸۷۵ء میں کلکتہ کے ہندوؤں نے انڈین ایسوسی ایشن اور انڈیا لیگ تشکیل کرلی تھی جو بلاشبہ ہندوؤں کی تنظیمیں تھیں ۔ اس موقع پر سید امیر علی پہلے شخص تھے جنہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے لئے ہندوستان کی عوامی زندگی میں باوقار طریقہ پر زندہ رہنے کے لئے اپنی باقاعدہ سیاسی تنظیم کی ضرورت تھی ۔ لہذا انہوں نے فوری طور پر سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی تشکیل کے لئے تحریک کی ۔ ۱۸۷۷ء میں ایسوسی ایشن نے کام شروع کر دیا اور سید امیر علی اس کے سیکریٹری منتخب ہوئے ۔ جلد ہی ہندوستان بھر میں اس ایسوسی ایشن کی ۵۳ شاخیں کھل گئیں اور اس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی ۔ سید امیر علی اس ایسوسی ایشن کے لئے ۲۵ سال تک انتھک کام کرتے رہے ۔

" ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ساڑھے پانچ کروڑ کے لگ بھگ ہے ۔ اتنی کثیر تعداد کو اقلیت کہنا مناسب نہیں ۔ گو یہ مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ گھل مل کر رہتے ہیں لیکن ان کی قومیت ، ان کی نسلی روایات ، ان کا مذہب اور ان کے راستے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں "

امیر علی پہلے مسلمان تھے جنہوں نے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کی ضرورت کو محسوس کیا ۔ انہوں نے ۱۸۷۷ء میں کلکتہ میں برصغیر ہند و پاک کی پہلی مسلمان سیاسی تنظیم قائم کی ۔ ۱۸۹۲ء میں انہوں نے وائسرائے ہند کو سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک یادداشت پیش کی جس میں انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے خاص غور و خوض کی اپیل کی ۔ اس یادداشت میں سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے لئے مناسب نمائندگی کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا ۔ وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن نے اس یادداشت پر غور کے بعد یہ جائز مطالبات تسلیم کر لئے ۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ سید امیر علی نے انتہائی مشکلات کے دنوں میں ہندوستان کے مسلمانوں کی بیش بہا خدمات سرانجام دیں ۔ امیر علی ہی کی

پہلی مسلمان تنظیم

ہندوستان میں یہ ایسوسی ایشن پہلی مسلمان سیاسی تنظیم تھی۔ ۱۹۰۹ء میں سید امیر علی نے ہندوستان کے سیکریٹری آف سٹیٹ لارڈ مورلے کو ایک خط میں لکھا:
قیادت میں پہلی بار بنگال میں علیحدہ مسلم قومیت کے تصور نے جنم لیا۔ سائمن کمیشن کی رپورٹ میں سید امیر علی کے اس اہم کردار کا ذکر خاص طور پر ملتا ہے جو انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کے سلسلہ میں ادا کیا۔ ۱۸۸۴ء میں جب سید امیر علی کراچی میں تھے تو انہیں ممتاز ماہر تعلیم حسن علی آفندی سے ملاقات کا موقع ملا۔ دونوں میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کے بارے میں طویل تبادلۂ خیال ہوا۔ کراچی میں تقریر کرتے ہوئے سید امیر علی نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ اپنی تقدیر کے مالک خود ہیں۔ وہ اس اعتقاد کو ترک کر دیں کہ جو لکھا گیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنے بال بچوں کو فراخدلی سے انگریزی کی تعلیم دلائیں۔
۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے قیام میں سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی سرپرستی کا بہت عمل دخل تھا لیکن جب سید امیر علی نے محسوس کیا کہ کانگرس پہ ہندو غلبہ حاصل کرتے جا رہے ہیں تو انہوں نے کانگرس کے ساتھ ایسوسی ایشن کا تعلق ختم کر دیا اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۸۸۹ء میں انہوں نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ بنگال کے تمام مدرسوں کی تنظیم نو ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے طرز پہ کی جائے —
۱۸۹۰ء میں انہیں کلکتہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا۔ پورے ہندوستان میں سید امیر علی دوسرے مسلمان جج تھے۔ ۱۹۰۴ء میں وہ ریٹائر ہو گئے اور مستقل طور پر انگلستان میں آباد ہو گئے۔

۱۹۰۸ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی لندن شاخ قائم ہو گئی اور ہز ہائی نس آغا خاں نے سید امیر علی کو اس شاخ کا پہلا صدر مقرر کیا۔ ۲۷ جنوری ۱۹۰۹ء کو سید امیر علی مسلم لیگ کی لندن شاخ کی طرف سے سیکریٹری آف سٹیٹ برائے امورِ ہند لارڈ مورلے کے پاس ایک وفد لے کر گئے۔ وفد نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے لوکل باڈیوں اور لیجسلیٹو اسمبلیوں میں علیحدہ نمائندگی کی بنیاد پر جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا۔ سید امیر علی نے مسلم لیگ کی لندن شاخ کو اپنی ذہانت اور محنت کی وجہ سے ایک نہایت فعال سیاسی تنظیم بنا دیا۔ انہوں نے اس شاخ کی

طرف سے اخبارات کو بہت سے خطوط اور کتابچے روانہ کئے جن میں مختلف مسائل پر مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی گئی تھی۔ بلقان کی جنگوں اور ترکی اور اٹلی کی جنگ کے دوران انہوں نے لندن میں برٹش ریڈ کریسنٹ سوسائٹی قائم کی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ برطانیہ کی ریڈ کراس سوسائٹی مسلمان زخمیوں کے لئے خلوص دل سے کام نہ کر رہی تھی۔

سید امیر علی نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ لندن میں کوئی مسجد نہیں۔ نومبر ۱۹۱۰ء میں انہوں نے لندن میں مسجد کی تعمیر کا منصوبہ تیار کیا۔ اس سلسلہ میں چندے جمع کئے گئے۔ بنک آف انگلینڈ میں حساب کھولا گیا اور ہز ہائی نس آغا خاں اور لارڈ ایمپتھل کو ٹرسٹی مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں سید امیر علی کو پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کا رکن بنا لیا گیا جہاں انہوں نے مسلم قوانین کے سلسلہ میں بہت زیادہ کام کیا۔

سید امیر علی نے اسلام کے لئے جو گرانقدر خدمات انجام دیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ انہوں نے "دی سپرٹ آف اسلام"، "اسلام"، "ویمن اِن اسلام"، "محمڈن لاء"، "دی پرسنل لاء آف دی محمڈنز"، "دی ریٹلس آف پرشیا"، "اے کمنٹری آن دی بنگال ایکٹ" اور "دی لیگل پوزیشن آف ویمن اِن اسلام" بھی لکھیں۔ ۳ اگست ۱۹۲۸ء کو وہ سسکس میں انتقال فرما گئے۔

شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء

مولانا شبلی نے ۱۸۵۷ء میں اعظم گڑھ کے ایک متموّل گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا جو ایک ممتاز وکیل اور زمیندار تھے۔ وہ اپنے شہر کی میونسپل کمیٹی کے اعزازی سیکرٹری بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کارخانے قائم کئے لیکن دولت اور تموّل کے باوجود دین سے محبت میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔ شبلی کے آباؤ اجداد کے بارے میں روایت ہے کہ ان کا تعلق ہندو مذہب سے تھا۔ جہاں تک ان میں ایک کنبہ کے اسلام قبول کرنے کا تعلق ہے تو وہ خاصا دلچسپ واقعہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک بزرگ شیو راج سنگھ تھے۔ ایک روز کسی ضروری کام سے ناشتہ کئے بغیر اپنی اراضی پر جانا پڑا۔ گرمی بھی بلا کی تھی تپتی دوپہر میں گھر لوٹے

تو گھوڑے کی پیٹھ سے اترتے ہی سیدھے رسوئی (باورچی خانہ) میں گئے مگر جوتے اتارنا بھول گئے
ان کی بڑی بھاوج نے دیکھا تو تُنک کر بولی "تم تو بس نِرے تُرک ہو گئے ہو۔ جوتوں ہمیشہ نوچ
لئے، پر چلے آئے۔ سارا بھوجن (کھانا) بھرشٹ ہو گیا" شیوراج سنگھ کو نہ جانے کیا سوجھی —
بے ساختہ جواب دے دیا: "اگر تُرک ہونے کا طعنہ ہے تو ہم تُرک ہی ہو کر دکھاتے ہیں۔" یہ کہہ کر
وہ اسی وقت کھانا کھائے بغیر مسجد موضع خانقاہ گئے اور اسلام قبول کر لیا اور ان کا اسلامی نام
سراج الدین رکھا گیا۔

مولانا شبلیؔ نے جنم لیا تو خوشی میں شہر بھر کی دعوت کر دی گئی جو سات روز تک جاری رہی۔
خیرات عام ہوئی اور پھر ان کا بچپن بے پناہ ناز و نعم میں گزرا مگر شبلیؔ کے والد کی دوسری شادی
کے باعث ان کی والدہ دلگیر رہنے لگیں جس کا شبلیؔ کو شدید صدمہ تھا۔ اسی لئے گھر کا ماحول بھی خاصا
بدل چکا تھا۔ کہا یہی جاتا ہے کہ ان کی دوسری والدہ نہایت نیک، فیاض اور فراخدل خاتون تھیں
مگر اس کے باوجود یہ گھرانہ اُن کو محبت نہ دے سکا۔ خود شبلیؔ نے زندگی میں صرف ایک بار سوتیلی
والدہ سے بات کی۔ اسی لئے والد کے ساتھ بھی شبلیؔ کے رویے میں گہری تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔
جب شبلیؔ بغرضِ تعلیم لاہور آئے تو انہوں نے دس روپے میں دو ماہ گزار دیئے مگر والد سے
دھیلہ نہ مانگا۔ ۱۹ سال کی عمر میں حج کے لئے گئے۔ ۱۸۷۶ء میں اپنے والد اور کچھ دیگر دردمند
مسلمانوں کے قائم کردہ مدرسہ کے مدرسِ اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ انہوں نے اپنے وقت کے ممتاز علماء سے
دینی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں والد کے ایماء پر وکالت کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ ان کا
چھوٹا بھائی مہدیؔ بھی اسی امتحان میں تفریحاً بیٹھا۔ مہدیؔ۔ شبلیؔ سے کتابوں کے اسباق تفریحاً
سُنا کرتا تھا مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ مہدیؔ تو کامیاب ہو گیا، شبلیؔ وکالت میں فیل ہو گئے۔ بہرحال
۱۸۸۱ء میں شبلیؔ نے دوبارہ امتحان دیا اور کامیابی کے بعد ۱۸۸۱ء میں اعظم گڑھ ہی میں وکالت کا
آغاز کر دیا۔ وکالت کا چلنا مشکل تھا کیونکہ شبلیؔ نے محض والد کے حکم کی اطاعت میں امتحان دیا اور
پریکٹس شروع کی۔ طبعاً وہ اس پیشہ ہی سے متنفر تھے۔ آخر انہوں نے وکالت ترک کر دی۔ ملازمت
تلاش کی تو صرف دس روپے ماہانہ کی اسامی ملی یعنی نقل نویسی کی مگر ملازمت عارضی تھی۔ آخر
اُن کے والد نے انہیں اپنے ہی کارخانے میں کام پر لگا دیا۔ شبلیؔ کی سیمابی طبیعت آڑے آئی۔
وہ یہاں بھی کام نہ کر سکے اور ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ چلے آئے۔ روزگار کے سلسلہ میں شبلیؔ نے بہت
ٹھوکریں کھائیں اور وہ خاصے دل برداشتہ بھی ہوئے مگر ان کی علمی و ادبی دلچسپیاں قائم رہیں ——

۱۸۸۲ء کے اواخر میں علی گڑھ کالج میں عربی کے لئے ایک معاون پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی تو شبلی نے اس کے لئے بھرپور کوشش کی۔ آخر کار مولوی سمیع اللہ خاں نے انہیں منتخب کر لیا۔ اسی موقعہ پر وہ پہلی بار سر سید احمد خاں سے متعارف ہوئے۔ یہاں انہیں چالیس روپے ماہانہ مشاہرہ ملا کرتا تھا لیکن شبلی کے لئے یہاں سب سے بڑی دلچسپی اور کشش یہ تھی کہ لائبریریوں کی وجہ سے ہر وقت مطالعہ کر سکتے تھے ادھر سر سید اور ڈی آرنلڈ کی صحبت نے شبلی پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ وہ قریباً ۱۶ سال تک علی گڑھ سے منسلک رہے۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران ہی شبلی کو یہ احساس شدت سے ہوا کہ فقہ، منطق اور صرف و نحو کے ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی بے حد ضروری ہے۔

۱۸۷۷ء میں ترکی اور روس کے درمیان جنگ کے دوران ہندوستان کے مسلمانوں میں بے پناہ جوش پایا جاتا تھا۔ ترکی کی امداد کے لئے گھر گھر سے چندہ جمع کیا جا رہا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب برطانوی حکومت روس کو اپنا حریف سمجھتی تھی۔ لہٰذا قدرتی طور پر حکومت کی طرف سے بھی ترکی کی مدد پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ تھی۔ اس وقت شبلی نعمانی ۲۰ سال کے تھے اور ان تمام مقامات مقدسہ کی زیارت کر آئے تھے جو سلطان ترکی کے زیر نگیں تھے۔ جب اعظم گڑھ میں ترکوں کے لئے چندہ جمع کرنے کا کام شروع ہوا تو ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا جس کے سیکریٹری شبلی تھے۔ اس انجمن نے ۳ ہزار روپے جمع کئے اور ترکی بھیجے۔

ترکی اور یونان کے درمیان جنگ پر سر سید احمد خاں کو شدید تشویش تھی۔ شبلی ہر قدم پر سر سید احمد کے ساتھ تھے۔ دونوں محسوس کر رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان جس حالت میں ہیں اس قابل نہیں کہ ترکی تو کیا کسی بھی اسلامی مملکت کے لئے کوئی عملی کام کر سکیں۔ ادھر یہ مسئلہ تھا کہ حکومت برطانیہ کی ہمدردیاں یونان کے ساتھ تھیں لہٰذا یہ ممکن تھا کہ ترکی کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کے نازک جذبات اور انگریز حکومت کی یونان سے ہمدردی کے باعث مسلمانوں اور انگریزوں میں فاصلہ قائم ہو جاتا جبکہ سر سید نے بڑے عجیب دور سے گزرنے اور مشکلات کا سامنا کرنے کے بعد اس فاصلے کو ختم کیا تھا۔ اس موقع پر سر سید احمد خاں نے ایسے متعدد مضامین لکھے جن میں ترکوں سے اسلامی ہندوستان کی محبت اور جذبات کا مکمل اظہار موجود تھا۔ ایک مضمون میں گلیڈسٹون اور دوسرے انگریزوں کے رویے کی شدید مذمت بھی کی گئی تھی مگر یہ بات بھی واضح کر دی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ترکی سے اس لئے محبت ہے کہ ترکی دنیا کی سب سے بڑی اسلامی

مملکت ہتے ہے۔ نہ کہ اس لئے کہ مسلمان، سلطان روم کو خلیفۃ المسلمین سمجھتے ہیں یا مذہبی امور میں اس کے احکامات کے پابند ہیں۔ اس بحث میں شبلی نے بھی سرگرمی سے حصّہ لیا۔ انہوں نے ایک نہایت مدلّل مضمون لکھا اور تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں (مثلاً مغل بادشاہوں) نے کبھی عثمانی ترکوں کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔

شبلی کافی عرصہ سے علیل رہنے لگے تھے مگر اُن کے مرض کی وجہ اب تک دریافت نہیں ہو سکی تھی تاہم انہوں نے تصنیف و تالیف اور قومی امور میں دلچسپی کے سلسلہ کو کسی قیمت پر بھی منقطع نہ ہونے دیا بلکہ اُن کی مصروفیت کچھ بڑھ ہی گئی۔ ۱۹۰۸ء میں صوبہ کے گورنر نے دارالعلوم ندوہ کی نئی اور وسیع عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا نیز حکومت کی طرف سے ندوہ کے لئے ۵ سو روپے ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کیا گیا۔ تقریباً دو صد روپے ماہانہ ندوہ کی اپنی آمدن تھی۔ حکومت نے جو امداد دی تھی وُہ غیر مذہبی تعلیم کے لئے تھی لہٰذا قدرتی طور پر غیر مذہبی تعلیم کا سلسلہ وسیع ہو گیا۔ علّامہ شبلی نے یہ حالات دیکھے تو انہیں شدید فکر لاحق ہُوئی۔ مولانا نے حضور بیگم بھوپال کے ادبی سیکرٹری مولوی محمد امین زبیری کو خط لکھا کہ حکومت نے ندوہ کے لئے ۵ سو روپے ماہانہ وظیفہ دیا ہے جبکہ خالص مذہبی علوم کا صیغہ اس کے مقابلہ میں بہت کم وقعت رکھتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ندوہ کی اپنی آمدن میں اضافہ ہو۔ جب حضور بیگم بھوپال کو اس امر کی اطلاع ملی تو انھوں نے بھوپال کی طرف سے دی جانے والی مالی امداد (۲ صد روپے ماہانہ) میں پچاس روپے ماہانہ کا اضافہ کر دیا۔ اس کے بعد ریاست رام پور سے پانچ سو روپے سالانہ کی امداد کا آغاز ہو گیا۔ ۱۹۱۰ء میں آغا خاں نے ندوہ کے معائنہ کے موقع پر پانچ سو روپے سالانہ کی امداد کا آغاز کر دیا۔

علّامہ شبلی نے ندوہ ہی کے پلیٹ فارم سے یہ کوشش کی کہ مسلمان کسی طرح متحد ہو کر قومی معاملات پر توجّہ دیں اور ان کی باگ ڈور علماء کے ہاتھوں میں آجائے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ندوہ کو قوم کی آواز بنانے کی سعی شروع کر دی۔ اس ضمن میں ایک کام تو "قانونِ وقف علی الاولاد" تھا جس کی بنا سر سیّد نے ڈالی تھی۔ پھر ایک بل کا مسودہ تیار کیا۔ مگر اس وقت قانون دان طبقہ اس کے خلاف تھا۔ کچھ عرصہ بعد سیّد امیر علی نے ۱۸۹۴ء میں بطور جج ہائیکورٹ کلکتہ اور بعد ازاں لندن کے ایک جریدے میں اس قانون کے حق میں ایسے مضبوط دلائل پیش کیے جن کی وجہ سے

قانونی اعتراضات کی رکاوٹ خاصی حد تک دور ہو گئی لیکن پریوی کونسل کا فیصلہ سید امیر علی کے فیصلے کے خلاف ہونے کی بنا پر نئے قانون کے ذریعہ ہی اس مسئلہ کا کوئی حل نکل سکتا تھا۔ بہر حال امیر علی کے فیصلہ اور مضمون کے بعد ہی شبلی نے اس مسئلہ کو از سر نو اٹھایا اور یہ سعی کی کہ امیر علی کے فیصلے کے مطابق حکومت قانون وقف علی الاولاد وضع کرے۔ ۱۹۰۷ء میں اس کے حق میں قائد اعظمؒ کی تقریر کے بعد (کانگریس کے اجلاس میں) شبلی کی پوزیشن مضبوط ہو گئی۔ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے ندوہ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۰۸ء میں اس قانون کے حق میں قرار داد منظور کرا لی۔ منظوری کے بعد انہوں نے عملی مساعی کا آغاز کیا۔ ایک مجلس وقف قائم کی اور جگہ جگہ جلسے منعقد کرانے کا اہتمام کیا۔ دریں اثناء منٹو مورلے سکیم کے تحت لیجسلیٹو کونسل تشکیل پا چکی تھی اور قائد اعظمؒ اس کے رکن تھے۔ چنانچہ قائد اعظمؒ نے حکومت سے اس مسئلہ پر سوال کیا۔ مگر حکومت نے اپنے طور پر ایسا کوئی قانون وضع کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اگر کسی غیر سرکاری کارکن نے بل پیش کیا تو حکومت یقیناً غور کرے گی۔ بعد ازاں قائد اعظمؒ نے خود "وقف علی الاولاد" کا بل کونسل میں پیش کیا جو قدرے ترمیم کے بعد منظور ہو گیا۔

۱۹۰۸ء میں آریہ سماجیوں نے راجپوتانہ، دلی اور اس کے نواحی علاقوں اور آگرہ وغیرہ کے بہت سے مسلمان راجپوتوں کو دوبارہ ہندومت قبول کر لینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ چنانچہ مولانا شبلی کو اسی سال پٹیالہ میں مسلمان راجپوت کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ واپسی پر علامہ شبلی نے متعدد مضامین لکھے اور اس سلسلہ میں سرگرم عمل ہو گئے۔

کانگریس سے متعلق سر سید سے اتفاق رائے کے علاوہ علامہ شبلی اس وقت بے حد محتاط رہے حتیٰ کہ نواب وقار الملک نے بنگال کی تقسیم کی تنسیخ کے بعد سیاسی حالات پر واضح طور پر اظہار خیال نہ کیا۔ اپریل ۱۹۰۵ء میں جب ندوہ کے سالانہ جلسے میں مجوزہ "جج بل" پیش کیا گیا تو علامہ شبلی نے اسے کسی حد تک سیاست میں ملوث ہونے کے برابر خیال کیا اور لکھا کہ "حجاج کی بحث چونکہ سرکاری قانون کی نسبت نکتہ چینی ہے اس لئے سیاسی ہے۔ اور جب عام طور پر یہ معلوم ہو جائے گا کہ ندوہ میں سیاسی بحثیں ہوتی ہیں تو قطعی سمجھ لیجئے کہ کل علماء متفق ہو کر بھی ندوہ کو نہیں چلا سکتے۔ اراکین انتظامیہ میں سے تمام عہدہ داران سرکاری و اراکین میونسپل وغیرہ مستعفی ہو جائیں گے اور جلسوں میں کسی کو مجال شرکت نہ ہو گی۔" اس طرح ایک عرصہ تک مولانا شبلی نہ صرف کانگریس کے معاملہ میں سر سید کے ہم خیال تھے بلکہ سیاست سے قطعی طور پر دور رہنا چاہتے تھے لیکن ۱۹۱۱ء میں انہوں نے نئی کروٹ لی۔ دسمبر ۱۹۱۱ء

میں دلی دربار کا انعقاد ہوا۔ حکومت تقسیم بنگال کو اٹل سمجھ رہی تھی لیکن اس موقعہ پر اسے منسوخ کر دیا گیا۔ بنگال کی تقسیم پر بنگالی مسلمان بہت خوش تھے۔ مگر جب اس کی تنسیخ ہوئی تو وہ بہت افسردہ ہوئے۔ مارچ ۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ نے بھی تقسیم بنگال کی تنسیخ پر احتجاج کیا۔ اسی موقعہ پر علامہ شبلی کھل کر سیاست میں آ گئے کیونکہ اب مزید احتیاط سے مسلمانوں کے مفادات پر واضح ضرب آ رہی تھی۔ علی گڑھ کے ارباب کی پالیسی تو یہ تھی کہ کانگرس سے علیحدگی اختیار کی جائے۔ علامہ شبلی کانگرس سے علیحدگی کے حق میں تو نہ تھے البتہ دیگر ہر پالیسی سے قطعی طور پر متفق تھے۔ انہوں نے لکھنؤ کے "مسلم گزٹ" میں "مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" کے عنوان سے ایک مضمون سپرد قلم کیا۔ اس مضمون میں مسلمانوں کی گزشتہ اور آئندہ پالیسی پر سیر حاصل بحث تھی۔ تاہم یہ اعتراض اس میں بھی موجود تھا کہ اگر مسلمانوں نے کانگرس میں شمولیت اختیار کی تو وہ تباہ ہو کر رہ جائیں گے بلکہ اس مضمون میں مسلم لیگ پر بھی کچھ طنز کیا گیا تھا ۔۔۔ انہوں نے کونسلوں اور یونیورسٹیوں میں مسلمان اراکین کی باتوں پر بھی اعتراض کیا ان کا کہنا تھا کہ مسلمان سطحی سوال کرتے ہیں جو نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتے جبکہ ہندو اعداد و شمار لے کر بات کرتے ہیں۔

علامہ شبلی نے قوم میں جوش و خروش پیدا کرنے اور آزادی کے جذبے کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ قوم کے خیالات میں انقلاب پیدا کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ طویل علالت کے بعد مولانا محمد شبلی ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے رحلت فرما گئے۔

مولانا عبید اللہ سندھی

۱۸۷۲ء تا ۱۹۴۴ء

جب پنجاب میں سکھوں کا زوال آیا تو بہت سے سکھ سرکاری افسر بے روزگار ہو گئے۔ انہی میں ایک گلاب رائے تھا۔ گلاب رائے کا بیٹا جسپت رائے بھی سرکاری ملازمت میں تھا۔ لہٰذا جب بے روزگاری بڑھی تو جسپت رائے کا لڑکا رام سنگھ سیالکوٹ میں آ کر آباد ہو گیا اور اس نے صرافہ کا کام شروع کر دیا۔ رام سنگھ کا کاروبار چل نکلا اور اس نے سیالکوٹ کے ایک سکھ خاندان کی لڑکی جیونی سے شادی کر لی۔۔۔ ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء کو رام سنگھ کے گھر سیالکوٹ کے موضع چیانوالی میں ایک لڑکا

پیدا ہوا جو بعد ازاں مشرف بہ اسلام ہو کر مولانا عبید اللہ سندھی کے نام سے مشہور ہوا۔

رام سنگھ بیٹے کی پیدائش کے صرف چار ماہ بعد انتقال کر گیا۔ اس کی بیوی اپنے بچوں کو لے کر پہلے ان کے دادا کے پاس رہی۔ کچھ عرصہ بعد ان کا دادا جسپت رائے بھی انتقال کر گیا۔ وہ بچوں کو لے کر ان کے نانا کے پاس چلی گئی لیکن بدقسمتی یہ کہ کچھ عرصہ بعد ہی وہ بھی مر گیا۔ اب اس نے اپنے دو بھائیوں کے گھر پناہ لی۔ یہ دونوں ڈیرہ غازی خاں میں پٹواری تھے۔

چھ سال کی عمر میں اردو سکول جام پور میں عبید اللہ کو داخل کرایا گیا اور ۱۸۸۷ء میں یہ بچہ تیسری جماعت میں ہوگیا۔ ابھی یہ بچہ مڈل سکول ہی میں تھا کہ آریہ سماج ہندو فرقہ سے تعلق رکھنے والے دوست نے اسے ایک کتاب "تحفۃ الہند" دی۔ عبید اللہ نے یہ کتاب پڑھنے کے بعد اسلام میں کشش محسوس کی اور پھر اسے جو بھی اسلامی کتاب نظر آئی، پڑھ ڈالی۔ اچانک اس نے فیصلہ کیا کہ اسے مسلمان ہوجانا چاہیے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی محسوس کیا کہ اگر اس نے اسلام قبول کر لیا تو اس کی ماں ناراض ہو جائے گی۔ لہذا وہ گھر سے بھاگ کر سیالکوٹ کے ایک گاؤں میں آباد ہوگیا۔ یہاں اسے سکول میں کسی دوست نے مولانا اسمٰعیل شہید کی کتاب "تقویۃ العوام" پڑھنے کے لئے دی۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد عبید اللہ نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ اس نے "تحفۃ الہند" کے مصنف عبید اللہ کے نام پر اپنا نام رکھا۔ وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ انہیں دائرہ اسلام میں شامل کرنے میں ایک ہندو عالم کا بڑا ہاتھ ہے جو خود کو "پنڈت مولوی" کہا کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ مدرسہ کے ایک مسلمان طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحیم شاہ پہنچے۔ چند دن کے بعد جب ان کے رشتہ داروں نے ان کے مسلمان ہونے پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا تو وہ سندھ چلے گئے۔ سندھ میں حافظ محمد صادق کے شاگرد ہو گئے۔ انہوں نے عبید اللہ کو بیک وقت ماں اور باپ کا پیار دیا۔ انہی کی وجہ سے بعد میں وہ حضرت شیخ الہند کی شاگردی میں آئے۔ ۱۷ سال کی عمر میں دارالعلوم دیو بند میں داخل ہو گئے۔ شیخ الہند سے انہوں نے اتنا اثر لیا کہ وہ زندگی بھر ان کے قریب رہے۔ یہاں سے امتحان پاس کر کے وہ گنگوہا چلے گئے مگر کچھ عرصہ بعد ہی علالت کی وجہ سے دلی لوٹ آئے۔ یہاں انہیں حافظ محمد صدیق کی اچانک وفات سے شدید صدمہ پہنچا۔ سکھر میں قیام کے دوران انہوں نے اسلامیہ سکول کے ایک مدرس محمد عظیم خاں کی صاحبزادی سے شادی کر لی۔ اس موقع پر انہوں نے

منت سماجت کرکے اپنی والدہ کو بھی بلایا۔ انہوں نے اپنے مطالعاتی دور میں مولانا اسمٰعیل شہید سے بے حد اثر قبول کیا۔ مولانا عبیداللہ کے خیال میں موخرالذکر کی تحریروں میں اسلامی اور انقلابی عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے اپنی سیاسی زندگی کے لائحہ عمل کی بنیاد مولانا اسمٰعیل شہید کی تحریروں ہی کو بنایا

۷سال تک امروٹ کے ایک دینی مدرسہ میں پڑھانے کے بعد وہ دیوبند واپس چلے گئے اور وہاں تین چار سال تک تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ دلی کر دیا گیا اور شیخ الہند کی خواہش پر مولانا عبیداللہ نے دتی کے نوجوان دانشوروں سے ربط قائم کر لیا۔ یہ وُہ نوجوان تھے جو مسلمانوں کے لئے جدوجہد میں پیش پیش تھے۔ یہیں پر مولانا کے مراسم مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری اور نواب وقار الملک کے ساتھ ہوئے۔ مولانا نے دلی کی مسجد فتح پوری میں مذہبی علوم کی تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہاں پر ان کے لیکچر سننے کے لئے بہت سے مسلمان، اور بالخصوص نوجوان آتے رہتے۔ تدریس کے دوران مولانا نے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی تبلیغ بھی شروع کر دی۔ اس الزام میں مولانا پر نہ صرف کڑی نگرانی شروع کر دی گئی بلکہ بعد ازاں انہیں گرفتار کر کے مدرسہ بھی بند کر دیا گیا۔ مولانا تیس سال تک پڑھاتے بھی رہے اور انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی آزادی کے لئے منصوبہ بندی کو بھی اپنا شعار بنائے رکھا۔ وہ ہندوستان اور بیشتر مسلمان ممالک پر مغربی غلبہ کے باعث روحانی تڑپ میں مبتلا رہتے۔ برطانوی سامراج کے خلاف ان کے رگ و پے میں ایک نئی انقلابی رُوح کروٹیں لیتی رہی۔ یہی وجہ تھی کہ ان پر خفیہ پولیس کی مسلسل اور کڑی نگرانی رہنے لگی۔ ان کی نظریں اُس وقت پر تھیں جب غیر ملکی سامراج کا سایۂ استبداد مطلعِ ہند سے ختم ہو تاکہ مسلمان ایک آزاد اور خودمختار و باوقار قوم کی حیثیت سے سانس لے سکیں۔

اچانک انہیں شیخ الہند نے ہدایت کی کہ وہ کابل چلے جائیں۔ مولانا کو یہ علم نہ تھا کہ کابل میں ان کا پروگرام کیا ہوگا۔ تاہم انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی آمد کے بارے میں پہلے ہی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ چونکہ جب وہ ہندوستان سے افغانستان پہنچے تو وہاں ان کا خیر مقدم بڑی گرم جوشی کے ساتھ کیا گیا۔ نیز حکومت کابل نے بھی ان کے ساتھ مکمل تعاون کیا۔

۱۹۱۶ء میں شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ نے مولانا کو ہدایت کی کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاسی کردار ادا کریں۔ چنانچہ مولانا آل انڈیا نیشنل کانگرس کے رُکن ہو گئے۔ ۱۹۲۲ میں انہوں نے کابل میں ڈاکٹر انصاری کے تعاون سے کانگرس شاخ کی بنیاد رکھی۔ اس شاخ کے آغاز کا فیصلہ کانگرس کے گیا کے اجلاس میں کیا گیا تھا۔ اس وقت شاہ افغانستان امیر امان اللہ خاں تھے۔ قریباً ایک سال بعد مولانا ماسکو چلے گئے۔ سات ماہ قیام کے دوران مولانا نے اشتراکیت کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا۔ اس بارے میں مولانا نے خود لکھا ہے کہ:

"گو مجھ پر اشتراکیت نے اپنا اثر کیا تھا لیکن شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کا اثر تھا کہ میرا اپنا عقیدہ راسخ رہا۔ اور میں نے اپنے سیاسی و مذہبی ایقان میں کسی "ازم" کو در نہ آنے دیا"

اسی دوران روس میں ترکی کے سفیر سے ان کے تعلقات ہو گئے۔ مولانا کو ترکی جانے کی اجازت مل گئی اور حکومت ترکی نے نہایت رازداری سے کام لیتے ہوئے ان کے سفر کا پروگرام مرتب کر لیا۔ دراصل بات یہ تھی کہ حکومتِ برطانیہ مولانا کو اپنے لئے ایک خطرناک آدمی تصوّر کرتی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو انگریز کے سامراجی عزائم اور اس کی غلامی کے سامنے دیوار بن کر حائل ہونے کی کوشش کرتا۔ وہ خطرناک تصوّر کیا جاتا کیونکہ مولانا نے بھی انگریز کے ناپاک ارادوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا تھا اس لئے انگریز کی نظر میں وہ زندگی بھر ایک خطرناک آدمی رہے۔ ترکی میں مولانا کا قیام ۳ سال تک رہا جہاں وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے مسلسل منصوبہ بناتے رہے۔ نیز دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو بھی مغربی سامراج کے خلاف جہاد کرنے کی تلقین کرتے رہے۔

مکّہ میں عالمی مسلم کانگرس کا اجلاس منعقد ہوتا تھا۔ مولانا کے خیال میں دنیا بھر کے مسلمان رہنماؤں سے ملنے اور مسلمانوں کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ چنانچہ انہوں نے اٹلی کے راستے ترکی سے مکّہ کا سفر اختیار کیا۔ لیکن برطانیہ کی خفیہ پولیس کے مخبر ان کی مسلسل نگرانی کر رہے تھے۔ سفر کے دوران مولانا کے راستے میں ان لوگوں نے اتنی رُکاوٹیں پیدا کیں کہ کانگرس کا اجلاس ختم بھی ہو گیا مگر مولانا سفر ہی میں رہے جب وہ مکّہ پہنچے تو کچھ مسلمان رہنما ابھی وہاں موجود تھے۔ لہٰذا مولانا کو ان سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا تھوڑا بہت

موقع مل گیا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ــــــ ۱۹۳۵ء کے بعد

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء شائع ہو چکا تھا اور اب یہ توقع کی جاتی تھی کہ پہلی مرتبہ عوامی وزارتیں تشکیل پائیں گی نیز صوبوں اور مرکز میں عوام کو کام کرنے کا موقع مل جائے گا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں بیداری پیدا ہو چکی تھی اور انگریز کو بھی یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ عوام کے مطالبات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا نیشنل کانگرس نے ہندوستان میں مولانا عبیداللہ کے داخلے پر پابندی اٹھانے کا پُرزور مطالبہ کیا۔ اس مطالبے کی حمایت ہر طرف سے کی گئی۔ ۱۹۳۷ء میں صوبائی خود مختاری کے تحت کام ہو رہا تھا اور کچھ صوبوں کی حکومتوں نے حکومت برطانیہ سے یہ سفارش کی تھی کہ مولانا کو ہندوستانی پاسپورٹ جاری کیا جائے۔ انگریز کو یہ مطالبہ منظور کرنا پڑا۔ اس طرح یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو مولانا کے لئے ہندوستانی پاسپورٹ جاری کر دیا گیا۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں جب مولانا ۲۴ سال کی جلاوطنی کے بعد ۶۷ سال کی عمر میں ہندوستان پہنچے تو ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔

مولانا کی ہندوستان میں آمد کے بعد انگریز کی پرانی تکلیف عود کر آئی۔ انگریز جس بات سے خائف رہتا تھا، مولانا نے وہی بات شروع کر دی یعنی مسلمانوں میں اس بات کی تبلیغ شروع کر دی کہ وہ خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہیں اور اس کے رسولؐ کی تعلیمات کو فراموش نہ کریں۔ کیونکہ مسلمان کے لئے صرف مادی خوشحالی سود مند نہیں تا وقتیکہ وہ اپنے اندر سے دیگر تمام خرابیوں کو ختم نہیں کر دیتا ورنہ اس کے مسائل کا لامتناہی سلسلہ جاری رہے گا۔ مولانا نے ہندوستان کے کاشت کار اور کارکن طبقہ کا معیار زندگی بہتر بنانے کی طرف بھی توجہ دی۔

سندھ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کا جو کھلا اجلاس ۱۲۔ جولائی ۱۹۴۰ء کو ٹھٹھہ میں منعقد ہوا۔ اس سے مولانا نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

" گزشتہ پچاس سال سے سندھ میرا وطن ہے کیونکہ اسی سرزمین نے میرے روحانی باپ کو جنم دیا۔ آپ لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایک ہندو پنڈت نے مجھے یہ بتایا کہ اسلام کیا ہے۔ جب میں نے استمبول سے لالہ لاجپت رائے کو خط لکھا تو وہ پنجاب سے چلے اور مجھے

ملنے گئے لئے ترکی پہنچے۔ یورپ سے واپسی کے بعد ہیں نے مشاہدہ کیا کہ دیوبند اور علی گڑھ کے مسلمانوں کے درمیان زبردست اختلافات پیدا ہو چکے ہیں لیکن میں ایمان داری سے سمجھتا ہوں اور کانگرس ہی کی سٹیج سے برملا کہتا ہوں کہ ان اختلافات کی خلیج کو وسیع کرنے میں کانگرس نے اہم کردار ادا کیا ہے جبکہ کانگرس کا فرض تو یہ تھا کہ وہ ان اختلافات کو ختم کرانے کی کوشش کرتی۔"

اسی طرح مولانا نے کئی مواقع پر گاندھی جی سے اختلافات کا اظہار کیا۔ انہوں نے صاف طور پر کہا کہ اگر گاندھی جی اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ ہندوستان کو کئی ہزار سال پہلے کا ہندوستان بنا دیں گے تو وہ یہ بھولتے ہیں کہ ہندوستان میں گزشتہ ۸۰۰ سال سے ایک اور قوم بھی آباد ہے جس کی زبان، مذہب، ثقافت اور سوچ کا انداز اس قوم سے مختلف ہے۔ جو گاندھی جی کی قوم ہے۔

اس کے بعد مولانا نے ایک نئی سیاسی جماعت جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی تشکیل کی۔ اس پارٹی کے مقاصد بیان کرتے ہوئے مولانا نے صاف طور پر کہا کہ ہندوستان کو کسی قیمت پر ایک ملک تصور نہیں کرنا چاہئے بلکہ اسے یورپ کی طرح لسانی اور ثقافتی بنیادوں پر تقسیم کرنا ضروری ہے۔ انہوں نے اس پارٹی کے لئے ایک نہایت ٹھوس سماجی و اقتصادی پروگرام مرتب کیا۔

پنڈت جواہر لعل نہرو نے اپنی خود نوشت میں مولانا عبیداللہ سندھی کے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا:

"مولوی عبیداللہ سے میری مختصر سی ملاقات اٹلی میں ہوئی۔ میں نے ان کی ذہانت اور قابلیت کے باوجود یہ محسوس کیا کہ وہ جدید تصورات نہیں رکھتے۔ انہوں نے مجھ سے یونائیٹڈ ری پبلک آف انڈیا کی سکیم کا ذکر بھی کیا۔ میرے خیال میں مولوی عبیداللہ کی طرف سے فرقہ وارانہ مسائل کے حل کی یہ ایک قابل قدر کوشش تھی۔ مولوی عبیداللہ نے مجھے اپنی استنبول کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی بتایا۔ لیکن میں نے ان سرگرمیوں کو خاص اہمیت نہ دی اور جلد ہی یہ بات میرے ذہن سے اتر گئی۔ چند ماہ بعد ترکی میں مولوی عبیداللہ کی ملاقات لالہ لاجپت رائے سے ہوئی تو مولوی عبیداللہ نے انہیں بھی اپنی ان سرگرمیوں کا قصہ سنایا۔ لالہ جی ان سرگرمیوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ لیکن ایک وقت وہ آیا جب انہی سرگرمیوں کے تذکرے نے انڈین کونسل کے انتخابات میں اہم کردار ادا کیا۔"

مولانا عبیداللہ سندھ کا دورہ کر رہے تھے۔ اس دوران انہوں نے طلبہ سے خطاب

کرتے ہوئے کہا:

"میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کے لئے انگریزی اور مغربی و سائنسی علوم سیکھنا بہت ضروری ہے تاکہ آپ کو یہ علم ہو کہ یورپ میں کون سی انقلابی تحریکیں جنم لے رہی ہیں۔ ہندوستان میں بھی آپ کو اسی قسم کے انقلاب کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔"

جب مولانا کراچی واپس آئے تو ان کی صحت بہت بگڑ چکی تھی ان کا زیادہ وقت بستر میں گزرتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کام کرتے رہے اور دوروں پر بھی جاتے رہے۔ آخر ۲۲ اگست ۱۹۴۴ء کو ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ انہیں ضلع بہاولپور کے موضع دین پور میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

علّامہ اقبالؒ

(۱۸۷۳ء تا ۱۹۳۸ء)

علامہ محمد اقبالؒ ۲۲۔فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد نے قریباً تین سو سال پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ بنیادی طور پر اس خاندان کا تعلق کشمیری برہمنوں سے تھا۔ اقبالؒ نے ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی۔ ایک مشہور عالم شمس العلماء میر حسن ان کے استاد تھے جنہوں نے اقبالؒ کی ذہانت اور ان کے اندر چھپے ہوئے جوہر کو پہچانا اور ان کی تعلیم کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں اقبالؒ کو شاعری سے مس ہوا اور وہ اپنی نظمیں حضرت داغؔ کو اصلاح کے لئے بھیجتے رہے۔ اکثر اوقات یہ ہوتا کہ داغؔ ان کی منظومات اصلاح کے بغیر واپس کر دیتے کیونکہ اصلاح کی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ مکتب کی تعلیم کے بعد اقبالؒ نے مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا، جہاں سے ۱۸۹۷ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور دو سال بعد ایم۔ اے کر لیا۔ فوراً بعد انہیں اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ کا مدرس مقرر کر دیا گیا۔ تاریخ کے علاوہ وہ فلسفہ اور انگریزی بھی پڑھاتے رہے۔ ۱۹۰۰ء میں انہوں نے پہلی بار انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں اپنی نظم "نالۂ یتیم" سنائی۔

اقبالؒ اپنی زندگی ہی میں سر تھامس آرنلڈ سے بہت متاثر تھے۔ ۱۹۰۵ء تک اورینٹل کالج لاہور

میں تدریس کے بعد سر تھامس آرنلڈ کے مشورے پر وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے۔ وہاں انگریزی اور جرمنی ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہاں قیام کے دوران انہیں بہت سے ممتاز دانشوروں سے تبادلۂ خیال کا موقع بھی ملا۔ یہ وہی دور تھا جب علامہ اقبالؒ کو خود غرضی اور تنگ نظر جذباتِ قوم پرستی سے نفرت پیدا ہوئی۔ ان کے خیال میں یورپ کے اندر سیاسی ہنگاموں اور انتشار کی بنیادی وجہ اسی قسم کے نظریات تھے۔ کیمبرج سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے میونخ سے ڈاکٹریٹ کیا اور بیرسٹری کی سند حاصل کر لی۔ لندن یونیورسٹی کی دعوت پر انہوں نے کچھ عرصہ عربی پڑھائی۔ اس دوران انہیں ایک فلسفی کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل ہو چکا تھا۔ انہوں نے لندن کے کیکسٹن ہال میں متعدد لیکچر بھی دیئے۔ ۱۹۰۸ء میں لاہور واپسی پر اچھی سے اچھی ملازمتوں کی پیشکش کی گئی۔ کچھ عرصہ تک وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی ادب کے جزوقتی پروفیسر کی حیثیت میں پڑھاتے رہے اور ساتھ ہی وکالت بھی کرتے رہے مگر انہوں نے جلد ہی محسوس کیا کہ اگر قوم کی خدمت بھی کرنا ہے تو ملازمت جاری رکھنا مشکل ہوگا۔ ۱۹۱۱ء کے بعد انہوں نے ملازمت ترک کر دی۔

علامہ اقبال کی سیاسی زندگی کا آغاز ان کے قیامِ انگلستان کے دوران ہی ہو گیا تھا۔ وہاں جب سید امیر علی نے آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی تو علامہ اقبال مسلم لیگ کی برطانوی کمیٹی کے سرگرم کارکن رہے۔ یہ کمیٹی انگلستان کے عوام اور سیاسی رہنماؤں میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کی راہ ہموار کر رہی تھی۔ جب وہ لاہور پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ مسلم لیگ کی صوبائی شاخ جس کے صدر مولوی شاہ دین اور سیکریٹری سر محمد شفیع تھے، خوب کام کر رہی تھی۔ علامہ اقبال نے مسلم لیگ کی رکنیت قبول کی اور سرگرمی کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ اس دوران انہیں ایک فلسفی اور شاعر کے طور پر ممتاز مقام حاصل ہو چکا تھا۔

ایک ممتاز انگریز گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر کا خاص مہمان تھا۔ گورنر نے علامہ اقبال کو مدعو کیا اور اپنے مہمان سے متعارف کرایا۔ یہ مہمان علامہ اقبال کے فکر کی گہرائی، فلسفہ اور شاعری سے اس درجہ متاثر ہوا کہ جونہی اقبال وہاں سے رخصت ہوئے اس نے گورنر سے شکوہ کیا کہ اتنے قابل شخص کی اس درجہ ناقدری کیوں کہ آج تک اسے کسی عزت سے نہیں نوازا گیا؟ کچھ عرصہ بعد ہی علامہ اقبال کو سر کا خطاب دے دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء کے بعد انہوں نے حیدرآباد، علی گڑھ اور مدراس میں

متعدد لیکچر دیئے جو بعد ازاں کتابی صورت میں شائع کر دیئے گئے۔ تین چار سال بعد انہوں نے یورپ کا دورہ کیا۔ سپین گئے اور یروشلم میں منعقدہ اسلامی کانفرنس میں شرکت کی۔

۱۹۲۶ء کے انتخابات میں وہ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے لئے منتخب ہو گئے۔ اسمبلی کے ۵۔ مارچ ۱۹۲۷ء کے بجٹ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے دیہی علاقوں کی صفائی اور عورتوں کے لئے طبی امداد پر زیادہ رقم صرف کرنے پر زور دیا اور کہا کہ تاج پہنائے اور اتارے جاتے رہے ہیں۔ لیکن صرف عوام مستقل حیثیت کے حامل ہیں۔ علامہ اقبال نے سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے گنجائش پیدا کرنے پر بھی بہت زور دیا۔ ۱۹۔ جولائی ۱۹۲۷ء کو انہوں نے کھلے مقابلوں کے ذریعہ سرکاری ملازمتیں پُر کرنے کے بارے میں ایک "تحریک" پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:

"اس ملک کی حالت ایسی ہے کہ ہمارے لئے مقابلے کے عام اور مروج طریق کار کو اپنانا ممکن نہیں۔ اس ملک کے لئے بہتر یہ ہے کہ نامزدگیوں کے ذریعے سرکاری آسامیاں پُر کی جائیں۔"

۴۔ مارچ ۱۹۲۹ء کو انہوں نے اسمبلی میں ایک اور تقریر کرتے ہوئے تعلیمی حالات کو مایوس کن قرار دیا اور اس امر کی مذمت کی کہ تعلیم کے معاملے میں مسلمانوں کے پسماندہ سکول صرف ۲۲ فیصد سرکاری گرانٹ حاصل کر رہے ہیں۔ تعلیم پر جو رقم خرچ کی جاتی ہے اس کی مساوی تقسیم ضروری ہے بالخصوص ان علاقوں میں جہاں کے لوگ پسماندہ ہیں اور تعلیمی اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ ۷۔ مارچ ۱۹۳۰ء کو صوبہ کی نازک اقتصادی حالت کے بارے میں کہا کہ یہ صوبہ مقروض ہے، بے روزگاری میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور تجارت غیر تسلی بخش ہے۔ انہی حالات سے صوبہ کے اقتصادی مستقبل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ صنعتی ترقی پر کچھ بھی خرچ نہیں کیا جاتا جب کہ اسی ترقی کے ذریعے بے روزگاری پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

جن دنوں علامہ اقبال پنجاب اسمبلی کے رکن تھے، انہی دنوں وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری بھی منتخب کر لئے گئے۔ ۳۔ فروری ۱۹۲۸ء کو سائمن کمیشن بمبئی پہنچا تاکہ ہندوستان میں آئینی اصلاحات کے سلسلہ میں مقامی رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں کے خیالات کا علم ہو سکے۔

سائمن کمیشن کے سامنے رکھی جانے والی تجاویز کے تعین کے لئے مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا لیکن علامہ اقبال اور دیگر ارکین مجلس عاملہ کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ مجلس عاملہ نے سائمن کمیشن کے روبرو تجاویز پیش کرنے کے لئے جو قرار دادیں منظور کیں، اقبال کو ان سے اختلاف تھا لہٰذا ۲۲۔ جون ۱۹۲۸ء کو انہوں نے اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ انہوں نے استعفا میں اپنی کمزور بینائی کے پیش نظر کام کرنے سے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ "اخبارات میں مسلم لیگ کی طرف سے یادداشت کا جو اقتباس شائع ہوا اس میں مکمل صوبائی خود مختاری کا کوئی مطالبہ نظر نہیں آتا۔ اس یادداشت میں ایک ایسی وفاقی طرزِ حکومت کی تجویز پیش کی گئی ہے جس میں قانون اور انصاف گورنر کے براہِ راست چارج میں دے دیئے گئے ہیں۔ واضح ہوتا ہے کہ کوئی آئینی پیش قدمی نہیں کی گئی۔ لہٰذا میں محسوس کرتا ہوں کہ ان حالات میں مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کے اتنے ذمہ دار عہدے پر فائز نہیں رہنا چاہیئے۔

علامہ اقبال ان اختلافات کے باوجود آل انڈیا مسلم لیگ کے نظریات اور اصولوں سے وفادار رہے۔ ۱۹۳۰ء میں انہیں الہ آباد مسلم لیگ کے عام اجلاس کی صدارت کے لئے مدعو کیا گیا اس اجلاس میں علامہ اقبال کا خطبۂ صدارت تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اقبال کا خطبہ الہ آباد

"مذہبی گروہوں کے وجود کی ٹھوس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر یورپی جمہوریت کا کوئی اصول ہندوستان پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں کیلئے ایک علیحدہ مسلم ہندوستان تخلیق کیا جائے، قطعی طور پر جائز اور مناسب ہے۔ میرا خیال ہے کہ دلی میں تمام مسلمان جماعتوں کی کانفرنس (آل پارٹیز مسلم کانفرنس) کی قرارداد اسی جمعیتِ کاملہ کے اعلیٰ تصور کی پیداوار ہے۔ قرارداد تمام اجزاء کی انفرادیت کو ختم کرنے کی جگہ یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ یہ اجزاء اپنی تمام تر پوشیدہ اور زیرِ تعطل صلاحیتوں کو روبہ عمل لائیں۔ مجھے اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ آج کا یہ اجلاس ان تمام مطالبات کی تصدیق کرے گا جو مسلم مطالبات کی حیثیت میں اس قرارداد کے اندر موجود ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے

میں اس قرارداد میں مندرج مطالبات سے بھی کچھ آگے بڑھوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ صوبہ پنجاب، صوبہ سرحد، صوبہ سندھ اور صوبہ بلوچستان کو یکجا کر کے ایک علیحدہ ریاست کی صورت دے دی جائے۔ انگریز سلطنت کے اندر مسلمان خود اختیار حکومت یا انگریز حکومت سے الگ شمال مغرب میں مسلمانوں کی نئی حکومت کی تشکیل ہی میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے قطعی مستقبل پوشیدہ ہے۔ نہرو کمیٹی نے اس تجویز کو صرف اس لئے مسترد کر دیا کہ اس تجویز کے نفاذ کی صورت میں ایک اتنی بڑی ریاست وجود میں آ جائے گی جسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تعداد سات کروڑ ہے اور ہر اعتبار سے باہم یکساں ــــ اور کوئی ایسا عنصر ہندوستان میں موجود نہیں۔ ہندوستان میں صرف مسلمان ہی نہیں جن کو 'قوم' کے جدید ترین معانی کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے ہمیں تسلیم ہے کہ ہندو ہم سے ہر معاملے میں آگے ہے لیکن ہندو کے اندر وہ یکسانیت موجود نہیں جو ایک قوم کا خاصہ ہوتی ہے جبکہ یہ چیز مسلمان کو اس کے مذہب کی طرف سے تحفہ کے طور پر ملی ہے۔

علامہ اقبال نومبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے انگلستان گئے۔ یہاں علامہ اقبال نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور زیادہ سے زیادہ آئینی اصلاحات کی بھرپور وکالت کی۔ وہ ایسے بہت سے ہندوستانیوں سے بھی ملے جو گزشتہ تیس پینتیس برس سے انگلستان میں آباد تھے۔ ان لوگوں نے وہاں اقبال ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن تشکیل کر رکھی تھی۔ جب علامہ اقبال لندن گئے تو اس انجمن کی طرف سے ان کا خیر مقدم بڑی گرم جوشی کے ساتھ کیا گیا۔ انجمن کی ایک دعوت میں انگلستان کی ممتاز و سرکردہ شخصیات اور نمایاں ہندوستانی رہنما بھی موجود تھے۔ اسی موقع پر تقریر کرتے ہوئے قائد اعظمؒ نے علامہ اقبالؒ کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ ۱۹۳۲ء میں علامہ اقبالؒ تیسری گول میز کانفرنس میں دوبارہ شرکت کی ــــ غرض وہاں سے انگلستان پہنچے۔ قائد اعظم اس وقت وہیں موجود تھے اور انہوں نے ہندوستانی سیاست سے قریباً کنارہ کشی اختیار کر لی تھی وہاں علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے درمیان متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور دونوں رہنما اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ گول میز کانفرنسیں مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت نہیں کر سکتیں۔ ۱۹۳۲ء میں اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت کی اور اس کانفرنس میں بھی اپنے اس موقف کا اعادہ کیا کہ وہ اس نیشنلزم کے شدید مخالف ہیں جسے یورپ میں جانا جاتا ہے۔ کیونکہ یورپ میں قومیت کا تصور محض مادیت پر ہے جب کہ اصل بنیاد

انسان کے ایمان و یقین، اس کی تہذیب اور اس کی تاریخی روایات پر ہوتی ہے۔

حکومتِ کشمیر کی مسلمانوں کے بارے میں نامناسب پالیسی نے مسلمانوں کی مشکلات میں اضافہ کر کے ان کے لئے مصائب کے دور کا آغاز کر دیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے ۰۔ جون ۱۹۳۴ء کو حکومت کشمیر کی مسلم دشمن پالیسی کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان رہنماؤں کی گرفتاریاں، عوام پر ظلم و تشدد اور فائرنگ اور بچوں اور عورتوں پر ناروا مظالم کے باعث کشمیر میں وہی حالات پیدا ہو سکتے ہیں جو کرنل کالون کی پالیسی سے پیدا ہو گئے تھے۔ اگر حکومت کشمیر، کشمیری مسلمانوں کے عدم اطمینان کی وجوہات کو نفسیاتی پس منظر میں جانچنے کی کوشش کرے اور مناسب رویہ اختیار کرے تو امن بحال ہو سکتا ہے۔ ۲۰۔ جون ۱۹۳۴ء کو انہوں نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے استعفاء دے دیا۔

اپریل ۱۹۳۶ء میں جب قائد اعظمؒ، علامہ اقبالؒ کی قیام گاہ لاہور پر ملنے کے لئے تشریف لائے تو انہوں نے علامہ اقبالؒ سے انتخابات لڑنے کے لئے پارلیمانی بورڈ کے قیام پر تبادلۂ خیال کیا۔ علامہ اقبالؒ فوری طور پر آمادہ ہو گئے۔ مئی ۱۹۳۶ء میں جب قائد اعظمؒ پنجاب میں سیاسی مشن پر تھے تو دشمنوں نے یہ افواہ اڑائی کہ بہت سے لوگ قائد اعظمؒ کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ اس موقع پر علامہ اقبال، ملک برکت علی، خلیفہ شجاع الدین، غلام رسول خاں اور پیر تاج الدین نے اخبارات کے نام ایک بیان جاری کیا جس میں واضح طور پر اس افواہ کی تردید کی گئی اور کہا گیا کہ پنجاب کے مسلمان قائد اعظمؒ اور مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ نیز ان کی قیادت اور دیانت داری پر بھرپور اعتماد رکھتے ہیں۔ اسی دن یعنی ۸۔ مئی پنجاب صوبائی مسلم لیگ کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت علامہ اقبالؒ نے کی۔ اجلاس نے انہیں متفقہ طور پر مسلم لیگ کا صدر چن لیا۔ ۲۱ مئی ۱۹۳۶ء کو قائد اعظمؒ نے سری نگر سے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اراکین کے ناموں کا اعلان کر دیا۔ پنجاب کے نمائندوں میں علامہ اقبال سرِفہرست تھے۔

مرکزی پارلیمانی بورڈ اور کونسل کا اجلاس لاہور میں ۸۔ جون ۱۹۳۶ء کو منعقد ہونا تھا۔ ان میں قائد اعظم کو بھی شرکت کرنا تھی۔ یہ افواہ گرم تھی کہ قائد اعظم کی آمد پر انگریزوں کے پٹھو یونینسٹ (جن کی قیادت میاں فضل حسین کر رہے تھے) سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ مظاہرہ کرنے کا پروگرام ترتیب کر رہے تھے۔ اس وقت علامہ اقبال کی صحت بھی خاصی خراب تھی۔ جب اس مجوزہ مظاہرے

کی اطلاع ملی تو علامہ اقبال نے ملک لال دین قیصر کو ذاتی نمائندے کی حیثیت ہیں یونینسٹ رہنماؤں کے پاس بھیجا اور اُن پر واضح کر دیا کہ اگر اس قسم کے کسی اقدام کی جرأت کی گئی تو نتائج انہی کے لئے سنگین ہوں گے۔ چنانچہ یونینسٹ مظاہرے کا ارادہ ترک کرنے پر مجبور ہو گئے۔ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ اجلاس اسلامیہ کالج کے ہال میں منعقد ہو گا۔ یہ کالج انجمن حمایت اسلام کی سرپرستی میں چل رہا تھا۔ نواب مظفر علی خاں نے جو کٹر یونینسٹ تھے، موقع غنیمت جانتے ہوئے مسلم لیگ کا اجلاس ہال میں کرنے کی اجازت نہ دی۔

علامہ اقبال نے جون ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء تک قائدِ اعظمؒ کو جو خطوط تحریر کئے اب وہ تحریک پاکستان کی تاریخ میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

۱۹۳۷ء میں علامہ اقبال کی بینائی کافی حد تک جواب دے چکی تھی۔ انہوں نے ایک خط میں قائد اعظمؒ سے معذرت طلب کرتے ہوئے اجازت چاہی کہ انہیں مسلم لیگ کی خدمات سے سبکدوش کر دیا جائے۔ تاہم ان کی تمام تر ہمدردیاں اور مشورے تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کے لئے وقف رہے۔ ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہ عظیم فلسفی، رہنما، شاعر اور تحریک آزادی کا سرگرم کارکن اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا، جسے بادشاہی مسجد کے احاطے میں دفن کر دیا گیا۔

شیرِ بنگال مولوی فضل الحق

(۱۸۷۳ء تا ۱۹۶۲ء)

اے، کے فضل الحق کے آباؤ اجداد کا تعلق ضلع باریسال کے ایک قریبی موضع چاکر سے تھا۔ فضل الحق کی پیدائش ۲۶۔ اکتوبر ۱۸۷۳ء کو ستوریہ میں ہوئی۔ ان کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ہی ان کے والد وکالت کے سلسلہ میں مستقلاً باریسال چلے آئے۔ ان کا شمار چوٹی کے قانون دانوں میں ہوتا تھا۔ بعد ازاں انہیں وکیل سرکار مقرر کر دیا گیا۔

فضل الحق کی ابتدائی تعلیم مکتب میں قرآن کریم، اسلامیات، عربی اور فارسی سے ہوئی۔ اس کے بعد وہ باریسال ضلع سکول میں داخل ہو گئے۔ ۱۴ سال کی عمر میں میٹرک کرنے کے بعد اگلے سال ہی انہوں نے ایف اے کر لیا اور ڈھاکہ ڈویژن میں اوّل آئے۔ بی اے کرنے کے

بعد ایم اے کیا اور کلکتہ یونیورسٹی کے ممتحن مقرر ہو گئے۔ انہوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور کلکتہ ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔ انہیں مالی اعتبار سے پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑا کیونکہ ان کے والد خاصی جائداد چھوڑ کر فوت ہوئے تھے۔ نیز ان کو وکالت سے بھی معقول آمدن ہو جایا کرتی تھی۔

وکالت کے دوران مولوی فضل الحق نے محسوس کیا کہ بنگالی مسلمانوں کی پسماندگی کی ایک بڑی وجہ تعلیم کا فقدان ہے۔ اس صورت حال سے متاثر ہو کر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی تمام زندگی مسلمانوں کی خدمت اور اُن کی تعلیمی ترقی کے لئے وقف کر دیں گے۔ سب سے پہلے انہوں نے ایک جریدہ 'بالک' کے نام سے شائع کیا۔ اس طرح پہلی بار ـــ باریسال کے حلقوں میں عوام کے ساتھ ان کے تعارف کا آغاز ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ہی وہ باقرگنج ڈسٹرکٹ بورڈ کے رکن منتخب ہو گئے۔ پھر باریسال میونسپلٹی کے کمشنر منتخب ہوئے۔

۱۹۰۶ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا تو اس اجلاس میں ملک کی اہم مسلمان شخصیات نے شرکت کی۔ کانفرنس کے تمام انتظامات ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ خاں کے ہاتھ میں تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے چند مسلمان نوجوانوں کو بطور رکن جمع کیا۔ انہی میں فضل الحق بھی شامل تھے۔ نواب سلیم اللہ ـ فضل الحق کی گرم جوشی اور ذہانت سے بہت متاثر ہوئے۔ یہ وہی اجلاس تھا جس کی صدارت ہز ہائی نس آغا خاں نے کی تھی اور درحقیقت اسی کانفرنس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ چند ماہ بعد باقاعدہ طور پر مسلم لیگ کا قیام عمل میں آ گیا۔ قیام مسلم لیگ کے بعد چار افراد پر مشتمل ایک آئین ساز کمیٹی تشکیل کی گئی۔ فضل الحق اس کمیٹی کے ایک جائنٹ سیکریٹری تھے۔ فضل الحق نے ... نواب وقار الملک کے ساتھ مل کر مسودۂ آئین تیار کیا۔ یہی مسودۂ آئین بعد ازاں ہندوستان کے مسلمانوں کے نمائندہ اجلاس نے متفقہ طور پر منظور کیا۔ جب فضل الحق کو ڈپٹی مجسٹریٹ بنایا گیا اس وقت وہ ڈھاکہ میں تھے۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ جمال پور کر دیا گیا۔ اس دوران جمال پور میں ہندو مسلمان فسادات ہو گئے ـــ مگر فضل الحق بے خوف ہو کر مسلمانوں اور ہندوؤں کے محلوں میں جاتے رہے۔ اس طرح وہ دونوں میں امن بحال کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد انہیں مداری پور میں اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز مقرر کیا گیا مگر جب رجسٹرار کی اسامی خالی ہوئی تو حکومت نے اپنی ہندو نواز پالیسی کے تحت ایک جونیئر ہندو کو رجسٹرار لگا دیا۔ چنانچہ فضل الحق نے اس ناانصافی کے خلاف بطور احتجاج استعفیٰ دے کر کلکتہ میں دوبارہ وکالت کا آغاز کر دیا۔ اس طرح انہیں تنسیخ تقسیم بنگال کے خلاف بھی کام کرنے کا موقع مل گیا۔

۱۹۱۳ء میں ڈھاکہ ڈویژن سے بنگال کی صوبائی کونسل کے لئے ایک نشست خالی ہوئی۔ رائے وہی کا حق جائداد کی اہلیت کی بنا پر دیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رائے دہندگان کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی۔ ان کا براہِ راست مقابلہ ایک نہایت بااثر ہندو، کمار مہندر ناتھ مِتّرا کے ساتھ تھا۔ فضل الحق اس کے مقابلے میں آزاد امیدوار تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے ہندو مدمقابل کو شکست دے کر کامیابی حاصل کر لی۔ کونسل میں ان کی پہلی تقریر بجٹ سے متعلق تھی۔ انھوں نے کہا "جہاں تک حکومت میں مسلمانوں کی شرکت کا سوال ہے تو اس سلسلہ میں حکومت ان سے ناانصافی کر کے سخت غلطی کر رہی ہے۔ مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں تمام تر سرکاری سرپرستی سے محروم کرکے انہیں پسماندہ رہنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اگر حکومت نے یہی رویہ قائم رکھا تو اس کا نتیجہ مسلمانوں میں بے اطمینانی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ حکومت اس بے اطمینانی اور بددلی کو بھی نظرانداز کر دے۔ ڈھاکہ میں محمڈن کالج اور کلکتہ میں اوّل درجے کا ایک کالج مسلمانوں کے لئے ہونا ضروری ہے۔ طلبہ کے لئے ہوسٹل کا قیام بھی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں سرکاری امداد حاصل کرنے والے مدارس میں عربی اور فارسی کی تعلیم کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

جب ۱۹۱۲ء میں بنگال کی صوبائی مسلم لیگ کے انتخابات ہوئے تو نواب سلیم اللہ کو صدر اور فضل الحق کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں جب نواب سلیم اللہ وفات پا گئے تو بنگالی مسلمانوں کی قیادت فضل الحق نے سنبھال لی۔ فضل الحق نے مسلم لیگ کی قیادت کے ساتھ ساتھ اپنے طور پر ۱۹۱۵ء میں کسان تحریک منظم کی۔ اس کا نام کرشک پرجا سمیتی رکھا گیا۔ جلد ہی بنگال کے بہت سے حصوں میں اس جماعت کی شاخیں قائم کر دی گئیں اور ایک وقت وہ بھی آیا جب کرشک پرجا پارٹی بنگال کی سیاست کا ایک اہم ستون بن گئی۔ بہت سے رہنماؤں نے تو اس پارٹی میں محض اس لئے شرکت کی کہ وہ اسے سیڑھی بنا کر سیاست میں قدم رکھ سکیں۔ اس پارٹی کا اجلاس تقریباً ہر سال ہوا کرتا تھا اور ۱۹۲۴ء تک یہ عالم تھا کہ یہ جماعت ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ کی مانند ہو گئی تھی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے روزنامہ "نواجگ" شائع کیا جس کی ادارت کسی دور میں نذر الاسلام کیا کرتے تھے۔ یہ روزنامہ بنگال کے کسانوں کا ترجمان تھا۔

مولوی فضل الحق کی صدارت میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۴ء کو ڈھاکہ میں بنگال پریذیڈنسی مسلم لیگ کا

اجلاس منعقد ہوا۔ اس موقع پر انہوں نے ہندوستان کی سیاست پر تفصیلی روشنی ڈالی اور ان مسائل کا ذکر کیا جو بنگال کے مسلمانوں کو درپیش تھے۔ اس موقع پر انہوں نے "تنسیخ تقسیم بنگال" کے مسئلہ پر بھی حکومت کو کھری کھری سنائیں۔ انہوں نے بنگال کے مسلمانوں کو سول سروس میں انتہائی کم حصہ دینے پر بھی حکومت کی سخت مذمت کی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ملازمتوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقلیتوں کو بھی مناسب نمائندگی دی جائے ورنہ حکومت کی کونسلوں میں عوام کی آواز قطعی طور پر غیر موثر ہو کر رہ جائے گی۔ اب مسلمانوں کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ سرکاری آسامیوں میں مناسب نمائندگی حاصل کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، اپنے مطالبات تسلیم کرائیں۔ انہوں نے پریس ایکٹ کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایکٹ برطانوی حکومت کے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ دسمبر ۱۹۱۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا جس کی صدارت قائد اعظمؒ نے کی۔ اس اجلاس میں مولوی فضل الحق نے بنگال کے نمائندے کے طور پر شرکت کی۔ اجلاس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اصلاحات کی ایک ایسی سکیم مرتب کرنا تھا جو مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کے لئے قابل قبول ہو۔ اس موقع پر انہوں نے کہا کہ اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعاون اور خیر سگالی کے جذبات کی شدید ضرورت ہے۔ یہ ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے کہ ہم کس حد تک یہ تعاون اور خیر سگالی پیدا کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کو ملک کی کونسلوں میں اور ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں میں مناسب اور موثر نمائندگی درکار ہے۔ اگر کوئی غیر متعصب ہندو ہے تو اسے ایک لمحہ کے لئے بھی اس معاملے میں سوچ بچار کی ضرورت نہیں۔

مولوی فضل الحق نے غریب اور مستحق مسلمان طلبہ کی امداد کی غرض سے ۱۹۱۲ء میں ایک سنٹرل نیشنل محمڈن ایجوکیشنل ایسوسی ایشن قائم کی۔ یہ انہی کی مساعی کا نتیجہ تھا کہ اس ایسوسی ایشن کو مسلمان طلبہ کی امداد کرنے کے لئے حکومت بنگال سے مالی مدد ملتی رہی۔ اس کے بعد انہی کی کوششوں سے ۱۹۱۶ء میں کلکتہ میں مسلمان طلبہ کے لئے دو ہوسٹل تعمیر کئے گئے۔ مولوی فضل الحق نے ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے قیام کے سلسلہ میں بھی ہز ہائی نس آغا خان اور نواب محسن الملک کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اسی سال وہ بنگال کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ مسلمانوں سے ناخواندگی ختم کرنے کے لئے اسلامیہ کالج قائم کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمان طلبہ کے لئے بھی سرکاری سکولوں اور کالجوں میں سنسکرت لازمی تھی مگر عربی اور فارسی پڑھانے کے لئے سٹاف موجود نہ

تھا۔ انہوں نے ۱۹۲۴ء میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے مسلمان طلبہ کے لئے متعدد سہولتوں کا انتظام کیا اور ان میں عربی اور فارسی پڑھنے کا شوق پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ احکام بھی جاری کر دیئے کہ محکمہ تعلیم میں نہ صرف مسلمانوں کی خاصی تعداد کو ملازم رکھا جائے بلکہ کالجوں اور ہائی سکولوں میں مسلمان طلبہ کے لئے بھی نشستیں مخصوص کی جائیں۔ اس طرح انہوں نے بنگال کے مسلمانوں پر احسان عظیم کیا۔ جب تحریکِ عدمِ تعاون کے سلسلہ میں سیاسی رہنماؤں نے طلبہ سے یہ اپیل کی کہ وہ سکولوں اور کالجوں میں جانا بند کر دیں تو مولوی فضل الحق نے مسلمان طلبہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ سیاسی معاملات میں الجھنے کی جگہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھیں۔ بنگال ایگریکلچرل ڈیٹرز ایکٹ ۱۹۳۶ء، منی لینڈرز ایکٹ اور بنگال ٹیننسی ایکٹ کی منظوری کا سہرا بھی انہی کے سر رہا۔ اس طرح انہوں نے بنگال کے مظلوم کاشت کار طبقہ کو ہندو سود خوروں کے کروڑوں روپوں کے قرض سے نجات دلا دی ——— انہی کے دور میں بنگال اسمبلی نے زمینداری کا سلسلہ ختم کر دیا۔

اب شیرِ بنگال مولوی فضل الحق کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی وہ مسلّمہ طور پر ایک سیاسی رہنما تھے۔ مسلم لیگ نے ۱۹۱۸ء میں انہیں اپنے گیارھویں سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے مدعو کیا۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کو خود حل کرنا چاہئے۔ اس مسئلہ میں ہندوؤں کی مداخلت ناقابلِ برداشت ہے۔ دراصل مولوی فضل الحق نے گاندھی جی کی طرف اشارہ کیا تھا جو خلافت کے معاملے میں پیش پیش تھے۔ مولوی فضل الحق کا موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کے مقدس مقامات بہر حال غیر مسلموں کے اثر و رسوخ سے پاک رہنے چاہئیں۔

فضل الحق کو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے بھی نامزد کیا گیا۔ انہوں نے اس سلسلے میں نہایت سرگرمی کا مظاہرہ کیا اور ۱۹۳۱ء کی اس کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ جداگانہ انتخابات کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ ان انتخابات کی وجہ سے مسلمانوں اور دوسرے لوگوں کو ایک دوسرے سے تعاون کرنے اور مجموعی طور پر ملک کے مشترکہ مفادات کے لئے کام کرنے کا موقع نصیب ہوگا۔ آپ نے اس توقع کا اظہار بھی کیا کہ امورِ مملکت چلانے میں مسلمانوں کو مناسب مواقع فراہم کئے جائیں گے۔

گول میز کانفرنس کے نتیجہ میں ہندوستان میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت حکومت کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد اسمبلیوں کے انتخابات ہونے اور مولوی فضل الحق کو پٹوا کھالی کے حلقہ سے انتخابات میں کامیابی حاصل ہوئی۔ وہ بنگال اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ قائد اعظم کے کہنے پر موصوف نے مسلم لیگ میں شرکت اختیار کر لی اور متفقہ طور پر مسلم لیگ مخلوط پارٹی کے قائد چن لئے گئے۔ اس طرح وہ وسط ۱۹۳۷ء میں بنگال کے پہلے وزیر اعلیٰ بنا دیئے گئے۔ ان کی کابینہ میں خواجہ ناظم الدین (مرحوم) اور سید حسین شہید سہروردی (مرحوم) بھی شامل تھے۔ شیر بنگال کا دور وزارت اعلیٰ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۳ء پر محیط ہے جسے بجا طور پر ایک سنہری دور کہا جا سکتا ہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے پورے بنگال کا طوفانی دورہ کیا اور مسلم لیگ کو ایک نہایت منظم سیاسی جماعت کی شکل دی۔ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے لکھنؤ میں منعقدہ مسلم لیگ کانفرنس سے خطاب کیا۔ صوبے کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے انہوں نے جو اہم ترین اقدام کیا وہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے مناسب نمائندگی کا حصول تھا۔ احکام میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ صوبے کی عوامی ملازمتوں میں آئندہ جہاں تک ممکن ہو سکے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے مساوی پالیسی اختیار کی جائے۔

دوسری طرف جن صوبوں میں کانگرس وزارتیں قائم تھیں وہاں مسلمانوں سے نہایت ناروا سلوک کیا گیا۔ ان صوبوں میں ہندو، مسلمان کو برداشت ہی نہیں کرتا تھا جس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اسی کے نتیجہ میں فسادات پھیلے تو ڈھاکہ تک پہنچ گئے لہذا مولوی فضل الحق نے وزیر اعلیٰ کی حیثیت میں ۲۲۔ فروری ۱۹۴۰ء کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک گول میز کانفرنس منعقد کی۔ یوں مسلمانوں اور ہندوؤں میں امن بحال ہو گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود ہندوؤں کے تعصب نے مسلمانوں کو دانش مند بنا دیا۔ اب مسلمانوں کو اس بات کا صحیح اندازہ ہو چکا تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندو ان سے کیا سلوک کرے گا۔ آئندہ ماہ ۲۲، ۲۳ اور ۲۴ تاریخ کو لاہور میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس قائد اعظمؒ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ۲۳ تاریخ کو مولوی فضل الحق نے قرارداد پاکستان پیش کی۔ اس موقع پر مولوی فضل الحق نے کہا کہ مسلم ہندوستان ایسے کسی آئین کو کسی قیمت پر قبول نہیں کرے گا جس کی تصدیق مسلمانوں سے نہ کرائی گئی ہو اور اگر ان پر کوئی آئین ٹھونسا گیا تو وہ نہ صرف اس کی مخالفت کریں گے بلکہ اسے ناقابل عمل بھی بنا دیں گے انہوں نے مزید کہا کہ ہندوستان میں ۹ کروڑ مسلمان ہیں۔ پنجاب اور بنگال میں ان کی واضح اکثریت

ہے لیکن ہم اسے مؤثر اکثریت کا نام نہیں دے سکتے۔ موصوف نے اس دوران مولانا ابوالکلام آزاد کی اس بات کی بھی شدید مذمت کی کہ "مسلمانوں کو گھبرانے یا خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہیں"۔ مولوی فضل الحق نے کہا کہ مولانا ابوالکلام کی یہ بات غیر اسلامی ہے۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ۸ کروڑ کوئی معمولی تعداد نہیں ___ نہ ہی مسلمان کو گھبرانے کی کوئی ضرورت ہے انہوں نے مسلمانوں کو انتباہ کیا کہ اگر وہ کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو قائداعظمؒ کی قیادت میں ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو جائیں اور مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو جائیں۔

۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مولوی فضل الحق بنگال اسمبلی کے لئے دو حلقوں سے بیک وقت کامیاب ہوئے۔ ان کی یہ کامیابی عوام میں ان کی مقبولیت کی واضح دلیل تھی۔ اس وقت مسلم لیگ کے ساتھ ان کے اختلافات پیدا ہو چکے تھے اور اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے (جو اس وقت کانگرس کے صدر تھے) فضل الحق سے کانگرس میں شمولیت کی درخواست کی نیز عارضی کابینہ میں ان کی نامزدگی کا سبز باغ بھی دکھایا لیکن مولوی فضل الحق نے ان کی یہ پیشکش ٹھکرادی۔ ستمبر ۱۹۴۶ء میں کلکتہ کے کچھ مسلمان ایک وفد کی صورت میں ان کے پاس آئے اور اصرار کیا کہ وہ دوبارہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔ مسلمانوں کے اسی وفد نے قائد اعظمؒ سے بھی ملاقات کی اور درخواست کی۔ مولوی فضل الحق پر جو پابندیاں عائد ہیں انہیں ختم کر دیا جائے۔ یہ کوشش کامیاب ہوئی اور مولوی فضل الحق دوبارہ مسلم لیگ میں آ گئے۔ ۱۹۴۶ء کے اواخر میں جب ملک کی تقسیم پر برطانوی حکومت نے آمادگی ظاہر کر دی تو کانگرس، مسلم لیگ اور ریڈ کلف کمشن کو دونئے ممالک کی سرحدوں کے تعین کا کام سونپا گیا۔ اس موقع پر فضل الحق نے کمیشن پر زور دیا کہ کھلنا کے ضلع کو پاکستان میں شامل کیا جائے انہی کی مساعی کی وجہ سے کھلنا پاکستان میں شامل کیا گیا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد جب مولوی فضل الحق پاکستان پہنچے تو ان کی عمر ۷۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ ۱۹۵۱ء میں وہ مشرقی پاکستان کے ایڈووکیٹ جنرل مقرر کئے گئے اور جب مشرقی پاکستان اسمبلی کے انتخابات قریب تھے تو انہوں نے حزب مخالف کے طور پر "متحدہ محاذ" قائم کیا۔ انتخابات میں متحدہ محاذ کو معجزانہ طور پر کامیابی حاصل ہوئی اور مولوی فضل الحق مشرقی پاکستان کے وزیر اعلیٰ ہو گئے۔ بعد ازاں وہ مرکزی حکومت میں وزیر داخلہ اور مشرقی

پاکستان کے گورنر بھی رہے۔
ان کی صحت مسلسل خراب ہو رہی. کچھ عمر کا تقاضا بھی تھا جو ۸۲ برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ ۲۷ اپریل ۱۹۶۲ء کو صبح کے وقت یہ مجاہد آزادی اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

مولانا حسرت موہانی

۱۸۷۵ء تا ۱۹۵۱ء

مولانا حسرت موہانی ۱۸۷۵ء میں موہان کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خاندانی روایات کے تحت ان کی ابتدائی تعلیم ایک مقامی مکتب میں ہوئی جہاں انہوں نے قرآن کریم، حدیث اور فقہ وغیرہ کا مطالعہ کیا۔ بعد ازاں انہوں نے عربی اور فارسی سیکھنا شروع کر دی۔ پھر اردو کی طرف توجہ دی۔ آٹھویں درجہ کا امتحان انہوں نے ۱۸۹۴ء میں پاس کیا اور صوبہ بھر میں اوّل آئے۔ موہان میں کوئی ہائی سکول نہ تھا لہٰذا مزید تعلیم کی غرض سے موہان سے فتح پور چلے گئے جہاں انہیں گورنمنٹ ہائی سکول میں داخلہ مل گیا۔ ۱۸۹۹ء میں میٹرک کر کے علی گڑھ کالج میں داخلہ لینے کے لئے چلے گئے۔ شاعری کا آغاز سکول کے دور ہی میں کر دیا تھا اور رفتہ رفتہ لوگ انہیں بطور شاعر جاننے لگے تھے۔

علی گڑھ کالج کے انگریز پرنسپل نے محسوس کیا کہ حسرت موہانی میں انقلابی "جراثیم" موجود ہیں۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ کالج کی زندگی ہی سے حسرت موہانی کو انگریز حکومت سے شدید نفرت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ حسرت موہانی کو ایسی سرگرمیوں کے الزام میں تین بار کالج سے نکالا گیا مگر وہ نواب محسن الملک سیکرٹری کالج کے چہیتے تھے لہٰذا انہی کی وجہ سے ہمیشہ دوبارہ داخلہ ملتا رہا۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا حسرت نے بی اے کا امتحان پاس کر لیا۔ اس دوران انہیں متعدد ملازمتوں کی پیشکش کی گئی مگر حسرت موہانی نے کوئی قبول نہ کی۔ دراصل وہ ملازم بن کر رہنے اور کسی کو ملازم بنا کر رکھنے کے قائل ہی نہ تھے۔ آزاد طبیعت پائی تھی۔ مناسب سمجھا کہ صحافت کا پیشہ اختیار کریں لہٰذا انہوں نے بی۔ اے کرتے ہی ایک جریدہ "اردوئے معلّٰی" کے نام سے جاری کیا۔ اس جریدہ میں برطانیہ کے خلاف مواد موجود ہوتا تھا، انگریز حکومت نے اس جریدے کی نگرانی شروع کر دی۔ ۱۹۰۸ء میں جب ایک مضمون بعنوان "مصر میں برطانیہ کی پالیسی" شائع ہوا تو انگریز حکومت کو اُن پر وار کرنے کا موقع مل گیا۔

اس مضمون پر حکومت کی طرف سے اعتراض کیا گیا اور عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ مگر حسرت موہانی نے کسی قیمت پر بھی مضمون نویس کا نام ظاہر نہ کیا۔ یہ مضمون نویس علی گڑھ کا ایک طالب علم تھا۔ ادھر عالم یہ تھا کہ شہر کا کوئی وکیل انگریز کے استبداد کی وجہ سے ان کے مقدمہ کی پیروی کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ مقدمہ کی سماعت محض دکھاوے کے لئے کی گئی اور انہیں چار سال قید بامشقت اور پانچسو روپے جرمانہ کی سزا سنادی گئی۔ حسرت کے پاس اتنی رقم کہاں تھی کہ جرمانہ ادا کر سکتے لہذا ان کی نادر کتب پر مشتمل لائبریری نیلام کر دی گئی جس سے صرف ساٹھ روپے جمع ہوئے۔

حسرت موہانی کو جیل بھیج کر بھی انگریز کے انتقام کی آگ ختم نہ ہوئی۔ قید و بند میں ان سے شدید مشقت لی جاتی اور طرح طرح کے ظلم ڈھائے جاتے۔ انہیں بالعموم قید تنہائی میں رکھا جاتا۔ کئی کئی گھنٹوں تک چکی میں اناج پسوایا جاتا۔ انہیں روزانہ ایک من گندم پیسنا پڑتی۔ یہ سلسلہ ایک سال تک جاری رہا۔ علی گڑھ جیل سے انہیں الہ آباد جیل منتقل کر دیا گیا۔ گو حکومت نے انہیں جیل سے منتقل کیا تھا مگر کرایہ بھی انہی سے وصول کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حسرت کے پاس پیسہ بالکل نہ رہا —— وہ تھوڑے سے چنے پانی میں بھگو دیتے اور رات کو کھا کر سو رہتے۔ الہ آباد جیل میں ایک بار اُن کے والد ملاقات کے لئے آئے تو ملنے کی اجازت نہ دی گئی۔ حتیٰ کہ حسرت موہانی کو ان کی آمد سے بھی مطلع نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے والد اسی غم میں کچھ دنوں بعد انتقال کر گئے۔ والد کی اس انداز میں موت کا حسرت کو بھی شدید دُکھ ہُوا اور اب انگریزوں کے خلاف ان کے اطوار میں مزید تلخی پیدا ہو گئی۔ انگریز نے اس حد تک پست ذہنیت کا مظاہرہ کیا کہ حسرت تک ان کے والد کی وفات کی اطلاع بھی نہ پہنچنے دی۔ ایک بار سپرنٹنڈنٹ جیل ان کی کوٹھڑی میں آیا اور ان کے تمام اخبارات، رسائل اور دیوان حافظ وغیرہ نذرِ آتش کر دیئے۔ اس کے بعد اپنے دفتر میں طلب کر لیا۔

۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے فراغت کے بعد ہی سے حسرت موہانی کی سیاسی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ ۱۹۰۷ء میں سورت میں کانگریس کا جو اجلاس منعقد ہوا وہ خاصا ہنگامہ خیز تھا۔ کانگریس دو گروپوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک گروپ کی قیادت دادا بھائی نوروجی کر رہے تھے اور دوسرے یعنی انتہا پسند گروپ کی قیادت تلک کے ہاتھ میں تھی۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی کانگریس کے اجلاس سورت میں شرکت کی۔ وہ تلک گروپ کے

ساتھ تھے۔ بعدازاں تلک نے کانگریس سے اختلافات کی بنا پر استعفا دے دیا تو حسرت بھی الگ ہو گئے۔ ان دنوں مولانا حسرت موہانی کو بعض ساتھیوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر کے مسلم لیگ میں شمولیت کا مشورہ بھی دیا مگر وہ نہ مانے۔

جب ہندوستان میں "سودیشی" تحریک کا آغاز ہوا تو حسرت نے اس تحریک کا ساتھ ختم کر دیا۔ وہ اس بات کے حق میں تھے کہ ہندوستانیوں کو تمام غیر ملکی اشیاء کا مکمل بائیکاٹ کر دینا چاہئے۔ انہوں نے ایک "سودیشی سٹور" قائم کر لیا۔ ان کے پاس تو تھا ہی کیا۔ مولانا شبلی نعمانی کی سفارش پر بمبئی کے سر فضل بھائی کریم بھائی نے انہیں رقم فراہم کی۔ یہ سٹور خوب چلا۔ حسرت موہانی کی اس کامیابی پر شبلی نعمانی نے کہا:

"تم انسان ہو کہ جن — ؟ پہلے تم شاعر تھے — پھر تم سیاست دان بنے — اب تم بنئے ہو گئے ہو۔"

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں شروع میں مولانا حسرت موہانی مسلم لیگ سے دُور دُور رہے۔ مگر جب ۱۹۱۳ء میں قائداعظمؒ نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور خود مختار حکومت کا نعرہ لگایا گیا تو حسرت موہانی نے کہا "الحمدللہ! مسلم لیگ نے ۱۹۱۳ء میں وُہ نعرہ لگایا جو میں نے ۱۹۰۷ء میں بلند کیا تھا۔ لہٰذا ۱۹۱۵ء میں حسرت موہانی نے مسلم لیگ میں باضابطہ شمولیت اختیار کر لی۔ اس کے بعد سے انہوں نے کانگریس اور مسلم لیگ کو قریب کرنے کے لئے مسلسل تگ و دو شروع کر دی — مولانا نے ۱۹۲۱ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ احمد آباد کی صدارت کی۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا:

"مسلمان کی حیثیت میں ہمارے لئے اتنا ہی کافی نہیں کہ ہم مکمل آزادی کے مطالبہ پر اکتفا کریں بلکہ ہمیں اس کا تعین بھی کرنا ہوگا کہ یہ حکومت ہوگی کس قسم کی؟ اگر ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں مگر خدا کا فضل ہے کہ بعض صوبوں میں ان کی واضح اکثریت موجود ہے۔ مثلاً کشمیر، سندھ، پنجاب، بلوچستان اور آسام وغیرہ ایسے ہی صوبے ہیں۔"

یہ وہ دور تھا جب گاندھی کو عروج حاصل تھا۔ گاندھی ہی کی تحریک پر کانگریس نے "سوراج" کے لفظ کو اپنایا تھا ———— جب کانگریس کے کھلے اجلاس میں "سوراج" کی بات

کی گئی تو مولانا نے گرج کر کہا کہ یہ لفظ بے ہودہ اور بے معنی ہے۔ ضروری ہے کہ جمعیت العلماء کی قرارداد میں اس کے معنی کو واضح کیا جائے اور یہ مفہوم قرارداد میں شامل کیا جائے کہ

"سوراج سے ہماری مراد بیرونی کنٹرول سے آزاد مکمل آزادی ہے۔"

مولانا حسرت موہانی کی یہ تقریر سن کر گاندھی جی بہت بوکھلائے اور مولانا کی اس ترمیم کی مخالفت کی۔ گاندھی جی نے حسبِ عادت کہا' بعض لوگوں کے رویے سے مجھے شدید دکھ پہنچا ہے۔ ایسی بات کرتے وقت ذمہ داری سے کام نہیں لیا جاتا۔ سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم اپنے اندر مکمل اتحاد پیدا کریں۔ ہمیں پانی کی گہرائی کا اندازہ کیے بغیر اس میں نہیں کودنا چاہیئے۔ حسرت موہانی نے جو بات کی ہے وہ گہرائی کا اندازہ کئے بغیر کی ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ جب حسرت موہانی نے مکمل آزادی کی بات کی تو گاندھی جی نے "سوراج" کے لفظ میں ہی پناہ ڈھونڈنے میں خیریت جانی۔ مگر "سوراج" کو "مکمل آزادی" کا مفہوم دینے سے گریز کیا۔ کانگرس ــ گاندھی جی کے زیرِ اثر تھی لہٰذا حسرت موہانی کی ترمیم کو کون پوچھتا تھا۔ کانگرس کی یہ قرارداد "سوراج" کے لفظ کے ساتھ ہی منظور کی گئی مگر حسرت کا وہ اعزاز کون چھین سکتا ہے جو انہوں نے پہلے ہندوستانی کی حیثیت میں ہندوستان کی "مکمل آزادی" کے مطالبہ کی صورت میں حاصل کیا تھا۔

اسی وقت سے مولانا حسرت موہانی اور گاندھی جی کے درمیان ٹھن گئی۔ ۱۹۳۰ء میں

کانگریس نے ستیہ گرہ تحریک شروع کر دی۔ اس موقعہ پر حسرت موہانی نے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ واقعہ دلچسپ ہے۔ لکھنؤ کے امان اللہ پارک میں جلسہ تھا۔ مولانا حسرت موہانی نے تقریر شروع کی تو برطانوی سامراج کو کھری کھری سنائیں۔ پارک کے باہر پولیس خاصی تعداد میں موجود تھی۔ تقریر کے دوران تو پولیس نے کچھ نہ کہا مگر جونہی ان کی تقریر ختم ہوئی، پولیس ان پر جھپٹ پڑی۔ مولانا نے پولیس کی لاری تک جانے سے انکار کر دیا اور زمین پر لیٹ گئے۔ وہ مسلسل "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ تنگ آ کر پولیس نے مولانا حسرت موہانی کو اٹھا کر لاری میں رکھ دیا اور جیل پہنچا دیا۔

۱۹۲۵ء میں جب ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانفرنس کا انعقاد ہوا تو حسرت اسکی استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ برطانیہ کے لئے کمیونسٹوں سے زیادہ خوفناک اور خطرناک چیز کوئی نہ تھی۔ لیکن کریلا اور نیم چڑھا۔ حسرت موہانی اور کمیونسٹ پارٹی ــ انگریز کے کان کھڑے ہو گئے۔ حسرت موہانی نے اس پارٹی کے پلیٹ فارم سے برطانوی استبداد کے خلاف دھواں دھار تقاریر کیں۔ انہوں نے کہا:

"کمیونزم کارکنوں اور کاشت کاروں کی ایک تنظیم و تحریک ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کمیونزم کسی دہشت پسندی کا نام ہے مگر ہم عدم تشدد پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ ہماری آزادی سوویت حکومت کے طرز پر ہونا ضروری ہے۔"

۱۸۔ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو لکھنؤ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ حسرت موہانی نے اپنی قرارداد "مکمل آزادی" کے لئے اراکین کو قائل کرنا شروع کر دیا۔ مگر قائداعظمؒ اس قرارداد کے حق میں تھے۔ مسلم لیگ کے عام اجلاس میں حسرت موہانی نے یہ قرارداد پیش کی جو منظور کر لی گئی۔ اس قرارداد کی حمایت مولانا ظفر علی خاں، حسین امام، عبدالرحمان صدیقی اور چودھری خلیق الزماں نے کی۔

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد مولانا حسرت موہانی نے لکھنؤ ہی میں مستقل قیام پسند کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۷۲ سال کے لگ بھگ تھی اور صحت بھی خاصی گر چکی تھی۔ ۱۳۔ مئی ۱۹۵۱ء کو وہ لکھنؤ میں انتقال کر گئے۔

محمد علی جناحؒ

۱۸۷۶ء تا ۱۹۴۸ء

محمد علی جناح ۲۵۔ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ انہیں سب سے پہلے گجراتی کی تعلیم دی گئی۔ ۴۔ جولائی ۱۸۸۷ء کو انہیں سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخل کر دیا گیا۔ چوتھی جماعت میں وہ اس سکول سے چلے گئے کیونکہ ان کی شادی کا اہتمام کر دیا گیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی کیونکہ گھریلو تعلیم کے بعد انہیں گیارہ سال کی عمر میں سکول میں داخل کیا گیا تھا۔ جب ان کی عمر سولہ سال کی ہوئی تو فریڈرک کرافٹ نے انہیں مزید تعلیم کے لئے لندن بھیجنے کا مشورہ دیا۔ ۱۸۹۲ء میں محمد علی جناح قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن روانہ ہو گئے وہاں انہوں نے ایک

انگریز کنبہ کے ساتھ رہائش اختیار کی۔ اس مقام پر بعد ازاں لندن کورٹ کونسل کی طرف سے یہ تحریر نصب کی گئی (جو آج تک موجود ہے) "قائداعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء تا ۱۹۴۸ء) بانیٔ پاکستان یہاں پر ۱۸۹۵ء تک مقیم رہے"۔ بیرسٹری کرنے کے بعد ۱۸۹۶ء میں ہندوستان کا رُخ کیا۔ قائداعظمؒ کے مطابق انہوں نے قانون سے محض اس بنا پر دلچسپی لی کہ لنکن اِنؒ کے صدر دروازے پر دنیا کو قانون دینے والوں کی فہرست میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ مبارک بھی شامل تھا۔ ۱۸۹۵ء میں وہ بار کے رُکن ہو چکے تھے اور ان کا شمار ہندوستان کے سب سے کم عمر بیرسٹر کے طور پر ہوتا تھا۔ محمد علی جناح جس وقت ہندوستان لوٹے تو گھر کا نقشہ بدلا ہوا پایا۔ دولت ختم ہو چکی تھی۔ والد کا کاروبار تباہ ہو چکا تھا اور گھر کا اثاثہ تک قرض خواہوں کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ کراچی سے بمبئی آ گئے اور ہائیکورٹ میں پریکٹس شروع کر دی۔ ان کے ابتدائی تین سال انتہائی عسرت میں گزرے تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ کچھ عرصہ بعد انہیں عارضی طور پر پریذیڈنسی مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ میعاد ختم ہونے پر انہیں پندرہ سو روپے ماہانہ ملازمت کی پیشکش کی گئی مگر محمد علی جناح نے اسے یہ کہہ کر قبول نہ کیا کہ اب وہ اتنی رقم روزانہ کما سکتے ہیں اور فی الواقع جلد ہی ان کی پریکٹس خوب چل نکلی۔

۱۹۰۶ء میں قائداعظمؒ، دادا بھائی نوروجی کے ساتھ نیشنل کانگرس کے اس تاریخی اجلاس میں شریک ہوئے جو کلکتہ میں منعقد ہوا تھا اور جس میں دادا بھائی نے ہندوستان کے لئے حکومتِ خود اختیاری کا خاکہ پیش کیا تھا۔ اسی اجلاس میں محمد علی جناح نے وقف علی الاولاد کے قانون کی فوری ضرورت پر تقریر کی۔ کانگرس کے اجلاس میں یہ ان کی پہلی تقریر تھی۔ اسی تقریر کا اثر تھا کہ بعد ازاں ہر سیاسی ماحول میں ان کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا جانے لگا۔

۱۹۱۰ء میں سر ولیم کی زیرِ صدارت الٰہ آباد میں مسلمان اور ہندو رہنماؤں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں دونوں کے اختلافی مسائل کے حل پر غور کیا گیا۔ محمد علی جناح نے اس کانفرنس میں نہایت گرم جوشی سے حصہ لیا۔ اسی سال انہیں بمبئی کے مسلمانوں کی طرف سے امپیریل لیجسلیٹو کونسل کا رکن چن لیا گیا۔ جب اس کونسل میں انہوں نے وقف بل پیش کیا تو مسلمان اور ہندو دونوں ہی ان کی سیاسی قابلیت اور دیانت کے قائل ہو گئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسی وقت سے ہندوستان کے مسلمانوں نے انہیں اپنے سیاسی رہنماؤں کے دائرے میں شامل کر لیا۔ ۱۹۱۲ء کے وسط میں مسلمان

رہنماؤں کی ایک کانفرنس کلکتہ میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں مسلم لیگ کے اساسی دستور میں حالات کے اعتبار سے ترمیم کی تجویز منظور کی گئی۔ اس تجویز پر عمل کرنے سے پہلے یہ طے پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری سر وزیر حسن سارے ملک کا دورہ کریں گے اور دستور پر نظر ثانی کے بارے میں مسلمانوں کی رائے معلوم کریں گے۔ ان کے دورے کے بعد اسی سال کے اواخر میں مسلم لیگ کونسل کا ایک خاص اجلاس سر آغا خاں کی صدارت میں منعقد ہوا اور ضروری ترامیم کے بعد مسلم لیگ کے دستور اساسی کا جدید مسودہ تیار کر دیا گیا جسے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں ۲۲۔ مارچ ۱۹۱۳ء کو منظور کیا گیا۔

ابتداء میں محمد علی جناح مسلم لیگ سے الگ تھلگ رہے۔ گو وہ کلکتہ کانفرنس میں بھی شریک ہوئے تھے لیکن عملی طور پر انہوں نے مسلم لیگ سے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی تھی۔ انہوں نے پہلی بار ۱۹۱۳ء کے اجلاس لکھنؤ میں مسلم لیگ کے ساتھ اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور مسلم لیگ کے جدید دستور کی اس دفعہ کی نہایت سرگرمی سے تائید کی جس میں مسلم لیگ کا سیاسی مطمح نظر بھی وہی قرار پاگیا تھا جو اس وقت کانگرس کا تھا یعنی

"تاج برطانیہ کے زیر نگیں، آئینی طریقوں سے ایسی خود اختیاری حکومت حاصل کرنا جو ہندوستان کے حالات کے مطابق ہو۔"

اپریل ۱۹۱۳ء میں محمد علی جناح اور گوکھلے یورپ روانہ ہو گئے۔ انہوں نے وہاں پہنچتے ہی لندن انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس طرح انگلستان میں تمام ہندوستانی طالب علم ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ اس دوران محمد علی جناح کی ذاتی سرگرمیوں سے اس ایسوسی ایشن کو اتنی اہمیت حاصل ہوئی کہ انڈیا آفس نے محض اس ادارے کے مطالبہ پر وہاں کے کالجوں کی تعلیم اور داخلہ کے سلسلہ میں ہندوستانی طالبعلموں کی جائز شکایت کی پڑتال کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی۔ اس کامیابی کے بعد اسی سال اکتوبر میں محمد علی جناح کے ہندوستان میں واپس ہونے سے پہلے مولانا محمد علی اور وزیر حسن نے (ان دنوں یہ دونوں لندن ہی میں تھے) محمد علی جناح کو مجبور کیا کہ وہ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کریں۔ محمد علی جناح اس وقت تک مسلم لیگ کے جلسوں میں شمولیت کے باوجود باقاعدہ رکن نہیں بنے تھے۔ آخر کار انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔

مئی ۱۹۱۴ء میں آل انڈیا کانگرس نے انڈیا کونسل کی مجوزہ اصلاحات کے سلسلہ میں اپنا

ایک وفد لندن بھیجا جس کے ممتاز رکن محمد علی جناح تھے۔ اس سال لندن جانے سے پہلے انہوں نے انڈیا کونسل کی مجوزہ اصلاحات کے خلاف کانگرس کے کراچی اور مسلم لیگ کے آگرہ والے اجلاس میں قرار دادیں منظور کرائی تھیں۔ اس موقع پر انہوں نے حکومت برطانیہ کے سامنے جس انداز میں ہندوستانیوں کا مطمح نظر پیش کیا اس نے انگریزوں پر بھی ہندوستانیوں کی سیاسی فہم و تدبر کا سکہ بٹھا دیا۔ انگلستان کا کوئی اخبار ایسا نہ تھا جس نے اس موقع پر محمد علی جناح کے انٹرویو شائع نہ کئے ہوں۔ نہ ہی لندن کی کوئی سیاسی جماعت ایسی تھی جس میں ان کے بیانات کا چرچا نہ ہوا ہو۔

فروری ۱۹۱۵ء میں گوپال کرشنا گوکھلے کا انتقال ہو گیا۔ جہاں تک گوکھلے کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں قائد اعظمؒ نے کہا تھا:

"گوکھلے ہندوستانی سیاست کا امام ہے جس نے اپنی قوم میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ میری دلی تمنا ہے کہ میں مسلمانوں کا گوکھلے بن جاؤں۔"

اور قائد اعظمؒ کی یہ خواہش پوری ہوئی۔ اس وقت جب محمد علی جناح، قائد اعظم بھی نہ ہوا تھا، گوکھلے نے اس کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا:

"محمد علی جناح میں بڑی صلاحیتیں ہیں۔ سیاسی مسائل میں ان کا فرقہ وارانہ اور مذہبی تعصب سے آزاد انداز انہیں ایک دن ہندو مسلم اتحاد کا بہترین قاصد بنا دے گا۔"

ممکن ہے کانگرس کی نظروں میں آج قائد اعظمؒ وہ نہ رہے ہوں جو وہ گوکھلے کے زمانے میں تھے لیکن اس میں محمد علی جناح کا کوئی قصور نہیں۔ بات تو ہندو کے تعصب پر آکر ٹوٹتی ہے — ۱۹۱۶ء کے بعد سے خود کانگرس کے سیاسی نقطۂ نظر میں جو تبدیلیاں ہوئیں محمد علی جناح کو بھی انہی کی بنا پر اپنی پالیسی بدلنا پڑی۔

بہر حال گوکھلے کی بے وقت موت کو ہندوؤں اور مسلمانوں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ محمد علی جناح نے ہندو مسلم اتحاد کی طرح ڈالی۔ اسی سال بمبئی میں کانگرس کا سالانہ اجلاس منعقد ہونا تھا محمد علی جناح نے کوشش کی کہ اس سال مسلم لیگ کا اجلاس بھی بمبئی ہی میں منعقد ہو۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کا اجلاس پٹنہ کے ایک بیرسٹر مظہر الحق کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسلم لیگ اور کانگرس کے اس مشترکہ اجتماع کو تاریخی حیثیت حاصل ہوئی۔ اسی اجتماع میں پہلی بار ہندو مسلم مفاہمت کی کوششیں

پہلی مرتبہ بار آور ہوئیں۔ محمد علی جناح کی قیادت میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی اور ہندو مسلمانوں میں سیاسی مفاہمت کی سکیم تیار کرنے کا کام کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔ اس وقت ہندوستان کی سیاسی حالت یہ تھی کہ حکومت کی طرف سے (۱۹۱۰ء میں) اصلاحات کی دوسری قسط ہندوستان کو ملنے والی تھی اور کانگرس نے ملک میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کر دی تھی۔ لیکن کانگرس کا یہ خواب اس وقت تک پورا نہ ہو سکتا تھا جب تک وہ ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت یعنی مسلمانوں کے ساتھ سیاسی مفاہمت نہ کرتی۔ ادھر مسلمانوں کو بھی مجوزہ اصلاحات کے معاملے میں خسارہ منظور نہ تھا۔ اصلاحات کا اثر چونکہ اس وقت تک حکومت پر نہیں پڑ سکتا تھا جب تک ہندوستان کی اہم سیاسی جماعت سے سمجھوتہ نہ ہو جاتا۔ اس لئے مسلمانوں کے ذمہ دار حلقوں میں مفاہمت کی سچی خواہش پیدا ہو گئی اور ہندو مسلم سمجھوتہ کے لئے فضا سازگار ہو گئی۔ اس موقع پر مسلم لیگ اور کانگرس دونوں کی نظریں محمد علی جناح پر پڑیں۔ انہوں نے یہ اہم اور نازک ذمہ داری قبول کر لی اور ایک ایسی سکیم تیار کی جس پر عمل کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی مفاہمت ہو سکتی تھی۔

نومبر ۱۹۱۶ء میں کلکتہ میں بنیرجی کی زیر صدارت مسلم لیگ اور کانگرس کا اجلاس منعقد ہوا اور محمد علی جناح کی مرتب کردہ سکیم کی روشنی میں وہ میثاق مرتب کیا گیا جسے میثاق لکھنؤ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس "میثاق" کی توثیق مسلم لیگ نے ۱۷ دسمبر ۱۹۱۶ء کو لکھنؤ کے اجلاس میں کر دی اس موقع پر محمد علی جناح نے کہا:

"میں ہمیشہ سے پکا کانگرسی ہوں اور فرقہ وارانہ ذہنیت کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود میرے نزدیک مسلمانوں پر ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کا جو الزام لگایا جا رہا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اس موقع پر جبکہ ایک عظیم الشان قومی نظام نہایت تیزی کے ساتھ عالم وجود میں آ رہا ہے۔ ایک اقلیت والی قوم کے لئے اس قومی نظام کی تشکیل میں حصہ لینے سے پہلے اپنی انفرادیت کی مکمل حفاظت کا اطمینان حاصل کر لینا بہت ضروری ہے اور یہ اطمینان ایک منفرد قوم کی حیثیت میں اپنی سیاسی ہستی کے کامل اور موثر تحفظ ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ میثاق لکھنؤ کی رو سے یہ طے کیا گیا ہے کہ مجالس قانون ساز کے آئندہ انتخابات میں ہندوستان کی اہم اقلیتوں کو موثر نمائندگی حاصل رہے اور یہ بھی طے پایا ہے کہ صوبوں کی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی نمائندگی خاص نشستوں کے ذریعے کی جائے۔ چنانچہ اس تصفیہ کی رو سے صوبوں کی کونسلوں میں

ان کی نیابت کا تناسب یہ ہوگا۔ پنجاب ۵۰ فیصد، بنگال ۴۰ فیصد۔ صوبۂ متحدہ ۳۰ فیصد، بہار ۲۵ فیصد، صوبہ متوسط ۱۵ فیصد، مدراس ۱۵ فیصد اور بمبئی ۳۳ فیصد۔

لیجسلیٹو کونسل کے منتخب شدہ ہندوستانی ممبروں کی کل تعداد کا ایک تہائی حصہ مسلمان ہوگا۔ مختلف صوبوں میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب سے مسلمان ممبروں کا انتخاب عمل میں آئے گا اور اسی تناسب سے ہر صوبے میں انتخاب ہوگا، جو تناسب صوبائی کونسلوں میں مسلمانوں کو حاصل ہے۔"

اسی سال بمبئی کے مسلمانوں نے محمد علی جناح کو دوسری بار وائسرائے کی کونسل کے لئے نمائندہ منتخب کیا۔ ابھی تک ہندو مہاسبھا نے میثاق لکھنؤ کی توثیق نہیں کی تھی اور نہ ہی ہندوؤں نے جماعتی حیثیت میں اسے تسلیم کیا تھا تاہم کانگرس اور مسلم لیگ کی ایک مشترکہ کمیٹی بن گئی جسے اصلاحات کی سکیم مرتب کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔ یہ سکیم حکومت کے سامنے پیش کردی گئی۔ لیکن اس میں موجود مسلم مطالبات کا کچھ پاس نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے عام مسلمانوں کو شکایات پیدا ہوگئیں۔

۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ انتہائی سیاسی بحران کا زمانہ تھا۔ کئی نئی سیاسی تحریکیں پیدا ہوگئی تھیں اور اس دور میں محمد علی جناح کانگریس کی پالیسیوں سے اتفاق نہ ہونے کی بنا پر خاموش تھے۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی نے "ترک موالات" کی تجویز پیش کی۔ سیاسی رہنما اس تجویز پر غور کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ ان میں محمد علی جناح بھی شامل تھے۔ وہ ان تجاویز سے مطمئن نہ ہوسکے۔ اور اس طرح کانگرس کے ساتھ محمد علی جناح کا تعلق ختم ہوگیا۔

۱۹۲۲ء کے بعد فرقہ وارانہ منافرت کا آغاز ہوا۔ ہندوؤں کی بعض متعصب تنظیموں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات پیدا کر دیئے۔ یہی وہ دور تھا جب مسلمانوں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ ہندو ان کو دھوکہ دے گیا ہے۔ ہندو نے سیاسی جنگ میں مسلمان کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلائی اور سیاسی اقتدار کا شکار خود کھیلا۔ گو اس موقع پر مسلمان رہنماؤں نے ہندو اور مسلمان کے درمیان مفاہمت کی پوری کوشش کی مگر بات نہ بنی۔ کیونکہ اب ہندو کو مسلمانوں کی خاص ضرورت نہ تھی۔ مفاہمت میں ناکامی کے باعث خود مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اس موقع پر (۱۹۲۴ء میں) محمد علی جناح ایک بار پھر مسلم لیگ کی سٹیج پر نظر آئے۔ انہوں نے ۱۹۲۷ء

میں مسلمانوں کو دن رات کوشش کے بعد مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع کیا۔ اس موقع پر ہندو مسلم مفاہمت کی ایک اور کوشش کی گئی۔ کانگریس نے تجاویز کو مان بھی لیا۔ لیکن بعدازاں ان کا پاس نہ کیا۔

۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا۔ کانگریس نے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ محمد علی جناح نے بھی اس معاملے میں کانگرس کا ساتھ دیا لیکن مسلم لیگ کے اندر سر محمد شفیع کی قیادت میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی جس نے سائمن کمیشن سے تعاون کا فیصلہ کر لیا۔ لہٰذا مسلم لیگ کے اندر بھی پھوٹ پڑ گئی۔ اسی دوران کانگرس نے دلی میں مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا اور ہندوستان کے لئے دستور مرتب کرنے کی خاطر تمام جماعتوں کے مشترکہ اجلاس ہوتے رہے مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ایک اور کمیٹی تشکیل کی گئی جس نے رپورٹ مرتب کی اور کانگرس نے اس پر غور کرنے کے لئے ایک اور کل جماعتی کانفرنس طلب کر لی۔ محمد علی جناح نے شرکت کی مگر ہندو مسلسل تعصب سے کام لے رہا تھا لہٰذا کسی فیصلہ پر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اسی اجلاس میں محمد علی جناح نے وہ چودہ نکات پیش کئے جو بعدازاں ہندوستانی مسلمانوں کی جداگانہ سیاست کی بنیاد قرار پائے۔

۱۹۳۰ء میں لندن میں ایک گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا تاکہ سائمن کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں ہندوستان کے لئے ایک جدید دستور مرتب کیا جا سکے۔ کانگرس نے شرکت سے انکار کر دیا۔ ۱۳۔ نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں پہلا اجلاس ہوا اور محمد علی جناح نے شرکت کی۔ مگر یہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔

۴۔ مارچ ۱۹۳۴ء کو حافظ ہدایت اللہ کی زیر صدارت مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں محمد علی جناح کو مستقل صدر منتخب کر لیا گیا۔ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے انتخابات میں

محمد علی جناح کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ایک پارلیمانی بورڈ قائم کریں جس میں کم ازکم ۳۵ ممبر شامل ہوں۔ ۱۹۳۷ء میں عام انتخابات کا آغاز ہوا اور مسلم لیگ کو مجالس قانون ساز میں پارٹی گروپ قائم کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ۱۹۳۸ء میں ان کی کوششوں سے بنگال اور پنجاب کی وزارتوں سے مسلم لیگ کا معاہدہ ہوگیا۔ آسام میں لیگ کی وزارت قائم ہوئی لیکن بعد میں ٹوٹ گئی۔ سندھ میں بعض مسلمان ممبروں کی وعدہ خلافی کے باعث وزارت قائم نہ ہو سکی۔

جب دوسری عالمگیر جنگ کے دوران حکومتِ برطانیہ کو ہندوستانی عوام کی مکمل حمایت کی ضرورت پیش آئی اور حکومت نے خود بات چیت کا آغاز کیا تو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے دسمبر ۱۹۴۱ء میں یہ قرار داد منظور کی کہ مسلم لیگ ملک کے دفاع کے لئے حکومت کے شانہ بشانہ کام کرنے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ مرکز اور صوبوں میں حقیقی ذمہ داریاں سونپی جائیں۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو سر سٹیفورڈ کرپس سیاسی مشن پر ہندوستان پہنچے اور انہوں نے کسی حد تک مسلمانوں کے مطالبات سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۳ء کو محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے اجلاس کراچی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے پیچھے کروڑوں عوام ہیں۔ ہمارا اپنا جھنڈا اور اپنا پلیٹ فارم ہے اور ہمارے سامنے پاکستان کی یقینی منزل موجود ہے۔ اب کوئی طاقت (اشارہ انگریز کی طرف تھا) ہم میں نفاق پیدا نہیں کر سکتی۔ انگریز کو چاہیئے کہ وہ ہندوستان تقسیم کرے اور یہاں سے چلا جائے۔

دسمبر ۱۹۴۵ء میں مرکزی اسمبلی کے لئے انتخابات ہوئے جن میں مسلم لیگ نے پاکستان کی بنیادوں پر حصّہ لیا اور ۸۷ فیصد مسلم ووٹ حاصل کر لئے۔ ۱۹۴۶ء کے شروع میں قائد اعظمؒ نے ایک الیکشن کمیشن قائم کیا جس کے سیکرٹری جی الانا تھے۔ سندھ کے انتخابات کے نتائج کا کانگرس کو شدت سے انتظار تھا لیکن میدان مسلم لیگ کے ہاتھ رہا۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو کابینہ مشن ہندوستان پہنچا اور ۴ اپریل کو قائد اعظمؒ نے مشن سے ملاقات کی۔ اسی موقع پر سید حسین شہید سہروردی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سلامتی کے لئے پاکستان کو واحد منزل قرار دیا۔ ۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے وائسرائے ہو کر آئے اور انہوں نے ہندوستان کو ۱۹۴۸ء تک آزادی دینے کے لئے کام کا آغاز کیا کانگرس نے پاکستان کی شدید مخالفت کی لیکن قائد اعظم کے تدبّر اور فراست نے کانگرس کو ہر قدم پر شکست دی۔ آخرکار ہندوستان کی آزادی کا بل ۴ جولائی ۱۹۴۷ء کو پارلیمان کے سامنے پیش ہوا، ۱۵ جولائی کو منظور ہوا اور ۱۸ جولائی کو شاہِ انگلستان نے اس کی توثیق کر دی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے تمام اختیارات ہندوستان اور پاکستان کو منتقل کر دیئے جائیں گے۔

قائد اعظمؒ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل مقرر کئے گئے مگر جون ۱۹۴۸ء میں ان کی صحت بے حد گر چکی تھی۔ ۱۳ اگست کو انہیں کوئٹہ بھیج دیا گیا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو

انہیں دوبارہ کوئٹہ سے کراچی پہنچا دیا گیا۔ اور اسی شب حالتِ خواب میں وفات پا گئے۔

پرنس آغا خاں

(۱۸۷۷ء تا ۱۹۵۷ء)

سلطان محمد شاہ (ہز رائل ہائی نس پرنس آغا خاں سوم) کے آباؤاجداد مصر کے فاطمی خلفاء سے تعلق رکھتے تھے۔ اس اعتبار سے ان کا شجرہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ سے ملتا ہے۔ سلطان محمد شاہ اپنے والد آغا خاں (دوم) کے بعد صرف آٹھ سال کی عمر میں اسمٰعیلیہ فرقہ کے سربراہ ہوئے۔ ان کی والدہ نے تمام جائداد وغیرہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جب آغا خاں (سوم) بالغ ہو گئے تو املاک ان کے سپرد کر دی۔ ان کی والدہ نے بیٹے کی تعلیم کے لئے بہترین علماء کی خدمات حاصل کیں جنہوں نے آغا خاں کو قرآن مجید، عربی اور فارسی کی تعلیم دی۔ آغا خاں نے اوائل عمر ہی میں اسلامی ادب اور تاریخ کا مطالعہ بھی کیا۔ گو ان کی ساری زندگی مغرب کے ماحول میں گزری تھی۔ لیکن اسلامی تعلیمات اور اسلام کے ساتھ انہیں بے حد لگاؤ تھا۔ ۱۹۲۰ء میں ان کی والدہ انتقال کر گئیں اور انہیں نجف میں اپنے شوہر کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ آغا خاں کو فلسفہ، دینیات اور فارسی شاعری سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ سعدی، فردوسی، عمر خیام، مولانا رومی، مولانا جامی اور حافظ کے انہیں لاتعداد اشعار یاد تھے۔ اسلام سے ان کے بے پناہ لگاؤ ہی کی وجہ تھی کہ ایک بار سر تھیوڈور موریسن نے ان کے بارے میں لکھا:

"مجھے قوی امید ہے کہ آئندہ نصف صدی کے دوران آغا خاں عالم اسلام کے ارفع مقاصد کے حصول کا رخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کریں گے۔ ان کی قابلیت اور مسلمانوں میں ان کی حیثیت دونوں ہی اس مستقبل کی نشان دہی کرتی ہیں۔"

آغا خاں نے ۲۵ سال کی عمر میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کی طرف توجہ دی۔ اسی سال لارڈ کرزن نے انہیں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کا رکن نامزد کیا۔ وہ کونسل کے سب سے کم عمر رکن تھے۔ کونسل میں انہوں نے جو تقاریر کیں۔ ان کی روشنی میں یہ بات واضح تھی کہ وہ مستقبل میں مسلمانوں کے لئے نمایاں خدمات سرانجام دیں گے۔ کونسل میں انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی اور تعلیمی حالت کے بارے میں حکومت کو مفید معلومات بہم پہنچائیں اور ان کے موقف کی

وکالت کی۔ آغا خاں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج کو اپنی زندگی کا مقصد بنا یا تھا کونسل کی رکنیت کے دوسرے ہی سال انہوں نے دلی میں منعقدہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کی۔ انہوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی پسماندگی ختم کرنے اور سیاسی قوت ختم کرنے کے لیے علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی کا قیام بے حد ضروری ہے۔ ۱۹۱۱ء میں آغا خاں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ اس سے قبل وہ یہ بات واضح کر چکے تھے کہ ہندوستان میں اسلام کے شایانِ شان یونیورسٹی کا قیام ان کی اولین ذمہ داری ہے۔ اسی موقع پر انہوں نے ایم۔ اے۔ او کالج کی وہ سالانہ امداد بھی بڑھا دی تھی جو کئی سال سے اپنی جیب خاص سے ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے بہت سے مسلمان طلبہ کے لئے وظائف جاری کیے تاکہ وہ بیرون ملک جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں۔ چندہ جمع کرنے کی مہم کے سلسلہ میں جب آغا خاں لاہور پہنچے تو ان کا زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے تیس لاکھ روپیہ جمع کیا۔ انہی کوششوں کو سراہتے ہوئے مولانا شبلی نے کہا تھا کہ جو کام چھ کروڑ مسلمان نہ کر سکتے تھے وہ پرنس آغا خاں نے تنہا کر دیا۔

جب مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کا سوال پیدا ہوا اور نواب محسن الملک کو وائسرائے سے ملنے کے لئے وفد کی تشکیل اور اس کے قائد کی نامزدگی کا اختیار دیا گیا تو انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے پینتیس مسلمانوں کو منتخب کیا اور وفد کی قیادت کیلئے آغا خاں کا نام تجویز کیا۔ گو انہی دنوں آغا خاں چین جا رہے تھے لیکن نواب محسن الملک کی درخواست پر وہ کولمبو ہی میں رک گئے اور وہاں سے سیدھے شملہ چلے آئے۔ جہاں انہیں وفد کو لے کر یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو وائسرائے سے ملاقات کرنا تھی۔ اس وفد کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ملاقات کے بعد ۴ ۲۔ اکتوبر کو آغا خان نے کلکتہ سے نواب محسن الملک کو ایک خط میں یہ تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کے سیاسی مفادات کی حفاظت کے لئے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں صوبائی انجمنیں قائم کی جائیں اور اسی طرح ایک مرکزی تنظیم کا قیام بھی عمل میں لایا جائے۔

۳۰۔ دسمبر ۱۹۰۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس نواب سلیم اللہ کی صدارت میں ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ لہذا آغا خاں کی تجویز کی روشنی میں اجلاس نے مسلمانوں کی

ایک سیاسی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ سفارش کی کہ جماعت کا نام انڈیا مسلم لیگ ہو۔ جب مسلم لیگ قائم ہو گئی تو آغا خان اس کے پہلے صدر منتخب ہو گئے اور ۱۹۱۲ء تک صدارت ان کے پاس رہی۔ در اصل آغا خان جس وفد کے ساتھ وائسرائے سے ملے تھے اسی کی کوششوں کے باعث ۱۹۰۹ء میں منٹو مورلے اصلاحات میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ شامل کیا گیا تھا اور انہی بنیادوں پر مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ وطن کے مطالبے کی منظوری ناگزیر ہو چکی تھی۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کی شدید مخالفت کی تو ۱۹۱۰ء میں آغا خاں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دلی میں کہا کہ اب جبکہ اصلاحات کی سکیم پر عمل شروع ہو رہا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں سبھی کے لئے بہتر یہ ہے کہ ان اصلاحات کو قبول کریں اور دوستی کی فضا قائم کریں۔

اب آغا خاں ہندوستان کے مسلمانوں کے مسلّمہ سیاسی رہنما بن چکے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں مونٹیگ، چیمسفورڈ اصلاحات کے بارے میں آغا خاں نے "ہندوستان، عبوری دور میں" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں انہوں نے ہندوستان میں اصلاحات کی ضرورت اور آئندہ متوقع اصلاحات میں ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ پر طویل بحث کی۔ انہوں نے لکھا کہ اگر انگریز اس اہم ترین ذمہ داری کی ادائیگی میں ناکام ہو گئے تو جنوبی ایشیا مصائب و آفاتِ انسانی کا بدترین نمونہ بن جائے گا۔ ہم ہندوستان میں نہ صرف سماجی اور اقتصادی بلکہ سیاسی ترقی بھی چاہتے ہیں اور ہم بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ جب تک سیاسی ترقی نہ کریں گے سماجی اور اقتصادی ترقی ممکن نہ ہوگی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ۱۹۱۸ء میں ترکی اور مسلمان ریاستوں کو شدید خطرات پیدا ہو گئے۔ اس موقع پر آغا خاں نے بجا طور پر محسوس کیا کہ ان مسلمان ریاستوں کے ساتھ اسلام کو بھی شدید خطرات کا سامنا ہے۔ اس موقع پر آغا خاں نے جو کردار ادا کیا وہ تاریخ یورپ میں انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔ انہوں نے مسلمان ریاستوں کو بچانے کے لئے حتی المقدور کوشش کی اور نورو جی وما بیا کے مطابق آغا خاں نے اس نازک ترین وقت میں اتنی صحیح سوچ سے کام لیا اور اتنے نپے تلے خطوط اختیار کئے کہ انہیں یورپ اور اسلامی ریاستوں دونوں کے لئے امن کا پیغامبر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

آغا خاں نے اس خطرے کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا کہ برطانیہ اپنی سامراجی خارجہ پالیسی

کی خاطر مسلمان ریاستوں کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہے۔ وہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد لے کر انگلستان گئے اور برطانوی وزیر اعظم لائیڈ جارج سے ملاقات کے دوران سمرنا اور تھریس کے وہ علاقے جو یونانیوں نے قبضہ میں کر لئے تھے۔ ترکی کو واپس دلانے پر اصرار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وفد نے برطانوی وزیر اعظم کے سامنے سراسر ترکی کی وکالت کی لیکن اس موقع پر برطانوی وزیر اعظم نے یہ کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی، "ہم کیا مدد کر سکتے ہیں۔ یونانی جن علاقوں پر قبضہ کر چکے ہیں انہیں وہاں سے باہر کون نکالے گا؟"

آغا خان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا: "محترم وزیر اعظم! گو میں بھی اتنی ہی عمر میں ہوں جتنے آپ ـــ لیکن اب تو یہی ہو سکتا ہے کہ میں خود تلوار ہاتھ میں لے کر جاؤں اور یونانیوں کو ان علاقوں سے باہر نکال پھینکوں۔ ہم ہر طرح ترکی کی مدد کریں گے۔ ہم پورے جہاز کرایہ پر حاصل کریں گے۔ لہٰذا اب آپ یونانیوں کا معاملہ ہم پر چھوڑ دیں۔"

برطانوی وزیر اعظم اس اچانک، غیر متوقع اور خوفناک حملہ اور کھلے الفاظ میں برطانیہ کی مذمت پر حیران و پریشان ہو گیا۔ اس نے کچھ عجیب سے مگر بزدلانہ لہجہ میں جواب دیا" آپ خود ہی سوچیں ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟" ۱۹۲۸ء میں مسلمانوں کو انتہائی نازک دور کا سامنا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی وکالت دو مختلف جماعتیں کر رہی تھیں اور دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ نبرد آزما تھیں۔ اس گروہ بندی کے نہایت خطرناک اور ناخوشگوار نتائج برآمد ہو سکتے تھے ـــ ان دنوں آغا خان بیمار تھے۔ جب انھیں تاروں کے ذریعے ان حالات سے مطلع کیا گیا تو وہ دسمبر ۱۹۲۸ء میں بحالت علالت یورپ سے ہندوستان پہنچ گئے۔ یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو دلی میں آل انڈیا پارٹیز مسلم کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ صدارت آغا خان نے کی۔ شملہ وفد کے بعد یہ کانفرنس غالباً مسلمانوں کی بھرپور نمائندگی کر رہی تھی۔ اس میں خلافت کانفرنس، جمعیت العلماء اور آل انڈیا مسلم لیگ کے دونوں گروپ شامل تھے۔ آغا خان نے اپنی تقریر میں کہا کہ اس موقع پر باہم اختلافات مسلمانوں کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ اپنے ملک کے مفادات کے تحفظ کی خاطر تمام اختلافات ختم کر دیں اور ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی دوستانہ اور برادرانہ انداز میں تعاون کریں۔ یہ وقت ایک دوسرے پر اپنی برتری ثابت کرنے کا نہیں۔ ہندوستان کے مسلمان اپنی انفرادی حیثیت کو ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہم سب مل کر ہی ان کی توقعات پر پورے اتر سکتے ہیں۔

۱۹۳۰ء تک انگریز محسوس کر چکا تھا کہ ہندوستان میں سیاسی اصلاحات بہت ضروری ہیں بصورت دیگر اسے حکومت برطانیہ کے ایک دوست کی حیثیت میں اپنے ساتھ رکھنا بہت مشکل ہوگا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ۱۲۔ نومبر ۱۹۳۰ء کو لندن میں پہلی گول میز کانفرنس طلب کی گئی۔ کانگرس نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیا۔ لیکن دوسری جماعتوں نے اس میں شرکت کی۔ نمائندوں کی نامزدگی برطانیہ کی طرف سے کی گئی۔ مسلمانوں کی طرف سے قائد اعظم، آغا خان، سر محمد شفیع مولانا محمد علی اور مولوی فضل الحق نے شرکت کی۔ دوسرے تمام طبقوں اور جماعتوں نے آغا خاں کو اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ آغا خاں کے لئے ہر طبقہ کا اس درجہ اعتماد بلاشبہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا جو دوسری گول میز کانفرنس کے وقت بھی انہی کے حصہ میں آیا۔

۱۹۳۲ء میں اور اس کے بعد دوسری جنگ عظیم کے آغاز تک آغا خان کو لیگ آف نیشنز میں ہندوستان کی نمائندگی کے لئے نامزد کیا جاتا رہا۔ ۱۹۳۷ء میں انہیں اسی لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ ۴۹ میں ۴۷ ووٹ انہیں ملے اور وہ پہلے ایشیائی تھے جنہیں یہ اعزاز نصیب ہوا۔

جون ۱۹۵۷ء میں انہیں دل کا دورہ پڑا اور ۱۱ جولائی ۱۹۵۷ء کو وہ جنیوا میں انتقال کر گئے۔ انہیں مصر میں اسوان کے قریب سپردِ خاک کر دیا گیا۔

مولانا محمد علی

(۱۸۷۸ء ــــ تا ــــ ۱۹۳۱ء)

رئیس الاحرار مولانا محمد علی ۱۸۷۸ء کے آخر میں رامپور میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد عبدالعلی خاں ایک معزز عہدے پر مامور تھے لیکن وہ عمری ہی میں والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا۔ ان کی والدہ نے بچوں کی ابتدائی تعلیم کا اہتمام کیا۔ محمد علی نے بریلی ہائی سکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ میں داخل کر دیئے گئے۔ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے علی گڑھ سے بی۔ اے کیا اور سول سروس کے لئے لندن روانہ ہو گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو محمد علی سے کچھ اور کام لینا منظور تھا۔ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت اور استثنائی قابلیت کے باوجود سول سروس کے امتحان میں ناکام رہے۔ اسی سال ان کی شادی کر دی گئی۔ شادی کے دوسرے برس پھر انگلستان گئے

اور آکسفورڈ سے انگریزی ادب میں آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم میں یہ اعزاز حاصل کرنے کے بعد محمد علی جب ہندوستان واپس ہوئے تو رام پور میں انہیں افسر تعلیمات کا عہدہ مل گیا۔ لیکن رام پور کی سازشی فضا محمد علی کو موافق نہ آئی اور انہوں نے کچھ عرصہ بعد اپنے عہدے سے استعفا دے دیا۔ رام پور سے علیحدہ ہونے کے بعد ریاست بڑودہ نے ملازمت دے دی — وہاں محکمۂ افیون کے سپرنٹنڈنٹ اور کچھ دنوں بعد ضلع نوساری کے کمشنر ہو گئے۔ محمد علی کو انگریزی ادب کا اچھا ذوق تھا۔ وہ زمانہ طالب علمی ہی سے انگریزی کے اچھے مضمون نگار مانے جاتے تھے۔ عمر، علم اور تجربے کے ساتھ ان کی مضمون نگاری میں بھی پختگی اور کہنہ مشقی آتی گئی اور یہ شوق اتنا بڑھا کہ دوران ملازمت بھی جاری رہا۔ وہ ادب سے بڑھ کر سیاسیات میں اپنے جوہر دکھانے لگے۔ بڑودہ کی ملازمت کے زمانہ میں محمد علی "ٹائمز آف انڈیا" میں سیاسی مضامین لکھا کرتے تھے۔ اخبار بین طبقہ میں یہ مضامین بڑے شوق اور توجہ سے پڑھے جاتے تھے۔ بڑودہ کونسل نے محمد علی کے اس شوق پر احتساب کرنا چاہا اور ان سے خواہش کی کہ وہ کم سے کم سیاسی رنگ کے مضامین نہ لکھا کریں۔ لیکن محمد علی کونسل کا یہ حکم ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے اور استعفا دے کر اپنے عہدے سے علیحدہ ہو گئے۔ بڑودے سے علیحدگی کے بعد نواب صاحب جاورہ نے محمد علی کو اپنے ہاں وزارت پیش کی اور بیگم صاحب بھوپال نے آپ کو چیف سیکرٹری کا عہدہ پیش کیا۔ لیکن محمد علی نے دونوں میں کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔ انھوں نے کلکتہ سے انگریزی کا ایک ہفتہ وار اخبار "کامریڈ" نکال لیا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۱ء کا ہے اور ہندوستان کی عملی سیاست میں بھی محمد علی کی ابتدا ہے۔ کامریڈ ہی کے ذریعہ محمد علی کے اصلی جوہر کھلے، "کامریڈ" ایک برس ہی میں اس قدر مقبول ہوا کہ ملک کے سربرآوردہ یوروپین اور ہندوستانی اس کے خریداروں میں نظر آنے لگے۔ اصل میں محمد علی کو انگریزی زبان پر اس درجہ قدرت حاصل تھی اور اسلوب بیان اس قدر شستہ ہوا کرتا تھا کہ بڑے بڑے انگریز مدبران کے قلم کا لوہا ماننے لگے تھے۔ یہی ان کے "کامریڈ" کی کامیابی کا راز تھا۔

کامریڈ کی ادارت کے ساتھ ساتھ محمد علی ملک کی عملی سیاست میں بھی حصہ لینے لگے — ۱۹۱۲ء میں جب جنگ بلقان شروع ہوئی اور ترکوں کی مالی امداد کے لئے ملک میں ہلال احمر کے نام سے انجمنیں قائم کی گئیں تو محمد علی اور ان کے بھائی شوکت علی نے اس مقصد کے لئے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا اور اپنی آتش بیانی سے ہندوستان کے مسلمانوں میں

ترکوں کی امداد کا ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر کے لاکھوں روپے جمع کئے۔ ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں ایک طبی وفد ترکی بھیج کر جنگ بلقان میں ترکوں کی امداد کی۔ اس سلسلہ میں محمد علی نے کامریڈ میں ترکوں کی ایک اپیل بھی چھاپی تھی۔ اس اپیل کا شائع ہونا تھا کہ حکومت نے کامریڈ کی وہ ساری کاپیاں جن میں یہ اپیل چھپی تھی ضبط کر لیں اور کامریڈ سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کر لی لیکن اس طلبی ضمانت کا محمد علی پر کوئی اثر نہ پڑا۔ ضمانت تو انھوں نے داخل کر دی مگر کامریڈ کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

۱۹۱۳ء کے وسط میں کانپور میں سڑک کی خاطر جامع مسجد کا ایک حصہ شہید کر ڈالنے پر ہنگامہ ہو گیا۔ پہلے مسلمانوں نے رسمی طور پر احتجاج کیا لیکن یوپی کی حکومت میں جب شنوائی نہیں ہوئی تو مسلمان ایک انبوہ کی شکل میں خود ہی مسجد کے شہید حصوں کو تعمیر کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ حکومت نے مجمع کو منتشر کرنے کے لئے گولیاں چلا دیں جس سے قریباً ایک سو مسلمان شہید ہو گئے۔ اس ہنگامے نے سارے ہندوستان میں آگ لگا دی اور مسلمانوں میں بے پناہ جوش پیدا ہو گیا۔

محمد علی نے فوراً اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انہوں نے گورنر یوپی سے رجوع کیا لیکن جب یہاں شنوائی نہ ہوئی تو میکڈانلڈ کو لندن تار دیا کہ وہ پارلیمنٹ میں اس کے لئے کوشش کریں لیکن جب وہاں سے بھی ان کے تار کا جواب نہیں ملا تو اکتوبر ۱۹۱۳ء میں سر وزیر حسن کے ساتھ خود لندن گئے اور سر جیمز لاٹوش سابق رکن مجلس وزیر ہند کی مدد سے اس قضیہ کو وزیر ہند تک پہنچایا۔ وزیر ہند نے وائسرائے کو ہدایت کی کہ مسجد کے شہید حصے دوبارہ بنوا دیئے جائیں۔ محمد علی اپنے پہلے ہی مشن میں پوری طرح کامیاب رہے۔ آخر دسمبر ۱۹۱۳ء میں ہندوستان واپس آئے جہاں مسلمانوں نے ان کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا۔ یہ محمد علی کا پہلا عوامی استقبال تھا۔ اس دوران حکومت ہند کا پایۂ تخت کلکتہ سے دہلی منتقل ہو گیا اور محمد علی بھی کامریڈ کا دفتر دہلی لے آئے یہاں آ کر حکیم اجمل خاں مرحوم کے مشورے سے کامریڈ کے ساتھ ایک اردو اخبار 'ہمدرد' بھی جاری کر دیا لیکن ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم شروع ہوئی تو لندن ٹائمز کے ایک اشتعال انگیز مضمون کے جواب میں محمد علی نے CHOICES OF THE TURKS کے نام سے کامریڈ کے ۲۴ کالموں میں ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون کو وجہ بنا کر حکومت نے کامریڈ کی ضمانت ضبط کر لی۔ محمد علی نے اس حکم کی اپیل کی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اور کامریڈ بے وقت موت کی آغوش میں

کچھ عرصہ بعد ہی محمد علی کی صحت خراب ہو گئی۔ چنانچہ ڈاکٹروں کے مشورے پر وہ آرام لینے رامپور آ گئے۔ یہاں نواب صاحب رام پور کے حکم سے وہ ۲۴ گھنٹے نظر بند رہے۔ اجمیر جانے کے لیے واپس دہلی آئے تو دوسرے ہی دن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ دہلی کے حکم سے مہرولی میں محمد علی کے ساتھ ان کے بڑے بھائی شوکت علی بھی نظر بند کر دیئے گئے لیکن مہرولی میں چونکہ محمد علی سے ملاقات کے لئے دلی کے مسلمانوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ اس لئے ان دونوں بھائیوں کو حکومت نے لینڈون بھیج دیا اور کچھ ہی دنوں بعد انہیں لینڈون سے چھندواڑہ جانا پڑا جہاں ایک غیر معین مدت کے لئے وہ نظر بند رہے۔

۱۹۱۷ء میں محمد علی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے لیکن حکومت نے ان کو رہا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے ان کی والدہ کو لیگ کی صدارت کرنا پڑی۔ اسی سال کانگریس کے سالانہ اجلاس میں تلک (آنجہانی) نے علی برادران کی رہائی کے لئے ایک قرارداد منظور کرائی مگر وہ بھی بے اثر ہوئی۔ ملک میں جگہ جگہ محمد علی اور شوکت علی کی رہائی کے لئے مظاہرے ہوئے مگر بظاہر کوئی اثر نہ پڑا البتہ یہ ضرور ہوا کہ ۱۹۱۷ء کے آخر میں حکومت کی خفیہ پولیس کا ایک افسر چھندواڑہ پہنچا اور اس نے ان دونوں بھائیوں کو بتایا کہ اگر وہ ایک عہد نامہ پر دستخط کر دیں تو انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ عہد نامہ یہ تھا کہ دوران جنگ میں دونوں بھائی ایسی بات نہ کریں گے جس سے شہنشاہِ انگلستان کے دشمنوں کو تقویت پہنچے۔ محمد علی اور شوکت علی نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور ان کی رہائی کا معاملہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔

۱۹۱۸ء میں علی بھائیوں کی تحقیقات کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر ہوا۔ اس کمیشن نے ان دونوں کے بیان لئے لیکن رہائی کی سفارش اس نے بھی نہیں کی۔

اسی سال نظر بندی کے دوران نماز جمعہ کے بعد چھندواڑے کی مسجد میں محمد علی نے مسلمانوں کے سامنے ایک زبردست تقریر کر ڈالی۔ حکومت نے اس تقریر کو وجہ بنا کر انہیں گرفتار کر لیا اور مقدمہ چلائے بغیر جیل میں بھیج دیا۔ گویا نظر بندی کے زمانے میں جو کچھ تھوڑی بہت آزادی حاصل تھی وہ بھی چھین لی گئی اور بالکل قیدیوں کی طرح کی زندگی شروع ہو گئی۔ ۱۹۱۹ء میں یہ دونوں بھائی جو نظر بندی اور اسیری میں پورے پانچ برس گزار چکے تھے غیر مشروط طور پر رہا کر دیے گئے۔ اس سال وہ کانگریس، خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ کے مشترکہ اجلاس میں شرکت کے لیے امرتسر پہنچے جہاں جلیاں والے باغ کا حادثہ پیش آیا تھا۔ محمد علی اور شوکت علی جیل سے رہا ہوتے ہی

سیدھے امرتسر گئے اور آرام کیے بغیر قوم اور ملک کی خدمت کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ امرت سر میں ان دونوں بھائیوں کا جیسا استقبال ہوا سو ہوا لیکن دہلی میں جس شاہانہ انداز سے ان کا خیر مقدم کیا گیا اس کی نظیر شاید شاہان مغلیہ کے عہد میں بھی نہیں مل سکتی۔

۱۹۲۰ء میں خلافت کا ایک وفد حکومت برطانیہ کو ترکی کے ساتھ اپنے وعدے یاد دلانے محمد علی کی قیادت میں لندن بھیجا گیا۔ لیکن اس وفد کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی اس ناکامی کو وجہ بنا کر محمد علی نے گاندھی جی کے ساتھ حکومت برطانیہ کے "مقاطعہ" والی تحریک میں تعاون کر لیا اور پورے جوش اور سرگرمی سے حکومت کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

گاندھی جی اور محمد علی کے تعاون کا یہ زمانہ اپنے مابعد نتائج کے اعتبار سے خاصا ہنگامہ خیز ہے اس لئے تحریک آزادی کی بنیاد فی الحقیقت اسی تعاون کے بعد پڑتی ہے۔ سارے ملک میں ایسی زبردست سیاسی بیداری پیدا ہو گئی کہ حکومت کے لئے اس کا مقابلہ مشکل ہو گیا۔ مقاطعہ والی تحریک میں خطابات کی واپسی، عدالتوں اور کونسلوں کے بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ اسکولوں اور کالجوں کا مقاطعہ بھی شامل تھا۔

محمد علی نے اپنے چند رفیقوں، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کے ساتھ علی گڑھ کے ارباب حل وعقد کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ حکومت کا دامن چھوڑ کر قوم کی پناہ میں آ جائیں لیکن یہ تجویز منظور نہ کی گئی۔ محمد علی نے کورٹ کے اس فیصلے کے بعد براہِ راست طالب علموں سے خطاب کیا اور انہیں آمادہ کیا کہ اسلام اور وطن کی خدمت کے لیے تعلیم کو خیرباد کہہ کر وہ قومی جنگ میں شریک ہو جائیں۔ طلبہ پر محمد علی کی تقریر کا کافی اثر ہوا۔ سینکڑوں طالب علموں نے جلسہ ہی میں اعلان کر دیا کہ وہ کالج چھوڑ دیں گے طلبہ کے اس فیصلہ سے علی گڑھ کالج کی پرسکون زندگی میں ایک طوفان سا آ گیا اور منتظمین کالج کو طوفان فرو ہونے تک کچھ دنوں کے لئے کالج بند کرنا پڑا۔

علی گڑھ کالج کے اس ہنگامہ کے بعد محمد علی نے قومی خطوط پر ایک اور کالج قائم کیا جس کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا گیا۔ اس معاملہ میں محمد علی کے سب رفیقوں نے ان کا ساتھ دیا۔

محمد علی نے علی گڑھ کالج کے طالب علموں میں منتظمین کے خلاف بغاوت پھیلا کر جس انداز سے اس اسلامی ادارے کو نقصان پہنچایا تھا اس پر بعض لوگوں کو سخت اعتراض ہوا اور یہ

بحث چھڑ گئی کہ تعلیم ختم کرنے سے پہلے سیاست میں طالب علموں کو حصہ لینا چاہیے یا نہیں
یہ ایک طویل اور تلخ بحث تھی جو مدتوں چلتی رہی اور طرفین سے اس پر بہت کچھ کہا گیا لیکن
اطمینان بخش انداز پر اس بحث کا فیصلہ نہ ہو سکا۔

معترضین کو محمد علی سے دراصل شکایت یہ تھی کہ اگر محمد علی قومی خطوط پر کوئی کالج قائم کرنا
چاہتے تھے تو علی گڑھ یونیورسٹی کو نقصان پہنچائے بغیر بھی ایسا کر سکتے تھے۔ علی گڑھ کو حکومت
سے کتنی ہی امداد کیوں نہ ملتی ہو وہ بہر حال ایک مسلم ادارہ تعلیم ہے جس کے تباہ کر ڈالنے
کا خیال ہرگز مستحسن نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں ہندو یونیورسٹی بنارس کی مثال پیش کی جاتی
تھی جہاں کے ارباب حل و عقد نے گاندھی جی کے بائیکاٹ والی تحریک کا اپنی یونیورسٹی پر
مطلق اثر نہ ہونے دیا اور نہ ہندوؤں کے قوم پرست لیڈروں نے ہندو یونیورسٹی کے منتظمین
اس فیصلے کے خلاف وہ انداز اختیار کیا جو محمد علی نے علی گڑھ میں جائز رکھا تھا۔ بہر حال صحیح یا غلط
محمد علی نے علی گڑھ کے بائیکاٹ کی تحریک ضرور چلائی اور اس کے جواب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ
بھی قائم کر ڈالا جو اب تک دلی میں خاص کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ بہر حال محمد علی کی نیت پر شبہ
نہیں کیا جا سکتا۔

گاندھی جی اور محمد علی کا اتحاد دراصل ہندو مسلم اتحاد تھا۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۲ء تک ہندو مسلم
اتحاد کے جو روح پرور نظارے ہندوستان میں نظر آئے وہ اسی اتحاد کی برکت تھی۔ لیکن یہ اتحاد
کچھ زیادہ پائدار ثابت نہ ہوا اور بہت جلد ہندوستان کی پر کیف اور وجد آور فضا مکدر ہو گئی۔

۱۹۲۱ء میں محمد علی نے کراچی خلافت کانفرنس کی صدارت کی۔ اس اجلاس میں ایک تجویز
منظور ہوئی کہ اسلام کے دشمنوں کی اعانت اور خدمت مذہباً حرام ہے۔ یہ تجویز کیا تھی۔ ایک
فتویٰ تھا جس پر علمائے دین کے بھی دستخط تھے اور سیاسی لیڈروں کے بھی! اس تجویز کا پاس
ہونا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں عام بے چینی پیدا ہو گئی اور حکومت کی ملازمت ناجائز
قرار دے دی گئی۔

اس تجویز کے الزام میں حکومت نے محمد علی کو گرفتار کر لیا۔ ان کے ساتھ شوکت علی، مولانا
عبد الباری، ڈاکٹر کچلو، پیر نگاڑو اور سوامی شنکر اچاریہ بھی پکڑے گئے۔ کراچی میں ان پر مقدمہ چلا
اور محمد علی کو حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے کے جرم میں دو سال کی سزا سنا دی گئی۔ دو سال
کی سزا بھگت کر اگست ۱۹۲۳ء میں محمد علی جیل سے باہر آئے اور اسی سال ان کی قومی خدمات کا

اعتراف کرتے ہوئے کانگریس کی صدارت کے لئے ان کا نام پیش کیا گیا۔

۱۹۲۴ء محمد علی کی صدارت کا سال ہے لیکن نہایت پُرشور اور ہنگامہ خیز! حکومت سے ترک تعاون والی تحریک کا ردِ عمل شروع ہو چکا تھا۔ ہندو مسلمانوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور برس بھر پہلے ان دونوں قوموں میں جو اتحاد تھا وہ رخصت ہوا۔ شردھانند جیل سے معافی مانگ کر رہا ہوا اور شدھی کی فرقہ وار تحریک شروع کر دی۔ پنڈت مالویہ نے پنجاب اور یو پی کے ہندوؤں کو سنگھٹن کی تلقین شروع کر دی۔ اس کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے تبلیغ اور تنظیم کی تحریکیں شروع ہوئیں اور مقابلہ کی فضا قائم ہو گئی۔ ان اکھاڑوں کا نتیجہ بھی بہت جلد نکل آیا۔ جگہ جگہ ہندو مسلم فساد ہوئے اور اتحاد و اتفاق کا خیال بھی حرام سمجھا جانے لگا۔

ان فرقہ وار ہنگاموں کے دوران مسلم قوم پرور رہنماؤں کی پوزیشن، جن میں محمد علی بھی شامل تھے، عجیب تھی۔ یہ قوم پرور رہنما تو اپنے رجعت پسند مسلمان بھائیوں سے دست و گریبان تھے اور ان کے خلاف انہوں نے پوری قوت سے جنگ شروع کر رکھی تھی لیکن ہندوؤں کے قوم پرست رہنما اپنے تاریک خیال مہاسبھائی ہندو کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالنے کو تیار نہیں تھے۔ بلکہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ کانگریس کے یہ نام نہاد ہندو رہنما مہاسبھائیوں کو فتنہ پردازیوں اور فرقہ وارانہ تحریکوں میں ان کی اخلاقی امداد بھی کرتے رہے تھے۔ اسی مشاہدے نے جو تواتر کی حد تک پہنچ گیا تھا، مسلم قوم پرور رہنماؤں کو بد دل کرنا شروع کیا اور وہ باری باری کانگریس سے علیحدہ ہونے لگے۔

۱۹۲۵ء کے وسط میں ایک خالص اسلامی مسئلہ زیرِ بحث آ گیا۔ حجاز پر ابنِ سعود کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا اور اس قبضہ کے دوران نجدیوں کی بے اعتدالیوں کے افسانوں نے ہندوستان کے سُنّی مسلمانوں کو بے چین کر رکھا تھا۔ اس کے ساتھ حجاز کے مستقبل کا سوال تھا۔ ابن سعود نے اعلان کیا تھا کہ اس کا تصفیہ مؤتمر اسلامی کرے گی۔ چنانچہ ہندوستانیوں کو بے چینی سے مؤتمر اسلامی کا انتظار تھا۔

۱۹۲۶ء میں مکہ میں مؤتمر اسلامی کا اعلان ہوا۔ محمد علی خلافت کے وفد کے ساتھ اس مؤتمر میں شامل ہونے مکہ گئے جہاں انہوں نے عمارتوں اور مقابر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جنہیں ابنِ سعود کے آدمیوں نے منہدم کر دیا تھا اور ابنِ سعود کے اس نظم و نسق کا بھی مطالعہ کیا جو وہاں موجود تھا۔ محمد علی حجاز مقدس میں ایک جمہوری نظام حکومت کی سکیم لے کر مؤتمر میں گئے مگر وہ

انہیں محسوس ہوا کہ یہ مؤتمر برائے نام ہے اور محض اس لئے طلب کی گئی ہے کہ ابن سعود کی شان میں فتح حجاز کے متعلق سپاسنامہ پیش کرے۔ محمد علی اس انداز سے بہت بددل ہوئے لیکن مؤتمر میں ان کی ایک نہ چلی۔ وہ ناکام ہندوستان واپس آئے اور یہاں انہوں نے ابن سعود کی پوری شدت کے ساتھ مخالفت شروع کر دی۔

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ابتداً میں محمد علی، شریف حسین کی بداعمالیوں کے باعث اس کے مخالف تھے اور ابن سعود نے چونکہ مقامات مقدسہ پر حکومت جمہوری کے قیام کا اعلان کیا تھا اس لئے اس کے طرفدار ہو گئے تھے لیکن نام نہاد مؤتمر کی ناکامی اور ابن سعود کے طرز حکومت کا مشاہدہ کرنے کے بعد محمد علی اسی شدت سے اس کے مخالف ہو گئے جس شدت سے کبھی اس کی حمایت کی تھی۔ اس ردعمل کا اثر یہ ہوا کہ خود مسلمانوں میں ایک طبقہ محمد علی کی اس روش پر معترض تھا۔ اس اعتراض کے ساتھ خلافت کمیٹی کے غبن کا مسئلہ بھی اٹھایا گیا اور یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ اس کے آگے مسلمانوں کے لئے ہندوستان کے دوسرے مسائل میں دلچسپی باقی نہیں رہی۔
اسی دوران یعنی مئی ۱۹۲۶ء میں خلافت کا خاص اجلاس ہوا جس میں ہندو قوم پرستوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا کہ وہ اپنے مہاسبھائی عنصر کی مذمت نہیں کرتے جس سے ملک کی فضا مکدر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کانفرنس کے بعد مسلم قوم پرور رہنما کانگریس سے علانیہ کشیدہ نظر آنے لگے انہیں لیڈروں میں محمد علی بھی تھے۔

محمد علی کانگریس کے مہاسبھائی ممبروں کی ذہنیت سے دل برداشتہ ضرور رہنے لگے تھے لیکن ابھی انہوں نے کانگریس سے اپنا رشتہ نہیں توڑا تھا بلکہ اس کوشش میں تھے کہ کسی نہ کسی طرح ایک بار پھر ہندو مسلم اتحاد ہو جائے۔ چنانچہ محمد علی کی سعی سے کئی یونٹی کانفرنسیں ہوئیں مگر ناکام رہیں، ۱۹۲۷ء میں آل پارٹیز کانفرنس کے نام سے اتحاد کی ایک اور کوشش ہوئی وہ بھی ناکام رہی۔ آخر محمد علی نے مسلمانوں کی سب جماعتوں کو متحد کرنے کی کوشش کی تاکہ یہ سب متحد ہو کر اپنا مطالبہ کانگریس سے منوا لیں۔ ۱۹۲۷ء میں اسمبلی کے زمانہ میں مسلم لیگ کا اجلاس دلی میں طلب کیا اور مسٹر جناح کی شرکت سے وہ مطالبے اس اجلاس میں پیش کئے جو مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مطالبات کے سلسلہ میں بطور بنیاد کام دے سکتے تھے۔ ان نکات کو سب مسلم جماعتوں نے تسلیم کر لیا اور محمد علی نے مسلم لیگ کی منظوری کے بعد ان مطالبات کو کانگریس کے روشن خیال طبقہ سے بھی منظور کرا لیا۔ اسی اثناء میں انگلستان کی مزدور حکومت کی طرف سے سائمن کمیشن

ہندوستان بھیجا گیا کہ وہ ملک کے حالات ء مطالعہ کر کے ہندوستان کے لئے ایک دستور اساسی کی سفارش کرے۔ کانگریس نے اس کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا اور مسلمانوں کا قوم پرور طبقہ بھی اس مسئلہ میں کانگریس کے ساتھ ہو گیا۔ لیکن مسلمانوں کے حکومت پرست طبقہ نے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس طبقہ کے لیڈر سر محمد شفیع تھے۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال مسلم لیگ کا اجلاس دو مقامات پر ہوا۔ ایک لاہور میں جس کے صدر سر محمد شفیع تھے اور دوسرا کلکتہ میں جہاں محمد علی جناح نے صدارت کی۔ کلکتہ والے اجلاس نے دہلی کی تجاویز کا اعادہ کیا اور محمد علی کی تجویز کے مطابق سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ قوم پرور مسلمانوں کے اس طرزِ عمل سے کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کا اختلاف بڑھنے نہ پایا اور فضا کسی قدر درست ہو گئی لیکن بہت دنوں تک یہ کیفیت باقی نہیں رہی۔ حکومت برطانیہ کے چیلنج کے جواب میں کانگریس نے ہندوستان کا دستور اساسی مرتب کرنے کے لئے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں کانگریسی ممبروں کی ایک سب کمیٹی بنائی جس نے ہندوستانی دستور کا خاکہ مرتب کر کے کانگریس میں پیش کر دیا۔ یہ خاکہ نہرو رپورٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہی وہ رپورٹ ہے جس کے کنونشن میں منظور ہونے کے بعد مسلمانوں کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ محمد علی نے بھی آل انڈیا کانگریس سے اپنی بے تعلقی کا اعلان کر دیا۔

نہرو رپورٹ جس وقت کانگریس کے سامنے پیش ہوئی، محمد علی علاج کے لئے یورپ گئے ہوئے تھے۔ لیکن یہ خبر سن کر وہ فوراً ہندوستان آئے اور انہوں نے علی الاعلان اس رپورٹ کی مخالفت کی۔

نہرو رپورٹ پر محمد علی کو دو بنیادی اعتراض تھے ایک یہ کہ رپورٹ کی بنیاد کانگریس کی منظور قرار داد "آزادیٔ کامل" کے نصب العین پر نہیں رکھی گئی بلکہ یہ ڈومینین اسٹیٹس کا غیر مکمل سا خاکہ ہے۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اس میں مسلمانوں کے ان سیاسی مطالبات کا تشفی بخش طریقہ پر حل نہیں پیش کیا گیا جو دہلی کی تجاویز میں صراحت کے ساتھ مسلمانوں کی ساری سیاسی جماعتوں کی منظوری سے قلم بند کئے گئے تھے۔ اسی سلسلہ میں محمد علی نے ایک بیان بھی شائع کیا، جس میں افسوس کے ساتھ کانگریس سے اپنی علیحدگی اور بے تعلقی کا اعلان کیا گیا تھا۔ کانگریس سے علیحدگی کے بعد محمد علی صرف خلافت کمیٹی کے ہو رہے اور مسلمانوں میں تنظیم کا کام شروع کر دیا۔

اسی دورِ تنظیم میں ایک ایسا ناگوار واقعہ پیش آیا جس نے مسلم سیاست میں مزید پراگندگی

پیدا کر دی اور محمد علی کی شخصیت کو ناقابلِ نقصان پہنچایا۔

حکومت سے "ترکِ تعاون" کے ابتدائی دور میں محمد علی نے مسلم عوام میں کامیابی سے بیداری اور جوش پیدا کرنے کے لئے مسلمانوں کے مذہبی طبقہ کو اسٹیج پر آنے کی ترغیب دی لیکن سیاست میں یہ طبقہ چونکہ بصیرت نہیں رکھتا تھا اس لیے محمد علی خود ہی اس طبقہ کے سیاسی استاد بھی تھے۔ ابتداً تو شاگردوں کے ساتھ استاد کا نباہ ہوتا رہا، لیکن کچھ ہی دنوں بعد سیاست کے ان نومشق شاگردوں میں مذہبی اختلافات کا جذبہ پیدا ہو گیا اور محض اس بنا پر کہ محمد علی کے پاس کسی مذہبی مدرسہ کی سند نہیں ہے، انھوں نے محمد علی کی قیادت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ وہ وقت تھا جب محمد علی نے کانگریس سے تعلق ختم کر دیا تھا اور اب وہ مسلمانوں کی طاقتور جماعت کو ہاتھ میں لے کر تنظیم کا کام کرنا چاہتے تھے۔ ایسے وقت میں مذہبی گروہ کے ان چند شوریدہ سر افراد کی تنگ دلی اور تنگ نظری سے محمد علی کو سخت تکلیف پہنچی اور انھیں ایسا محسوس ہوا کہ ان کے سیاسی مخالفوں نے ان لوگوں کو اکسا کر انھیں نیچا دکھایا اور مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرنا چاہا۔ چنانچہ جب یہ حقیقت بالکل ظاہر ہو گئی تو اس گروہ کے بعض ان افراد کے ساتھ جنھیں ان کی قیادت پر کامل اعتماد تھا، محمد علی نے جمعیت العلمائے ہند کانپور کے نام سے ایک نئی جماعت کی بنیاد ڈال دی وہی اس کے پہلے صدر منتخب ہو گئے۔ مسلمانوں میں آپس کے اختلاف کی یہ ابتدا تھی۔ اس کے بعد مسلمانوں میں گروہ بندی کی وہ وبا پھیلی کہ اسلامی یکجہتی کے پرزے اڑ گئے۔ جو لوگ سیاست کو مذہبی عینک سے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے ان کے نزدیک محمد علی کی یہی غلطی تھی کہ انھوں نے مولویوں کی جماعت کو سیاسی اسٹیج پر آنے کی ترغیب دی اور یہ اس سے بھی بڑی غلطی تھی کہ ۱۹۲۰ء میں اس گروہ کو دو مخالف جماعتوں میں تقسیم کر دیا کہ مولویوں کا مسلم عوام پر بڑا اثر تھا جس سے کام لے کر بعض کوتاہ اندیش مولویوں نے مسلم سیاست اور مسلم مفادات کی حفاظت کو تو پسِ پشت ڈال دیا اور ذاتی اقتدار کی خاطر مذہبی دھڑے بندی کے اصول پر سیاسی دھڑے بندی شروع کر دی جس کے بعد مسلمانوں کی سیاسی مرکزیت کا خیال ایک ایسا خواب بن کر رہ گیا جس کی کوئی تعبیر ہی نہیں ہو سکتی۔

محمد علی کی زندگی کا آخری کارنامہ گول میز کانفرنس میں شرکت ہے۔ ہندوستان سے لندن تک کا یہ سفر محمد علی نے بحالتِ علالت پر کیا جس وقت لندن پہنچے، مرض میں کسی قدر افاقہ تھا

کانفرنس میں شریک ہوئے اور معرکہ آرا تقریر کی جس کا یہ آخری جملہ آج تک زبان زد عام ہے اور جو حقیقتاً ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ محمد علی نے برطانوی پارلیمان کے نمائندوں کو مخاطب کر کے کہا:

"میں آج اس مقصد سے یہاں آیا ہوں کہ جب میں اپنے وطن واپس جاؤں تو آزادی کا منشور میرے ہاتھ میں ہو۔ میں غلام ملک میں واپس نہیں جاؤں گا ایک غیر ملک میں، جسے آزادی کی نعمت حاصل ہے مجھے غریب الوطنی کی موت منظور ہے۔ اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو آپ کو میرے لئے یہاں قبر کے لئے جگہ دینا ہو گی۔"

جس سچے جوش اور جذبہ سے محمد علی نے یہ بات کہی تھی اس کا اثر بھی فوراً ظاہر ہوا اور اس تقریر کے صرف دو ہی دن بعد وہ ہندو مسلم سمجھوتے کے لئے اپنی آخری اسکیم تیار کر رہے تھے کہ ۴۔ جنوری ۱۹۳۱ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انتقال کے بعد بعض احباب کی تجویز یہ تھی کہ مرحوم کو لندن ہی میں دفن کیا جائے مگر ان کی بیگم کا اصرار تھا کہ مرحوم کی لاش ہندوستان لے جائی جائے۔ ان دونوں تجویزوں کے برعکس، مفتیِ اعظم فلسطین امین الحسینی کے ایماء پر انہیں یروشلم میں دفن کیا گیا۔ اسلام اور مسلمانوں سے مرحوم کو جو محبت اور سچا خلوص تھا اور ساری عمر جس طرح انہوں نے اسلام کی خدمت کی۔ اس کے بعد وہ یقیناً اس اعزاز کے مستحق تھے انہیں مقدس سرزمین نصیب ہوئی جو مسلمانوں کی قبلۂ اوّل تھی۔

ایچ۔ جی ویلز نے ان کے بارے میں کہا کہ

"مولانا کے پاس میکالے کا قلم، برک کی زبان اور نپولین کا دل تھا۔"

نوابزادہ لیاقت علی خاں

(۱۸۹۵ء تا ۱۹۵۱ء)

قریباً سوا پانچسو سال پہلے نوشیرواں عادل کی نسل سے تعلق رکھنے والا ایک خاندان ایران سے ہندوستان آیا۔ تلاشِ روزگار کے سلسلے میں اس خاندان کو مختلف شہروں میں گھومنا پڑا۔ لاہور کے بعد یہ کنبہ پہلے مظفر نگر گیا۔ پھر مستقل طور پر مشرقی پنجاب کے شہر کرنال میں آباد ہو گیا۔ مظفر نگر میں فوجی ملازمتوں اور اعلیٰ خدمات سرانجام دینے کے صلے میں اس کنبہ کو

کافی جاگیریں اور دیگر اعزازات ملے۔ اسی کنبے میں ایک شخص نواب رستم علی خاں تھے ان کے چار بیٹوں میں ایک نواب زادہ لیاقت علی خاں تھے جو کرنال میں یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔

لیاقت علی خاں نے قرآن کریم اور حدیث کی تعلیم بعض علماء سے اپنے گھر پر حاصل کی اور اس کے بعد کرنال کے اسکول میں داخل کر دیئے گئے۔ پانچویں جماعت میں جب وہ اول درجے پر آئے تو انہیں انعام کے طور پر ایک کتاب دی گئی لیکن لیاقت علی خاں نے کتاب کی جگہ یہ درخواست کی کہ انہیں چھٹی کی بجائے ساتویں جماعت میں کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، لیاقت علی خاں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ موسیقی کا بھی بہت شوق تھا اور اس مقصد کے لئے انہوں نے استاد اللہ رکھا سے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے بی اے کرنے کے لئے علیگڑھ کالج میں داخلہ لیا۔ کچھ عرصہ وہاں تعلیم حاصل کی۔ پھر الہ آباد کے ایک کالج میں داخل ہو گئے ــــ ۱۹۱۹ء میں بی اے کرنے کے بعد وہ کرنال واپس آ گئے۔ کچھ عرصے بعد ہی ان کے والد انتقال کر گئے اور لیاقت علی خاں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان چلے جائیں۔ ایگزیٹر کالج آکسفورڈ یونیورسٹی سے انہوں نے ۱۹۲۱ء میں ایم اے کی سند حاصل کی بعد ازاں وہیں سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۳ء میں وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ انہیں بہت سی اچھی ملازمتوں کی پیش کش کی گئی مگر انہوں نے ملازمت سے انکار کر دیا۔

ہندوستان لوٹنے کے بعد انہوں نے سیاسی حالات کا مطالعہ شروع کیا اور اس کوشش میں رہے کہ مناسب وقت پر سیاست میں عملی حصّہ لینا شروع کر دیں۔ اس وقت مسلم لیگ، ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی لہذا لیاقت علی خاں نے اس کی رکنیت اختیار کر لی اور جب ۱۹۲۶ء میں لیجسلیٹو اسمبلی کے انتخابات کا آغاز ہوا تو انہوں نے بھی بطور آزاد امیدوار حصّہ لیا۔ وہ باآسانی جیت گئے اور صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ ابتداء اسمبلی میں وہ مسلم لیگ کی بنچوں پر بیٹھنے کی بجائے احتیاطاً آزاد بنچ پر رہے۔ یہاں سے انہیں جو تجربہ حاصل ہوا اس کی روشنی میں انھوں نے اسمبلی کے اندر ڈیموکریٹک پارٹی تشکیل کی اور اس کے قائد چنے گئے۔ جب ڈپٹی سپیکر کا انتخاب ہوا تو انہیں متفقہ طور پر چن لیا گیا۔

۱۹۲۴ء میں انہوں نے مسلم لیگ میں شرکت کر لی اور اس کے بعد سے سیاست میں گہری دلچسپی لینا شروع کر دی۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں قائد اعظم کو آل پارٹیز نیشنل کنونشن میں

شرکت کی دعوت دی گئی تاکہ نہرو رپورٹ پر بحث کی جاسکے۔ یہ معاملہ مسلم لیگ کونسل کے زیر بحث آیا۔ کچھ لوگوں نے اس کنونشن میں شرکت کے حق میں بات کی اور کچھ نے اس کے خلاف، لیکن جب کونسل نے نہرو رپورٹ کو مسترد کرنے کا فیصلہ کیا تو چھاگلہ نے بمبئی مسلم لیگ کے سیکرٹری کے عہدے سے استعفا دے دیا۔ تاہم اُن کی یہ تجویز کہ قائد اعظمؒ کی قیادت میں مسلم لیگ کی ایک کمیٹی کنونشن میں شرکت کرے، منظور کر لی گئی اس مقصد کے لئے ۲۰ افراد پر مشتمل وفد ترتیب دیا گیا جس میں لیاقت علی خاں بھی شامل تھے۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۳۲ سال تھی۔

پہلی گول میز کانفرنس کے بعد جب قائد اعظم سیاست سے کنارہ کش ہو کر انگلستان چلے گئے لیاقت علی خاں نے ہی انہیں مسلسل اصرار کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے پر آمادہ کر لیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۲۔ اپریل ۱۹۳۶ء کو بمبئی میں سید وزیر حسن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محمد علی جناح مسلم لیگ کے صدر تھے اور جنرل سیکرٹری کے عہدے کیلئے انتخاب ہونا تھا۔ اکثر لوگ راجہ غضنفر علی خاں کے حق میں تھے لیکن قائد اعظم نے خود ایک قرارداد پیش کی اور لیاقت علی خاں کی تعریف کرتے ہوئے اپیل کی کہ انہیں سیکرٹری چن لیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور لیاقت علی خاں آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے جنرل سیکرٹری منتخب ہو گئے اس وقت سے ۱۹۴۷ء تک وہ اسی عہدے پر رہے۔

اس دوران وہ قائد اعظمؒ کے بہترین معتمد اور دستِ راست رہے۔ ۱۹۴۰ء میں اجلاس لاہور میں قراردادِ پاکستان منظور ہونے کے بعد پنجاب کے یونینسٹ پاکستان کے مطالبے کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے اور جب مدراس میں اپریل ۱۹۴۱ء میں مسلم لیگ کا ۲۸واں اجلاس ہوا تو یہ بات واضح کر دی گئی کہ مسلم لیگ پاکستان کے مطالبے سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹے گی۔ اس موقع پر نوابزادہ لیاقت علی خاں نے قراردادِ پاکستان کے مقاصد پر مشتمل ایک اور قرارداد پیش کی جو متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

۱۹۴۳ء میں جب دوبارہ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کے انتخاب کا مسئلہ پیش آیا تو قائد اعظمؒ نے مسلم لیگ کے اجلاس میں لیاقت علی خاں کو اس انداز میں خراجِ عقیدت پیش کیا کہ شاید آج تک کسی کو نصیب نہ ہوا ہو۔

" لیاقت علی خاں میرا دستِ راست ہے اور اس نے تاریخ کے مشکل ترین دور

میں اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان دل سے اس کی عزت کرتے ہیں اور اس پر اعتماد کرتے ہیں۔ لیاقت علی خاں بلاشبہ ایک اونچے گھرانے کی پیداوار ہے لیکن عوام کے ساتھ اس نے جو سلوک کیا ہے وہ مثالی حیثیت رکھتا ہے اور ہم سب کو اس کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔ میری دعا ہے کہ خدا اسے عمرِ دراز عطا فرمائے تاکہ وہ قوم کی زیادہ سے زیادہ خدمات انجام دے سکے۔"

۱۹۴۷ء تک لیاقت علی خاں ہندوستان کے مسلمانوں کے مسلمہ رہنما بن چکے تھے۔ اسی بورڈ کے چیئرمین اور مسلم لیگ کے ترجمان روزنامہ ڈان کے مینجنگ ڈائرکٹر تھے۔

۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو جب شملہ کانفرنس کا انعقاد ہوا تو انہوں نے سب سے پہلے اس اصول پر اصرار کیا کہ مسلم لیگ کو کانفرنس میں شریک ہونے والے لوگوں کی نامزدگی کا مکمل اختیار ہونا چاہیئے۔ مولانا آزاد کو کانگریس کے صدر، خضر حیات ٹوانہ کو پنجاب کے وزیر اعلیٰ اور ڈاکٹر خان صاحب کو صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت میں مدعو کیا گیا۔ مسلم لیگ کی نمائندگی چھ افراد نے کی اور ان میں نوابزادہ لیاقت علی خاں بھی شامل تھے۔ ۱۹۴۶ء میں جب مرکز کی عبوری حکومت قائم کی گئی تو لیاقت علی خاں کو خزانے کی وزارت سونپی گئی۔ کانگرس نے لیاقت علی خاں پر اس گھمنڈ میں اعتراض نہ کیا کہ ایک مسلمان خزانے کے معاملے میں بُری طرح ناکام ہو جائے لیکن جلد ہی ہندوؤں کو محسوس ہو گیا کہ انہوں نے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ خود مولانا آزاد نے لکھا:

"جلد ہی کانگریس نے محسوس کیا کہ محکمہ مالیات کی مرضی کے بغیر کسی محکمے میں ایک چپڑاسی بھی بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔"

اسی دوران میں پہلی بار ایک مسلمان وزیرِ خزانہ کو ملک کا بجٹ پیش کرنا تھا۔ بجٹ کی تجاویز میں لیاقت علی خاں نے ایک خاص حد سے زیادہ آمدنی پر ۲۵ فیصد ٹیکس عائد کر دیا۔ اس تجویز پر کانگریس تو کیا پورے ہندوستان کا ہندو بُری طرح چیخ اٹھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی تجارت ہندو کے اردگرد گھوم رہی تھی اور اس ٹیکس سے سرکاری خزانے میں صرف ہندو کی دولت سمٹ کر آجاتی۔ کانگریسی وزیر اور خود پنڈت نہرو، کابینہ کے اجلاس میں تو اس تجویز سے متفق ہو گئے کیونکہ کانگریس بار بار یہ نعرہ بلند کرتی تھی کہ اس کا نقطۂ نظر سوشلزم ہے جبکہ مسلم لیگی سرمایہ داری کے حامی ہیں۔ اس طرح کانگریس خود اپنے جال میں پھنس گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے ہندو سرمایہ دار کانگریس کے خلاف ہو گئے۔ نہرو نے یہ دیکھا تو بجٹ تجاویز کی مخالفت شروع کر دی اور

سال جب حکومتِ ہندوستان نے ایک تجارتی وفد انگلستان بھیجا تو لیاقت علی خاں کو بھی اس میں شامل کر لیا۔ جب ۱۹۴۰ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے تو انہوں نے یو پی اسمبلی میں انتہائی خدمات سرانجام دیں۔ اس موقعے پر مسلم لیگ نے انہیں بریلی سے انتخاب لڑنے کو کہا اور وُہ بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ اُن کی شب و روز محنت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اُن کے پاس بیک وقت متعدد ذمہ داریاں تھیں۔ وُہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے لیڈر، مسلم لیگ کے اعزازی جنرل سیکریٹری، آل انڈیا مسلم لیگ کی ایکشن کمیٹی کے کنوینر، مرکزی پارلیمانی ۹ پیغام گوشتہ نمروں کو قبول گئی۔ آخر کار لیاقت علی خاں نے ٹیکس کم کرکے ۱/۲ ۱۴ فیصد کر دیا۔

۲۹۔ نومبر ۱۹۴۶ء کو وائسرائے ہند لارڈ ویول نے آئین ساز اسمبلی کے لئے دعوت نامے جاری کئے۔ اسمبلی کا کام یہ تھا کہ وہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرے۔ لیکن مسلم لیگ کے ممبروں کو ہدایت کی گئی کہ وُہ اسمبلی میں شریک نہ ہوں۔ یہ سن کر لارڈ ویول کو سخت غصہ آیا اور اس نے لیاقت علی خاں سے کہا کہ اگر انہوں نے ۱۶ مئی کی تجویز کو قبول نہ کیا تو عبوری حکومت سے مسلم لیگ کے تمام وزراء کے نام خارج کر دیئے جائیں گے اس پر لیاقت علی خاں نے جواب دیا کہ مسلم لیگ کابینہ سے الگ ہونا گوارا کر سکتی ہے لیکن اپنے اصولوں کو نظرانداز کرنے پر ہرگز تیار نہیں۔ جب حالات خراب ہو گئے تو وائسرائے کو انگلستان سے حکم ملا کہ وُہ مسلم لیگ، کانگریس اور سردار بلدیو سنگھ سے درخواست کریں کہ وُہ انگلستان آئیں اور اس تعطل کو ختم کرنے کی کوشش کریں لہٰذا قائد اعظم اور لیاقت علی خاں ۲ دسمبر ۱۹۴۶ء کو لندن پہنچ گئے۔ برطانیہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ کے ساتھ بات چیت کے دوران یہ فیصلہ کیا گیا کہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے ہندوستانیوں کو اختیارات منتقل کر دیئے جائیں۔

نواب زادہ لیاقت علی خاں نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی ختم کرنے کے لئے بھی پُوری جد و جہد کی۔ اس کی ابتداء انہوں نے پہلے اپنے صُوبے سے اور پھر کل ہند سطح پر کی۔ وُہ ایک عرصے تک علی گڑھ یونیورسٹی کی ایگزامینیشن کمیٹی کے رکن رہے اور اس کے بعد اینگلو عریبک کالج دلی کی کمیٹی کے رکن اور بعد ازاں اس کے سیکریٹری بھی رہے۔ یہ اعزازی عہدے اُن کے پاس سات سال تک رہے۔

۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ ۱۵ اگست کو انہیں پاکستان کا وزیر اعظم مقرر کر دیا گیا۔ اُن کے کندھوں پر ایک نوزائیدہ مملکت کی جو بھاری ذمہ داریاں آن پڑی

تھیں، انہیں لیاقت علی خاں نے نہایت دیانت داری اور جانفشانی سے کے ساتھ سرانجام دیا۔
۱۶۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو وہ کراچی سے راولپنڈی گئے۔ یہاں انہیں ایک جلسہ عام سے خطاب کرنا تھا
چار بجے شام وہ کمپنی باغ میں پہنچے لیکن جونہی انہوں نے عوام سے خطاب شروع کیا۔ ایک شخص سید
اکبر نے ان پر فائر کھول دیئے۔ گولی اُن کے سینے میں لگی۔ انہوں نے کلمہ پڑھا اور یہ کہہ کر "خدا پاکستان
کی حفاظت کرے" ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ گو یہ کہا جاتا ہے کہ ان کے قاتل کو موقعہ پر
ہی ہلاک کر دیا گیا لیکن اب تک اس شخص کے اصل قاتل ہونے پر اس لئے شبہ کیا جاتا ہے کہ اس
سازش میں کچھ اعلیٰ سرکاری افسروں کا ہاتھ تھا تاہم اس لمحے تک اس قتل کے بارے میں واضح طور پر
کوئی بات سامنے نہیں آسکی۔

چودھری رحمت علی

۱۸۹۵ء تا ۱۹۵۱ء

چودھری رحمت علی ۱۸۹۵ء میں ضلع ہوشیارپور کے ایک گاؤں موہر میں پیدا ہوئے۔ ان کے
والد کی تھوڑی سی زمین تھی جس سے باعزت زندگی گزارنے کے لئے مناسب آمدن ہو جاتی تھی۔
چودھری رحمت علی کے والد کی خواہش تھی کہ اُن کا لڑکا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔ اسی گاؤں میں ابتدائی
تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے موضع راہوں کے مڈل سکول میں داخلہ لے لیا۔ میٹرک کرنے
کے لئے وہ جالندھر گئے اور اینگلو سنسکرت ہائی سکول میں داخل ہو گئے۔ یہاں سے میٹرک کرنے کے
بعد وہ لاہور چلے آئے اور اسلامیہ کالج سے بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ کالج کی تعلیم کے دوران ہی
وہ ایک اخبار "کشمیری" میں سب ایڈیٹر ہو گئے جہاں انہوں نے انگریز سامراج کے خلاف مضامین
لکھنا شروع کر دیئے۔ ایسے ہی ایک مضمون پر حکومت حرکت میں آگئی اور اخبار کو ضمانت داخل
کرانے کے لئے کہا گیا۔ اخبار کے مالک محمد دین فوق نے ضمانت داخل کرا دی لیکن چودھری رحمت علی
کو ملازمت سے جواب دے دیا۔

کالج میں بھی ان کی سرگرمیاں اسی قسم کی تھیں۔ ایک بار کالج کے ہندو طلبا نے ہندو
پرنسپل مسٹر چیٹرجی سے شکایت کی "چودھری رحمت علی انگریز اور ہندو کے خلاف بہت باتیں کرتا
ہے"۔ اس کے جواب میں پرنسپل نے کہا: "اس کی باتوں کو نظرانداز کر دیا کرو کیونکہ وہ جاگتے میں خواب
دیکھتا ہے اور ایک پاگل لگتا ہے"

چودھری رحمت علی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد چیفس کالج لاہور میں لیکچرر ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد ہی بیرسٹری کرنے کے لئے انگلستان چلے گئے انہوں نے اعزاز کے ساتھ ایم اے اور پی۔ ایل۔ بی کیا۔ اسی دوران ہندوستان کے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں مخصوص خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء کے دوران انہوں نے کیمبرج میں قومی تحریکِ پاکستان کی ابتداء کی۔ ۲۸۔ جنوری ۱۹۳۳ء کو اولین، لیکن انتہائی تاریخی اہمیت کا حامل کتابچہ "اب یا کبھی نہیں" شائع کیا۔ اس کے نیچے "چودھری رحمت علی بانی قومی تحریکِ پاکستان" لکھا تھا اور ۳۔ ہمبرسٹون روڈ کیمبرج انگلستان کا پتہ درج تھا۔ اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا جس میں کہا گیا تھا:

"میں پاکستان کے تین کروڑ مسلمانوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں ایک اپیل روانہ کر رہا ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کے صوبہ پنجاب، سرحد، کشمیر، سندھ اور بلوچستان میں رہتے ہیں۔ منسلک کتابچے میں ان لوگوں کی علیحدہ قومی حیثیت کے تعین کا مطالبہ درج ہے"۔

کتابچے میں کہا گیا تھا کہ "یہ اپیل ایسے نازک موقع پر کی جا رہی ہے جب مسلمان زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ اس کے بہت سے حصوں میں مختلف قومیتیں موجود ہیں۔ مسلمانوں کا مذہب، ثقافت، تاریخ، روایات، سماجی ضابطہ، اقتصادی نظام، قوانینِ وراثت اور شادی ہندوستان میں رہنے والی ہر دوسری قوم سے مختلف ہیں۔ ہم ان کے ساتھ کھا نہیں سکتے نہ ایک دوسرے سے شادی کر سکتے ہیں۔ ہمارے قومی رسم و رواج اور کیلنڈر، حتیٰ کہ ہماری خوراک اور لباس بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اگر اس کے باوجود پاکستان کے مسلمانوں کو مجوزہ وفاقِ ہند میں مدغم کر دیا گیا تو ہم بھی اقلیت ہی کر رہ جائیں گے یہ وہ ٹھوس اور تاریخی حقائق ہیں جنہیں کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ ہم جس کے مستحق ہیں اسی کا مطالبہ کر رہے ہیں لہذا "پاکستان" کی صورت میں اور باقی ماندہ ہندوستان سے علیحدہ ہماری قومی حیثیت کا تعین ضروری ہے۔ پاکستان کا قیام ایک علیحدہ قوم کے لیے ہوگا باقی حصہ ہندوؤں کے پاس رہے گا جہاں وہ خود مختار حیثیت میں زندہ رہیں گے ماضی میں ہم نے لاتعداد مصائب اور خطرات کا سامنا کیا لیکن ہم صرف ایک چیز برداشت نہیں کر سکتے اور وہ ہے خودکشی! ہم اپنے آپ کو کسی قیمت پر بھی ہندو کی صلیب پر نہیں چڑھنے دیں گے۔ ہمارے سینوں میں اسلام کا نور اب بھی موجود ہے۔ ہمارا مسئلہ ابھی حل ہونا چاہئے ورنہ یہ کبھی حل نہ ہو سکے گا۔ اگر ہم اپنے عقائد سے

انحراف نہ کریں تو ہمارا مستقبل دیوی دیوتاؤں کی گود میں نہیں بلکہ ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوگا۔ ہم چاہیں تو اسے بنا سکتے ہیں چاہیں تو بگاڑ سکتے ہیں۔

چودھری رحمت علی نے ایک اور کتابچہ ۱۹۴۲ء میں شائع کیا جس کا عنوان تھا "قومی تحریکِ پاکستان کا مطلب کیا ہے؟"

اس بات پر ایک طویل عرصہ بحث رہی کہ سب سے پہلے پاکستان کا لفظ کس کی اختراع ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ سب سے پہلے "پاک ستان" کی صورت میں چودھری رحمت علی کی اختراع تھی اور ان کے کتابچہ "اب یا کبھی نہیں" میں استعمال کیا گیا۔ اس کتابچے کی تلاش برطانیہ کی لائبریریوں میں ایک عرصے تک جاری رہی۔ آخر مسٹر آر ڈبلیو برچ فیلڈ اسے کہیں نہ کہیں سے تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے، جس کی نقل انہوں نے شریف الدین پیرزادہ کو بھیجی۔

مسلمان طالب علموں میں چودھری رحمت علی کے پیغام نے بیداری کی لہر دوڑا دی تھی اور جب یہ تحریک عروج کو پہنچی تو چودھری رحمت علی نے بنگالی مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ آزاد وطن "بانگِ اسلام" اور حیدرآباد دکن میں "عثمانستان" کے قیام کا نعرہ بھی شامل کر لیا۔ انہوں نے معروف ترکی مورخ خاتون خالدہ ادیب کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے "پاک ستان" کا لفظ پنجاب، کشمیر، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد (جسے افغان صوبہ بھی کہا جاتا تھا) سے حروف لے کر اختراع کیا۔

مارچ ۱۹۴۰ء میں جب آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس لاہور میں ہو رہا تھا تو ایک روایت کے مطابق چودھری رحمت علی ہندوستان ہی میں موجود تھے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ انہیں اس اجلاس میں شرکت کا کوئی دعوت نامہ جاری کیا گیا یا نہیں۔ اور وہ کیا وجوہات تھیں کہ انہوں نے اجلاس میں شرکت نہ کی۔ پاکستان سے دوبارہ انگلستان جانے کے بعد انہوں نے دینیہ کونٹی نینٹل موومنٹ بھی چلائی۔ اس تحریک کے تحت مسلمانوں، اچھوتوں، عیسائیوں، سکھوں، بدھوں اور پارسیوں کی الگ الگ قومی حیثیت کے تعین کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

پاکستان کے قیام کے بعد چودھری رحمت علی ۱۹۴۸ء میں یہاں آئے یہ وہی ملک تھا جسے کالج کی زندگی میں اُن کے ہندو پرنسپل نے "خوابوں کا ملک" قرار دیا تھا۔ لاہور میں چودھری

رحمت علی اپنے ایک دوست ڈاکٹر یار محمد خاں کے پاس ٹھہرے۔ اُن کے بہت سے انٹرویو اخبارات میں شائع ہوئے جن پر ہندوستانی حکومت نے شدید احتجاج بھی کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہماری حکومت نے بھی چودھری رحمت علی کی عظیم خدمات کا کوئی نوٹس نہ لیا جس کی وجہ سے بہت افسردہ رہنے لگے۔ بعد ازاں انہوں نے جیل روڈ پر ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لے کر رہائش اختیار کر لی لیکن کچھ عرصے بعد ہی بیگم شائستہ اکرام اللہ اور اقبال شیدائی کے ایماء پر وہ پھر یورپ چلے گئے وہاں سے ان تینوں نے کشمیر کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے اقوام متحدہ کے نام ایک اپیل بھیجی۔

گو چودھری رحمت علی کے خوابوں کی سرزمین حقیقت بن کر آباد تھی لیکن انہیں یہ سرزمین راس نہ آسکی۔ وہ یہاں پر خود کو انتہائی تنہا محسوس کرتے رہے۔ آخر ۱۲۔ فروری ۱۹۵۱ء کو وہ دیارِ غیر میں وفات پا گئے۔ ان کی قبر وو کنگ میں موجود ہے لیکن اس قبر پر کوئی کتبہ نظر نہیں آتا کہ اس مجاہد آزادی کی نشان دہی کر سکے۔

نواب بہادر یار جنگ

۱۹۰۵ء تا ۱۹۴۴ء

نواب بہادر یار جنگ کا تعلق حیدر آباد دکن کے ایک متموّل گھرانے سے تھا۔ ان کے آباؤ اجداد ۱۸ ویں صدی کے وسط میں احمد شاہ ابدالی کی افواج کے ساتھ ہندوستان آئے تھے بعد ازاں اس فوج کے کچھ سپاہی افغانستان لوٹ گئے اور کچھ ہندوستان ہی میں آباد ہو گئے۔ ان میں ایک کنبہ ریاست جے پور کے نزدیک بارہ بستی میں آباد ہو گیا۔ ۱۹ ویں صدی کے اوائل میں یہ کنبہ حیدر آباد دکن منتقل ہو گیا۔ اس کنبہ کے افراد کو جلد ہی دکن کی فوج میں عمدہ ملازمتیں مل گئیں۔ فوجی خدمات ہی کے سلسلہ میں اس کنبہ کو بہت بڑی جاگیر بھی دی گئی۔ ۲۰ ویں صدی کے شروع میں اس سنے سربراہ نواب نصیب یاور جنگ کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام محمد بہادر خاں رکھا گیا جو بعد ازاں نواب بہادر یار جنگ کے نام سے مشہور ہوا۔

بہادر یار جنگ کی پیدائش کے ساتویں روز ان کی والدہ وفات پا گئیں۔ لہٰذا اُن کی نانی نے پرورش کا اہتمام کیا۔ گھر پر مذہبی تعلیم سے آغاز ہوا۔ پھر بنیادی تعلیم کے لئے مدرسہ میں داخل کروا دیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں جب وہ دسویں میں زیرِ تعلیم تھے، والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا

اور نواب بہادر خاں کو تعلیم اس لئے ترک کر دینا پڑی کہ اُن کے والد جائداد کی جگہ قریباً ۸ لاکھ روپے کے قرض کا ورثہ چھوڑ گئے تھے۔ قرض خواہوں نے گھر کے چکر لگانا شروع کر دیئے اور ادائیگی کے لئے تقاضے بڑھتے چلے گئے۔ نواب بہادر یار جنگ نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ۸ سال تک یہ قرضے اقساط میں ادا کئے اور ساتھ ہی اپنے تمام نوابی ٹھاٹھ ختم کر کے انتہائی سادہ زندگی گزارنا شروع ... دی۔

بہادر یار جنگ اپنی اہلیہ کے ہمراہ حج بیت اللہ پر گئے اور واپسی پر مشرق وسطیٰ اور بالخصوص افغانستان میں قیام کیا۔ اس دوران انہوں نے متعدد ممالک کی سیاسی شخصیتوں سے بھی ملاقات کی اور اسلامی ممالک کو پیدا شدہ خطرات کا مطالعہ بنظرِ غائر کیا۔ وہاں عوام کو لیکچر بھی دیتے رہے اور انہیں متحد ہو کر حالات کا مقابلہ کرنے کی ترغیب بھی دی۔ واپسی پر خواجہ حسن نظامی سے ان کی بیٹھک ہوتی رہی۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کے بارے میں ایک بار اس رائے کا اظہار کیا کہ "بہادر یار جنگ صحیح معنوں میں ہندوستان کا ابن بطوطہ ہے۔"

اب نواب بہادر یار جنگ نے سیاست سے بھی دلچسپی لینا شروع کر دی اور متعدد اسلامی ممالک کی معروف شخصیتوں مثلاً مصر میں وفد پارٹی کے رہنما مصطفیٰ نحاس پاشا اور محمد علی پاشا وغیرہ کو خطوط لکھے اور ان سے گزشتہ ملاقاتوں کے حوالہ سے مسلمانوں کے عام حالات اور مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ نواب صاحب نے انہیں مسلمانوں کے دیگر مسائل سے بھی آگاہ کیا۔

۱۹۳۸ء کے بعد انہوں نے خاکسار تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس تحریک کی قیادت علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کر رہے تھے۔ نواب صاحب نے علامہ مشرقی کے ساتھ ایک سرگرم کارکن کی حیثیت میں کام کیا۔ حکومت برطانیہ خاکسار تحریک کو ایک فاشسٹ تحریک خیال کرتی تھی۔ ۱۹۴۰ء میں علامہ مشرقی کو گرفتار کر کے ویلور جیل میں بند کر دیا گیا۔ جہاں علامہ نے بھوک ہڑتال کر دی۔ اس موقع پر نواب بہادر یار جنگ نے انتہائی کوشش کی کہ علامہ مشرقی سے جیل میں ملاقات ہو سکے، لیکن انھیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ان دنوں نواب بہادر یار جنگ خاکسار تحریک کے حاکم اعلیٰ تھے۔

لیکن ۱۹۴۲ء تک علامہ مشرقی کے مضامین سے یہ بات نواب بہادر جنگ پر عیاں ہو چکی تھی کہ وہ قائد اعظمؒ اور مسلم لیگ کے مقاصد کے سخت خلاف ہیں۔ علامہ مشرقی کے اس

موریہ نے نواب صاحب کو شدید رنج پہنچایا۔ اتفاقاً انہی دنوں ایک خاکسار نے مبئی میں قائد اعظمؒ پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ نواب بہادر یار جنگ اس سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے علامہ مشرقی کے نام یہ لکھ کر کہ وہ ان کی قیادت سے اعتماد کھو بیٹھے ہیں، استعفا دے دیا۔

۱۹۳۹ء میں نواب بہادر یار جنگ کو پہلی بار مجلس اتحاد المسلمین، حیدر آباد دکن کا صدر چن لیا گیا۔ نواب صاحب کی کوششوں سے اس مجلس میں نئی روح پیدا ہو گئی۔ بعد ازاں یہی مجلس حیدر آباد کے مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا باعث بنی۔ جب نظام حیدر آباد نے یہ دیکھا کہ مجلس کے پلیٹ فارم سے ریاست کی حکومت کے خلاف عوام کی سیاسی رنجشیں مطالبوں کی صورت میں سامنے آ رہی ہیں تو انہوں نے پہلے تو نواب صاحب کو انعام و اکرام سے نوازنا چاہا لیکن جب بات نہ بنی تو انہیں سب سے بڑے انعام یعنی ریاست کے وزیر اعلیٰ کے عہدے کی پیشکش کر دی گئی۔ لیکن لوگوں کے ساتھ نواب بہادر یار جنگ کی وفاداریاں ختم نہ کی جا سکیں۔ اس کے بعد نظام حیدر آباد نے دھمکیاں دینا شروع کر دیں اور ایسی تقاریر سے باز رہنے کو کہا۔ جن میں سرکاری پالیسیوں پر نکتہ چینی کی جاتی تھی لیکن نواب صاحب نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ

"ایسا کوئی راستہ جو قرآن کریم کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹ کر، کسی اور منزل کی طرف رہنمائی کرتا ہو صرف اور صرف جہنم ہی کی طرف جاتا ہے۔"

پھر وہ دور آیا جب پاکستان کا مطالبہ زور پکڑ چکا تھا۔ قائد اعظم ہندوستان کے مسلمانوں کو مطالبہ پاکستان کے لئے قائل کرنے کی غرض سے مسلسل ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے تو نواب بہادر یار جنگ نے ہندوستان کی ریاستوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ انتہائی نامساعد حالات کے باوجود بہادر یار جنگ آزادی کی جد و جہد میں حصہ لیتے رہے۔ قائد اعظمؒ نے نواب صاحب کو ریاستوں کی مسلم لیگوں کا صدر منتخب کیا تھا اور یہ عہدہ ان کے پاس تا دم مرگ یعنی ۱۹۴۴ء تک رہا۔

اب بہادر یار جنگ ہندوستان کے مسلمانوں کے مسلمہ رہنماؤں میں شامل ہو چکے تھے۔ وہ اپنی تقاریر میں حکومت برطانیہ پر انتہائی سخت نکتہ چینی کرتے رہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے آزادی کے مطالبے پر ڈٹے رہے۔ وہ حیدر آباد دکن کے نظام کی پالیسیوں کو بھی زیر بحث لاتے رہے۔ نظام تو خود ہی ان سے تنگ تھے ... وائسرائے نے نظام

کو ہدایت کی کہ وہ فوری طور پر نواب صاحب کی سرگرمیوں کو ختم کرنے کے لئے اقدامات کرے۔
نظام نے موقع غنیمت جانا اور نواب صاحب کو ریاست کی حدود کے اندر یا باہر تقریر کرنے کی ممانعت کر دی۔ انہی دنوں قائد اعظمؒ صوبہ سرحد میں عام انتخابات کے انعقاد کے سلسلہ میں متفکر نظر آتے تھے۔ اس علاقے میں خان عبدالغفار خان، جنہیں کانگریس پیار سے سرحدی گاندھی بھی کہتی تھی، اپنے خدائی خدمت گاروں کی قوت کے باعث بہت زیادہ اثر رکھتے تھے۔ قائد اعظمؒ نے محسوس کیا کہ اس وقت نواب بہادر یار جنگ کے سوا کوئی دوسرا شخص سرحدی مسلمانوں کو ہمنوا نہیں بنا سکتا مگر مشکل تو یہی تھی کہ موصوف کو کہیں بھی تقریر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ قائد اعظمؒ نے نظام دکن سے ایک خط میں درخواست کی کہ نواب صاحب کو مسلم لیگی امیدواروں کے حق میں صوبہ سرحد کے اندر تقاریر کرنے کی اجازت دی جائے۔ نظام دکن نے اجازت دے دی اور نواب صاحب نے سرحد کا طوفانی دورہ شروع کر دیا۔ ان کی آتش بیانی نے سرحد کے ہزاروں عوام کو مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دینے پر مجبور کر دیا۔
دریں اثناء نظام دکن کے بہت سے چاپلوس درباری نواب صاحب کے خلاف نظام کے کان بھر رہے تھے۔ سازشوں اور ناانصافیوں کے اس غلیظ ماحول سے دل برداشتہ ہو کر نواب صاحب نے اپنا خطاب (نواب بہادر یار جنگ) اور جاگیر واپس کر دی۔
جب نواب صاحب نے ۱۳، ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۴ء کو سری نگر میں آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کے اجلاس کا اعلان کیا اور اس میں اپنی اور قائد اعظم کی شرکت کی بات کی تو کشمیر کے سکھ راجہ کے پاؤں تلے کی زمین کھسک گئی۔ ۱۲ اگست ۱۹۴۴ء کو جب وہ اپنی بیگم کے ہمراہ کشمیر کی سرحد میں داخل ہوئے تو پہلی چیک پوسٹ پر ان کا پستول چھین لیا گیا۔ جب وہ سرینگر پہنچے تو علی الصبح انہیں گرفتار کر کے پولیس کی گاڑی میں ڈال کر ایک گھنے جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔ شدید بارش ہو رہی تھی اور نواب صاحب عجیب کشمکش میں تھے کیونکہ دوسرے روز کانفرنس منعقد ہونا تھی۔ انہیں سری نگر میں داخلہ کی ممانعت کر دی گئی، سامان چھین لیا گیا اور ان کی بیگم کو بھی ان سے جدا کر دیا گیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ قائد اعظمؒ بھی انتہائی مصروفیات کے باعث سری نگر نہ پہنچ سکے۔ اسی دوران انگریز حکومت نے ان کی طرف سے یا ان کو بھیجے جانے والے خطوط اور تار ضبط کرنا شروع کر دیئے۔ بہر حال اس کے باوجود کشمیری مسلمانوں کے لئے ان کی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہ ہو سکی۔

۱۹۴۴ء میں مسلم لیگ کے اجلاس کراچی میں نواب صاحب نے تحریکِ پاکستان کے مقاصد بیان کئے۔ تقریر کے دوران جب انہوں نے یہ کہا کہ پاکستان کا آئین اسلامی اصولوں پر مبنی ہوگا تو قائداعظمؒ نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے ان کے خیال کی بے ساختہ تائید کی۔

نواب بہادر یار جنگ نے مجلسِ تبلیغ اسلام، جس کے وہ خود ہی بانی تھے، کی وساطت سے تبلیغ اسلام کی بہترین مثال قائم کی۔ انہوں نے حیدرآباد دکن میں بیسیوں عام مذہبی جلسوں سے خطاب کیا اور شہر شہر، قریہ قریہ مجلس کی شاخیں قائم کیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہزاروں ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ وہ دور تھا جب آریہ سماجی اپنے رہنما سوامی دیانند سرسوتی کی قیادت میں اسلام دشمنی میں پیش پیش تھے۔ آریہ سماجیوں نے بہادر جنگ کی مذہبی سرگرمیوں کے باعث ان پر طرح طرح کے بے ہودہ الزامات عائد کئے۔ لیکن موصوف ہندو اخباروں کے الزامات، اپنے خلاف احتجاجی پوسٹروں اور بے مقصد پراپیگنڈے سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف رہے۔ اسی دوران انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارک پر جابجا لیکچر دینا شروع کر دیئے۔ ہزاروں مسلمان ان کی تقریر سننے کے لئے دور دور سے چلے آتے۔ ان کی زبان کی مٹھاس اور اندازِ بیان کچھ اتنا معروف ہُوا کہ ایک رات (۱۹۴۰ء میں) جب بہادر یار جنگ وکٹری گراؤنڈ میں سیرتِ نبویؐ بیان کر رہے تھے تو نظام دکن خاموشی کے ساتھ آئے اور ان کا بیان سنتے رہے۔ بہادر یار جنگ نے اپنی آواز قدرے بلند کی اور نظام کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گرج کر کہا :

> "سنو! تم وہ شخص ہو، جس کے سر پر تاج اور جس کے نیچے تخت ہے لیکن تم بھی اسلام کے آخری اور سب سے بڑے پیغمبر کے غلام ہو، کیونکہ صحیح تاجدار وہی ہیں۔"

یہ سنتے ہی نظام کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ نظام جلسہ کے بعد چلے گئے اور ایک فرمان کے ذریعے انہیں نواب بہادر یار جنگ کا خطاب عطا کیا گیا۔

سیرتِ نبویؐ پر جلسوں میں شرکت اور تقریر کے لئے ہندوستان کے کونہ کونہ سے ا ... یں موصول ہوتی رہیں۔ نواب بہادر یار جنگ کا عالم یہ تھا کہ ۱۹۴۴ء تک انتہائی سیاسی مصروفیات کے باوجود وہ تبلیغ اسلام میں مصروف رہے۔ ان کا معمول تھا کہ نمازِ فجر کے بعد بلاناغہ مسجد میں درس قرآن دیتے اور تاریخ اسلام بتاتے۔ اس طرح ان کے ہر دن کا آغاز

تبلیغِ اسلام سے ہوتا۔

۲۵ جون ۴۴ء ۱۹ کی صبح درسِ قرآن کے بعد عادت کے مطابق کوئی ایک گھنٹہ تک خطوط کے جواب لکھواتے رہے۔ اس کے بعد وہ مدرسۂ عربیہ نسواں میں لڑکیوں سے خطاب کرنے چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا بیگم کے ساتھ کھایا، تھوڑی دیر آرام کیا اور شام کو جسٹس ہاشم علی کے یہاں عشائیہ پر چلے گئے۔ کھانے کے بعد حسبِ عادت حُقّہ پینے لگے لیکن ان کا سر چکرا گیا اور کچھ دیر بعد یہ مجاہدِ آزادی صرف ۶۲ سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔

باب ۹

ہندوستان کا آئینی ارتقاء

(۱۸۶۱ء تا ۱۹۳۵ء)

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں پر قابو پانے کے بعد انگریزوں نے مناسب یہی سمجھا کہ فوری طور پر ہندوستان میں آئینی حکومت قائم کر دی جائے۔ برطانیہ کی پارلیمان نے ایک قانون کی منظوری دی جس کے تحت بورڈ آف ڈائریکٹرز اور بورڈ آف کنٹرول کی جگہ ہندوستان کے لئے ایک سیکرٹری آف سٹیٹ کا عہدہ قائم کیا گیا۔ اور اس کے لئے پندرہ اراکین پر مشتمل ایک کونسل قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ یہ قانون انڈین کونسل ایکٹ مجریہ ۱۸۶۱ء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ تاج برطانیہ نے براہ راست ہندوستان کے علاقوں کا کنٹرول سنبھال لیا۔ کمپنی کے بعد ہندوستان میں یہ پہلی آئینی تبدیلی تھی۔ ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں۔ کہ برطانوی پارلیمان کن وجوہات کی بنا پر یہ قانون منظور کرنے پر مجبور ہوئی اس کی دیگر اہم وجوہات یہ تھیں کہ اس وقت جو قوانین موجود تھے۔ عوام ان سے بددل تھے۔ گورنر جنرل کی لیجسلیٹو کونسل کو پورے ملک کے لئے قانون وضع کرنے پڑتے تھے۔ قانونی مرکزیت ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ کے تحت قائم کی گئی تھی۔ مگر وہ اس لئے انتہائی غیر مؤثر ثابت ہوئی۔ کہ مرکزی حکومت کے لئے پریذیڈینسیوں کی ضروریات اور عام حالات کی تفصیل میں جانا ناممکن تھا۔ بلکہ حکومت خود بھی لیجسلیٹو کونسل کی کارکردگی سے مطمئن نہ تھی۔ حکومت اس چیز کو محسوس کر چکی تھی۔ کہ ۱۸۵۷ء کی

جدوجہد آزادی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستانیوں کو امورِ مملکت سے بالکل لاتعلق رکھا گیا تھا۔ سرسید احمد خان نے ۱۸۵۸ء میں ہی اپنے رسالہ "اسباب بغاوت ہند" میں یہ واضح کر دی تھی کہ اگر ہندوستانیوں کو امورِ قانون سازی میں شامل رکھا جاتا۔ تو ۱۸۵۷ء کی جنگ کے ابھرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ حکومت ہندوستانیوں کے مشورے کے بغیر قوانین کا اطلاق کرتی ہے۔ ان میں وہ مقامی حالات، رسم و رواج اور مذہبی عقائد کو یکسر نظر انداز کر دیتی،

بنئے قانون کے تحت گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کر کے ایک اور رکن کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ یعنی اب یہ کونسل گورنر جنرل سمیت ۵۔ اراکین پر مشتمل ہو گئی۔

گورنر جنرل کی مجلس قانون ساز (LEGISLATIVE COUNCIL) میں کم از کم چھ اور زیادہ سے زیادہ بارہ ۱۲ اراکین کی توسیع کی گئی۔ ان میں سے نصف اراکین غیر سرکاری ہونا ضروری تھے،

مجالس قانون ساز مدراس اور بمبئی میں قائم کی گئیں۔

گورنر جنرل کو پنجاب اور صوبہ سرحد میں بھی اسی قسم کی مجالس قائم کرنے کا اختیار دیا گیا۔

مجالس قانون ساز کے اختیارات قطعی طور پر یہ قانون سازی تک محدود کر دیئے گئے

گورنر جنرل کی مجلس قانون ساز کی طرف سے ہر منظور شدہ بل کے لئے گورنر جنرل کی منظوری ضروری تھی تاکہ اسے قانون کی حیثیت حاصل ہو جائے کسی پریذیڈنسی یا صوبہ کی مجلس قانون ساز کی طرف سے منظور شدہ بل کے لئے متعلقہ صوبہ کے گورنر اور اس کے بعد گورنر جنرل کی توثیق ضروری تھی ہندوستان میں کسی بھی مجلس قانون ساز کے منظور شدہ بل کو تاج مسترد کر سکتا تھا۔

۱۸۶۱ء کے اس قانون کے تحت گورنر جنرل کو ہنگامی حالات کی صورت میں امن قائم کرنا اور برطانوی مقبوضہ ہندوستان میں بہتر حکومت کے قیام کے لئے آرڈی نینس جاری کرنے کا اختیار تفویض کیا گیا تھا۔

ایکٹ ۱۸۶۱ء کی اہمیت

۱۸۶۱ء کے ایکٹ کے تحت پہلی بار ہندوستانیوں کو حکومت کے امور میں حصہ لینے کا موقع ملا۔ بلاشبہ کونسلوں میں ہندوستانیوں کی شمولیت ایک اہم اقدام تھا۔ یہ ایکٹ ہندوستان کی آئینی تاریخ میں دو وجوہات کی بنا پر اہمیت کا حامل ہے۔ ایک تو یوں کہ اس کی وجہ سے گورنر جنرل کو مقامی لوگوں کو قانون سازی کے کام میں ساتھ ملانے کا موقع ملا۔ نیز اس لئے کہ مختلف صوبوں میں قانون ساز کونسلوں کے قیام کے باعث اس قانون نے ۱۹۳۷ء میں صوبوں کو داخلی خود مختاری دینے کی بنیاد ڈالی۔

انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء

آئینی ترقی میں دوسرا اہم قدم انڈین کونسل ایکٹ مجریہ ۱۸۹۲ء تھا۔ اس ایکٹ کے تحت قانون ساز کونسلوں (مرکزی اور صوبائی) میں توسیع کی گئی اور مزید اراکین شامل کئے گئے۔ مرکزی کونسل میں اراکین کی تعداد بڑھا کر ۱۶ کر دی گئی اور صوبائی کونسلوں میں (بڑے صوبوں میں) ۲۰ اور ۱۵ (چھوٹے صوبوں میں) کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی غیر سرکاری اراکین کی تعداد میں بھی اضافہ کر دیا گیا۔ پہلے ان مجالس قانون ساز کے اراکین کے اختیارات صرف قانون سازی تک محدود تھے۔ لیکن اس ایکٹ کے تحت انہیں بجٹ پر بحث کرنے اور تنقید کرنے کے اختیارات بھی دے دیئے گئے۔ تاہم مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز میں سرکاری اراکین کی اکثریت کو قائم رکھا گیا۔

منٹو مارلے اصلاحات ۱۹۰۹ء

انڈین کونسل ایکٹ ۱۹۰۹ء ہی کو منٹو مارلے اصلاحات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاریخ ہند و پاک پر اس ایکٹ نے بھی گہرے اثرات مرتب کئے۔

ہندوستان کے عوام ۱۸۹۲ء کی اصلاحات سے کچھ مطمئن نہ تھے۔ مرکزی مجلس قانون ساز (امپیریل لیجسلیٹو کونسل) اور صوبائی مجالس قانون ساز کے اختیارات محدود تھے۔ لہذا ہندوستانیوں نے مزید اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ علاوہ ازیں لارڈ کرزن کی انتظامی پالیسی نے حکومت کے ساتھ

عوام کی ہمدردیاں ختم کر دیں۔ کرزن کا رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ نامناسب تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ کہ ہندوستانی حکومت کے اہل نہیں۔ لہٰذا اُس نے تمام اعلےٰ عہدے انگریزوں کے سپرد کر دیئے۔ کرزن مقامی خود مختار اداروں کے خلاف تھا۔ اس نے کلکتہ کارپوریشن ایکٹ میں ترمیم کر کے کلکتہ کی مقامی خود مختار حکومت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ انڈین یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۰۴ء کے تحت ملک بھر کی یونیورسٹیاں سرکاری تحویل میں چلی گئیں۔ ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم نے ملک بھر میں بے چینی کی لہر دوڑا دی۔ لنکا، ملایا اور جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں سے توہین آمیز سلوک کیا جاتا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اور آغا خان کی قیادت میں ایک وفد نے گورنر جنرل سے مل کر مسلمانوں کے لئے علیحدہ انتخابات کا مطالبہ کر دیا تھا۔ لارڈ منٹو ۔ اس مطالبہ پر ہمدردانہ غور کا وعدہ بھی کیا۔

انہی حالات کے تحت وزیر ہند لارڈ مورلے اور گورنر جنرل ہندوستان لارڈ منٹو نے محسوس کیا۔ کہ ہندوستانیوں کی بہتری کے لئے مزید اصلاحات ناگزیر ہیں۔ اُنہوں نے آئین میں کچھ تبدیلیوں کی سفارش کی جس کی روشنی میں برطانوی پارلیمان نے ۱۹۰۹ء میں انڈین کونسل ایکٹ منظور کیا۔ یہ آئینی تبدیلیاں کیا تھیں؟

ایکٹ ۱۹۰۹ء کے تحت مجالس قانون ساز میں توسیع کر دی گئی۔ گورنر جنرل کی مجالس میں زائد اراکین کی تعداد ساٹھ کر دی گئی۔ صوبہ متحدہ، بہار، اڑیسہ، بنگال، مدراس اور بمبئی کی مجالس میں یہ تعداد پچاس اور برما، آسام اور پنجاب کی مجالس میں ۳۰ کر دی گئی۔ ایکٹ میں واضح کیا گیا کہ مجلس کے اراکین منتخب اور نامزد افراد پر مشتمل ہوں گے۔ گورنر جنرل کی مجلس میں ۳۷ سرکاری اور ۳۱ غیر سرکاری اراکین شامل ہونا تھے۔ ۳۷ سرکاری اراکین میں سے ۲۸ گورنر جنرل کی طرف سے نامزد کئے جانے تھے۔ باقی اراکین بلحاظ عہدہ رکن ہونا قرار پائے۔ ان میں خود گورنر جنرل، کمانڈر انچیف، اس صوبہ کا گورنر جہاں اجلاس منعقد ہونا ہو، اور گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے ۶ عام اراکین شامل تھے۔ ۳۱ غیر سرکاری اراکین میں ۲۷ کا انتخاب اور ۵ کی نامزدگی قرار پائی۔ جو ۲۷ اراکین منتخب کئے جانے تھے ان میں سے ۱۳ عام انتخابات میں، ۶ زمینداروں سے، ۶ مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخابات سے اور ۲ چیمبر ز آف کامرس سے منتخب ہونے تھے۔ سرکاری اکثریت مرکز ہی کے ہاتھ میں رہی۔

صوبائی مجالس قانون ساز میں بھی توسیع کر دی گئی۔ مدراس، بنگال، یو۔پی، بمبئی، بہار

اور آسام کی مجالس کے لئے ۵۰ اور پنجاب، برما اور آسام کے لئے ۳۰ اراکین کی تعداد مقرر کی گئی۔

مجالس قانون ساز کی ذمہ داریاں بھی بڑھا دی گئیں۔ مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کو بجٹ پر بحث کا اختیار دیا گیا۔ اراکین مجلس قانون ساز بجٹ پر، یا عام مفاد کے کسی دوسرے معاملہ پر قرار داد پیش کر سکتے تھے ایسی کسی قرار داد کو صرف سفارش کی حیثیت دی گئی۔ حکومت اس پر اقدام کرنے کی پابند نہ تھی۔ اراکین کو سوالات اور ضمنی سوالات کرنے کی اجازت بھی دی گئی۔ لیکن سوال سے متعلقہ محکمہ کا رکن فوری طور پر سوال کا جواب دینے سے انکار کر سکتا تھا اور اس مقصد کے لئے وقت طلب کر سکتا تھا۔

اس ایکٹ کے تحت بمبئی، بنگال اور مدراس کی طرف سے ایگزیکٹو کونسل میں اراکین کی تعداد ۴ کر دی گئی۔

حق رائے دہی محدود تھا۔

پہلی مرتبہ مسلمانوں کے مطالبہ پر جداگانہ انتخاب کو منظور کیا گیا۔ دوسری اقلیتوں کو جداگانہ انتخاب کا حق نہیں دیا گیا۔

ہندوستانیوں کو ایگزیکٹو کونسلوں میں شامل کیا گیا۔ گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل میں سب سے پہلے ہندوستانی رکن ایس، پی سہا تھے لیکن ایکٹ کے تحت ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدے بھی دیئے گئے۔

۱۹۰۹ء کی ان اصلاحات نے نمائندہ حکومتوں کے قیام کی طرف پہلا قدم بڑھانے کا موقع فراہم کیا۔ لیکن یہ اصلاحات ہندوستانیوں کی سیاسی امنگوں اور خواہشات کو پورا نہ کر سکیں۔

اعتراضات

ہندوستان کے لوگ ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کا مطالبہ کر رہے تھے۔ لیکن منٹو مارلے اصلاحات میں ایسی حکومت کے لئے کوئی بنیاد نہ تھی۔ صرف مجالس قانون ساز کے اختیارات میں تھوڑی بہت تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ اصل اختیارات اب بھی انگریز حکومت کے ہاتھ تھے۔

گو پارلیمانی نظام حکومت کا ڈھانچہ موجود تھا۔ لیکن انگزیکیٹو یا مقننہ پر ذمہ داریاں عائد تھیں اس ایکٹ کے تحت بڑے زمینداروں اور تجارتی چیمبروں کو بلا وجہ علیحدہ نمائندگی دی گئی تھی انتخابی طریق کار تو موجود تھا۔ لیکن حق رائے دہی محدود تھا ووٹروں کی تعداد اتنی کم تھی۔ کہ ان سے آسانی کے ساتھ سودا بازی کی جا سکتی تھی۔

انتخاب کا بالواسطہ طریق کار غیر جمہوری تھا۔ اس لئے کہ ایسے انتخابی طریق کار کے باعث ووٹ دینے اور ووٹ لینے والے کے درمیان کوئی براہ راست تعلق نہ رہتا تھا۔ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق نہیں تھا۔ نہ ہی ان کی کسی سیاسی حیثیت کا تعین کیا گیا تھا۔

مرکز میں سرکاری اراکین اور صوبوں میں غیر سرکاری اراکین کی اکثریت کسی صورت بھی اختیارات تفویض نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ منتخب اراکین بہرحال اقلیت ہی میں رہتے تھے۔ لہٰذا سرکاری اور نامزد غیر سرکاری اراکین کی آراء کی اکثریت اوّل الذکر کی رائے پر غلبہ حاصل کر سکتی تھی۔

اس اعتبار سے ۱۹۰۹ء کا یہ ایکٹ ہندوستان کے لوگوں کو مطمئن کرنے میں ناکام رہا اور اسی بنا پر مزید اصلاحات کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء

۔مونٹیگ چیمسفورڈ اصلاحات۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء پہلی جنگ عالمگیر کے بعد منظور ہوا اس ایکٹ کی منظوری جن حالات میں کی گئی وہ یہ تھے۔

۱۹۰۹ء میں جو اصلاحات کی گئی تھیں اُن سے ہندوستان کے عوام مطمئن نہ تھے کیونکہ ان کے تحت ہندوستانیوں کو مناسب اختیارات تفویض نہیں کئے گئے تھے۔ گو پارلیمانی طرزِ حکومت قائم کر دیا گیا تھا لیکن انگزیکیٹو، مقننہ کے سامنے جواب دہ نہ تھی۔ امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں سرکاری اراکین کی اکثریت اور صوبائی مجالس قانون ساز میں غیر سرکاری اراکین کی اکثریت رکھی گئی اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اختیارات عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں نہ تھے۔

شروع شروع میں مسلمانوں کا رویہ حکومت کے ساتھ دوستانہ تھا کیونکہ حکومت کی طرف سے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تھا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد بنگال کی تقسیم کی تنسیخ کا اعلان دہلی دربار میں کیا گیا اور حکومت کے اس اقدام سے مسلمانوں کو جو صدمہ پہنچا اس کی وجہ سے حکومت پر مسلمانوں کا اعتماد ختم ہو گیا۔ مسلمانوں نے حکومت کے اس اقدام کو مسلمانوں کے ساتھ تعصب اور ہندوؤں کے ساتھ رواداری پر مبنی قرار دیا علاوہ ازیں انگریزوں نے ترکی اور اٹلی کی جنگوں میں ترکی کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریز کی اس پالیسی پر شدید اعتراض تھا کہ اس نے آڑے وقت میں ترکوں کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر مسلمان، حکومت برطانیہ سے بددل ہو گئے تھے۔

جنگ عظیم کے اثرات

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی ہندوستانیوں نے حکومت سے بہت سی رنجشوں کے باوجود اُن کی مدد کی تقریباً دس لاکھ ہندوستانی برطانیہ کی طرف سے لڑنے کے لئے سمندر پار گئے۔ اُنہوں نے فرانس سے مشرقی افریقہ تک اپنی بہادری اور وفاداری کی مثال قائم کی۔ اپنی انہی خدمات کے صلہ میں ہندوستانی اب اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ انہیں حکومت خود اختیاری سونپی جائے گی۔

جنگ طول کھینچتی گئی اور ہندوستانی محسوس کرنے لگے کہ حکومت اُنہیں حکومت خود اختیاری سونپنے کے وعدے پر بھی آمادہ نظر نہیں آتی تھی۔

وطنی حکومت کی تحریک

انگریزوں کی طرف سے مایوسی کے بعد مسز اینی بیسنٹ نے وطنی حکومت کی تحریک شروع کر دی مسز بیسنٹ نے کہا کہ حکومت خود اختیاری ہندوستانیوں کا پیدائشی حق ہے۔ بیشتر ہندوستانیوں نے اس تحریک کا ساتھ دیا اور ایس پی سنہا نے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ عوام اور خاص طور پر نوجوانوں کو مطمئن کرنے کے لئے اس ضمن میں واضح اعلان کرے۔ حکومت نے بھی محسوس کیا کہ ہندوستانیوں کے لئے اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا

برطانوی سکریٹری آف سٹیٹ برائے امورِ ہند لارڈ مونٹیگ نے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو برطانوی پارلیمان میں اعلان کیا کہ تاج برطانیہ کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستان میں حکومت خود اختیاری قائم کرنے کے لئے ہندوستانیوں کو انتظامیہ کے ہر شعبے میں جگہ دی جائے اور ہندوستان میں ایک ذمہ دار حکومت کے قیام کی خاطر حکومت خود اختیاری کی بتدریج نشوونما حکومت برطانیہ کے ایک جزو لاینفک کی حیثیت سے کی جائے۔ اِس اعلان میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ برطانوی حکومت کا نصب العین یہ ہے کہ ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری دی جائے۔

لارڈ مونٹیگ ہندوستان آئے اور ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ چیمسفورڈ کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد انہوں نے اصلاحات کے لئے ایک سکیم مرتّب کی۔ یہ سکیم برطانوی پارلیمان کے سامنے پیش کی گئی اور پھر اسی رپورٹ کی بنیاد پر برطانوی پارلیمان نے ۱۹۱۹ء میں ایک ایکٹ منظور کیا۔ جسے عام طور پر مونٹیگ۔ چیمسفورڈ اصلاحات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

خاص خاص باتیں

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء ..... مونٹیگ چیمسفورڈ رپورٹ کی بنیاد پر منظور کیا گیا اِس ایکٹ کی خاص خاص باتیں یہ تھیں۔

- ابتدائیہ میں ایکٹ کے مقاصد کی مکمل وضاحت کر دی گئی تھی یہ وہی باتیں تھیں جن کا ذکر ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان میں کیا گیا تھا (دیکھئے وطنی حکومت کی تحریک)۔ اس کے تحت ہندوستان کو بہرحال تاج برطانیہ کا ایک جزوِ لاینفک رہنا تھا اور ہندوستانیوں کو بتدریج ایک ذمہ دار حکومت قائم کرنا تھی۔ ہر صوبے میں اقدامات کی نگران حکومت برطانیہ کو رہنا تھا۔
- ایکٹ ۱۹۱۹ء کے تحت صوبوں میں جزوی طور پر ذمہ دار حکومتوں کا قیام عمل میں آنا تھا لہٰذا اِس بنا پر مختلف ذمہ داریوں اور امور کی تفہیم لازمی ہو جاتی تھی اِن امور کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

(۱) مرکزی (۲) صوبائی

دفاع، سیاسی اور خارجہ تعلقات، کسٹمز، ڈاک و تار، کرنسی اور مواصلات وغیرہ مرکزی

امور میں شامل کئے گئے اور مقامی حکومت خود اختیاری کو صحت عامہ، صفائی تعلیم زراعت
اور آبپاشی وغیرہ دے دیئے گئے۔

- اس ایکٹ کے تحت برطانوی سیکریٹری آف سٹیٹ برائے امور ہند کے اختیارات میں قدرے
تخفیف کر دی گئی اس کے کچھ اختیارات گورنر جنرل کو منتقل کئے گئے۔ ایسے متعدد امور
جن کے سلسلے میں بغرض وضع قانون اس کی رضامندی ضروری تھی، میں بھی کمی کر دی گئی۔
صوبائی امور میں بھی تخفیف کی گئی ہندوستانی کونسل کے ڈھانچے میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔
ایکٹ کے تحت سیکریٹری آف سٹیٹ برائے امور ہند اور اس کی کونسل کے اراکین کے
مشاہروں کی ادائیگی برطانوی خزانے کے ذمہ کر دی گئی ہندوستانی کونسل میں اراکین کی
تعداد کم کر کے اس میں کم از کم آٹھ اور زیادہ سے زیادہ ۱۲ اراکین کی گنجائش رکھی گئی ان
میں کم از کم نصف اراکین ایسے ہونا ضروری تھے جن کا ہندوستان میں سروس کا تجربہ دس
سال ہو۔ ان کی میعاد رکنیت ۵ سے سات سال تک کر دی گئی۔ لیکن ان کا سالانہ مشاہرہ
بڑھا کر ایک ہزار سے بارہ سو پونڈ کر دیا گیا۔

- ایکٹ کے تحت پہلی بار ہائی کمشنر برائے ہندوستان کا عہدہ قائم کیا گیا اور انگلستان سے
ہندوستان کی حکومت کے لئے مشینوں اور دیگر اشیاء کی خریداری کی ذمہ داری بھی ہائی کمشنر
کے سپرد کر دی گئی۔ اس کے ذمہ انگلستان میں ہندوستانی طالب علموں کی بہبود کی نگرانی بھی
کر دی گئی۔ ہائی کمشنر کو گورنر جنرل کے ماتحت کر دیا گیا اس کے عہدے کی میعاد چھ سال
مقرر کی گئی جو ہندوستان کے خزانے سے واجب الادا تھی۔

- ایکٹ کے تحت مرکز میں ایک دو ایوانی
مقننہ کا نظام قائم کر دیا گیا۔ دو ایوانوں کو مجلس قانون ساز اور مجلس مملکت
کا نام دیا گیا۔ مجلس مملکت ایوان بالا
کو کہا جاتا تھا جس کے اراکین کی کل تعداد ساٹھ مقرر تھی۔ ان میں سے ۳۳ منتخب اور ۲۷
نامزد کئے جاتے تھے۔ اس کی میعاد پانچ سال مقرر کی گئی۔ تاہم گورنر جنرل کو اس میعاد
میں توسیع کا اختیار تھا۔ مجلس قانون ساز ایوان زیریں کہلاتا تھا جو ۱۴۵ اراکین پر مشتمل تھا۔
ان میں سے ۱۰۴ منتخب اور ۴۱ نامزد کئے جاتے تھے اس کی میعاد تین سال تھی جس میں توسیع
کا اختیار گورنر جنرل کو دیا گیا۔ گورنر جنرل کو دونوں ایوانوں کا اجلاس طلب کرنے، ختم کرنے

اور انہیں کالعدم کرنے کا اختیار تھا اور وہ دونوں ایوانوں سے خطاب بھی کر سکتا تھا۔

مرکزی مقننہ گو پورے برطانوی ہند کے لیئے قانون سازی کر سکتی تھی تاہم اُس کے اختیارات کی کچھ حد بھی مقرر تھی۔ دفاع، تعلقاتِ خارجہ، عوامی قرضوں اور امورِ مذہبی کے بارے میں گورنر جنرل کی پیشگی اجازت کے بغیر کوئی بھی مقننہ میں پیش نہ کیا جا سکتا تھا۔

- مرکزی مقننہ کے اختیارات پر مندرجہ بالا روک ٹوک سے یہ ظاہر تھا کہ مرکزی ایگزیکٹو اُس کی ہر بات کو رد کر سکتی تھی ایگزیکٹو کے اراکین مقننہ سے نہیں لیئے جاتے تھے اور نہ ہی وہ اس کے سامنے جواب دہ تھے اس اعتبار سے مرکزی مقننہ، مرکزی ایگزیکٹو کے سامنے بے بس تھی۔ لہذا مرکزی ایگزیکٹو کو کسی صورت بھی ذمہ دار ادارہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔
- مورلے منٹو اصلاحات کے تحت صوبائی مجالس قانون ساز میں غیر سرکاری اکثریت تھی تھی۔ لیکن ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت تمام صوبوں میں یہ اکثریت انتخاب کے ذریعہ قائم کی گئی۔ اور اب اس کے تقریباً ۷۰ فی صد اراکین منتخب کیئے جاتے تھے۔
- انتخابی طریق کار میں بہت سے اسقام تھے۔ انتخاب کے لیئے جائداد کی اہلیت بہت زیادہ تھی اور پورے ملک میں اس کا یکساں معیار مقرر نہ تھا۔ علیحدہ انتخابات کا نظام صرف مسلمانوں ہی کے لیئے نہیں بلکہ سکھوں کے لیئے بھی رکھا گیا تھا۔
- صوبوں میں دوعملی DYARCHY نظامِ حکومت کا طریق کار رائج کیا گیا اور صوبائی امور کو محفوظ اور منتقل دو شقوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

دوعملی کا طریق کار

دوعملی کا مطلب یہ ہے کہ دوہری حکومت دو با اختیار اداروں کے تحت کام کرے۔ برطانوی حکومت میں پہلی بار ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت ہندوستانی صوبوں کو ذمہ دار نظام حکومت کے آغاز کے لیئے موزوں قرار دیا گیا لیکن فوری طور پر اس بات کو مناسب نہ سمجھا گیا کہ

تمام صوبائی محکمے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل کر دیئے جائیں لہذا کچھ محکمے اُنہیں دیئے گئے اور کچھ صوبائی امور ایگزیکٹو کونسل کی مدد سے حکومت کے زیرِ انتظام لائے گئے۔ کیونکہ صوبائی حکومتوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا یعنی ایک وہ جو وزیروں کے ہاتھ میں تھا اور دُوسرا وہ جو ایگزیکٹو کونسلوں کے ہاتھ میں! یہ نظامِ حکومت دوعملی کہلانے لگا۔

دوعملی کے تحت ۴۲ امور کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا یعنی محفوظ اور منتقل! پولیس، امن عامہ، انصاف اور آبپاشی وغیرہ محفوظ امور تھے۔ جن کا انتظام صوبے کا گورنر ایگزیکٹو کونسل کی مدد سے کرتا تھا۔ اس کے اراکین کی تعداد مختلف صوبوں میں دو سے چار تک تھی اور ہر رُکن ایک یا ایک سے زائد محکمے کا ذمے دار تھا۔ یہ رُکن مقننہ کے سامنے جواب دہ نہیں تھے محفوظ محکموں کا انتظام وزراء کے سپرد تھا۔ وزیروں کی تعداد مختلف صوبوں میں مختلف رہی۔ ہر وزیر ایک یا زائد محکموں کا انچارج تھا۔ وزراء کا تقرر مقننہ کے منتخب اراکین میں سے گورنر کرتا تھا ان کی دوہری ذمہ داریاں تھیں۔ وہ گورنر اور مقننہ دونوں کے سامنے جواب دہ تھے۔ منتقل محکموں میں کچھ مقامی حکومت، خود اختیاری، صحتِ عامہ، تعلیم، زراعت اور امدادِ باہمی پر مشتمل تھے۔ اگر کسی وقت کسی منتقل محکمے کا انچارج وزیر نہ ہوتا تو وزیر کی تقرری تک گورنر خود اس محکمے کی ذمہ داری سنبھالتا تھا۔ گورنر جنرل سیکریٹری آف سٹیٹ کی پیشگی اجازت سے کسی ایک یا سب صوبائی امور کے انتقال کو معطل یا ختم کر سکتا تھا اور صورت میں یہ امور محفوظ امور ہو جاتے تھے جن کا انتظام و انصرام گورنر کے سپرد ہو جاتا تھا۔

دوعملی نظامِ حکومت ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۷ء تک قائم رہا۔ لیکن تجربے کی روشنی میں یہ نظام تسلی بخش ثابت نہ ہُوا۔ اس کی ناکامی کی متعدد وجوہات تھیں:

- دوعملی کا بنیادی اصول ہی غلط تھا کیونکہ انتظامیہ کی دو حصوں میں تقسیم اور دونوں کی ایک دُوسرے سے آزاد علیحدگی بنیادی طور پر سیاسی نظریئے اور حکومت کے طریق کار کے خلاف تھی۔ حکومت کو جو ہمہ گیر حیثیت حاصل ہے، اُسے دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا لہذا قدرتی طور پر یہ تقسیم غلط تھی۔
- منتقل اور محفوظ صوبائی امور کی تقسیم بھی بنیادی طور پر غلط تھی۔ زراعت، منتقل امور میں شامل تھا۔ لیکن آبپاشی کو محفوظ امور میں رکھا گیا۔ اسی طرح تعلیم منتقل امور میں شامل کی گئی۔ لیکن اینگلو انڈینز کی تعلیم محفوظ امور کے زمرے میں شامل کی گئی۔ محکموں کی یہ غیر سائنسی تقسیم

بھی اس تجربے کی ناکامی کا باعث بنی۔ مثلاً وزیر زراعت، آب پاشی پر کنٹرول کے بغیر اپنے فرائض صحیح طور پر سرانجام نہیں دے سکتا تھا حتیٰ کہ بعض اوقات تو یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہو جاتا تھا کہ کونسا شعبہ کون سے مخصوص محکمے کے ماتحت ہے۔

○ حکومت کی تسلی بخش کارکردگی کے لئے مختلف محکموں کے درمیان تعاون، بنیادی ضرورت ہوتا ہے لیکن دوعملی میں اس تعاون کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ایگزیکٹو کونسل کے رُکن افسر شاہی سے متعلق تھے۔ جبکہ وزراء عوام کے نمائندے تھے۔ اس طرح ان دونوں میں تعاون کا سوال تو دُور رہا۔ وہ اکثر اوقات ایک دوسرے پر کھلے بندوں تنقید کرتے رہتے تھے۔

○ گورنر، ایگزیکٹو کونسل کے اراکین کا مجموعی مشورہ تو حاصل کر لیتے تھے لیکن انہوں نے وزراء سے اجتماعی مشورہ کبھی حاصل نہ کیا۔ گورنر ہمیشہ ہر وزیر سے انفرادی طور پر مشورہ کرتا تھا۔

○ دوعملی نظام کے تحت وزراء کی حیثیت بہت نازک تھی۔ اُن کے سر پر بیک وقت دو آقا سوار رہتے، یعنی گورنر اور مجلس قانون ساز۔ وزیر کی تقرری گورنر کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ اُسے کسی وقت بھی برطرف کر سکتا تھا چنانچہ وزیر کی کوشش یہ ہوتی کہ گورنر کو خوش رکھے۔ اُدھر مقننہ کسی وزیر کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کر سکتی تھی۔ وزیروں کو اپنی پالیسی کی تصدیق کونسل سے کرانا پڑتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وزیر بیک وقت گورنر اور کونسل دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش میں ناکام ہو کر دونوں کی ناراضگی مول لے لیتے تھے بالعموم وہ گورنر کو خوش رکھنے کی کوشش میں مصروف رہتے اگر کسی وزیر سے گورنر خوش ہوتا تو اُسے مجلس مقننہ میں تیس فی صد نامزد سرکاری ممبروں کی حمایت حاصل ہو جاتی۔

○ آل انڈیا سروس کے لوگوں کی طرف سے بھی وزیروں کے لئے بہت سی دشواریاں پیدا کی جاتی تھیں صوبوں میں اعلیٰ ترین عہدے آل انڈیا سروس کے لوگوں کے پاس تھے وزیروں کا تقرریوں، برطرفیوں یا معطلی پر کوئی کنٹرول نہ تھا۔ سروس کے افسر وزیروں کو خاطر میں نہ لاتے اور وزیروں کی طرف سے پالیسیوں کے نفاذ میں روڑے اٹکاتے تھے۔

○ جن معاملات میں وزیروں کو اپنے محکمے کے سکریٹری سے اختلاف ہوتا، وہ معاملہ گورنر کے پاس چلا جاتا۔ سکریٹری کی پہنچ گورنر تک براہِ راست تھی اور ویسے بھی اُسے ہفتے میں ایک بار گورنر سے ضرور ملنا ہوتا۔ لہٰذا وہ وزیر کے خلاف آسانی کے ساتھ بات کرسکتا نیز گورنر کو اپنا ہمنوا بنا لیتا اس طرح ہر کام میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء

جیسا کہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ سے واضح ہو چکا ہے۔ کہ اس ایکٹ کی وجہ سے مرکز میں خاص تبدیلیاں پیدا نہ ہوئیں۔ مرکز میں دو ایوانی مقننہ کا نظام متعارف کرایا گیا۔ لیکن اس کے باوجود مقننہ کے اختیارات میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہ ہُوا۔ صوبوں میں دوعملی کی ترویج کی گئی۔ لیکن دوعملی نظامِ حکومت عملاً اور اصولاً کھوکھلا ثابت ہُوا۔ ہندوستانیوں نے محسوس کیا کہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت انہیں خاص اختیارات نہیں دیئے گئے۔ چنانچہ ان میں بیدلی پیدا ہوگئی۔ علاوہ ازیں رولٹ ایکٹ، جلیانوالہ باغ امرتسر کا سانحہ، مارشل لاء اور ایسی ہی دیگر وجوہات کی بناء پر عوام میں خاصی تلخی پائی جاتی تھی۔

سائمن کمیشن

۱۹۲۷ء میں برطانوی پارلیمان نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ جس کے چیئرمین سرجان سائمن تھے۔ مقصد یہ تھا۔ کہ یہ کمیشن صوبوں میں دوعملی حکومت کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کرے۔

لیکن ہندوستان کی ممتاز سیاسی جماعتوں اور بااثر طبقہ نے کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا۔ بائیکاٹ کی وجہ یہ تھی کہ کمیشن کے تمام اراکین انگریز تھے۔ کمیشن نے سرکاری افسروں اور صوبائی مقننہ کے اراکین کی مدد سے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اپنی رپورٹ مرتّب کی۔ جو ۱۹۳۰ء میں برطانوی حکومت کو پیش کر دی گئی۔ رپورٹ کا لب لباب یہ تھا کہ دوعملی نظامِ حکومت ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ خودمختاری کو دی جائے۔ یہ سفارش بھی کی گئی کہ ہندوستان کا آئینی مسئلہ ایک گول میز کانفرنس میں زیرِ بحث لایا جائے۔

گول میز کانفرنس

۱۹۳۰ء میں لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ جس میں ہندوستان اور برطانوی حکومت کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس نے کل ہند وفاق (آل انڈیا فیڈریشن) کی سفارش کی۔ کانگرس نے کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ اور فیڈریشن کی تجاویز کو عملی صورت دینے کے لئے کوئی اقدام نہ کیا۔ ۱۹۳۱ء میں گاندھی۔ ارون معاہدہ طے پایا۔ اور دوسری گول میز کانفرنس ۱۹۳۱ء میں منعقد ہوئی۔ کانگرس کی طرف سے صرف گاندھی نے شرکت کی۔ لیکن دوسرے مذاہب کی نمائندگی کا سوال اپنی جگہ موجود رہا۔ کیونکہ گاندھی نے اقلیتی نمائندوں کی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کانفرنس کے بعد برطانوی حکومت نے (۱۹۳۲ء) میں ایک کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا۔

ہندوستان واپسی پر جب گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک چلانے کے عزم کا اظہار کیا۔ تو انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ۱۹۳۲ء کے اواخر میں تیسری گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ لیکن کانگرس کی عدم شمولیت کے باعث خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

۱۹۳۳ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے لئے نئے آئین پر مشمولہ تجاویز کے سلسلہ میں قرطاس ابیض جاری کیا۔ یہ تجاویز برطانوی پارلیمان کی ایک مشترکہ مجلس انتخاب (جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی) کو غور و خوض کے لئے بھیج دی گئیں۔ اسی کمیٹی کی رپورٹ کی بنیاد پر برطانوی پارلیمان نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء منظور کیا۔

ایکٹ کی نمایاں باتیں

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ایک طویل اور تفصیلی دستاویز کی صورت میں سامنے آیا۔ اس ایکٹ پر ۱۹۳۶ء میں عملاً کام شروع ہوا۔ اور پہلی بار اس کے مجوزہ خطوط پر ملک میں عام انتخابات کا انعقاد ہوا۔ اپریل ۱۹۳۷ء میں اس کا مکمل نفاذ عمل میں آیا۔ اس ایکٹ کی خاص خاص باتیں یہ تھیں۔

- ایکٹ کے تحت دو نئے صوبے، سندھ اور اڑیسہ قائم کئے گئے۔ ان صوبوں کے قیام کے بعد گورنری صوبوں کی کل تعداد گیارہ ہو گئی۔

- ایکٹ کی اہم ترین بات صوبائی خود مختاری تھی۔ دوعملی نظام اور "منتقل" اور "محفوظ" امور کی تقسیم ختم کر دی گئی۔ تمام صوبائی امور وزراء کو منتقل کر دیئے گئے۔ اور وزراء کو مقننہ کے سامنے جواب دہ قرار دیا گیا۔
- ایکٹ کے تحت برطانوی ہندوستانی صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں پر مشتمل ایک آل انڈیا فیڈریشن کے قیام کی تجویز پیش کی گئی۔ اس وفاق (فیڈریشن) کی اا۔ آئینی وحدتیں گورنری صوبوں، چھ چیف کمشنر کے صوبوں کی صورت میں اور وفاق میں شمولیت پر رضامند ریاستوں پر مشتمل تھیں۔ ہر ریاست کو اس بات کی مکمل آزادی حاصل تھی کہ وہ وفاق میں شرکت کرے یا نہ کرے۔ مگر شرکت کی صورت میں وہ ریاست وفاق کی وحدت بن جائے گی ہر وحدت کو اپنے اندرونی معاملات کے معاملے میں مکمل خود مختاری حاصل تھی۔
- وفاق اور صوبائی خود مختاری کی تجاویز کے باعث مرکز اور صوبوں کے درمیان محکموں کی تقسیم بھی لازمی ہو گئی۔ گو ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت یہ تقسیم کر دی گئی تھی۔ لیکن اس پر نظر ثانی کی گئی۔ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت صرف دو ہی فہرستیں ترتیب دی گئیں۔ یعنی مرکزی فہرست اور صوبائی فہرست۔ لیکن ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت تین فہرستیں مرتب کی گئیں۔ یعنی

(۱) وفاقی (۲) ریاستی (۳) مشترکہ

- ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت صوبائی سطح سے دوعملی ختم کر کے مرکز میں دوعملی کو رواج دیا گیا۔ وفاقی امور کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یعنی "محفوظ" اور "منتقل"۔ ا۔ "محفوظ" میں دفاع، مذہبی امور، امور خارجہ اور قبائلی علاقوں کے انتظامی امور شامل تھے۔ ان کا انتظام گورنر جنرل کے پاس تھا۔ جس کی مدد ایگزیکٹو کونسلر کرتے تھے۔ جن کی تعداد تین تھی۔ باقی تمام امور منتقل امور میں شامل کئے گئے۔ یہ امور بھی گورنر جنرل کے ذمہ تھے لیکن اُن کی انجام دہی میں وزراء کی مجلس کو اس کی مدد کرنا تھی۔ وزیروں کی تعداد زیادہ سے زیادہ دس مقرر کی گئی۔ وزراء گورنر جنرل اور مقننہ کے سامنے جواب دہ تھے۔ گورنر جنرل اپنے خاص اختیارات کے تحت وزراء کی رائے کے خلاف فیصلہ دے سکتا تھا۔

- اس ایکٹ کی ایک اور نمایاں خصوصیت اقلیتوں کے تحفظ کا اقدام تھا۔ اس کا جواز یہ تھا۔ کہ اکثریت کے ہاتھوں اقلیت کا تحفظ ضروری ہے۔ تاہم قوم پرستوں کو اس چیز کا کوئی جواز نظر نہ آیا۔ ان کے خیال میں یہ محض ایک فریب تھا۔ تاکہ اس طرح گورنر جنرل اور گورنروں کو وزراء اور قانون سازوں پر غالب کر دیا جائے۔
- مقننہ میں توسیع کر دی گئی۔ مجوزہ وفاقی مقننہ ایک ایوان بالا (کونسل آف سٹیٹ) اور ایک ایوان زیریں (فیڈرل اسمبلی) پر مشتمل تھی۔ ان دونوں کے علی الترتیب ۲۶۰ اور ۳۷۵ رکن تجویز کئے گئے۔ ۱۱ صوبوں سے چھ میں دو ایوانی مقننہ کا نظام ترتیب دیا گیا۔ ایکٹ کے تحت رائے دہی کا دائرہ بھی وسیع کر دیا گیا۔ اور آبادی کے تقریباً دس فی صد حصہ کو صوبائی مقننہ کے لئے حق رائے دہی استعمال کرنے کا حق دے دیا گیا۔
- ایکٹ کے تحت ایک وفاقی عدالت کے قیام کی تجویز بھی شامل کی گئی۔ عدالت کے قیام کا مقصد یہ تھا۔ کہ ریاستوں کے باہمی تنازعات اور آئین کی وضاحت کا فیصلہ کیا جاسکے تاہم اپیل کے لئے یہ آخری عدالت نہ تھی۔ بعض معاملات میں انگلستان میں پریوی کونسل میں بھی اپیل کی جا سکتی تھی۔ مذکورہ وفاقی عدالت کا قیام ۱۹۳۷ء میں عمل میں آیا۔
- ۱۸۵۸ء میں سکریٹری آف سٹیٹ برائے ہند کے لئے جو ہندوستانی کونسل ترتیب دی گئی تھی۔ اسے ختم کر دیا گیا۔ اب سکریٹری آف سٹیٹ کے لئے کونسل کی جگہ مشیر مقرر کر دیئے گئے۔ صوبائی خودمختاری کے باعث منتقل امور پر سکریٹری آف سٹیٹ کی گرفت بھی کافی حد تک کمزور ہو گئی۔ تاہم گورنر جنرل اور گورنروں کے اختیارات پر اس کی گرفت میں کوئی فرق نہ آیا۔
- اس ایکٹ کے تحت ہندوستانی عیسائیوں اور اینگلو انڈینز کو علیحدہ انتخابات کا حق دیا گیا۔
- برطانوی پارلیمان کی برتری اس ایکٹ کے تحت بھی قائم رہی۔ ہندوستان کی کوئی وفاقی یا صوبائی مقننہ آئین میں ترمیم یا تنسیخ نہیں کر سکتی تھی۔ صرف برطانوی پارلیمان کو ترمیم یا تنسیخ کا حق حاصل تھا۔ ہندوستانی قانون ساز ادارے زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے تھے

کہ ایک قرارداد کے ذریعہ حکومت برطانیہ سے آئین میں تبدیلی کی درخواست کر دیں۔

- اس ایکٹ کے تحت اپریل ۱۹۳۷ء سے برما کو ہندوستان سے الگ کر دیا گیا۔ عدن کو حکومت ہند کے انتظامی کنٹرول سے الگ کر کے نوآبادیاتی دفتر کے سپرد کر دیا گیا۔ اس طرح عدن تاج برطانیہ کی ایک نوآبادی بن گیا۔

ایکٹ کا صوبائی حصہ

ایکٹ کے صوبائی حصہ کا نفاذ یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے ہوا۔ لیکن وفاقی حصہ کبھی مؤثر نہ ہو سکا اور مرکزی حکومت بدستور ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت کام کرتی رہی۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت جو بنیادی اور اہم تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ وہ یہ تھیں:۔

۱۔ سندھ اور اڑیسہ کے دو نئے صوبے قائم کئے گئے۔ اور اب گیارہ گورنری صوبے تھے۔

۲۔ صوبائی مقننہ میں گورنر بطور نمائندہ تاج برطانیہ شامل تھا۔ اور یہ مقننہ ایک یا دو ایوانوں پر مشتمل تھی۔ مدراس، بمبئی، بنگال، متحدہ صوبے، بہار اور آسام کے ہر صوبے میں دو ایوان تھے۔ جنہیں ایوان بالا (لیجسلیٹو کونسل) اور ایوان زیریں (لیجسلیٹو اسمبلی) کہا جاتا تھا۔ پنجاب، مرکزی صوبے (سی۔ پی) بہار، اڑیسہ، سندھ اور صوبہ سرحد میں ہر ایک صوبہ کا صرف ایک ایوان تھا۔ جسے لیجسلیٹو اسمبلی کہا جاتا تھا۔

۳۔ جہاں تک لیجسلیٹو کونسل کا تعلق تھا۔ تو گورنروں کو کچھ اراکین نامزد کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ جبکہ لیجسلیٹو اسمبلی مکمل طور پر منتخب ادارہ تھا۔ لیجسلیٹو کونسل کو مستقل حیثیت حاصل تھی۔ لیکن ہر تین سال بعد اس کے ایک تہائی اراکین ریٹائر کر دیئے جاتے تھے۔ لیجسلیٹو اسمبلی کی میعاد پانچ سال تھی۔ لیکن گورنر اسے میعاد سے پہلے بھی کالعدم قرار دے سکتا تھا۔

۴۔ مقننہ میں نمائندگی پونا پیکٹ کے تحت نظرثانی شدہ کمیونل ایوارڈ کی مطابقت سے ضروری تھی۔

۵۔ صوبوں میں دوعملی ختم کر دی گئی۔ اب وہاں "محفوظ" امور اور کوئی ایگزیکٹو کونسل باقی نہ رہی۔ وزارتی کونسل کو خود ہی تمام صوبائی امور سرانجام دینا تھے۔ ماسوا امن عامہ وغیرہ! ان امور کے لئے گورنر پر خاص ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں۔ وزیروں کا انتخاب منتخب

اراکین صوبائی مقننہ سے ہونے لگا۔ اور وزراء مجموعی طور پر اسی کے سامنے جوابدہ تھے۔

۶۔ جہاں تک صوبائی امور کا تعلق تھا، صوبائی حکومتیں خود مختار ہو گئی تھیں۔ یعنی ڈوعملی ختم کر کے خود مختاری دے دی گئی تھی!

۷۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت گورنروں کو کچھ غیر معمولی اختیارات دے دیئے گئے۔ وہ آرڈیننس جاری کر سکتے تھے۔ اور قانون نافذ کر سکتے تھے۔

۸۔ رائے دہی کو وسعت دے کر رائے دہندگان کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ اور مقننہ میں عورتوں کے لئے نشستیں مخصوص کر دی گئیں۔

ایکٹ کا وفاقی حصہ

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے وفاقی حصہ کی نمایاں باتیں یہ تھیں۔

۱۔ ایکٹ کے تحت ہندوستان کے آئین کے لئے وفاقی طرز تجویز کیا گیا۔ ہندوستانی ریاستوں سے بھی یہ توقع کی گئی۔ کہ وہ وفاق میں شامل ہو جائیں گی۔ اس اعتبار سے کل ہند وفاق برطانوی ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں پر محیط تھا۔

۲۔ مجوزہ وفاقی مقننہ ایک دو ایوانی ادارہ تھا۔ جس میں ایوان بالا (کونسل آف سٹیٹ) اور وفاقی اسمبلی (ایوان زیریں) شامل تھے۔

۳۔ کونسل آف سٹیٹ یا ایوانِ بالا کے کل ۲۶۰ اراکین تجویز کئے گئے۔ ان میں سے ۱۰۴ وفاق میں شامل ریاستوں کے حکمرانوں کے نامزد نمائندے اور چھ گورنر جنرل کے نامزد کردہ شامل تھے، باقی ۱۵۰ نمائندے منتخب ہوتے تھے۔ کونسل آف سٹیٹ ایک مستقل ادارہ تھا اور اس کے اراکین کا انتخاب ۹ سال کے لئے ہونا قرار پایا۔ ایک تہائی اراکین ہر ۳ سال بعد ریٹائر ہوتے تھے۔

۴۔ وفاقی اسمبلی کے لئے کل ۳۷۵ اراکین تجویز کئے گئے۔ ان میں ۲۵۰ برطانوی ہندوستان کے نمائندوں اور ۱۲۵ ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں کے طور پر شامل ہوتے تھے۔ برطانوی ہندوستان کے نمائندہ اراکین کا انتخاب براہِ راست ان انتخابی اداروں کے ذریعہ ہوتا تھا جو ایوان زیریں کے اراکین پر مشتمل تھا۔ لیکن ہندوستانی ریاستوں کے نمائندوں کی نامزدگی

ریاست کا فرمانروا کرسکتا تھا۔ اس کی میعاد ۵ سال مقرر کی گئی۔ تاہم قبل از وقت گورنر جنرل اسے کالعدم قرار دے سکتا تھا۔

۵۔ مرکز میں دو عملی کو رواج دیا جانا تھا۔ اور وفاقی امور کو "محفوظ" اور "منتقل" دو حصوں میں تقسیم کرنا تھا۔ دفاع، اور امور خارجہ وغیرہ "محفوظ" امور میں شامل کئے گئے۔ جن پر براہِ راست گورنر جنرل کا اختیار تھا۔ گورنر جنرل کی اعانت کے لئے تین کونسلروں کا تصور ہوا۔ "منتقل" امور وزراء کے ذمہ تھے۔ وزراء مقننہ کے سامنے جواب دہ تھے۔

۶۔ وفاق میں قانون سازی کے اختیارات کی تقسیم کو ضروری قرار دیا گیا۔ ایکٹ میں ۳ فہرستیں شامل کی گئیں۔ (ا) وفاقی (ب) صوبائی (ج) متفقہ یا مشترکہ۔

۷۔ گورنر جنرل کے لئے خصوصی اختیارات اور ذمہ داریاں تجویز کی گئیں۔ جن کے تحت وہ اپنی مرضی سے اپنے اختیارات کو استعمال کرسکتا تھا۔

۸۔ ایک وفاقی عدالت ہند کا قیام جسے وفاق سے متعلقہ تنازعات کے فیصلے اور اہم قانونی نکات کے طرح ہونے کی صورت میں۔ دیگر عدالتوں کے فیصلے کے خلاف اپیلوں کی سماعت کا اختیار تھا۔

"حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کے تحت ہندوستانیوں کی منزلِ آزادی کافی حد تک قریب آگئی۔ اور یہ ایکٹ برطانوی حکومت سے ہندوستانی ہاتھوں میں اقتدار کی منتقلی کی تمہید ثابت ہوا۔"

لیکن پروفیسر کپلینڈ کے اس خیال سے ہندوستانی رہنما متفق نہیں۔ جہاں تک اس ایکٹ کے وفاقی حصہ کا تعلق ہے۔ ہندوستانی اور بالخصوص مسلم لیگی قطعی طور پر غیر مطمئن تھے۔ اس ایکٹ کے بارے میں قائداعظمؒ نے کہا تھا۔

"قطعی طور پر بکواس، بنیادی طور پر گندہ اور کلیتًا ناقابلِ قبول۔"

کانگرس کے راج گوپال اچاریہ نے اس ایکٹ کے بارے میں کہا۔

"یہ آئین دو عملی سے زیادہ خراب ہے۔"

نہرو نے یوں اظہار خیال کیا۔

"یہ غلامی کا ایک نیا باب ہے۔ یہ اس مشین کی طرح ہے۔ جس کے بریک نہایت مضبوط مگر انجن غائب ہو"

سب سے زیادہ اعتراض وفاقی مقننہ میں ریاستی حکمرانوں کی شمولیت، گورنر جنرل اور گورنروں کی "مخصوص ذمہ داریوں" صوبائی مقننہ میں ایک ایوان کے اضافہ اور "حکومت خود اختیاری کی خود کار نشوونما" کی عدم موجودگی پر کی گئی۔

باب ۱

مسلم قومیت کا آغاز

۔ سید احمد کا کردار

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد برِصغیر ہند و پاک کے مسلمان سیاسی اقتدار سے قطعاً محروم ہو چکے تھے۔ سماجی اور اقتصادی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ انگریز، مسلمان کو اس جنگِ آزادی کے لئے موردِ الزام ٹھہرا رہا تھا اور مسلمان اس کے دل میں خار کی طرح کھٹک رہا تھا۔ مسلمان، تعلیمی میدان میں بھی ہندو کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ گئے تھے اسی لئے انہیں سرکاری ملازمتوں میں کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ اس موقع پر سرسید احمد خاں اور سید امیر علی نے محسوس کیا کہ جب تک مسلمانوں میں تعلیم عام نہ کی جائے گی انہیں باعزت مقام حاصل نہ ہو سکے گا ۱۸۵۹ء میں سرسید احمد خاں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہندوستان کی سول سروس میں ہندوستانیوں کے لئے گنجائش ہونا ضروری ہے۔ اُس وقت تک انڈین سول سروس پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ ۱۸۸۲ء میں سید امیر علی نے مسلمانوں کے مطالبات اور رنجشوں کے بارے میں ایک یادداشت مرتب کر کے وائسرائے ہند لارڈ رپن کو سنٹرل ایسوسی ایشن کی طرف سے روانہ کی جس کے ذریعے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں جگہ دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اسی موقع پر محمڈن ایسوسی ایشن کا تصادم انڈین ایسوسی ایشن کے ساتھ ہوا۔ انڈین ایسوسی ایشن نے یہ مطالبہ کیا کہ سول

سروسوں کے لئے مقابلے کے امتحانات بیک وقت انگلستان اور ہندوستان میں منعقد کئے جائیں۔ نیز امیدواروں کی عمر کی حد بھی اُنیس سال سے بڑھائی جائے (جو ۱۸۷۲ء سال سے ۱۹ سال کر دی گئی تھی) لیکن محمڈن ایسوسی ایشن نے یہ مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کے لئے نامزدگی کے ذریعہ ملازمتوں میں گنجائش پیدا کی جائے۔ سید امیر علی کا کہنا یہ تھا کہ ۱۸۶۵ء تک تو حکومت مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے ملازمتوں میں توازن قائم رکھتی رہی لیکن اُس کے بعد سے اس امر کا کوئی خیال نہ کیا گیا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں کے لئے ملازمتوں کے دروازے بند ہوتے چلے گئے۔

سرکاری اعداد وشمار کے مطابق اُس وقت صرف چوبیس پرگنہ کے کل ۱۱۲ عہدے داروں میں صرف ۲ مسلمان تھے۔ بنگال کے دوسرے اضلاع میں بھی کم و بیش یہی صورت تھی۔ کلکتہ کے ۹۰ فی صد دفاتر میں تو ایک بھی مسلمان نظر نہ آتا تھا۔ سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن کے مطابق مسلمانوں کو ملازمتوں سے جان بوجھ کر دُور رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ جو مسلمان ملازمت کے اہل بھی ہوتے تھے اُنہیں بھی جگہ نہ دی جاتی۔

ان حالات میں سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کے لئے نیا تعلیمی لائحہ عمل مرتب کیا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کر چکے تھے کہ انگریزی اور مغربی علوم و سائنس کے حصول کے بغیر مسلمانوں کی پسماندگی کو ختم کرنا بہت مشکل ہے۔ ۱۸۶۳ء میں انہوں نے غازی پور میں ایک سکول قائم کیا جس میں انگریزی کی تعلیم ضروری تھی۔ آئندہ سال ایک ترجمہ سوسائٹی کی بنیاد رکھی جس کا صدر دفتر بعد ازاں علی گڑھ منتقل کرنے کے بعد نیا نام سائنٹفک سوسائٹی کر دیا گیا۔ اس سوسائٹی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو مغربی افکار کی نشوونما کے بارے میں باخبر رکھنے کی غرض سے انگریزی کتب کا اُردو میں ترجمہ کرایا جائے اس سوسائٹی کو ایک ایسے پلیٹ فارم کی حیثیت بھی حاصل تھی جہاں مسلمان اور انگریز باہمی مفادات پہ تبادلۂ خیال کر سکیں۔

سر سید احمد خاں نے نازک حالات کے تحت یہ بھی محسوس کیا کہ اگر مسلمانوں نے انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون کا سلسلہ جاری رکھا تو یہ اُن کے مفادات کے لئے تباہ کن ثابت ہوگا۔

سر سید احمد خاں نے انہی دنوں اسباب بغاوتِ ہند کے نام سے جو کتابچہ لکھا، شروع میں تو اُس پر بہت لے دے ہوئی، لیکن بعد ازاں یہی کتابچہ بہت سی اصلاحات کے لئے نکتۂ آغاز بنا۔ قریباً ایک سال بعد ہی ہندوستانیوں کو لیجسلیٹو کونسل میں شامل کر لیا گیا اور کانگریس کے بانی لارڈ ہیوم نے یہ اعتراف کیا:

"سر سید احمد خاں کے رسالہ اسباب بغاوتِ ہند پڑھنے کے بعد ہی میں نے پہلی بار ہندوستانیوں کی رائے عامہ کے بارے میں جاننے کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اسی کے نتیجے میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔"

برٹش انڈیا ایسوسی ایشن علی گڑھ

مئی ۱۸۶۶ء میں سر سید احمد خاں نے علی گڑھ کے ممتاز لوگوں کا ایک اجلاس طلب کیا تاکہ برطانوی انتظامیہ کی طرف سے نافذ کردہ قوانین کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا جاسکے۔ اسی موقع پر برٹش انڈین ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ راجہ جے کشن داس کو ایسوسی ایشن کا صدر اور سر سید احمد خاں کو سکریٹری چنا گیا۔ آئین میں کہا گیا تھا کہ نسل اور مذہب کے امتیاز کے بغیر کوئی بھی باعزت شخص، جو ہندوستان میں رہتا ہو یا ہندوستان میں مستقلاً رہائش پذیر کوئی غیر ملکی انجمن کا رکن بن سکتا ہے۔ یہ پہلی تنظیم تھی جس میں ہندو اور مسلمان بیک وقت شامل تھے لیکن یہ صرف ایک سال تک قائم رہی۔ اس دوران اس ایسوسی ایشن نے ایک ہی کام کیا، یعنی شمال مغربی صوبہ میں ایک یونیورسٹی کے قیام کا فیصلہ!

برہمو سماج

راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۸ء میں برہمو سماج قائم کی۔ یہ خالصتاً ایک ہندو تحریک تھی جس کا مقصد ہندوؤں کو عیسائیوں کے مذہبی اثر و رسوخ سے دُور رکھنا تھا۔ راجہ رام موہن رائے نے بُت پرستی کی جگہ وحدانیت کا نعرہ لگایا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک ہندو کہلانا پسند کرتے رہے۔ وہ اس الزام کی تردید بھی کرتے رہے کہ انہوں نے ہندوؤں کے اندر ایک نیا فرقہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس تحریک کے ہفتہ وار جلسوں میں کٹر برہمن اور دوسری ذات کے ہندو مل کر وید پڑھا کرتے تھے۔ رام موہن رائے کی موت کے بعد اس تحریک کو دیوندر ناتھ ٹیگور نے سنبھالا، بعد ازاں کیشب چندر سین نے اس تحریک میں مزید نعرے شامل کئے۔ انہوں نے عورتوں کی تعلیم، بیواؤں کی دُوسری شادی اور مذہبی میدان میں سب کی برابری پر زور دیا۔

آریہ سماج

انگریزی اثر ورسوخ کے خلاف ایک اور تحریک آریہ سماج کے نام سے سامنے آئی۔ ۱۸۷۵ء میں اس کی بنیاد بمبئی کے دیانند سراسوتی نے رکھی۔ یہ قطعی طور پہ ایک متعصب ہندو جماعت تھی۔ جس میں مسلمانوں عیسائیوں اور غیر ہنود کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ لالہ دیانند نے ہندوؤں پہ زور دیا کہ وہ اپنے قدیم مذہب پہ سختی کے ساتھ کاربند رہیں اور عیسائیوں اور مسلمانوں کے خلاف اپنا "جہاد" جاری رکھیں۔ دیانند نے غیر ہنود کو ہندو بنانے کے لئے شدھی کی تحریک بھی چلائی۔ ۱۸۸۲ء میں ایک "گئو رکھشا" سوسائٹی قائم کی تاکہ اس آڑ میں ہندوؤں کو مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف منظم کیا جا سکے۔ حکومت کو ایک یادداشت پیش کی گئی جس میں گائے کے ذبیحہ پہ پابندی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس تحریک کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں نفرت پیدا ہو گئی اور ہندوستان میں جا بجا ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے۔ ۱۸۹۰ء میں گئو رکھشا کے نعرے کے تحت ہی تلک نے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو خوب ہوا دی اور فساد کرا لئے۔

انڈین ایسوسی ایشن

ایک اور ہندو سیاسی تنظیم انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے ۱۸۷۶ء میں کلکتہ میں قائم کی گئی۔ اس کے بانی بابو سریندر ناتھ بینرجی تھے۔ وہ خود انگلستان کے تعلیم یافتہ تھے۔ اس تحریک کا مقصد تعلیم یافتہ متوسط درجے کے بنگالی ہندوؤں میں سیاسی بیداری پیدا کرنا تھا۔ تاہم اس تحریک کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

مسلمانوں کے شبہات

ہندوؤں کی طرف سے ایسی ہی تحریکوں اور تعصب آمیز اقدامات کی وجہ سے مسلمان کافی بددل ہو چکے تھے۔ انڈین ایسوسی ایشن کے قیام کے ایک سال بعد یعنی ۱۸۷۷ء میں سید امیر علی نے سنٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کر دی تھی اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اپنی قدیم روایات کی پاسبانی کے ساتھ وقت کے تقاضوں کا ساتھ بھی دیں۔ نیز مسلمانوں کو باعزت

سیاسی سطح پر لانے کے لئے تگ و دو کی جائے۔ چند سال ہی میں اس ایسوسی ایشن نے ملک کے اہم شہروں میں اپنی شاخیں قائم کر لیں اور مسلمانوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ تنظیم کی پہلی کوشش یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خلاف غیر مسلم تنظیموں کی سرگرمیوں کا مقابلہ کیا جا سکے تاہم ہندوؤں کو اس تنظیم میں شرکت اور ووٹ دینے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن غیر مسلم سراسر مسلمانوں کے امور پر ووٹ دینے کا حق استعمال نہ کر سکتے تھے۔

ہندوستان میں یہ پہلی مسلم سیاسی تنظیم تھی۔ اس تنظیم نے متعدد یادداشتیں حکومت کو پیش کیں اور مسلمانوں کے مطالبات سے آگاہ کیا ۱۸۸۲ء میں اس تنظیم نے وائسرائے ہند لارڈ رپن کو مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور سرکاری دفاتر میں اُن کی عدم موجودگی کے بارے میں یادداشت پیش کی۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے سماجی سیاسی اور مذہبی مفادات کے تحفظ کا بیڑہ بھی اٹھایا۔ یہ تنظیم ۱۸۸۵ء تک مؤثر انداز میں کام کرتی رہی تاہم بعد ازاں علی گڑھ کی قیادت اس تحریک پر حاوی ہو گئی۔

ہندو مسلم اتحاد

سرسید پر یہ الزام عائد کیا جاتا تھا کہ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کو صدمہ پہنچایا۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید احمد نے ابتداء میں جتنی بھی جدوجہد کی وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترکہ مفادات میں تھی۔ لیکن اس بات کا کیا علاج کہ ہندو نے انگریز کے ساتھ مل کر مسلمان کو نہ صرف مکمل طور پر نظر انداز کر دیا بلکہ اُس کے مفادات کو بھی پوری طرح ضرب لگانے کی کوشش کی۔ سرسید نے واضح الفاظ میں یہ کہا تھا کہ اگر ملک کے قوانین میں نسلی امتیاز روا رکھا گیا تو حاکم اور محکوم کے درمیان فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اُنہوں نے صرف مسلمان کا نام نہیں لیا تھا۔ اسی بنا پر ۱۸۸۳ء میں البرٹ بل کی حمایت کی، ہندو مسلم تعاون کی ضرورت پر زور دیا نیز ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو آنکھوں سے تشبیہ دی اور کہا کہ اگر ایک آنکھ بھی ضائع ہو گئی تو پورا جسم بدنما ہو جائے گا۔

جالندھر میں لالہ بھگت رام نے سرسید احمد خاں کو سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا "سید صاحب کسی ایک مذہب کے لوگوں یا کسی مخصوص طبقے کے ساتھ نہیں وہ کشیب چندرسین اور سوامی دیانند سرسوتی کے پیروکاروں کے ساتھ بھی اُسی حد تک مخلص ہیں جتنے مسلمانوں کے ساتھ۔ وہ صحیح معنوں میں محب وطن ہیں"

سر سیّد احمد خاں نے جب بھی ملک کے انتظام اور یکساں قوانین وضع کرنے کی سرگرمیوں میں شرکت کے لئے ہندوستانیوں کی شمولیت کا مطالبہ کیا تو لفظ ہندوستانی ہی استعمال کیا اور کوئی امتیاز قائم نہ کیا۔ جب انہوں نے ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تو ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس کے رکن تھے، غازی پور میں سکول قائم کیا تو وہاں انگریزی اور عربی کے ساتھ ساتھ سنسکرت کی تعلیم کا انتظام بھی کیا۔ ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی تو اس کا مقصد بھی ہندوستانیوں کے حقوق کا تحفظ تھا، اس ایسوسی ایشن کے جلسوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے رہے۔

علی گڑھ کالج میں ۳۰۰ ہندو لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ نہ صرف ہندو طلبہ کا باورچی خانہ الگ تھا بلکہ انہیں اپنی عبادت اور سماجی رسومات کی ادائیگی کی بھی کھلی آزادی حاصل تھی۔

سوال یہ ہے کہ آخر سر سیّد احمد خاں کو اپنے رویے میں تبدیلی کیوں کرنا پڑی؟

اُردو اور ہندی کا تنازعہ

یہ بات واضح ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اُردو کے سوا اور کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ ان دونوں کے درمیان یہی زبان ہندوستان کے ایک کونے سے دُوسرے کونے تک اور بالخصوص شمال مغربی صوبوں میں باہم رابطہ کا واحد ذریعہ تھی۔ مسلمان اور ہندو دونوں، انگریز کی غلامی میں آچکے تھے، آزادی کا حصول ان دونوں کا واحد مقصد تھا۔ جہاں تک سر سیّد احمد خاں کی مساعی کا تعلق تھا تو انہوں نے ہندو اور مسلمان کے درمیان کبھی فرق محسوس نہ کیا۔ لیکن اس کے برعکس ہندوؤں نے کچھ ایسی تحریکیں چلائیں (جن کا ذکر ہم اُوپر کر چکے ہیں) کہ مسلمان دل برداشتہ ہو گئے۔ سر سیّد احمد خاں ایسا نڈر شخص بھی جس نے انتہائی نازک دَور میں رسالہ "اسباب بغاوتِ ہند" لکھا، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرف سے اُن کے حقوق کے حصول کی بھرپور جدوجہد کی، ہندوؤں کے اس رویّہ سے بددل ہو گیا اور جب ہندوؤں نے ہندی کا فتنہ کھڑا کیا تو سر سیّد احمد خاں کو یقین ہو گیا کہ مسلمان کا ہندو ذہنیت کے ساتھ جینا ممکن نہیں۔

۱۸۶۶ء میں بنارس کے کچھ ممتاز ہندوؤں نے یہ تحریک شروع کی کہ سرکاری عدالتوں میں فارسی رسم الخط میں اُردو کی جگہ دیوناگری رسم الخط میں ہندی کو متعارف کرایا جائے۔ اُن کے خیال میں اُردو زبان مسلمانوں کی تھی اور ہندو تہذیب کی جگہ مسلمان تہذیب کی نمائندگی کرتی تھی۔ دیکھتے

ہی دیکھتے تمام شمالی مغربی صوبوں میں مختلف ہندو تنظیمیں وجود میں آگئیں اور ہندی کا فتنہ کھڑا کر دیا گیا۔ ان تمام تحریکوں کا مرکز الٰہ آباد تھا۔ تمام ہندو اخبارات نے اس تحریک کی پُرزور حمایت کی اور شمالی مغربی صوبوں کے لئے ایک یونیورسٹی کے قیام اور اس میں ہندوؤں کے لئے ہندی ذریعہ تعلیم قرار دینے کا مطالبہ شروع کر دیا۔ قدرتی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اسی موقع پر سرسید احمد خاں نے محسوس کیا کہ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے اس وقت تک جو کوشش کی وہ اکارت گئی۔ لہٰذا ان کی سرگرمیوں کا رُخ فوراً تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا:

" اگر ہندو اس حد تک تنگ نظر ہے کہ وہ مشترکہ قومی زبان کو بھی برداشت نہیں کر سکتا تو اُس سے مزید کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ کیا اس کے باوجود برصغیر میں ایک مشترکہ قومیت کا شائبہ بھی ہو سکتا ہے"؟ بنارس کے ڈویژنل کمشنر مسٹر شیکسپیئر نے یہی بات سن کر سرسید احمد خاں کو جواب دیا تھا کہ" میں نے آج پہلی بار آپ کی زبان سے صرف مسلمانوں کی ترقی کے بارے میں سُنا ہے ورنہ اس سے پہلے تو آپ ہمیشہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ مفادات کی بات کیا کرتے تھے"۔

سرسید احمد خاں نے اُسی وقت یہ پیش گوئی کر دی تھی کہ رفتہ رفتہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات کی وسیع خلیج حائل ہوتی چلی جائے گی کیونکہ ہندو کسی قیمت پر بھی مسلمان کو ترقی کے راستے پر گامزن نہیں دیکھ سکتے تھے۔

مسلم قومیت پر یقین

بلاشبہ سرسید احمد خاں پہلے مسلمان تھے جنہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔ لیکن جب انہوں نے ہندوؤں کی تنگ نظری اور تنگ دلی کے مظاہرے دیکھے تو اس وقت بھی وہ پہلے مسلمان تھے جن کے ذہن میں علیحدہ مسلم قومیت کے تصوّر نے جنم لیا۔ سرسید نے محسوس کیا کہ ان دونوں کے درمیان اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی مفاہمت کبھی پیدا نہ ہو سکے گی اور دونوں کے نظریات کا تصادم ہوتا ہی رہے گا۔ چنانچہ مسلمانوں کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انہی تجربات نے انہیں بعد ازاں مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس سے الگ رہنے کی تاکید کرتے پر مجبور کیا اور اسے قطعی طور پر ایک ہندو متعصب جماعت قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان کے

مسلمانوں کو باوقار زندگی گذارنے کے قابل بنانے کے لیئے ان کی جدوجہد کا آغاز ہو گیا۔ اس مقصد کے لیئے انہوں نے نہ صرف علی گڑھ کو ایک تعلیمی بلکہ سیاسی مرکز بھی بنایا۔

علی گڑھ تحریک

علی گڑھ تحریک کو اگر پاکستان کا سنگِ بنیاد قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

١٨٦٩ء میں سرسید احمد خاں انگلستان گئے۔ انہوں نے قریباً ڈیڑھ سال تک برطانوی نظامِ تعلیم کا بنظرِ غائر جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے لیئے انہی خطوط پہ تعلیم حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ وطن واپس آتے ہی مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لیئے اُن کی تعلیمی ترقی کی طرف توجہ دی۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں آراء طلب کیں اور ان کی روشنی میں محسوس کیا کہ مسلمان والدین میں اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی خواہش اور انگریزی تعلیم کے خلاف نفرت کسی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ سرکاری سکولوں میں مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کا پورا ہونا مشکل تھا کیونکہ ان سکولوں میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ تھا لہٰذا مسلمانوں کو اس کے لیئے خود ہی ہاتھ پاؤں مارنا پڑیں گے۔

اس مقصد کے لیئے جو کمیٹی قائم کی گئی اُس نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے نام سے ایک درس گاہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ سرسید اس کی انتظامیہ کمیٹی کے سکریٹری چنے گئے۔ رقم فراہم کرنے کے لیئے دن رات کوشش کا آغاز کر دیا گیا۔ خود سرسید احمد خاں نے ہندوستان کے کونے کونے کا دورہ کیا اور لاتعداد مشکلات کا سامنا کیا۔ بہت سے مسلمانوں کے دل سے یہ خوف دور کرنے کے لیئے کہ اگر مغربی تعلیمی خطوط پر اُن کے بچوں کو تعلیم دی گئی تو مذہبی عقائد بُری طرح متاثر ہوں گے، کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے ایک سکول قائم کر کے ثابت کر دیا جائے کہ مغربی تعلیم سے اُن کے مذہبی اعتقادات اور اسلامی اصولوں پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔ مئی ١٨٧٥ء میں ایم۔ اے او سکول کھول دیا گیا۔ اور کوئی دو سال بعد اِسے کالج کا درجہ دے دیا گیا ٨ جنوری ١٨٧٧ء کو گورنر جنرل لارڈ لٹن نے اس کا سنگِ بنیاد رکھا چند ہی سال میں کالج کی شاندار عمارت تعمیر کر دی گئی اس طرح یہ ایک مثالی درس گاہ بن گئی۔ جو لوگ باہر سے آتے، ہندوستان میں ایسی درس گاہ دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ طلبہ کے لیئے مخصوص لباس مقرر کیا گیا۔ مذہبی تعلیم کے ساتھ پانچ وقت نماز اور روزوں کو لازمی قرار دیا گیا۔ اس طرح علی گڑھ مسلمانوں کی سماجی،

ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی ادارے نے مسلمانوں کو قیادت دی اور ہندوستان کے مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑا دی۔

اُدھر بنگال میں مسلمانوں کے لئے تعلیم کا بیڑہ نواب عبداللطیف خاں نے اُٹھایا۔ نواب عبداللطیف خاں کلکتہ مدرسہ میں عربی کے پروفیسر تھے۔ ۱۸۴۹ء میں انہیں بنگال میں ڈپٹی مجسٹریٹ بنا دیا گیا بعد ازاں بنگال کی لیجسلیٹو کونسل کے لئے نامزد ہوئے۔ وہ کونسل کے پہلے مسلمان رکن تھے۔ ۱۸۶۲ء میں وہ کلکتہ یونیورسٹی کے فیلو بنا دیئے گئے۔ اسی سال نواب عبداللطیف خاں نے سرسید احمد خاں کی طرح مسلمانوں کی پسماندگی سے متاثر ہو کر ایک محمڈن لٹریری سوسائٹی آف کلکتہ کی بنیاد رکھی۔ جس کے مقاصد بہت حد تک علی گڑھ سے ہم آہنگ تھے۔ اس سوسائٹی کا اجلاس ہر ہفتہ نواب صاحب کے گھر ہوتا جس میں ممتاز انگریز اور ہندوستانی مضامین پڑھتے اور مسلمانوں کی اخلاقی و مادی ترقی کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے۔ حکومت اس سوسائٹی کو بنگال کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی نمائندہ تسلیم کرتی تھی۔ اسی سوسائٹی کی وجہ سے بنگال کے مسلمانوں میں تنظیم کا احساس پیدا ہوا۔

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام

برطانوی حکومت کو ہندوستانیوں کے مطالبات اور ان کے مصائب سے آگاہ کرنے کے لئے ملک میں بہت سی سیاسی اور نیم سیاسی تنظیمیں قائم تھیں۔ ۱۸۶۶ء میں سرسید احمد خاں برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کر چکے تھے جس کی وساطت سے کونسل میں ہندوستانیوں کے لئے نشستوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ۱۸۷۶ء میں بنگال کے سریندر ناتھ بینرجی نے انڈین ایسوسی ایشن قائم کر دی تھی جس کا مقصد سیاسی تھا۔ بینرجی کو انڈین سول سروس سے نکال دیا گیا تھا اور ہندو اس اقدام پر احتجاج کر رہے تھے لیکن جب سول سروس امتحانات کے لئے عمر کی حد اکیس ۲۱ سے اُنیس ۱۹ سال کر دی گئی تو یہ احتجاج نازک صورت اختیار کر گئے اس طرح سریندر ناتھ بینرجی بڑے آرام سے ایک سیاسی رہنما بن گئے۔

اِس احتجاج کے فوراً بعد ہندوستانیوں نے پریس ایکٹ اور آرمز ایکٹ کے خلاف بھی تحریک شروع کر دی۔ دونوں ایکٹ کے ذریعے ہندوستانیوں اور انگریزوں میں امتیاز قائم کیا گیا۔ اور جب البرٹ بل مجریہ ۱۸۸۳ء کا نفاذ ہوا تو انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان

نسلی امتیاز اور منافرت مزید زور پکڑ گئی ان تمام تحریکوں کی وجہ سے سیاسی بیداری کی لہر دوڑ گئی اور قومی پیمانے پر سیاسی جدوجہد کا آغاز ہو گیا۔

حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ایک ریٹائرڈ سول افسر ایلن آکٹوویں ہیوم نے سوچا کہ ان تحریکوں کا رُخ بدلنے کی کوئی تدبیر کی جائے اور ہندو جو خفیہ سازشیں مذہب کی آڑ لے کر کر رہے ہیں اُنہیں ختم کر دیا جائے نیز ہندوستانی کے لوگ آئینی طریقوں پر کام کریں۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر حالات پر فوراً قابو نہ پایا گیا تو بغاوت کا اندیشہ ہے انہوں نے ایک سکیم مرتب کی جس میں کچھ ممتاز ہندوستانی بھی شامل تھے۔ مسٹر ہیوم شملہ گئے اور وائسرائے سے مشورہ کیا تاہم لارڈ ڈفرن نے سکیم سے اتفاق نہ کیا چنانچہ ہیوم نے وائسرائے سے مل کر ایک اور سکیم تیار کی۔ دونوں سکیمیں ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کے سامنے پیش کی گئیں۔ ان رہنماؤں نے بھی لارڈ ڈفرن کی سکیم کو پسند کیا۔ لیکن اُس وقت تک ان رہنماؤں کو یہ قطعاً علم نہ تھا کہ جس سکیم سے وہ متفق ہوئے ہیں، وہ وائسرائے کی سکیم تھی۔ اس سلسلے میں ہیوم اور ڈفرن کے درمیان پہلے ہی معاہدہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ ہیوم نے انگلستان کا رُخ کیا یہاں لارڈ رپن، لارڈ ڈلہوزی، سر جیمز کیرڈ، جان برائٹ، مسٹر ریڈ اور مسٹر سلیگ کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا۔ انہوں نے وہاں ایک انڈین پارلیمانی کمیٹی بھی قائم کی۔

اس طرح انگریز کی سرپرستی میں اور ہندو رہنماؤں کی اکثریت کی مرضی سے انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی میں منعقد ہوا۔ کانگریس کے قیام کے بعد پہلے اجلاس میں شرکت کرنے والے ۷۰ نمائندوں میں سے صرف دو مسلمان۔ آر ایم سیانی اور اے ایم دھرمسی تھے۔ اس موقعہ پر "ٹائمز" لندن نے واضح طور پر لکھا۔

"کانگرس میں صرف دو مسلمان۔ نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

پہلے اجلاس میں کانگرس نے اپنے غیر واضح اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے "ہمارے محبوب لارڈ رپن" کے الفاظ استعمال کئے۔ سر سید احمد خان پر انگریزوں کی خوشامد کا جو الزام عائد کیا جا رہا تھا۔ کانگرس نے وہ الزام خود ہی اپنے سر لے لیا۔

اب کانگرس قدم قدم پر لارڈ ہیوم اور ان کے انگریز ساتھیوں کے مشوروں پر عمل کر رہی تھی۔ [illegible] ایک بڑی وجہ انگریز سے اپنی وفاداری ثابت کر کے مسلمانوں کے خلاف متحدہ محاذ

قائم کرنا تھی جس میں بعدازاں ہندو کامیاب بھی ہؤا۔ کانگرس کے پہلے اجلاس کی صدارت ڈبلیو سی بینرجی نے کی۔

ردِ عمل

کچھ مسلمان رہنماؤں نے کانگرس میں شمولیت اختیار کر لی۔ لیکن اکثر اس سے دُور دُور رہے۔ وجہ صرف یہ تھی۔ کہ ہندو اکثریت کی حامل کانگرس مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ نہ کر سکتی تھی۔ ماضی میں کانگرس نے جس تنگدلانہ رویّہ کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے پیشِ نظر یہ بات واضح ہو چکی تھی۔ انہی وجوہات کی بنا پر سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو کانگرس سے الگ تھلگ رہنے کی تلقین کی۔ سر سید احمد خاں نے کانگرس کی اس تجویز کی بھی مخالفت کی کہ وائسرائے کی کانفرنس میں انتخاب کے ذریعے نمائندے لئے جائیں۔ سر سیّد اس خطرے سے بہت پہلے باخبر ہو گئے تھے کہ اگر ہندوستان میں مغربی طرز پر جمہوریت قائم کی گئی تو کونسل میں مسلمانوں کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ کیونکہ ہندوؤں کے مقابلے میں اُن کی تعداد ایک چوتھائی تھی۔ ہؤا بھی یہی، انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۹۲ء نافذ ہؤا اور لیجسلیٹو کونسل کے لئے نصف اراکین بذریعہ انتخاب اور نصف بذریعہ نامزدگی شامل کئے گئے۔ کونسل کے لئے ایک بھی مسلمان منتخب نہ کیا گیا۔ کانگرس خود اس ایکٹ سے ناخوش تھی۔ چنانچہ کانگرس نے خود بھی آئینی تحریک کا ارادہ ترک کر دیا۔ اسی دوران کچھ ہندوؤں نے انقلابی پالیسی اختیار کی اور ہندوستان میں قومی تحریک کے نام پر "ہندو راج" کے خواب دیکھنے لگے۔ قدرتی طور پر مسلمان عوام اور رہنماؤں کے دل میں ہندوؤں کے خلاف شبہات جنم لینے لگے۔ ان شبہات کو اس وقت مزید تقویت پہنچی جب ۱۹۰۵ء میں ہندوؤں نے تقسیم بنگال کے خلاف آواز بلند کی۔ تقسیم بنگال، صوبہ کے انتظام و انصرام میں آسانیاں پیدا کرنے اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کو اقتصادی اور دیگر سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے لارڈ کرزن نے کی تھی۔ اس تقسیم کے خلاف ہندوؤں نے زبردست تحریک چلائی۔ آخر کار ۱۹۱۱ء میں حکومت کو بنگال کی تقسیم منسوخ کرنا پڑی۔

کانگرس کا یہ مطالبہ کہ چپڑاسیوں، کلرکوں اور اس قسم کی دوسری سرکاری ملازمتوں کو مقابلے کے امتحانات کے ذریعے پُر کیا جائے۔ مسلمان کیونکہ مغربی تعلیم سے بے بہرہ اور ہندو کے مقابلے میں بہت پیچھے تھے۔ لہٰذا یقینی طور پر اس طریق کار سے ان کے مفادات کو شدید دھچکا لگنے کا

احتمال تھا۔ جہاں تک لیجسلیٹو کونسلوں میں نمائندگی کا سوال تھا۔ تو مسلمان اہلیت املاک کی بنیاد پر ووٹ دینے کا حق اپنی غربت کے باعث استعمال نہ کر سکتا تھا۔ اور اگر میونسپلٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، ایوان ہائے تجارت اور یونیورسٹیوں کے اراکین کے ذریعہ ووٹ کا حق دیا جاتا۔ اس صورت میں بھی مسلمان، کونسل میں نشست حاصل نہ کر سکتے۔ کیونکہ ان اداروں پر بھی ہندو چھائے ہوئے تھے۔ یہی وجوہات تھیں کہ سر سید احمد خان، نواب عبداللطیف اور سید امیر علی نے مسلمانوں کو کانگرس سے الگ تھلگ رہنے کی تاکید کی اور ان سے اپنے الگ سماجی۔ ثقافتی اور سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیۓ اپیل کی۔

"نیشنل" کا فریب کیوں؟

۱۸۸۸ء میں جسٹس بدرالدین طیب جی (جو کانگرسی تھے) اور کانگرس کے بانی لارڈ ہیوم نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح سر سید احمد خاں کو کانگرس میں شامل کرلیں۔ لیکن سر سید نے بدرالدین طیب جی سے پوچھا

"مجھے یہ تو بتائیے۔ کہ لفظ نیشنل کانگرس سے آپ کی مراد کیا ہے۔ کیا نیشنل کا لفظ استعمال کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ کہ ہندوستان میں رہنے والے مختلف نسلوں اور فرقوں کے لوگ ایک ہی قوم ہیں۔ یا وہ ایک قوم ہو سکتے ہیں یا ان کی امنگیں اور ان کے مقاصد ایک ہیں؟ میرے خیال میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اگر یہ ناممکن ہے تو نیشنل کانگرس قسم کی کوئی چیز بھی میری سمجھ سے باہر ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے تمام عوام کو یکساں فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ کیا آپ صرف نیشنل کانگرس کے الفاظ ہی سے یہ سمجھتے ہیں۔ کہ پورے ہندوستان کو صرف اس نام اور اس نام کے چکر سے فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ میں ایمانداری سے سمجھتا ہوں۔ کہ یہ بات نہ صرف مسلمانوں کے لیۓ مہلک ہے بلکہ مستقبل میں ہندوستان کے لیۓ بھی بے سود ہے۔ میں ہر اس کانگرس سے خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو اور جو ہندوستان کے عوام کو ایک قوم تصور کرتی ہو، متفق نہیں ہو سکتا۔"

۱۸۸۶ء میں سر سید احمد خان محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کر چکے تھے اس کے قیام کا مقصد قطعی طور پر غیر سیاسی تھا۔ لیکن جب دسمبر ۱۸۸۷ء میں مدراس میں کانگرس کا تیسرا اجلاس جسٹس بدرالدین طیب جی کی صدارت میں منعقد ہوا تو سر سید احمد خان بھی کھل کر کانگرس

یس کے مقابلے میں آگئے۔ اس موقع پر برطانیہ کے پریس نے بھی واضح طور پر یہ بات کی
ب تک کانگرس کو مسلمانوں کی تائید وحمایت باقاعدہ حاصل نہ ہوگی اسے ایک قومی تحریک
سمجھا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ کانگرس نے مسلمانوں کی حمایت کا ثبوت فراہم کرنے کے
بدرالدین طیب جی کو تیسرے اجلاس کی صدارت کے لئے منتخب کرلیا۔ حالانکہ اس وقت تک
رس کے ساتھ جو مسلمان تھے اُنہیں انگلیوں پہ گنا جا سکتا ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ طیب جی
جہ سے اس اجلاس میں بکثرت مسلمان مندوبین شریک ہوگئے۔ اس موقع پر سرسید احمد خان بے حد
یشان ہوئے۔ کیونکہ کانگرس کو اپنے اس دعویٰ کا ثبوت فراہم کرنے میں کامیابی ہوتی جارہی تھی
انگرس قومی سطح کی جماعت تھی۔ چنانچہ فوراً بعد ہی انہوں نے ملک بھر کا دورہ شروع کردیا
جا بجا جلسے منعقد کرکے مسلمانوں کو خبردار کیا کہ اگر انہوں نے کانگرس کا ساتھ دینا شروع کردیا
نگین نتائج برآمد ہوں گے۔

۱۸۸۸ء میں سرسید احمد خان نے ایم۔ اے۔ او کالج کے پرنسپل تھیوڈور بیک کی اعانت
یونائیٹڈ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس کی رکنیت بلا امتیاز مذہب سب کے لئے
تھی۔ اس تنظیم میں مسلمان نواب، ہندو راجے، کچھ انگریز اور دیگر معززین شامل ہوگئے۔ کانگرس
مقابلے میں سرسید کی یہ بڑی کامیابی تھی۔

علی گڑھ گزٹ مؤرخہ ۲۸ راگست ۱۸۸۸ء میں اس ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد
ع کئے گئے۔ ان کے مطابق اہم ترین مقصد یہ تھا کہ کانگرس کے اس پراپیگنڈے کا مؤثر
ب دیا جائے جو وہ ملک کے اندر اور بیرونِ ملک یہ ثابت کرنے کے لئے کر رہی تھی کہ ہندوستان
م اقوام، ہندوستانی کی تمام اقوام، ہندوستانی سربراہان قبائل اور ریاستوں کے فرمانروا
رس کے ساتھ تھے۔ دُوسرا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں امن وامان قائم رکھا جائے۔ جس میں
گرس اپنے مقاصد کی خاطر خلل ڈالتی رہتی ہے۔

اس ایسوسی ایشن نے انگلستان اور ہندوستان میں بہت سے مضامین چھاپ کر تقسیم کئے۔
دسمبر ۱۸۹۳ء میں انہوں نے ایک اور تنظیم اینگلو اورینٹیل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف
انڈیا قائم کی اور واضح طور پر کہا۔ کہ وقت کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں پر مشتمل ایک
ہ تنظیم کا قیام عمل میں لایا جائے۔ بمبئی اور اعظم گڑھ کے فسادات، کانگرس کے احتجاجات
ثال ہیں۔ لہذا مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ وہ اپنے سیاسی مقاصد کے تحفظ کے لئے

علیحدہ تنظیم قائم کریں۔ مسلمانوں کو سیاسی احتجاج سے دُور رکھنا بھی اس تنظیم کے مقاصد میں تھا۔ ہندوؤں کے تعصب اور نامناسب رویہ کے باوجود سرسید احمد خان نے اس وقت بھی مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ گائے ذبح نہ کریں۔ کیونکہ اس طرح ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچ سکتی ہے۔

کانگرس سے مسلمانوں کی علیحدگی

۱۸۸۹ء میں کانگرس میں موجود مسلمانوں کے مطالبہ کے باعث کشمکش کا آغاز ہو گیا اور سرسید نے کئی سال پہلے جو پیشگوئی کی تھی کہ "ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں اور یہ دونوں ایک پرچم تلے اور ایک پلیٹ فارم پر کبھی یکجا نہیں ہو سکتیں"، پوری ہوئی۔ کانگرس میں موجود مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ مرکزی اور صوبائی کونسلوں میں جو نمائندے بھیجے جائیں ان کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں یکساں ہونا ضروری ہے لیکن کانگرس نے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سے مسلمان کانگرس سے الگ ہو گئے۔ وہ مسلمان جو سرسید احمد خان کے رویہ کو غیر مذہبی سمجھتے تھے۔ اب محسوس کرنے لگے کہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا، درست تھا۔ چنانچہ اس موقع پر حکومت کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرنا بھی بہت ضروری تھا۔ سرسید احمد خان نے ۷۰ شہروں کے قریباً ۴۰ ہزار مسلمانوں کے دستخطوں کے ساتھ حکومت کو ایک یادداشت روانہ کی۔ جو برطانیہ کے ایوان عام میں پہنچائی گئی۔ اسی قسم کی ایک یادداشت کلکتہ کی محمڈن لٹریری سوسائٹی نے بھی روانہ کی۔

۱۸۹۲ء میں انڈین کونسل ایکٹ آ گیا۔ جو ۱۸۶۱ء کے ایکٹ کی ترمیم شدہ صورت میں تھا۔ مگر مسلمان اس ایکٹ سے مطمئن نہ تھے۔ (دیکھئے باب ۱۱) ہندو کونسل کی نشستوں پر قبضہ کرنے کے لئے بیتاب نظر آتا تھا۔ لیکن مسلمان یہ محسوس کر رہا تھا کہ ہندو، جو تعلیمی اور اقتصادی معاملات میں اس سے بہت آگے نکل چکا ہے، اب اس کے لئے مزید پریشانیوں کے اسباب پیدا کرے گا۔ اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان کے درمیان خاصی کشیدگی پیدا ہو گئی۔ ہندوؤں نے اپنے نوجوانوں کو منظم اور مسلح کرنے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ تلک نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ اگر مسلمانوں کو کونسلوں میں مناسب نمائندگی نہ ملتی تو ان کا جینا دشوار ہو جاتا۔ ۱۸۹۶ء میں سرسید احمد خان کے صاحبزادے سید محمود نے ایک سکیم پیش کی جس میں یہ بات واضح کی گئی تھی۔ کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہے جس کی روایات، مذہب اور مفادات ہندو سے بالکل مختلف ہیں۔ لہٰذا لوکل باڈیوں اور مرکزی و صوبائی کونسلوں میں ان کے لئے جداگانہ انتخابات کے ذریعہ علیحدہ

نشستیں ہونا ضروری ہیں۔ سکیم میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر کانگرس مسلمانوں کے اس مطالبے سے متفق ہو جائے تو مسلمان اس کے ساتھ تعاون پہ آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بات واضح تھی کہ کانگرس کسی صورت بھی اس سکیم کو قبول نہ کرے گی اور قدرتی طور پہ مسلمانوں میں مسلم قومیت کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔

سرسید نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا۔ کہ مسلمان اپنے ملک میں دو بدترین دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ ایک ہندو اور دوسرا انگریز! انہوں نے محسوس کیا کہ اس موقع پر ہندو کے تعصب اور مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی کوششوں کے خلاف محاذ قائم کرنا۔ انگریز کے ساتھ ٹکر لینے کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کو حکومت کے خلاف احتجاج سے روسے رکھا اور انگریزوں کے ساتھ مناسب حد تک دوستانہ رویہ اختیار کیا۔ شاید اسی وجہ سے کانگرس نے ان پہ انگریز کی چاپلوسی کا الزام عائد کیا۔ حالانکہ جو شخص انتہائی نازک دور میں رسالہ "اسباب بغاوتِ ہند" لکھ کر انگریز کی دشمنی مول لے سکتا تھا، اسے چاپلوس کیسے کہا جا سکتا تھا؟

کانگرس کے حامی وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن بھی اب حالات کی نزاکت کو محسوس کر رہے تھے اور انہیں اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ ہندو اور مسلمان کا ساتھ ناممکن ہے۔ جس کانگرس کو انہوں نے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا وہ ہندوستان کے ہندوؤں کی محبت کا مرکز تو بن سکتی تھی اور ان کی قیادت بھی سنبھال سکتی تھی لیکن وہ کسی طور بھی مسلمانوں کی نمائندگی کے قابل نہ تھی کیونکہ مسلمان اور ہندو کے درمیان بنیادی طور پر اتنے اختلافات تھے۔ کہ مسلمانوں کا کانگرس سے مطمئن ہونا ناممکن تھا۔ ڈفرن کے ساتھی اور کانگرس کے باوا آدم لارڈ ہیوم کا نظریہ بھی کافی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ لارڈ ہیوم نے جسٹس طیب جی کے نام ۲۲ر جنوری ۱۸۸۸ء کو ایک ذاتی خط میں لکھا۔

"لارڈ ڈفرن اب ہمارے خلاف ہو چکے ہیں۔ شاید وہ مسلمانوں کی قوت سے خائف بھی ہیں۔ ہماری حیثیت ان کے نزدیک ایک ایسی جماعت کی طرح ہے۔ کہ جب ہماری کوئی بات انہیں پسند آجائے۔ تو وہ قبول کر لیتے ہیں اور ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن جب ہماری بات انہیں پسند نہ آئے تو وہ اُسے آسانی سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جہاں تک سرسید کا تعلق ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کہ ان کی شخصیت میں نمایاں انقلاب کیسے آ گیا۔ مسلمان بھی ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اور وہ انگریز افسروں میں بھی مقبول ہیں۔"

دلچسپ بات یہ ہے۔ کہ لارڈ ہیوم ایک کانگرسی سے یہ سوال کر رہا تھا کہ۔ سرسید کی شخصیت بدل

کیوں گئی ؟ لارڈ ہیوم نے کتنی آسانی کے ساتھ حالات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ قدم قدم پہ محسوس کر رہے تھے، کہ کانگرس مسلمان پہ غلبہ حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتی اور ایک قومیت کی آڑ میں اُس نے مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی قدیم روایات سے محروم کرنے کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ایک سرسید ہی کیا، لارڈ ہیوم نے ان مسلمانوں کی طرف سے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ جو سرسید کے مخالف تھے۔ اور کانگرس میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن بہت جلد کانگرس کے ناپاک عزائم کے پیش نظر انہوں نے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

باب ۱۱

مسلم لیگ کا قیام

۱۸۶۷ء میں بنارس سے جو اردو ہندی تنازعہ شروع ہوا تھا، رفتہ رفتہ پورے ملک میں پھیل گیا لیکن ہندوؤں کی طرف سے یہ تخریبی اور متعصبانہ اقدام مسلمانوں کے لئے اس اعتبار سے بہت سود مند ثابت ہوا کہ انہیں جلد ہی ہندوؤں کی ذہنیت اور ان کے پس پردہ عزائم کو پڑھنے اور جانچنے کا موقع مل گیا۔ نیز اس تنازعہ نے مسلمانوں میں بیداری کی جو لہر پیدا کی اس کی وجہ سے مسلمانوں میں کانگریس کے پھیلاؤ کو روکنے میں بڑی مدد ملی۔ کانگریس اس وقت ملک کی واحد سیاسی تنظیم تھی اسی لئے مسلمان اس کے پرچم تلے اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔ جب کانگریس قائم ہوئی تو صرف دو مسلمان اس میں شامل تھے چار سال کے اندر اندر کانگریس میں مسلمان مندوبین کی تعداد ۲۲۱ ہو گئی تھی اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ۱۸۸۸ء میں معدودے چند مسلمان مندوبین کے مقابلے میں ہندو مندوبین کی تعداد ۹۶۵ تھی۔

قدرتی طور پر مسلمانوں نے اس تنازعہ سے سبق حاصل کیا اور اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کرنے کی جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

۱۸۹۵ء میں شمال مغربی صوبوں کا لیفٹیننٹ گورنر سر انتھونی میکڈانل مقرر ہوا۔ وہ ہندوؤں کے حق میں تھا چنانچہ اردو کے خلاف ہندوؤں کی مہم اور ناگری رسم الخط میں ہندی کی ترویج کا مطالبہ تیز تر ہو گیا۔ لیکن حالات ایسے تھے کہ گورنر فوری طور پر ہندوؤں کا یہ مطالبہ

تسلیم نہ کرسکا، تاہم ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو گورنر نے ایک قرارداد کی اشاعت کے ذریعہ اعلان کیا کہ بعض سرکاری اغراض کے لئے سرکاری دفاتر میں ہندی، ناگری رسم الخط میں استعمال ہوگی۔ مزید کہا گیا کہ شمال مغربی صوبوں میں ہندی کو عدالتی زبان کا درجہ دیا جائے گا اور آئندہ صرف ایسے لوگوں کی تقرری کی جائے گی (ان سرکاری دفتروں میں انگلش کے ساتھ جہاں قطعی طور پر انگریزی استعمال ہوتی ہو) جو بیک وقت اردو اور ہندی جانتے ہوں۔ ہندوؤں نے اس قرارداد کا خیر مقدم کیا لیکن اس کے برعکس مسلمانوں میں بے چینی کی زبردست لہر دوڑ گئی کیونکہ انہیں سرکاری ملازمتوں کے سلسلہ میں اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا۔ اردو ۱۸۳۷ء سے سرکاری زبان چلی آرہی تھی۔ اس کے بدل جانے کا واضح مطلب یہ تھا کہ مسلمان تمام سرکاری ملازمتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ مسلمان اخباروں نے بھی حکومت کے اس اقدام پر زبردست احتجاج کیا۔ ملک کے کونے کونے میں احتجاجی جلسے منعقد کئے گئے آخر اگست ۱۹۰۰ء میں علی گڑھ کے رہنماؤں نے لکھنؤ میں ایک اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی۔ علی گڑھ کالج کے سکریٹری نواب محسن الملک اس انجمن کے صدر اور بیرسٹر حمید علی خاں سکریٹری چنے گئے۔ انجمن نے ہندی کی ترویج کے خلاف فوری طور پر زبردست مہم چلانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۸۹۸ء میں سرسید وفات پا چکے تھے۔ اور اب علی گڑھ کی تمام ذمہ داریاں نواب محسن الملک پر آپڑی تھیں۔ نواب محسن الملک نے ۱۳ مئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کا ایک وفد گورنر سے ملے اور اسے اردو کے بارے میں مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرے۔ اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ ہندوؤں کی مخالفت سے بہرصورت احتراز کیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا ایک وفد گورنر مکڈانل کے پاس پہنچا لیکن گورنر مسلمانوں کی اس جرأت پر چراغ پا ہوگیا۔ وہ اپنی بات کو حرفِ آخر سمجھتا تھا۔ اس نے مسلمان وفد کے ساتھ جو سلوک کیا، اس میں مسلمانوں سے مخاصمت کا انداز نمایاں تھا۔ کچھ دنوں بعد گورنر خود علی گڑھ کالج پہنچا اور اس نے کالج کے سرپرستوں کا اجلاس طلب کیا۔ گورنر نے واضح طور پر یہ کہہ دیا کہ اگر نواب محسن الملک علی گڑھ کالج کے سکریٹری اور اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کے صدر رہے تو حکومت، کالج کی مالی امداد بند کرنے پر مجبور ہو جائے گی گورنر نے اپنی پست ذہنیت کا مزید مظاہرہ یوں کیا کہ ایسے دولت مند مسلمانوں کو جو کالج کے لئے امداد فراہم کرتے تھے، یا کرسکتے تھے، انتباہ کیا کہ اگر انہوں نے کالج کی مالی امداد کرنے کی کوشش کی تو حکومت کسی نہ کسی انداز میں ان کے خلاف کارروائی کرے گی۔ بہرحال کالج کی اہمیت کے شدید احساس

کے بوجھ تلے آکر نواب محسن الملک نے کالج کے عہدے سے استعفا دے دیا۔

مسلمان اخباروں اور مسلمان انجمنوں نے نہایت جرأت سے کام لیتے ہوئے گورنر مکڈانل کے خلاف لکھا اور قراردادیں منظور کیں۔ساتھ ہی نواب محسن الملک کو استعفا واپس لینے پر مجبور کر دیا۔

اس موقع پر مسلمان رہنماؤں نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ ان کی ایک الگ تنظیم کا قیام بہت ضروری تھا۔ مہدی حسن اور نواب وقارالملک کی اس تجویز کی مخالفت نواب محسن الملک نے کی کیونکہ وہ سرسید کی ہدایات کے مطابق مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے لیکن یہ بات بھی پیش نظر تھی کہ اگر مسلمانوں نے الگ سیاسی تنظیم قائم نہ کی تو وہ کانگریس کا رخ کریں گے وقتی طور پر اس تنظیم کے قیام کا فیصلہ بدل دیا گیا لیکن جلد ہی لکھنؤ میں ایک اجلاس طلب کر لیا گیا۔

مکڈانل کی فرعونیت سے ۱۹۰۱ء میں مسلمانوں کو نجات مل گئی۔ اور سر جیمز لاٹوش نئے گورنر مقرر ہوئے۔ نئے گورنر نے محتاط پالیسی اختیار کی اور مسلمانوں کے مطالبات پر ہمدردانہ غور کا وعدہ کیا۔

پہلا قدم

لکھنؤ کا اجلاس ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کی طرف پہلا قدم تھا۔ یہ اجلاس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام اکتوبر ۱۹۰۱ء میں منعقد ہوا اور اس نے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے قیام کے سلسلے میں نواب وقارالملک کی سکیم کو منظور کر لیا۔ نواب وقارالملک سے درخواست کی گئی کہ وہ ملک کے کونے کونے میں اس جماعت کی شاخیں قائم کریں مگر کچھ عرصے بعد ہی موصوف حج کے لئے چلے گئے۔ اور نئی سیاسی تنظیم کا کام رک گیا۔

لکھنؤ کے اجلاس میں جو مقاصد پیش کئے گئے وہ یہ تھے۔

۱۔ مسلمانوں کا نقطہ نظر حکومت تک پہنچایا جائے۔

۲۔ مسلمانوں کو اپنے حالات بہتر بنانے کے لئے بیدار کیا جائے۔

۳۔ مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت سے روکا جائے۔

۴۔ کانگریس کے اس مطالبے کی مخالفت کی جائے کہ ملک میں جمہوری ادارے قائم ہوں اور انڈین سول سروس کے مقابلے کے امتحانات بیک وقت انگلستان اور ہندوستان میں ہوں۔

تقسیم بنگال

برطانوی حکومت کے تحت بنگال کو ایک بہت بڑی انتظامی وحدت کی حیثیت حاصل تھی جب بنگال میں انگریزوں کی حکومت مستحکم ہو گئی تو یہ محسوس کیا گیا کہ انتظامی آسانیوں کی خاطر بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ۱۸۷۴ء میں آسام کا انتظام و انصرام علیحدہ کر دیا گیا۔ ۱۸۹۲ء کی اصلاحات کے بعد حکومت نے چٹاگانگ کو بھی علیحدہ کر کے آسام کے صوبے میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی۔ لیکن بعدازاں اسے ملتوی کر دیا گیا۔ لارڈ کرزن نے انتظامی ضروریات کے تحت اس سوال کو دوبارہ اٹھایا اور بنگال کو دو حصوں یعنی مسلم بنگال اور ہندو بنگال میں تقسیم کرنے کا ارادہ کیا۔ بنگال کے شمالی حصے میں مسلمانوں اور مغربی حصے میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ابتداء میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس سکیم کی مخالفت کی لیکن جلد ہی مسلمان رہنماؤں نے اپنے عوام پر تقسیم کی اہمیت واضح کی۔ لارڈ کرزن نے بھی فروری ۱۹۰۴ء میں بنگال کے مختلف صوبوں کا دورہ کیا اور عوام کو سکیم کے بارے میں آگاہ کیا۔ لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کو قانونی صورت دینے کے لئے امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ذریعہ قانون منظور کرایا۔ اس قانون کے نفاذ کے کچھ عرصہ بعد اکتوبر ۱۹۰۵ء میں فلر کو نئے صوبے کا گورنر مقرر کیا گیا آئندہ ماہ اس نے لارڈ منٹو کو بطور گورنر جنرل چارج دے دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بنگال کی تقسیم لارڈ کرزن کی اختراع نہ تھی۔ یہ تقسیم ۱۸۵۴ء میں لارڈ ڈلہوزی کے ذہن میں انتظامی دشواریوں کے تحت آئی۔ ۱۸۷۲ء میں بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر جارج کیمپبل نے بھی بنگال کی اسی نوعیت کی تقسیم کی کوشش کی تھی جو ۱۹۰۵ء میں کرزن کی طرف سے عملاً کی گئی۔ اوّل الذکر کی سفارش ہی پر ۱۸۷۴ء میں آسام کو بنگال سے علیحدہ کر کے ایک چیف کمشنر کے ماتحت کر دیا گیا۔ اس کے باوجود بنگال کا رقبہ ایک لاکھ ۸۹ ہزار میل اور آبادی قریباً پونے آٹھ کروڑ تھی۔ مواصلات کا انتظام نہایت ناقص تھا لہٰذا تمام علاقوں پر حکومت کی نگرانی اور گرفت ناممکن تھی۔ انہی وجوہات کی بنا پر بنگالی کسانوں کی حالت بھی قابلِ رحم تھی تعلیم کی ترویج اور جرائم کے خاتمے میں بہت سی مشکلات پیش آ رہی تھیں اڑیسہ کے صوبوں، بنگال، آسام اور صوبہ ہائے متوسط کے درمیان تھا مقامی لوگ اس صورتِ حال سے پریشان تھے اور درحقیقت انہی لوگوں کی درخواستوں پر بنگال کی تقسیم کا معاملہ لارڈ کرزن کے سامنے آیا۔

دراصل ہندوؤں کو خطرہ یہ تھا کہ مسلمان اکثریت والے علاقوں کا ”مسلم بنگال“ مسلمانوں

کا مرکز نہ بن جائے۔ مسلمان یہ چاہتے تھے کہ تقسیم تو بے شک ہو لیکن آسام کے نو تشکیل صوبے کے لئے اگر ایک ایسی ہی کونسل قائم کر دی جائے جیسی بنگال میں قائم تھی اور اسی طرح علیحدہ بورڈ آف ریونیو بنا دیا جائے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اسی سال کرزن نے بہت سے اضلاع کا دورہ کیا تا کہ تقسیم کے بارے میں عوام کی رائے معلوم کر سکیں۔ لہٰذا واپسی پر انہوں نے عوام کی آراء کی روشنی میں سکیم میں کچھ ترمیم کی اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو بنگال تقسیم کر دیا گیا۔

تقسیم بنگال کے خلاف احتجاج کا سلسلہ کلکتے سے شروع ہوا۔ کلکتہ بار ایسوسی ایشن جس کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی، نے محسوس کیا کہ تقسیم بنگال کے بعد قدرتی طور پر ایک علیحدہ ہائی کورٹ بھی قائم کی جائے گی تا کہ نئے صوبے کی آبادی کے لئے آسانیاں فراہم کی جا سکیں چنانچہ اس صورت میں انہیں اقتصادی اور سیاسی طور پر نقصان اٹھانا پڑے گا۔

جلد ہی احتجاجی سلسلہ فرقہ وارانہ تحریکوں اور غنڈہ گردی میں تبدیل ہو گیا۔ دراصل ہندو کو سب سے بڑی تکلیف یہ تھی کہ مسلمان کو اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک گوشۂ عافیت کیوں نصیب ہوا؟ ہندوؤں نے تقسیم کو دھرتی ماتا کے قتل سے تعبیر کیا اور کالی ماتا رزمین کی دیوی کی زبردست توہین قرار دیا۔ بندے ماترم کا ترانہ ابھرا جو بنکم چندر چیٹر جی کے ناول آنند مٹ سے لیا گیا تھا اس ناول کا مرکزی خیال ۱۸۵۷ء میں سنیاسیوں کی مسلمان حکومت کے خلاف بغاوت پر مبنی تھا۔ ہندوؤں کی طرف سے ان اشتعال انگیز کارروائیوں کے باعث جگہ جگہ ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ کانگرس نے پورے ہندوستان میں تقسیم کے خلاف احتجاجی مظاہرے شروع کر دیئے۔ ہندوؤں نے انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا، سودیشی تحریک چلائی اور مسلمانوں پر مسلح حملے شروع کر دیئے۔ اس موقع پر برہمو سماج، پرارتھنا سماج، آریہ سماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی، سنگھٹن۔ غرضیکہ تمام ہندو تنظیمیں کھل کر مسلمانوں کے خلاف ہو گئیں۔ ان تنظیموں نے فراخ دلی اور دوستی کا جو نقاب پہن رکھا تھا، وہ تقسیم بنگال کے موقع پر خود ہی اتر گیا۔ مسلمانوں کو تنگ کرنے کے لئے ہندوؤں نے مسجدوں کے سامنے سنکھ اور باجے بجانے شروع کر دیئے۔

شملہ وفد

۱۹۰۵ء میں کرزن کی جگہ منٹو ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں بعد برطانیہ میں لبرل وزارت قائم ہوگئی اور جان مورلے کو سکریٹری آف سٹیٹ برائے امورِ ہند مقرر کیا گیا ہندوؤں نے ہوا کا رُخ اپنے حق میں دیکھا تو تنسیخ تقسیم بنگال کے لئے اپنی کوششیں تیز تر کردیں۔ دراصل مورلے خود بھی اس تقسیم کے خلاف تھے۔ چنانچہ نواب محسن الملک نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو متحد کرکے اُن کے حقوق کی حفاظت میں اقدامات کئے جائیں اور ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے سے ملاقات کرے۔ ستمبر ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا ایک خاص اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا جس میں وائسرائے کو پیش کی جانے والی یادداشت پر بحث کے بعد آغا خاں کی قیادت میں یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ہندوستانی مسلمانوں کا ایک وفد شملے پہنچ گیا۔ اس وفد میں ہندوستان کے ۳۵ مسلمان رہنما شامل تھے آغا خاں نے مسلمانوں کی طرف سے یادداشت پڑھی جس کا اقتباس یہ ہے:

۱۔ سیاسی اداروں کے لئے انتخاب کا طریقہ ایسا ہو جس کے ذریعے مسلمان مخصوص حلقوں سے اپنے نمائندے منتخب کرسکیں۔
۲۔ مسلمانوں کی تاریخی اہمیت، ان کی روایات اور سیاسی حیثیت کے اعتبار سے زیادہ نشستیں دی جائیں نیز ان کی آبادی کے تناسب کو پیشِ نظر رکھا جائے۔
۳۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے تناسب کا تعین کیا جائے نیز ایگزکٹو کونسل کے اراکین ہائی کورٹ کے ججوں اور چیف کورٹ کے ججوں کے عہدوں پر مسلمانوں کا تقرر کیا جائے۔
۴۔ یونیورسٹیوں میں بھی مسلمانوں کے لئے علیحدہ نشستیں محفوظ کی جائیں۔
۵۔ ایک مسلمان یونیورسٹی کے قیام کے لئے حکومت کی طرف سے سہولتیں فراہم کی جائیں۔
۶۔ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے اور اُن کی جداگانہ معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔ اور یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کے طریقِ کار کو تسلیم کیا جائے۔

لارڈ منٹو نے یادداشت پڑھنے کے بعد یقین دلایا کہ وہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق و مفادات کے

تحفظ کی پوری کوشش کریں گے۔ نیز حکومت اس امر کا خاص خیال رکھے گی کہ انگریز حکومت پر مسلمانوں کا اعتماد قائم رہے اور مسلمانوں کے مذہبی عقائد اور قومی روایات کا احترام قائم رہے۔

لارڈ منٹو نے مزید کہا

"میں اس بات سے بالکل متفق ہوں کہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ حیثیت کا تعین ضروری ہے میونسپل بورڈ ہو یا ڈسٹرکٹ بورڈ یا مجلس قانون۔ مسلمانوں کی علیحدہ حیثیت کا تعین بہرحال ضروری ہے"۔

لارڈ منٹو نے جو مصالحانہ انداز اختیار کیا تھا اُس کی کچھ وجوہات تھیں۔

۱۔ ہندوؤں کے بعد ہندوستان میں مسلمان ہی دُوسری بڑی اکثریت تھے اور اُن کی علیحدہ حیثیت کو زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

۲۔ مشرقی بنگال اور آسام میں نئے صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر فلر کے استعفا اور تقسیم بنگال کی تنسیخ کے حق میں مظاہروں کے بعد مسلمانوں کی طرف سے بھی احتجاجی کارروائیوں کا شدید خطرہ لاحق تھا۔

بہرحال وفد کامیاب رہا۔ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ مسلمان بلا تاخیر اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم قائم کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کریں۔

شملہ وفد (۱۹۰۶ء) میں مندرجہ ذیل رہنما شامل تھے۔

ہز ہائی نس آغا خان (قائد)، شہزادہ بختیار شاہ، کلکتہ۔ ملک عمر حیات خان ٹوانہ، شاہ پور۔ میاں محمد شاہ دین، بار ایٹ لاء، لاہور۔ سید شرف الدین بار ایٹ لاء پٹنہ۔ نواب سید نواب علی چودھری، میمن سنگھ۔ سید امیر حسن خان، کلکتہ۔ نواب ناصر حسین خان خیالؔ، کلکتہ۔ مرزا شجاعت علی بیگ، مرشد آباد۔ سید علی امام بار ایٹ لاء، پٹنہ۔ نواب سرفراز حسن خان، پٹنہ۔ احمد محی الدین، مدراس۔ مولوی رفیع الدین احمد، پونہ۔ ابراہیم بھائی آدم جی پیر بھائی، بمبئی۔ مسٹر عبدالرحیم بار ایٹ لاء، کلکتہ۔ اللہ داد شاہ، خیر پور۔ مولانا ایچ۔ ایم۔ مالک، ناگ پور۔ خلیفہ سید محمد حسین پٹیالہ۔ خواجہ یوسف شاہ، امرتسر۔ میاں محمد شفیع بار ایٹ لاء، لاہور۔ شیخ غلام صادق، امرتسر۔ حکیم محمد اجمل خان، دلی۔ مولوی احتشام علی، لکھنؤ۔ سید کرامت حسین بار ایٹ لاء، الہ آباد۔ مسٹر عبدالسلام خان، مراد آباد۔ نواب مزمل اللہ، علی گڑھ۔ حاجی محمد اسمٰعیل خان، علی گڑھ۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان، علی گڑھ۔ نواب وقار الملک۔ مولوی مشتاق حسین، امروہہ۔ مولوی

حبیب الرحمٰن خان شیروانی، علی گڑھ - سید سردار علی، بمبئی - نواب محسن الملک سید مہدی علی، علی گڑھ (سکریٹری) -

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام

وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے ملاقات کے بعد مسلمانوں کے وفد نے شملہ ہی میں مسلمانوں کی علیحدہ سیاسی تنظیم کے قیام کے معاملے پر تبادلۂ خیال شروع کر دیا۔ وہیں یہ فیصلہ کیا گیا۔ کہ قومی سطح پر مسلمان سیاسی تنظیم کا قیام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے آئندہ سالانہ اجلاس میں کر دیا جائے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا۔ کہ اس تنظیم کے اغراض و مقاصد اور نوعیت کا حتمی تعین مسلمانوں کے اس نمائندہ اجلاس میں میں کیا جائے۔ جو دسمبر کے آخری ہفتہ میں اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے اختتام پر منعقد ہونا تھا۔ دسمبر کے وسط میں ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ نے کل ہند کنفیڈریسی کے بارے میں ایک جامع لائحہ عمل پیش کیا۔ جس میں مسلمانوں کی مجوزہ سیاسی تنظیم کا نام "آل انڈیا مسلم کنفیڈریسی" تجویز کیا گیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ نام نہاد انڈین نیشنل کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو کم کیا جائے۔ چنانچہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اختتام پر ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہندوستان بھر کے مسلمان رہنماؤں کا ایک نمائندہ اجلاس منعقد ہوا۔ جس کی صدارت نواب وقار الملک نے کی۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا۔

"آج ہمارا اجتماع جس مقصد کے لئے ہوا ہے۔ وہ اجنبی نہیں۔ اس کی ضرورت تو اسی دن پیدا ہو گئی تھی۔ جس دن انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد پڑی تھی۔ ہم سرسید احمد خان مرحوم کی پالیسی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کانگرس کی روز افزوں قوت کو محسوس کرتے ہوئے نہایت بے خوفی سے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ اگر انہیں اپنی سلامتی درکار ہے۔ تو وہ کانگریس میں شریک نہ ہوں۔ آج سرسید ہمارے درمیان موجود نہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہم محسوس کر رہے ہیں کہ مرحوم کی رائے کتنی صائب تھی۔ اس رائے کی اہمیت اب نمایاں ہو رہی ہے۔ کانگرس کے رویّے کے پیش نظر ہی سرسید احمد مرحوم نے مسلمانوں کو اپنے سیاسی حقوق کے تحفظ کی جدوجہد کا سبق دیا تھا۔ مسلمان، تقسیم بنگال اور مجالس قانون ساز میں توسیع کے سرکاری ارادے کا علم ہونے کے بعد وائسرائے ہند سے ملے اور انہیں اپنے مطالبات سے آگاہ کیا۔ نیز وہ ناانصافیاں بھی بتائیں۔ جو

مدت سے مسلمانوں کے ساتھ ہو رہی ہیں۔ مسلمانوں کے وفد نے وائسرائے سے جو باتیں کیں اور جواباً انہیں وائسرائے کی طرف سے جو یقین دہانی کرائی گئی۔ وہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ وائسرائے سے ملاقات کے فوراً بعد مسلمانوں نے حالات پر غور کرنے کے لئے شملہ ہی میں باہم تبادلہ خیال کیا۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا۔ کہ دسمبر میں تمام صوبوں کے مسلمان نمائندوں کا ڈھاکہ میں ایک اجلاس منعقد کر کے مستقل حل تلاش کیا جائے۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ کہ اگر فوری طور پر تدابیر اختیار نہ کی گئیں اور اگر کسی وقت ہندوستان سے برطانوی اقتدار اٹھ جائے۔ تو ہندو بڑی آسانی کے ساتھ ہم پر غلبہ پا کر ہمیں اپنا غلام بنا لے گا۔ یہ بات ہم اپنے ہی دل سے پوچھ سکتے ہیں کہ اگر ایسا ہو گیا۔ تو ہمارا مذہب، ثقافت، معیشت، جان و مال اور آبرو کس کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ آج برطانوی حکومت کی ہندوستان پر مضبوط گرفت کے باوجود ہمیں قدم قدم پر مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تو کل جب تنگ نظر ہندو ہمیں اپنی غلامی میں لے لے گا تو ہمارا کیا انجام ہو گا؟

لہٰذا ہمارا یہ فرض اولین ہے۔ کہ ہم ایک سیاسی تنظیم قائم کریں۔ اور حتی الوسع کوشش کریں کہ اپنے دوستوں کو غلط راستوں پر چلنے سے روک دیں۔ ہم ہر ایک کے ساتھ حسن اخلاق اور حسن سلوک کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔"

نواب وقار الملک کی اس تقریر کے بعد نواب سلیم اللہ خان نے ایک قرارداد پیش کی جس کی تائید حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خان نے کی۔

قرارداد یہ تھی:

• یہ اجلاس جو ڈھاکہ میں جمع ہونے والے ہندوستان کے مختلف حصوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے، فیصلہ کرتا ہے۔ کہ ایک سیاسی تنظیم کا قیام عمل میں لایا جائے جس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ ہو اور جس کے اغراض و مقاصد یہ ہوں:

ا۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں حکومت برطانیہ کے لئے وفاداری کے جذبات کو ترقی دینا اور کسی آئندہ تجویز و تدبیر کی نسبت اگر حکومت کے ارادوں سے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا ہو، تو اسے دور کرنا۔

(ب) مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ اور مسلمانوں کی ضروریات اور امنگوں کی حکومت کے سامنے ترجمانی کرنا۔

(ج) مسلم لیگ کے ان اغراض و مقاصد کو ٹھیس پہنچائے بغیر دوسری جماعتوں کے خلاف مسلمانوں میں جذبات کی پرورش کا انسداد کرنا۔

تمام صوبوں کی نمائندگی کرنے والے مسلمانوں پر مشتمل ایک عبوری کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ جس کے جوائنٹ سیکرٹری نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مقرر کئے گئے۔ کمیٹی ساٹھ اراکین پر مشتمل تھی۔ اور اس کے قیام کا مقصد مسلم لیگ کے لئے دستور وضع کرنا تھا جس کے بعد مسلم لیگ کے ایک نمائندہ اجلاس میں اس پر غور و خوض ہونا تھا۔

مسلم لیگ کے اس جلسہ تاسیس میں یہ نمایاں لوگ شامل تھے۔

نثار احمد خان، حسین شہید سہروردی، عبدالرحمٰن صدیقی، مولانا محمد علی، سید غلام حسنین غازی عبدالعزیز، شوکت علی، سید بقاء الحسن، فضل محمد خان، شیخ عبداللہ، عبدالمجید، سید نبی اللہ، عبدالسلام رفیقی، صاحبزادہ آفتاب احمد خان، نواب محمد علی، راجہ نوشاد علی خان، نواب سر سلیم اللہ خان، اشرف الدین، نواب محسن الملک، سر رفیع الدین احمد، مولانا ظفر علی خان، خورشید نبی، عبدالکریم، انوار احمد، نجم الدین، ظہور احمد، شاہ مصطفےٰ، وزیر حسن، شمشاد احمد خان، محمد یوسف، چوہدری غلام مصطفےٰ۔ سید ظہور احمد، نواب سید نواب علی، مسٹر محمد علی جسٹس شاہ دین وغیرہ۔

دستور پر غور کرنے اور اس کی منظوری دینے کے لئے مسلم لیگ کا پہلا اجلاس کراچی میں ۲۹ اور ۳۰ دسمبر ۱۹۰۷ء کو منعقد ہوا۔ صدارت بمبئی کے سر آدم جی پیر بھائی نے کی۔ اس اجلاس نے دستور کی منظوری دے دی۔ تاہم اس موقع پر دستور کمیٹی میں کچھ مزید اراکین بھی شامل کر لئے گئے تھے اور اس کے بعد دستور کو حتمی صورت دی گئی تھی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۰۸ء کو دستور کی توثیق علی گڑھ میں کی گئی۔ یہ مسلم لیگ کا دوسرا باقاعدہ اجلاس تھا۔ جس کی صدارت مسٹر شاہ دین نے کی۔ اسی اجلاس میں ہز ہائی نس آغا خان کو مسلم لیگ کا صدر اور سید حسن بلگرامی کو سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ بہت سے اہم شہروں میں اس سال کے وسط تک مسلم لیگ کی شاخیں کھول دی گئیں۔ ایک شاخ لندن میں بھی قائم کی گئی۔ جس کے صدر سید امیر علی اور سیکرٹری سید ابن حسن تھے۔ نواب محسن الملک اکتوبر ۱۹۰۷ء میں انتقال کر گئے تھے۔ چنانچہ

ان کی جگہ علی گڑھ کالج کے اعزازی سیکریٹری کا عہدہ نواب وقار الملک نے سنبھال لیا تھا۔

یوں پہلی بار ہندوستان کے مسلمان مسلم قومیت کی بنیاد پر اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم مسلم لیگ اور اس کے ٹھوس دستور کے ساتھ میدانِ عمل میں آنکلے۔ مسلم لیگ نے برِ صغیر کے مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ ہر شعبہ زندگی میں کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کے سامنے سب سے اہم مسئلہ مسلمانوں کی باقاعدہ نمائندگی تھا۔ مسلمانوں نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو تمام کونسلوں (مقامی اور صوبائی) اور مرکز میں مسلمانوں کو نمائندگی دینے سے متعلق وائسرائے ہند کے سامنے اپنے مطالبات پیش کر دیئے تھے اور یہ مطالبہ بھی کیا تھا کہ یہ نمائندگی مسلمان ووٹوں کے ذریعہ ملنی چاہیئے۔

اب صورت یہ تھی۔ کہ مسلم لیگ جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کر رہی تھی اور کانگرس ہر قدم پر اس کی مخالفت کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھی۔ مسلمانوں کو ۱۸۸۲ء کے میونسپل اور ڈسٹرکٹ کونسل ایکٹ اور کونسل ایکٹ کے تحت مخلوط انتخابات کا تلخ تجربہ ہو ا تھا۔ اس کی ایک واضح مثال یہ تھی کہ کلکتہ کے میونسپل انتخابات میں ۸۰ نشستوں میں ایک بھی مسلمانوں کو نہ مل سکی۔ اب مسلمان یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی ثقافتی اور معاشرتی و اقتصادی حقوق کا تحفظ کیسے کیا جائے۔ اگر انہیں ہندوؤں کے ساتھ مل کر ہی زندگی گذارنا ہے۔ تو جداگانہ انتخابات ہی واحد حل ہے۔ نیز ہندو کی تنگ نظری، ناانصافی اور چیرہ دستی سے محفوظ رہنے کے لئے مسلمان اور ہندو کی نمائندگی میں توازن بھی ضروری ہے۔ کیونکہ کانگرس مسلمانوں کو اپنے مقابلے پر دیکھنا پسند نہ کرتی تھی۔ لہذا جداگانہ انتخابات کے معاملہ میں اس نے اپنی معاندانہ پالیسی برقرار رکھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کانگرس اور ہندوؤں سے مسلمانوں کی نفرت اور بیزاری فزوں تر ہو گئی۔ جب اصلاحات سے متعلق حکومت نے مسلم لیگ اور کانگرس کو مراسلے روانہ کئے تو مسلم لیگ نے اس بات سے اتفاق کیا کہ مرکزی (امپیریل) کونسل میں کچھ مدت تک سرکاری اراکین اکثریت میں رہیں گے۔ تاہم جہاں تک صوبائی کونسلوں کا تعلق تھا۔ ان کے لئے مسلمان علیحدہ حلقوں سے اپنے نمائندے منتخب کریں گے۔ نیز جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں ان کی سیاسی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دی جائیں۔ اور میونسپل ڈسٹرکٹ بورڈوں میں جداگانہ انتخاب کے اصول پر عمل کیا جائے۔

مشکل یہ تھی۔ کہ انگریز جداگانہ انتخاب کے مطالبہ کو ہندوستان کے کئی قوموں والے ملک اور مسلمان قوم کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ وہ کسی حد تک اس کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ کانگرس، جداگانہ انتخابات کے آئینے میں اپنی تنگ دلی کی شکست دیکھ رہی تھی لیکن اس کے باوجود ہندوستان بھر میں دو ایسے ہندو بھی تھے۔ جنہوں نے جداگانہ طریق انتخاب کی حمایت کھُل کر کی۔ ان میں ایک لارڈ سنہا اور دوسرے مسٹر گوکھلے تھے۔

یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو حکومت برطانیہ کی طرف سے نائب وزیر ہند نے جو اعلان کیا۔ وہ مسلمانوں کی پہلی جیت تھی۔ کہا گیا:۔

"مسلمانوں کے لئے علیحدہ انتخابی رجسٹر ہوگا۔ گو اس اصول کے تحت بظاہر لوگوں میں فرق قائم ہوگا۔ اور مذہبی بنیادوں پر وہ دو گروہوں میں منقسم ہو جائیں گے۔ مگر تاریخی روایات میں اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ معاشرتی رسم و رواج کے اختلاف کو آخر کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟"

منٹو مارلے اصلاحات

منٹو مارلے سکیم میں یہ بات تسلیم کر لی گئی تھی۔ کہ ہندوستان میں کیونکہ بہت سی نسلوں اور مذہبی جماعتوں پر مشتمل آبادی موجود ہے لہذا نمائندگی کا حق بھی اسی بنیاد پر دیا جانا چاہیئے۔ اس سکیم کے تحت جب نئے ضابطے مرتب کئے گئے۔ تو مرکزی کونسل میں مسلمانوں کو ۵ نشستیں دی گئیں۔ بمبئی، بنگال، بہار، اڑیسہ، مدراس اور صوبہ ہائے متحدہ میں جداگانہ انتخابات کے اصول پر ایک نمائندہ تسلیم کیا گیا۔ مسلمانوں کو یہ حق بھی دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو غیر مسلم حلقوں سے بھی انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں۔ گورنر جنرل کو یہ اختیار دیا گیا۔ کہ وہ پنجاب سے ایک مسلمان نمائندہ کی نامزدگی کر سکتا ہے۔ مذکورہ اصلاحات کے تحت حکومت کو اختیار تھا کہ لفٹنٹ گورنروں کے زیر انتظام صوبوں میں ایگزیکٹو کونسلیں قائم کریں۔ مدراس اور بمبئی میں تین تین کی جگہ چار چار کونسلر رکھے گئے۔ تاہم ان میں سرکاری افسروں کی تعداد دو سے زائد نہ ہو سکتی تھی۔ بہار اور اڑیسہ کے نئے صوبوں کو لیفٹیننٹ گورنروں کے زیر انتظام کر دیا گیا۔ اور ان گورنروں کی مدد کے لئے ایگزیکٹو کونسلیں قائم کر دی گئیں۔

صوبائی مجالس قانون ساز کی نشستوں میں بھی اضافہ کیا گیا۔ بڑے صوبوں کی کونسلوں

کے لئے ارکین کی زیادہ سے زیادہ تعداد پچاس مقرر کی گئی۔ چھوٹے صوبوں مثلاً پنجاب اور برما کے لئے ۳۰ نشستوں کا تعین کیا گیا۔

منٹو مورلے سکیم سے ہندوستان کے سیاسی درجہ میں تو اضافہ نہ ہوا۔ البتہ مجموعی طور پر ہندو ان اصلاحات کے لئے انگریزوں کے شکرگزار تھے۔ لیکن انہیں دکھ اس بات کا تھا کہ مسلمانوں کو خاص مراعات کیوں دی گئیں؟ مسلمانوں کو ان اصلاحات سے فائدہ نہ پہنچا۔ یہ درست ہے کہ وہ ہندوؤں کے غاصبانہ ہتھکنڈوں سے محفوظ ہو گئے۔ لیکن آبادی کے تناسب کے اعتبار سے اُن کو بہت کم نشستیں ملیں۔ اس کا اندازہ درجہ ذیل اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے۔

صوبہ	آبادی	نشستیں
صوبہ متحدہ	۱۴ فیصد	۸ فیصد
پنجاب	۵۴ فیصد	صرف ۷
بمبئی	۲۰ فیصد	۵ء۹ فیصد

بہار اور اڑیسہ کی علیحدگی کے بعد مشرقی اور مغربی بنگال جب دوبارہ متحدہ صوبہ بنا دیئے گئے۔ تو مسلمانوں کی کل آبادی ۶ء۲۵ فیصد تھی مگر نشستوں کا تناسب صرف ۶ء۱۰ فیصد تھا۔

(منٹو مارلے اصلاحات کا تفصیلی جائزہ۔ دیکھئے باب ۱۱)

باب ۱۲

تنسیخ تقسیم بنگال

ترکی کا مسئلہ

ڈھاکہ کے نواب سلیم اللہ نے مسلم لیگ کے قیام میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ڈھاکہ میں انہی کی تحریک پر اجلاس بلایا گیا اور اس سے قبل مسلم لیگ کے قیام کی تجویز پر غور کیا گیا تھا۔ نواب سلیم اللہ ہی پہلے شخص تھے جنہوں نے بنگال کی تقسیم کی تجویز پیش کی جو برطانوی حکام نے قبول کر لی تھی۔

۱۹۱۰ء میں جارج پنجم انگلستان کے تخت پر بیٹھے۔ اسی سال لارڈ منٹو کی جگہ لارڈ ہارڈنگ ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ نئے وائسرائے نے ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو دلی میں بادشاہ کی تاجپوشی کا دربار منعقد کیا اس موقع پر بہت سے اہم اعلان کئے گئے ان میں اہم ترین کلکتہ کی جگہ دلی کو دارالحکومت بنانے اور مشرقی بنگال اور آسام کے حالیہ تشکیل کردہ صوبے کو ختم کر کے بنگال کو گورنری صوبے کا درجہ دینے سے متعلق تھا۔ نواب سلیم اللہ کو ۱۹۱۱ء میں یہ فرمانِ شاہی سن کر سخت صدمہ ہوا۔ انگریز نے تنسیخ تقسیم بنگال کا زخم دھونے اور اشک شوئی کرنے کے لئے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کا تحفہ دینے کی کوشش کی۔
دارالحکومت، کلکتہ سے دلی منتقل کرنے کا مطالبہ لارڈ ولیم بینٹنک کے وقت سے

پہلا آرہا تھا۔ کیونکہ دلی شملہ سے نزدیک تھا اور شملہ حکومتِ ہند کا گرمائی دارالحکومت بھی تھا۔ علاوہ ازیں دلی میں بیٹھ کر اُس کی مرکزی حیثیت کے باعث برصغیر کا انتظام و انصرام بہتر طریق پر کیا جا سکتا تھا تقسیم بنگال کی تنسیخ کے بارے میں انگریز حکومت نے یہ جواز پیش کیا کہ درا صل تقسیم کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا گیا بلکہ بعض تجربات کے بعد انتظامات کے سلسلے میں نیا اہتمام ضروری تھا۔

حکومت نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا جواز ضرور پیش کیا لیکن وہ بلاشبہ حقائق کے برعکس تھا تقسیم بنگال کے وقت سے بنگال کے ہندوؤں میں نیم فوجی تحریک عروج پر تھی اور ہندو تحریکیں کانگریس کے اشیرباد کے ساتھ ہندو نوجوانوں کو مسلح کر کے مسلمانوں کے خلاف باقاعدہ تیاریاں کر رہی تھیں۔ دسمبر ۱۹۱۰ء میں خود شاہِ انگلستان نے لارڈ ہارڈنگ کو یہ ہدایت کی کہ وہ بنگال کے دو حصوں میں منقسم صوبے کو دوبارہ متحد کر دیں کیونکہ اس طرح بنگالی ہندوؤں میں بے اطمینانی ختم ہوگی اور بنگال میں تخریبی کارروائیاں ختم ہونے میں مدد ملے گی۔ لارڈ ہارڈنگ بذاتِ خود اس تجویز کے خلاف تھے اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ تقسیم کو منسوخ کر کے جرائم اور تخریبی کارروائیوں میں کمی کی جگہ اضافہ ہو جائے گا نیز انتظامیہ میں بھی بہت سی بدعنوانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ لیکن لارڈ ہارڈنگ، بادشاہ کے فرمان کے سامنے مجبور تھے اس موقع پر نواب سلیم اللہ نے کہا کہ تقسیم بنگال کی تنسیخ، تخریبی کارروائیوں اور جرائم کی حوصلہ افزائی کا باعث بنے گی۔ حکومت کے اس اقدام سے عوام کے ذہنوں میں یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ حکومت کو بعض عناصر کے اوچھے ہتھیاروں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

ترکی اور دیگر مسائل

یہ ایک ایسا دور تھا جس نے مسلمانوں کو دیگر بہت سے مسائل سے دوچار کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کے اضطراب میں تنسیخ تقسیم بنگال کے ساتھ ساتھ ان مسائل کا بھی نمایاں حصہ تھا۔ عالم اسلام پر مصائب اور مشکلات کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے ترکی کے شہر طرابلس (ٹریپولی) پر کسی اشتعال کے بغیر حملہ کر کے مسلمانوں میں شدید بے چینی پیدا کر دی تھی اٹلی اور ترکی کے درمیان عداوت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ طرابلس میں اکثریت مسلمانوں کی تھی جو نسلاً عرب اور ترک تھے۔ اٹلی کے وزیر خارجہ نے ۳۰ دسمبر ۱۹۱۰ء کو اپنی پارلیمان میں اس اعلان

کے باوجود کہ اٹلی طرابلس کو ترکی کا حصہ تسلیم کرتا ہے، یہ جارحانہ کارروائی کی۔ دراصل اٹلی کو یہ بات بڑی طرح کھٹک رہی تھی کہ فرانس، تیونس پر قابض کیوں ہے؟ جبکہ اٹلی، تیونس پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ فرانس نے اپنا دامن بچانے کے لئے اٹلی کو یہ سبق پڑھایا کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرلے۔ گو اس بارے میں فرانس نے کوئی باضابطہ اجازت نہ دی تھی لیکن طرابلس پر اٹلی کے حملے کے وقت فرانس کی خاموشی اور مصر کی غیر جانبداری کا اعلان فرانس کی بدنیتی کا واضح ثبوت تھا ترکوں کو مصر کے راستے طرابلس میں فوج بھیجنے سے روک دیا گیا جبکہ مصر اُس وقت تک ترکوں کا ملک تھا اور برطانیہ کو ایسے کسی اقدام کا حق نہیں پہنچتا تھا۔ غرضیکہ ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کرلیا کیونکہ سلطان ترکی عبدالحمید دوم کو عالمِ اسلام کا خلیفہ تسلیم کیا جاتا تھا لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں میں اضطراب ایک قدرتی امر تھا۔

ایک ہی سال بعد اکتوبر ۱۹۱۲ء میں بلقان کی چار ریاستوں مانٹی نیگرو، سرویا، بلغاریہ اور یونان نے پہلے سے کئے گئے ایک خفیہ معاہدے کے تحت اس بہانے ترکی پر حملہ کردیا کہ سلطنت عثمانیہ میں عیسائیوں پر ظلم ڈھایا جارہا ہے۔ ترکی کے لئے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ پہلے ہی طرابلس میں اٹلی کے ساتھ نبردآزما تھا اور بیک وقت دو محاذوں پر لڑنا اُس کے لئے دشوار تھا۔ لہٰذا ترکی نے اٹلی کے ساتھ صلح کرلی اور طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کرلیا۔ اُدھر اٹلی نے بحیرۂ ایجین کے جزائر سے اپنی فوج ہٹانے پر رضامندی ظاہر کردی مگر بعد میں اپنے وعدے سے منحرف ہوگیا۔ ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء کو لندن میں برطانیہ کی مداخلت پر مذکورہ بالا چاروں عیسائی ریاستوں کے ساتھ ترکی کا ایک معاہدہ طے پایا، اس طرح جنگ بند ہوئی اور بلقان پر ترکوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

اس موقع پر برِصغیر کے مسلمانوں نے ترکی کی مدد کے لئے ایک طبی مشن روانہ کیا۔ اس کی قیادت ڈاکٹر انصاری کررہے تھے۔ مشن کا مقصد یہ تھا کہ زخمی ترکی سپاہیوں کی ہر ممکن مدد کی جائے۔ علاوہ ازیں سلطنت عثمانیہ کی سالمیت کے لئے ہندوستانی مسلمانوں نے ایک انجمن خدامِ کعبہ کی بھی تشکیل کی۔

علی گڑھ کالج اور کانپور مسجد

مسلمانوں میں اضطراب کا ایک اور سبب یہ تھا کہ حکومت نے ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ

کو یونیورسٹی کا درجہ دینے سے انکار کر دیا تھا شروع میں حکومتِ ہند نے مسلمانوں کے سامنے یہ شرط پیش کر دی کہ پہلے وہ اس مقصد کے لئے ۳۰ لاکھ روپیہ جمع کر لیں اس کے بعد حکومت ان کے مطالبے پر غور کرے گی۔ حکومت کی توقع کے خلاف مسلمانوں نے یہ شرط منظور کر لی۔ فوری طور پر محمود آباد کے راجہ علی محمد خان، آغا خان اور مولانا شوکت علی نے چندہ جمع کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ جب حکومت نے یہ دیکھا کہ مسلمان نہایت فراخ دلی کے ساتھ چندہ دے رہے ہیں اور یہ رقم جلد ہی اکٹھی ہو جائے گی تو اس نے مزید رکاوٹیں پیدا کرنا شروع کر دیں۔ حکومت نے نئی شرط یہ پیش کی کہ اس یونیورسٹی کو خود مختار ادارے کی حیثیت حاصل نہ ہو گی، نہ ہی اس کے ساتھ علی گڑھ سے باہر کوئی تعلیمی ادارہ الحاق کر سکے گا۔ مسلمان حکومت سے اس بد دیانتی کی توقع نہ کرتے تھے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس طرح یونیورسٹی کے قیام کا بنیادی مقصد ہی فوت ہو جائے گا اور اگر بیرونی تعلیمی اداروں کا الحاق نہ ہوا تو یونیورسٹی کے قیام کا فائدہ بھی کیا؟ چنانچہ مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وائسرائے سے ملاقات کر کے اس معاملہ پر تبادلۂ خیال کیا جائے لیکن اسی اثناء میں جنگِ عالمگیر کے آغاز کی وجہ سے یہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا اور مسلمانوں کا اضطراب بدستور رہا۔

ابھی یہ مسائل سامنے تھے کہ کانپور کی مسجد کا تنازعہ شروع ہو گیا۔ جولائی ۱۹۱۳ء میں کانپور کے میونسپل حکام نے سڑک نکالنے کے لئے ایک مسجد کو شہید کر دیا۔ مسلمانوں کی مقامی آبادی نے اس اقدام پر بھرپور احتجاج کیا لیکن ان کی آواز کو دبانے کی پوری کوشش کی گئی۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ مسجد کا جو حصہ شہید کیا گیا تھا اُسے از سرِ نو تعمیر کیا جائے۔ صوبے کے گورنر نے بھی مسلمانوں کے خلاف فیصلہ دیا جس کے نتیجہ میں مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مسجد کے اُس حصے کو خود تعمیر کریں گے۔ لہٰذا جب مسلمانوں نے تعمیر کا کام شروع کیا تو پولیس نے ان پر گولی چلا دی۔ اس انسانیت سوز اقدام سے بہت سے مسلمان شہید ہو گئے اور سینکڑوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

صورت یہ تھی کہ یہ مسجد (مسجد مچھلی بازار) اور ایک مندر دونوں ہی لے۔ بی روڈ پر واقع تھے۔ سڑک کو سیدھا کرنے کے لئے اصولی طور پر مندر زد میں آتا تھا لیکن میونسپل حکام نے مسجد کو نشانہ بنایا یہ اقدام صرف اس لئے کیا گیا کہ میونسپل بورڈ میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ۱۳ نومبر ۱۹۱۳ء کو لیفٹیننٹ گورنر سر جیمز مسٹن خود کانپور آیا تھا اور اس نے مسلمانوں کے وفد کو یقین دلایا تھا کہ مسجد یا مندر، کسی کا کوئی حصہ گرایا نہ جائے گا۔ لیکن بعد ازاں میونسپل بورڈ

کے ہندو چیئرمین نے گورنر کو یہ کہہ کر کہ مسجد شہید نہیں کی جائے گی، بلکہ صرف اس کا ایک برآمدہ جو سڑک کے ساتھ لگتا ہے، گرایا جائے گا۔ حالانکہ اس تجویز کی منظوری بورڈ نے نہیں دی تھی اس کے باوجود کانپور کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ٹائلر نے اس اقدام کی منظوری دے دی۔ مسلمانوں نے جب دوبارہ گورنر سے رجوع کیا تو اُس نے مسلمانوں کی درخواست ٹھکرا دی۔
۳۰ر جولائی ۱۹۱۳ء کو گورنر نے اچانک کانپور آکر دوبارہ مسجد کا معائنہ کیا لیکن دُوسرے ہی دن مسلح پولیس نے مسجد کا محاصرہ کر لیا، مکمل ناکہ بندی کر دی اور مسجد کے برآمدے کو زمین بوس کر دیا۔ مسلمانوں نے اُسی دن دوپہر کو عید گاہ میں زبردست جلسہ منعقد کیا اور حکومت کی توجہ اس نامناسب اور پست اقدام کی طرف مبذول کرائی۔ مسلمان اخباروں نے بھی شور مچایا لیکن حکومت نے سُنی ان سُنی کر دی۔ مجبور ہو کر کانپور کے مسلمانوں نے مسجد کے شہید کئے جانے والے حصّے کی دوبارہ تعمیر اور اس سلسلے میں ہر قسم کی قربانی دینے کا عزم کر لیا۔ ۳ر اگست ۱۹۱۳ء (ماہِ رمضان) کو بہت سے مرد، لڑکے اور بچے مسجد کی دوبارہ تعمیر کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ اچانک پولیس آ گئی اور مسلمانوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ اس خبر نے پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں زبردست غم و غصّہ کی لہر دوڑا دی۔ گورنر نے آگرہ میں تقریر کرتے ہوئے حکومت کے اقدام کو جائز قرار دیا۔ جب ۱۶ر اگست کو راجہ صاحب محمود آباد کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک وفد گورنر سے ملا تو اُس نے یہ پیشکش کی کہ اگر مسلمانوں کو برآمدہ ہی بنانا ہے تو مسجد کے شمالی حصّے کی طرف اُنہیں جگہ مہیا کر دی جائے گی۔

تنگ آ کر آل انڈیا مسلم لیگ نے ستمبر ۱۹۱۳ء میں مسٹر محمد علی اور سیّد وزیر حسن پر مشتمل ایک وفد انگلستان بھیجا تاکہ یہ وفد وہاں اپنے مؤقف کی وضاحت کر سکے۔ لندن میں سکریٹری آف سٹیٹ برائے امورِ ہند اور کابینہ کے دُوسرے ارکین میں کسی نے بھی وفد سے ملاقات نہ کی۔ تاہم یہ وفد وہاں کے اخبارات اور عوام کی رائے ہموار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

علاوہ ازیں اس وفد کو ایک اور بڑی کامیابی یہ بھی حاصل ہوئی کہ واپسی سے پہلے اس نے مسٹر محمد علی جناح کو جو اُن دنوں لندن میں تھے مسلم لیگ میں شمولیت پر آمادہ کر لیا۔

۱۴ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کو وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ اور حکومتِ ہند کے رکنِ قانون سیّد امام علی کانپور پہنچے۔ وائسرائے نے مسجد کی آرائش کے لئے اپنی جیب سے عطیہ دیا اور شہید ہونے والے مسلمانوں کے پسماندگان سے اظہارِ ہمدردی کیا۔ انہوں نے مسجد کے معاملے

میں ملوث مسلمانوں کے خلاف مقدمات واپس لینے کا فیصلہ بھی سنایا۔ مسجد کا جو حصّہ شہید کیا گیا تھا، اُس کے بارے میں وائسرائے نے یہ فیصلہ دیا کہ ۸ فٹ کی بلندی پر ایک محراب بنا دی جائے جس کے اُوپر بر آمدہ اُسی صورت میں ہو جس صورت میں پہلے نیچے موجود تھا تاکہ سڑک نیچے سے گزر جائے اور مسجد بھی پہلی شکل میں قائم رہے۔ اس طرح مسلمانوں نے سکون کا سانس لیا اس معاملے میں محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی، مظہر الحق، ظفر علی خاں اور مولانا عبد الباری نے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

باب ۱۳

مسلم لیگ — ایک نیا دور

جیسا کہ ہم گزشتہ باب میں بیان کر چکے ہیں، ہندوستان کے مسلمان گوناگوں مسائل میں گھرے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے بارے میں برطانیہ کی پالیسی نے ان میں مزید اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ عیسائی، دنیا بھر کے مسلمانوں کو کچل کر ہمیشہ کے لئے پستیوں میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ ان دنوں مولانا ظفر علی خاں نے روزنامہ "زمیندار"، محمد علی نے کامریڈ اور ہمدرد میں اور ابو الکلام آزاد نے "الہلال" میں نہایت جرأت مندانہ اور مدبرانہ اداریے سپرد قلم کئے۔ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی نفرت اور بیزاری کا ایک قدرتی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مسلمان سیاسی جد و جہد میں ہندوؤں سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مسلم لیگی رہنما یہ بات بھی شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے کہ صرف حقوق اور مفادات کے تحفظ کے نام پر ان کے سیاسی مقاصد کا حصول ناممکن تھا۔ وہ جس منزل کی طرف قدم بڑھا رہے تھے اس کے حصول کے لئے بڑے دشوار گزار راستوں اور رکاوٹوں سے گزرنا تھا اور اس طویل سفر کے لئے مسلمانوں کو ایک مضبوط قیادت کی ضرورت تھی۔ مسلم لیگی رہنماؤں میں یہ احساس بھی عام ہو چلا تھا کہ جماعت کی قیادت کے لئے نیا خون اور نیا ولولہ درکار ہوگا۔ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا۔ کچھ عرصہ پہلے جب مسٹر محمد علی اور سید وزیر حسن کانپور کی مسجد مچھلی بازار کے تنازعہ کے سلسلے میں لندن گئے تھے تو وہاں انہوں نے محمد علی جناح سے درخواست کر کے انہیں مسلم لیگ کا رکن بنا لیا تھا۔

جہاں تک مسلم لیگ میں محمد علی جناح کی باقاعدہ شمولیت کا معاملہ تھا، اسے بلاشبہ مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک اہم موڑ شمار کیا جا سکتا ہے۔ نئی قیادت میسر آنے کے بعد جب ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تو مسلم لیگ نے محمد علی جناح کی تجویز پر ایک قرارداد منظور کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ،

"مسلم لیگ تاج برطانیہ کے زیر سایہ آئینی وسائل کے تحت ایک ایسا طرز حکومت خود اختیاری حاصل کرنے کی جدوجہد کرے۔ جو ہندوستان کے لئے مناسب ہو نیز اس مقصد کے حصول کی خاطر ہندوستانی عوام میں خدمت کا جذبہ پیدا کر کے مختلف طبقوں کے مابین تعاون پیدا کرے اور موجودہ انتظام حکومت میں اصلاح کے بعد استحکام قائم کرے۔"

مسلم لیگ کی اس قرارداد کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں مسلمانوں کی ترقی کی بعید گنجائش تھی۔ شاید اس وقت کانگریس کے رہنما اس قرارداد کے وسیع تر مفہوم کو نہ پا سکے اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اب سیاسی مقاصد کے اعتبار سے مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ مسلم لیگ کی قرارداد میں اس بات پر بالخصوص زور دیا گیا تھا کہ ہندوستان میں بسنے والی تمام اقوام کی ترقی اور تابناک مستقبل کی خاطر ان میں زیادہ سے زیادہ تعاون کی کوشش کی جائے اور ماحول کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنایا جائے۔ خود ہندو رہنماؤں نے مسلم لیگ کی اس قرارداد کی مکمل کر تائید کی۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ اس وقت مسلم لیگ اور کانگریس کے ضابطوں میں اس امر کی ممانعت نہ تھی کہ کوئی شخص ایک وقت میں صرف ایک ہی جماعت کا رکن ہو سکتا ہے۔ اسی بناء پر محمد علی جناح دونوں پلیٹ فارموں سے بات کر رہے تھے۔

۲۷۔دسمبر ۱۹۱۳ء کو آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی میں بھی مسلم لیگ کی اس قرارداد کا خیر مقدم کیا گیا۔ اجلاس کے صدر مسٹر بھوپندر ناتھ باسو نے کہا "ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی توجہات ایک مقصد پر مرکوز کر دینا چاہئیں۔ آج ہم جس ہندوستان میں رہ رہے ہیں وہ ہندو کا ہے نہ مسلمان کا، اینگلو انڈین کا نہ یورپین کا! آج کا ہندوستان وہ ہے جس میں ہم سب شریک ہیں۔ یہ توقع رکھنا ضروری ہے کہ مستقبل کا ہندوستان زیادہ عظیم، زیادہ طاقتور اور زیادہ روشن ہوگا۔ وہ ہندوستان جو اشوک کے وقت میں تھا، نہ اکبر کے دور میں!"

مسلم لیگ نے اس چیز کو قبل از وقت محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان میں اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے وہ مغربی پارلیمانی نظام جو برطانوی نوآبادیوں میں قائم تھا۔ کسی صورت بھی مناسب نہ ہوگا کانگریس کے مسٹر گوکھلے کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان پر ہندوستانیوں کے مفادات کے مطابق حکومت ہونا چاہیئے اور وقت کے ساتھ ساتھ ایک ایسا طرز حکومت اختیار کرنا چاہیئے۔ جو سلطنت برطانیہ کی نوآبادیوں میں خود مختار حکومتوں کی صورتوں میں قائم ہے۔ اس وقت برطانوی نوآبادیوں میں جو نظام حکومت تھا وہ برطانوی پارلیمانی نظام کی بنیادوں پہ اور اکثریت کی حکومت کے اصول پر قائم تھا وہاں ایک مخلوط معاشرہ موجود تھا۔ چنانچہ یہ طریق ہندوستان میں حکومت کے لئے مناسب نہ تھا۔ اسی وجہ سے مسلم لیگی رہنما میاں محمد شفیع نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اس نوع کا طرز حکومت مسلمانوں کے لئے سیاسی اعتبار سے غیر محفوظ ہوگا۔

کانگرسی رہنماؤں میں خاصے اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ دوسری طرف مولانا محمد علی اور شوکت علی عالم اسلام کے مسائل میں بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے۔ محمد علی جناح پوری توجہ کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارموں سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد کے لئے جدوجہد میں مصروف تھے۔ ۱۹۱۵ء میں کانگریس کا اجلاس بمبئی میں ہو رہا تھا محمد علی جناح نے مسلم لیگ سے کہا کہ وہ بھی اپنا اجلاس بمبئی میں منعقد کرے۔ گو مسلم لیگ کونسل نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں بعض امور پہ اختلاف کے باعث ایک گروہ نے یہ غلط فہمی پیدا کر دی کہ مسلم لیگ کو کانگرس میں ضم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ محمد علی جناح نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ایک بیان دیا کہ مقصد صرف دونوں جماعتوں کے درمیان اشتراک عمل ہے۔ مسلم لیگ کو کانگریس میں ضم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسلم لیگ ایک علیحدہ اور آزاد سیاسی جماعت کی صورت میں کام کرتی رہے گی لیکن اس کے باوجود جب اجلاس منعقد ہوا تو کچھ لوگوں نے ہنگامہ آرائی کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے روز اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ اس کی رہی سہی کارروائی تاج محل ہوٹل میں ہوئی۔ اسی ہوٹل میں محمد علی جناح نے ایک قرارداد کے ذریعہ یہ تجویز پیش کی کہ ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو دیگر سیاسی جماعتوں سے مشورہ کے بعد آئینی اصلاحات کے بارے میں ایک لائحۂ عمل مرتب کرے اور اس میں مسلمانوں کی بنیادی ضروریات اور مفادات کا خاص خیال رکھا جائے۔

کانگریس نے بھی اپنی کمیٹی سے کہا کہ مسلم لیگ کمیٹی کے ساتھ مل کر حکومت خود اختیاری کا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے تاکہ دونوں سیاسی جماعتیں آئینی اصلاحات کے سلسلہ میں متفقہ طور پر حکومتِ برطانیہ کو سکیم پیش کر سکیں۔ اس سلسلہ میں تبادلۂ خیال کا آغاز اپریل ۱۹۱۶ء میں ہوا۔ نومبر ۱۹۱۶ء میں کلکتہ میں دوسرا اجلاس ہوا۔ یہ کانگریس اور مسلم لیگ کی کمیٹیوں کا مشترکہ اجلاس تھا۔ آخر کار سکیم مرتب کر لی گئی۔ اس کے بعد لکھنؤ میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس منعقد ہوئے۔ مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح تھے۔ دونوں جماعتوں کی کمیٹیوں نے جو مشترکہ سکیم مرتب کی تھی اس کی توثیق دونوں جماعتوں نے کر دی جسے کانگریس اور مسلم لیگ کے مشترکہ مطالبہ کی صورت میں حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

"ریشمی رومال" سازش"

۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۶ء میں کچھ طالب علم اور سیاسی کارکن آزادئ ہند کے لیے کام کرنے کی غرض سے ہندوستان سے بھاگ گئے۔ ان میں ۵ طلبہ شامل تھے اور تقریباً سبھی لاہور کے کالجوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ۵۔ فروری ۱۹۱۵ء کو یہ لوگ ترکی جانے کی غرض سے افغانستان پہنچے۔ اس کے ساتھ پشاور اور کوہاٹ کے کچھ سیاسی کارکن بھی شامل ہو گئے۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے بھی اس گروہ کا ساتھ دیا۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں راجہ مہندر پرتاپ کی قیادت میں ہندوستانیوں، جرمنوں اور ترکوں پر مشتمل ایک وفد بھی ایران کے راستے کابل جا پہنچا، جہاں یہ سب اکٹھے ہو گئے۔ اس گروہ کا اصل مقصد افغان حکومت کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کرنا تھا تاکہ وہ ہندوستانی فوجوں کو اپنی سرحدوں پر جنگ میں مصروف کر لیں۔ کہا جاتا ہے کہ در پردہ راجہ مہندر پرتاپ کا مشن یہ تھا کہ وہ نیپال کے راجہ کی مدد سے ہندوستان میں ہندو حکومت قائم کر سکے۔ دریں اثناء دارالعلوم دیو بند کا ایک وفد محمود الحسن کی قیادت میں حجاز روانہ ہوا تاکہ جیسے بھی ممکن ہو ترکوں کی مدد کی جائے۔ اس وفد نے وہاں قیام کے دوران حجاز کے ترکی فوجی گورنر غالب پاشا سے جہاد کا اعلان کرا دیا اور ہندوستان کے مسلمانوں سے یہ اپیل کی گئی کہ وہ ترکی کے لئے آدمی، رقم اور مزید جو کچھ بھی ممکن ہو، فراہم کریں۔

عبیداللہ سندھی نے جو کابل میں اس تحریک کی قیادت کر رہے تھے۔ حجاز میں مقیم گروپ کے قائد دیو بند کے محمود الحسن کو ایک ریشمی رومال پر خفیہ پیغام لکھ کر بھیجا۔ اس

پیغام کے ذریعے انھیں تمام سرگرمیوں سے آگاہ کیا گیا تھا۔ یہ رومال ایک شخص شیخ عبدالحق کو دیا گیا تا کہ وہ اسے ایک اور شخص عبدالرحیم کے سپرد کر دے۔ عبدالرحیم کا کام یہ تھا کہ یہ رومال اپنے کسی معتمد خاص کے ذریعہ یا خود حجاز جا کر محمود الحسن کے سپرد کر دے۔ لیکن منزل مقصود پر پہنچنے سے قبل یہ رومال کسی نہ کسی طرح حکومت کے ہاتھوں میں پہنچ گیا اور حکومت نے اس کا نام "ریشمی رومال سازش" رکھ دیا۔

معاہدۂ لکھنؤ

۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہونا تھے، مسلم لیگ کے اجلاسِ دسمبر ۱۹۱۶ء کی صدارت محمد علی جناح کو کرنا تھی۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین راجہ محمود آباد نے مسلم لیگ کے اجلاس کے انتظامات کئے۔ لکھنؤ کی قیصر باغ بارہ دری میں یہ اجلاس ۳۰ اور ۳۱ دسمبر کو منعقد ہوا۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے اُن حالات کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا، جن کے تحت مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کرنے کے لئے مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا تھا۔ انہوں نے کہا:

"مسلمانوں نے خود کو سیاسی جدوجہد کے لئے منظم کرنے کی جس ضرورت کو محسوس کیا وہ بلاشبہ وقت کی اہم ترین ضرورت تھی۔ بصورتِ دیگر برطانیہ کے لبرل پارٹی سے تعلق رکھنے والے سیکرٹری آف سٹیٹ نے جو تبدیلیاں تجویز کی تھیں ان کے تحت مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت ہمیشہ کے لئے ختم ہو کر رہ جاتی۔ بلاشبہ مسلمانوں کے لئے ایسے نازک وقت میں اور کوئی راستہ نہ تھا کہ اپنی روایات کے تحت یہ بات واضح کر دیتے کہ وہ یقینی طور پر جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ وہ تعداد میں کم ہیں۔ لیکن صرف منظم سیاسی جدوجہد ہی اپنی قوت دے سکتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے سلسلہ میں جن اصولوں کو بنیاد بنایا گیا تھا ان میں بنیادی اصول یقیناً یہی تھا کہ مسلمان جداگانہ حیثیت کے حامل ہیں اور ہندوستان میں خواہ کوئی بھی آئینی ردوبدل ہو۔ وہ اپنی سیاسی نشوونما کے خیال کو کسی صورت بھی دل سے نہیں نکال سکتے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کانگرس کے شانہ بشانہ چل کر ایسی ہر کوشش میں حصہ لینے کے لئے تیار رہے جو بحیثیت مجموعی ملک کی ترقی اور اس کے مفادات میں ہو۔"

اس موقع پر محمد علی جناح نے یہ بھی کہا کہ وہ عوامی زندگی میں بلاشبہ ایک کٹر کانگرسی ہے۔ لیکن یہ کہنا غلط تھا کہ وہ مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ کسی بھی اقلیت کو اپنے سیاسی حقوق اور مفادات کے تحفظ کا مکمل حق پہنچتا ہے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ اقلیت اپنے سیاسی وجود کو قائم رکھ سکے۔

"معاہدہ لکھنؤ" (لکھنؤ پیکٹ) کے نام سے جس معاہدہ کو یاد کیا جاتا ہے وہ دراصل اسی سکیم کا دوسرا نام ہے، جو مسلم لیگ اور کانگرس کی کمیٹیوں نے مل کر مرتب کی تھی۔ اس سکیم کا مفہوم یہ تھا کہ صوبائی کونسلوں میں جداگانہ انتخابات کے ذریعہ مسلمانوں کو نمائندگی حاصل ہو اور اس کا تناسب یہ ہو:

پنجاب ——— منتخب اراکین کونسل کی نصف تعداد
یوپی ——— منتخب اراکین کا ۳۰ فیصد
بنگال ——— منتخب اراکین کا ۴۰ "
بہار ——— " " " ۲۵ "
سی پی ——— " " " ۱۵ "
مدراس ——— " " " ۱۵ "
بمبئی ——— منتخب اراکین کا ایک تہائی

شرط یہ تھی کہ صوبائی مجالس قانون ساز اور مرکزی مجلس قانون ساز کے انتخابات میں مسلمان اپنے مخصوص حلقوں کے سوا کسی دوسرے حلقہ سے کھڑے نہ ہوں۔ نیز اگر کوئی غیر سرکاری رکن ایسا مسودہ قانون یا مسودۂ قانون کی کوئی دفعہ یا کوئی ایسی قرارداد پیش کرے جس سے کوئی ایک فرقہ متاثر ہوتا ہو، تو کسی مجلس قانون ساز (بشمول مرکزی کونسل) میں کارروائی نہ کی جائے گی بشرطیکہ متاثر ہونے والے فرقہ کی تین چوتھائی تعداد ایسے مسودہ قانون، مسودہ قانون کی کسی دفعہ یا قرارداد کی مخالفت کرے۔

معاہدہ لکھنؤ محمد علی جناح کی زندگی کا نہ صرف ایک بہت بڑا کارنامہ تھا بلکہ اس معاہدے کی بنا پر مسلم لیگ کو آگے قدم بڑھانے کے مواقع بھی نصیب ہوئے۔ محمد علی جناح نے انتہائی پیچیدہ معاملات کو جس انداز میں سلجھایا تھا اور باہم غلط فہمیوں میں مبتلا فرقوں میں جس انداز سے مفاہمت پیدا کی تھی اس کی مثال ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں کم ملتی ہے۔

کچھ لوگوں نے اس معاہدے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات ہمیشہ کے لئے کشیدہ ہوگئے، ہندوستان کی تقسیم کی بنیاد پڑی۔ اور جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو وہ پنجاب اور بنگال کے بہت سے علاقوں سے محروم ہوگیا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس معاہدے کے تحت کانگرس نے مسلمانوں کے لئے جُداگانہ انتخابات کو تسلیم کیا جبکہ وہ پہلے دن سے ہی مسلمانوں کے لئے علیحدہ نمائندگی کی مخالفت کر رہی تھی اور جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وُہ مسلمانوں کو ایک الگ قوم تسلیم نہ کرتی تھی۔ علاوہ ازیں مسلم اقلیت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی کا توازن قائم کیا گیا۔ یہ درست ہے کہ پنجاب اور بنگال جیسے اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو اکثریت کی بنا پر حاصل مفادات سے محروم ہونا پڑا۔ مثلاً پنجاب میں آبادی کے اعتبار سے ان کی قوتِ نمائندگی ۱۰۰ میں ۹ اور پنجاب میں تین چوتھائی بنتی تھی لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مسلمانوں کی یہ جیت بہت بڑی تھی کہ انہوں نے کانگرس سے اپنی علیحدہ نمائندگی تسلیم کرائی تھی اور اسی ٹھوس بنیاد پر اُسے جد وجہد پاکستان میں بہت سی آسانیاں میسر آئیں۔ ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ ۱۹۰۶ء میں تقسیم بنگال کے وقت مغربی بنگال میں ہندوؤں اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ہندوؤں نے تقسیمِ بنگال کے موقع پر جو ہنگامہ کیا اس کی بنیاد نہ صرف یہ تھی کہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ صوبے کے قیام کے باعث انہیں ایک مرکز نصیب ہوگا۔ بلکہ یہ بھی کہ وہ صوبے کے کسی ایک حصے میں مسلمانوں کی اکثریت کو برداشت نہ کرسکے۔ شاید انہی بنیادوں پر متعصب ہندو یہ سمجھ رہا تھا کہ مسلمان صوبے کا قیام بجائے خود ایک مسلمان مملکت کے قیام کی تمہید نہ بن جائے۔ گو اس وقت پاکستان کا تصور وجود میں نہ آیا تھا، لیکن ہندو کی سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ وہ مسلمان کو پنپتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر ۱۹۱۶ء میں بنگال میں مسلمان اکثریت کی بنیاد پر حق نمائندگی کا مطالبہ کیا جاتا تو ہندو، بنگال یا پنجاب، کسی کے معاملے میں بھی اس پر صاد نہ کرتے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء کا یہ تاریخی معاہدہ اگر طے نہ پاتا تو مسلمانوں کو مرکز میں ایک تہائی، صوبوں میں توازن ——— (WEIGHTAGE) پنجاب میں جُداگانہ انتخاب کے ساتھ ۵۰ فیصد اور بنگال میں پانچ مسلمان (۴۲ غیر مسلموں کے مقابلے میں) نشستوں کی جگہ ۴۰ فیصد مسلم نمائندگی کے وُہ سیاسی مفادات حاصل نہ ہو سکتے جو انہیں پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے تک حاصل رہے۔

پہلی جنگِ عالمگیر

۴ اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی تھی۔ ترکی اور جرمن اتحادی تھے۔ ترکی نے جنگ کے چند ماہ بعد اتحاد قائم کیا، اور برطانیہ کے خلاف جنگ میں مصروف تھے۔ ہندوستان انگریز کا محکوم لیکن ترکی کا دوست تھا۔ لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں میں اضطراب قدرتی تقاضا تھا۔ انگلستان کے ایک اخبار لندن ٹائمز نے ایک مضمون میں ترکوں کے بارے میں توہین آمیز الفاظ استعمال کئے جس کے جواب میں مولانا محمد علی نے ایک مضمون لکھا اور برطانیہ کے خلاف ترکوں کی جنگ کو حق بجانب قرار دیا۔ حکومتِ برطانیہ نے مولانا محمد علی کے اخبار کامریڈ پر پابندی عائد کر کے مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو مہرولی میں نظر بند کر دیا۔ نظر بندی کے دوران مختلف مقامات پر لے جایا جاتا رہا۔ ۱۹۱۵ء میں جب دونوں بھائیوں نے چھندواڑہ میں ایک مسجد بنوائی تو انہیں بیتول جیل میں بھیج دیا گیا۔ کچھ دیگر مسلمانوں کی گرفتاریاں بھی ہوئیں جن میں مولانا حسرت موہانی بھی شامل تھے۔

اس دوران وائسرائے ہند نے ایک بیان کے ذریعہ ترکوں کے جرمنوں کے ساتھ اتحادی بننے کی مذمت کی اور کہا کہ جدہ کی بندرگاہ، عرب اور عراق کے مقدس مقامات پر برطانوی افواج کے حملوں سے محفوظ رہیں گے۔ سوائے اس صورت کے کہ ہندوستان کے حاجیوں اور زائرین کے معاملات میں مداخلت ہو نومبر ۱۹۱۴ء میں برطانیہ کے وزیر اعظم نے وائسرائے کے اس بیان کی توثیق کر دی۔ بعد ازاں فرانس اور روس نے بھی یہی اعلان کیا کہ مسلمانوں کے تمام مقدس مقامات کا احترام اور تحفظ کیا جائے۔ ان اعلانات کے باوجود ہندوستان کے مسلمان اس لئے مطمئن نہ تھے کہ انگریز حکومت کی فوج کے مسلمان سپاہیوں کو ترکوں کے مقابلے میں جنگ کے لئے بھیجا جا رہا تھا کیونکہ مسلمان اپنے عقیدے کی رُو سے مسلمان کو قتل کرنا حرام سمجھتے ہیں لہٰذا اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ ہندوستان کا مسلمان سپاہی اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خلاف نبرد آزما تھا۔ اس اثناء میں برطانوی حکومت نے شریف حسین سے وعدہ کیا کہ جنگ ختم ہوتے ہی عرب کو خود مختاری دے دی جائے گی اور انہیں حاکم عرب مقرر کر دیا جائے گا۔ شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ محفوظ نہ رہ سکے۔ مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا

کرے تب انگریز کی چال میں آکر نہ صرف یہ کہ جنگ کے بعد بھی خود مختار نہ ہو سکیں گے بلکہ ترکی سلطنت بھی نیست و نابود ہو کر رہ جائے گی۔

دوسری طرف انگریزوں نے ہندوستان کے لوگوں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لئے انہیں خود مختار حکومت کے سبز باغ دکھائے اور ہندوستانیوں کو تقسیم کر کے اپنا اُلو سیدھا کرنے کا جال پھیلایا۔ برطانوی وزیر اعظم نے واضح طور پر کہا کہ ہندوستان کے مسئلہ کو ایک نئے زاویۂ نظر سے دیکھنا چاہئے۔ ہندوؤں کے لئے بھلا اس سے بہتر اور کیا موقع ہو سکتا تھا۔ انہوں نے جنگ کی پالیسی کے بارے میں انگریزوں کی حمایت شروع کر دی۔

" اگر ہم انگریز حاکموں کے شانہ بشانہ میدانِ جنگ میں اپنی پوری قوت کے ساتھ اتحادیوں کی فتح و نصرت کے مقصد کے لئے لڑے تو یہ جنگ ہمارے اپنے مقصد کے حصول کا سبب بھی ہو گی۔ اس کے بعد ہم انگریزوں سے بڑی آسانی کے ساتھ، مستقبل قریب میں نہیں بلکہ فوری طور پر وطنی حکومت (HOME RULE) حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔"

یہ الفاظ ہندوؤں کے نزدیک آزادی کے سب سے بڑے مجاہد، انگریز کے دشمن اور محبِ وطن رہنما گاندھی کے تھے۔ گاندھی کی اس اہم خدمت کے صلے میں انہیں قیصرِ ہند میڈل بھی عطا کیا گیا جسے انہوں نے بصد شکریہ قبول کر لیا مگر مسلمانوں میں کوئی گاندھی نہ تھا جو موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض حکومتوں کی تباہی کے حق میں انسانیت سوز نعرے بلند کرتا۔ گاندھی نے مسلمان کے زخموں پر یہ نمک اس وقت چھڑکا جب وہ مسلمان حکومتوں کے خلاف انگریز کی چیرہ دستیوں اور مظالم پر احتجاج کر رہے تھے اور مقاماتِ مقدسہ کے لئے تڑپ رہے تھے۔

وطنی حکومت کا نعرہ

اسی دوران ہندوستان میں ایک نئی تنظیم ہوم رول لیگ کے نام سے وجود میں آئی۔ جس کے رہنما اینی بیسنٹ اور تلک تھے۔ اس تنظیم کے نعروں میں تشدد اور تلخی کا انداز نمایاں تھا۔ تنظیم وطنی حکومت کا قیام اپنا حق سمجھتی تھی۔ جب مظاہرے زور پکڑ گئے تو اگست ۱۹۱۷ء میں برطانوی ایوانِ عوام نے ہندوستان کے لئے فوری طور پر آئینی پیش قدمی کا اعلان کر دیا۔

مدراس حکومت نے مسز اینی بیسنٹ اور اُن کے ساتھیوں کو نظر بند کر دیا۔ اس موقعے پر محمد علی جناح نے بھی وطنی حکومت کے بارے میں اقدام کیا اور ہوم رول لیگ کے اراکین کی

درخواست پر لیگ کے اجلاس کی صدارت قبول کر لی۔ انگریز کو یہ بات ناگوار گزری اور جنگی کونسل
کے سلسلے میں محمد علی جناح اور لارڈ ولنگڈن کے درمیان اتنے شدید اختلافات پیدا ہو گئے کہ محمد علی
جناح نے برملا یہ نعرہ لگایا:

"میں دیکھوں گا کہ بمبئی کے لوگ لارڈ ولنگڈن کو الوداعی دعوت کیسے دیتے ہیں" بمبئی کا جناح
ہال اسی جرأت کی یادگار میں تعمیر کیا گیا۔ چند دن بعد مسلم لیگ اور کانگریس کا مشترکہ اجلاس ہوا۔
اجلاس نے کچھ قراردادیں منظور کیں اور مشترکہ بیان جاری کیا۔ بیان میں وائسرائے ہند اور بعض صوبوں
کے گورنروں کی اس پالیسی کے خلاف شدید احتجاج کیا گیا کہ وہ جان بوجھ کر ان اصولوں کو
غلط رنگ دینے کی کوشش کر رہے ہیں جو ایک یادداشت کے ذریعہ امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی کے
۱۹ اراکین نے روانہ کی تھی۔

جناح کا مطالبہ، پالیسی کا اعلان

۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو مسٹر مونٹیگو نے وزیر امور ہند مقرر ہونے کے بعد ایک بیان دیا کہ
برطانوی حکومت، حکومتِ ہند کی اس پالیسی سے متفق ہے کہ ہندوستانیوں کو ہر شعبے میں شریک
کیا جائے اور حکومت خود اختیاری میں بتدریج اضافہ کیا جائے۔ برطانوی حکومت کے جزو لاینفک
کی حیثیت سے ہندوستان میں رفتہ رفتہ ایک ذمہ دار حکومت قائم ہو۔ ان معاملات پر وائسرائے
ہند سے گفتگو کی جائے اور اس کے مشورے سے صوبائی حکومتوں کی آرا پر غور و خوض کیا جائے
علاوہ ازیں دیگر تجاویز پر بحث و تمحیص کے بعد مناسب وقت پر ان تجاویز کو پارلیمان کے سامنے
پیش کیا جائے۔

مسٹر مونٹیگو نے اس پالیسی کا اعلان محمد علی جناح کے مطالبہ پر کیا۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں
وہ ہندوستان آئے۔ ان کے ہمراہ پانچ افراد تھے۔ اس مشن نے مختلف صوبوں کا دورہ کر کے
ہر طبقہ خیال کے لوگوں سے تبادلۂ خیال کیا۔ اس موقعے پر مولانا محمد علی نے، جو نظر بند تھے مشن سے
ملنے کی اجازت طلب کی لیکن اجازت نہ دی گئی۔ چنانچہ علی گڑھ کالج کے اعزازی سیکرٹری نواب
محمد اسحٰق کی قیادت میں ایک وفد مونٹیگو سے ملنے دلی پہنچا۔ وفد کو اس شرط پر ملاقات کی اجازت
دی گئی کہ وہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے بارے میں کوئی بات نہ کرے۔ لیکن مسلمان وفد نے
اپنی روایتی غیرت کا ثبوت دیتے ہوئے واضح طور پر بتا دیا کہ وفد، مسلمانوں کے نمائندے کے طور پر

گیا ہے نہ کہ ذاتی حیثیت میں ، لہذا وہ اپنے خطاب میں کسی ترمیم کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ یہ بات حکومت کے لئے قابل قبول نہ تھی: لہذا وفد واپس چلا آیا۔ دیگر ہندو اور مسلمان رہنماؤں کی ملاقات مونٹیگو مشن سے ہوئی۔

مونٹیگو کے مذکورہ بالا اعلان میں یہ بات واضح نہیں تھی کہ ہندوستان کو کیا دیا جائے گا؛ لیکن اس ابہام کے باوجود ہندوستان اور انگلستان کے عیسائی اس سکیم کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ جون ۱۹۱۸ء میں مونٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ شائع کر دی گئی (دیکھئے باب ۱۵)، لیکن یہ رپورٹ کانگریس اور مسلم لیگ کی بعض تجاویز سے متصادم تھی۔ کانگریس نے اصلاحات میں بعض ترامیم کے ساتھ قبولیت کی قرارداد منظور کر لی۔ تاہم انہیں مایوس کن بھی کہا۔ مسلم لیگ نے اپنی قرارداد میں صرف اتنا کہا کہ بعض ترامیم کے ساتھ یہ اصلاحات منظور کر لی جائیں۔ محمد علی جناح نے ایک بیان جاری کیا جس میں اعلان کے اس حصہ سے اختلاف کیا گیا تھا کہ ترقی کے ساتھ ساتھ صوبوں میں ذمہ دار حکومت قائم کی جائے گی۔ محمد علی جناح کا کہنا یہ تھا کہ خود مختار حکومتیں صوبوں اور مرکز میں بیک وقت ترقی کے راستے پر کار فرما ہوں۔ نیز قانون کا ہر مسودہ آئینی اور پارلیمانی ضوابط کی مطابقت سے منظور کیا جائے۔ صرف امنِ عامہ، انتظام و انصرام اور تحفظ سے متعلق قوانین کے لئے گورنر جنرل یا کونسل کے سرٹیفکیٹ سے کام لیا جائے۔

رولیٹ ایکٹ

۱۹۱۷ء کے آخر میں حکومتِ ہندوستان نے ایک کمیٹی قائم کی جس کے سربراہ مسٹر جسٹس ایس۔ اے رولیٹ تھے۔ کمیٹی کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ وہ ملک کے اندر موجود سازشوں اور ان کی نوعیت کے بارے میں تحقیقات کرنے کے بعد ایسی تدابیر کی سفارش کرے جن کے ذریعہ حالات پر قابو پایا جا سکے اور ان سازشوں کی روک تھام کی جا سکے۔ اپریل ۱۹۱۸ء میں اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کر دی۔ اسی رپورٹ کی بنیاد پر حکومتِ ہند نے فروری ۱۹۱۹ء میں دو مسوداتِ قانون مرکزی اسمبلی میں پیش کر دیئے۔ ان میں ایک انڈین کریمنل لاء (امینڈمنٹ) بل (۱)

INDIAN CRIMINAL LAW (AMMENDMENT) BILL 1

اور دوسرا دی کریمنل لاء (ایمرجنسی پاورز) بل (۲)

CRIMINAL LAW (EMERGENCY POWERS) BILL II

تھا۔ مرکزی اسمبلی نے مارچ ۱۹۱۹ء میں ان کی منظوری دے دی۔

یہی وہ رولٹ ایکٹ ہے جس کے تحت انفرادی آزادیوں اور سیاسی سرگرمیوں پر متعدد پابندیاں عائد کردی گئیں۔ حالانکہ جنگ کے بد (۱۹۱۸ء) میں ختم ہوچکی تھی۔ ایسے ظالمانہ قوانین کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اسمبلی میں پیش ہونے سے پہلے بھی مختلف سیاسی جماعتوں نے اس کی شدید مخالفت کی تھی۔ چنانچہ اس ایکٹ کی منظوری کے بعد ہندوستانیوں کے شبہات میں اضافہ ہوگیا اور یہ خیال پیدا ہُوا کہ حکومت "شبہ" کا فائدہ اٹھا کر ہندوستانیوں کو ان کے بعض رہناؤں سے محروم کرنا چاہتی ہے کیونکہ ایکٹ میں یہ بات بھی موجود تھی کہ حکومت مقدمہ چلائے بغیر "سیاسی مشتبہ" لوگوں کو سزا دے سکتی ہے۔

محمد علی جناح نے اسمبلی میں بھی اس مسودہ قانون کی شدید مخالفت کی اور واضح طور پر کہا کہ کسی مہذب حکومت میں ایسے جابرانہ قوانین کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ایکٹ کی منظوری کے بعد انہوں نے وائسرائے کے نام ایک خط لکھا اور احتجاج کے طور پر امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے۔

گاندھی نے ایکٹ کی منظوری سے قبل ہی شدید مخالفت کا آغاز کیا اور اس کے خلاف ستیہ گرہ کرنے کی دھمکی بھی دی۔

ستیہ گرہ تحریک

گاندھی نے ایک حلف نامہ تیار کیا:

"ستیہ گرہی یہ حلف اٹھاتا ہے کہ اگر رولٹ ایکٹ منظور کر لیا گیا اور اسے قانون کی صورت دے دی گئی تو وہ ان قوانین کی پابندی نہیں کرے گا تاوقتیکہ یہ قوانین واپس نہ لئے جائیں۔"

گاندھی نے اس عہدنامے پر دستخط کرانے کی مہم شروع کر دی۔ لیکن اس مہم کا حکومت پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ لہٰذا گاندھی نے ایکٹ منظور ہوتے ہی آئندہ اتوار کا دن مقرر کیا۔ لوگوں سے اس جابرانہ قانون کے خاتمہ کے لئے دُعا کی اپیل کی اور ہدایت کی کہ اتوار (۳۰ مارچ) کو عام ہڑتال کی جائے اور روزہ رکھا جائے۔ بعدازاں احتجاج کے لئے ۶ اپریل مقرر کی گئی لیکن ۳۰ مارچ کو بھی لوگوں نے دلی میں جلوس نکالا جس پر پولیس نے فائر نگ کر دی۔ ۶ اپریل کو دوبارہ ہڑتال ہُوئی۔ جلسے منعقد کئے گئے اور جلوس نکالے گئے۔ گاندھی، بمبئی میں کامیابی کے بعد

پنجاب آنے کے لئے جب دلی پہنچے تو انہیں یہ حکم دیا گیا کہ وہ پنجاب میں داخل نہ ہوں۔ جب گاندھی نے حکم ماننے سے انکار کر دیا تو انہیں گرفتار کر کے دوبارہ بمبئی بھیج دیا گیا۔ ۱۰ اپریل ۱۹۱۹ کو امرتسر میں جلسہ منعقد ہونا تھا مگر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے جلسے کے منتظم ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو ملاقات کے بہانے بلایا اور خاموشی کے ساتھ گرفتار کر کے کسی نامعلوم جگہ بھیج دیا۔ گاندھی کی گرفتاری اور پنجاب میں داخلے پر پابندی اور اس کے بعد امرتسر میں دو رہنماؤں سے یہ سلوک ہندوستانیوں کیلئے اشتعال کا باعث بنا۔ لوگوں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ امرتسر کے بنگلے کا رُخ کیا جسے فوج نے روکنے کی کوشش کی لیکن عوام نے فوج پر زبردست سنگ باری کی جس کے جواب میں گولی چلا دی گئی — ہندوستانیوں نے غصے میں آکر پانچ انگریزوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، جس کے بعد امرتسر فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ لیکن کلکتہ، بمبئی، احمد آباد، ندیا اور لاہور میں ہنگامے شروع ہو گئے جہاں بہت سی عمارات کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔

جلیانوالہ باغ کا حادثہ

یہ ہنگامہ دن بہ دن نازک صورت اختیار کرتا گیا۔ شاید ہی کوئی شہر ایسا ہو جہاں عوام اور پولیس کے درمیان تصادم نہ ہوا ہو۔ پولیس کے لئے لاٹھی چارج یا اشک آور گیس تو کیا' فائرنگ بھی ایک معمول بن چکی تھی۔ اُدھر عوام سرکاری عمارات کو روزانہ نذرِ آتش کر رہے تھے۔ ۱۱ اپریل ۱۹۱۹ء، یعنی ہنگامہ کے آغاز کے دن سے پورے ہندوستان میں یہ آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ ۱۲ اپریل کو فوجی کمانڈر جنرل ڈائر نے امرتسر کا کنٹرول سنبھال لیا۔ فوج گلیوں میں گشت کر رہی تھی اور عام جلسے منعقد کرنے کی ممانعت کر دی گئی تھی، اس کے باوجود ۱۳ اپریل کو جلیانوالہ باغ امرتسر میں ایک جلسۂ عام کا اہتمام کیا گیا۔ یہ باغ چار دیواری کے اندر تھا اور داخلہ یا باہر نکلنے کے لئے چند چھوٹے چھوٹے دروازے تھے۔ جب امرتسر کے عوام اس باغ میں پُرامن طریقہ پر جمع ہو گئے تو جنرل ڈائر نے فوج اور مشین گنوں کے ساتھ باغ کا رُخ کیا۔ اس نے عوام کو انتباہ اور منتشر ہونے کا موقع فراہم کئے بغیر فائرنگ شروع کر دی۔ لوگ راستوں کی کمی کی وجہ سے اپنی جان بھی نہ بچا سکے۔ ڈائر کے اس وحشیانہ اقدام کے باعث نہتے مرد، عورتیں اور بچے گولیوں کی بوچھاڑ کی زد میں آکر دھڑا دھڑ مرنے لگے۔ درندہ صفت جنرل ڈائر نے فائرنگ اس وقت بند کی جب گولیاں ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد وہ فوج کو واپس لے گیا۔ باغ کے اندر لاشوں کے پُشتے

لگے ہوئے تھے۔ لاتعداد زخمی لاشوں کے تلے دبے کراہ رہے تھے۔ ان زخمیوں کو ہسپتال پہنچا کر طبی امداد فراہم کرنے کا بھی کوئی انتظام نہ کیا گیا کیونکہ جنرل ڈائر نے صاف کہہ دیا تھا کہ یہ اس کے فرائض میں شامل نہیں۔ اس کا فرض صرف اتنا تھا کہ وہ لوگوں کو ایسا سبق دے جسے وہ زندگی بھر فراموش نہ کر سکیں۔

مارشل لاء کا نفاذ

اس کے فوراً بعد لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈائر نے صوبے میں مارشل لاء نافذ کر دیا۔ اس دوران تعلیم یافتہ اور معزز شہریوں پر جو مظالم ڈھائے گئے وہ تاریخ میں انگریز کے دامن پر ایک بدنما داغ کی صورت میں ہمیشہ موجود رہیں گے۔ ریل گاڑیوں میں سفر کرنے کی اجازت صرف ان لوگوں کو تھی جن کو پاس جاری کئے گئے تھے۔ فوج نے عورتوں کی بے عزتی کی۔ امرت سر کے ایک بازار میں لوگوں کو پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کیا گیا۔ اگر کوئی شخص سانس لینے کی خاطر رکنے کی کوشش کرتا تو اس کی پشت پر رائفلوں کے دستے مارے جاتے۔ معزز شہریوں کے مکانات پر مارشل لاء کے حکام کی طرف سے پوسٹر چسپاں کر دیئے جاتے اور حکم دیا جاتا کہ اگر یہ پوسٹر کسی نے ضائع کئے تو مالک مکان کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ میاں فضل حسین، پیر تاج الدین اور خلیفہ شجاع الدین جیسے معزز شہریوں اور ممتاز رہنماؤں کو ان پوسٹروں کی حفاظت کے لئے رات رات بھر اپنے گھروں کے باہر کھڑے رہنا پڑتا۔ لوگوں کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ جہاں بھی کسی انگریز کو دیکھیں فوراً سلام کریں۔ اگر سواری پر ہوں تو اتر کر آداب بجا لائیں۔ ایک تاریک اور ۱۵ فٹ اور ۱۲ فٹ طویل و عریض کمرے میں ۲۵ آدمیوں کو ایک ہفتہ تک محبوس رکھا گیا۔ جو لوگ فوجی عدالتوں کے سامنے پیش ہوتے انہیں وکیل صفائی کی خدمات حاصل کرنے کی اجازت نہ تھی۔ شاید ہی سزائے موت اور عمر قید سے کم کوئی سزا دی گئی ہو۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان بھر میں 'ہندو مسلم کی جے' کے نعرے لگ رہے تھے لاہور میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک ہی برتن میں کھا پی کر 'ہندو مسلم بھائی بھائی' کا نعرہ لگایا۔ جب لاہور میں ان واقعات کی اطلاع ملی تو یہاں بھی ہنگامہ آرائی شروع ہو گئی۔ انارکلی سے ایک جلوس ہائی کورٹ کی طرف بڑھا، پولیس اور فوج نے اسے ۱۵ منٹ کے اندر منتشر ہونے کا حکم دیا، اس کے بعد گولی چلا دی۔ کچھ دیر بعد بہت سے طالب علم جن میں راجہ

غضنفر علی خاں بھی شامل تھے ۔ مال روڈ پر پہنچ گئے ۔ پولیس نے ان پر بھی لاٹھی چارج شروع کر دیا ۔ یہ مجمع منتشر ہونے کے بعد دوبارہ لوہاری دروازے میں جمع ہو گیا، پولیس نے اس پر پھر گولی چلائی ۔ اگلے دن نمازِ جمعہ کے موقع پر شاہی مسجد لوگوں سے اٹی پڑی تھی، ہندو بھی کثیر تعداد میں موجود تھے ۔ کچھ ہندو رہنماؤں نے نماز کے بعد لوگوں سے خطاب کیا ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شام کو گورنمنٹ ہاؤس میں افسروں کے اجلاس میں پولیس کی یہ رپورٹ پہنچی کہ لوگوں نے ڈنڈا فوج قائم کر لی ہے اور جمعہ کی نماز کے موقع پر سب لوگوں کے پاس ڈنڈے موجود تھے ۔ گورنر نے ہفتہ کے دن لوگوں کو ہراساں کرنے کے لئے مسلح فوج سے شہر کی سڑکوں پر پریڈ کرائی اور دو فوجی چوکیاں قائم کر دیں ۔ لوگ پھر اکٹھے ہو گئے اور بادشاہی مسجد کے قریب ایک بار پھر گولی چلا دی گئی ۔ اپریل اور مئی تک مارشل لاء کے تحت مقدمات چلتے رہے ۔

ہندوستانیوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے بعد حاکموں نے لارڈ ہنٹر کی قیادت میں ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کر دیا ۔ اس کمیشن میں پنڈت جگت نرائن، سرچمن لال اور صاحبزادہ سلطان احمد شامل تھے ۔ جنرل ڈائر سے کمان واپس لے کر انگلستان بھیج دیا گیا ۔ اس موقع پر ہندوستان میں مقیم بہت سے انگریزوں نے چندہ جمع کر کے جنرل ڈائر کو بطور نذرانہ پیش کیا جو اس کی "اعلیٰ خدمات" کا صلہ تھا ۔ کچھ عرصہ بعد گورنر مائیکل کو اس کے عہدے سے ریٹائر کر دیا گیا ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مرکزی حکومت کی پیشگی منظوری اور ایک خاص ضابطہ کے بغیر مارشل لاء نافذ نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ لیکن ڈائر نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے یہ اقدام کیا ۔ کمیشن کے سامنے شہادتوں کے دوران یہ بات بھی کھلی کہ امرتسر میں ۲۴ گھنٹے تک پانی اور بجلی کی سپلائی بند رکھی گئی ۔ اس موقع پر ایک ہندو ہنس راج جو ٹکٹ کلکٹر رہ چکا تھا ، انگریزوں کے ساتھ مل کر غداری کرتا رہا اور دوسری طرف ہندوستانیوں کے ساتھ وفاداری کا مظاہرہ بھی کرتا رہا ۔ اس شخص نے امرتسر میں ۳ بنکوں کو لوٹا اور وہاں کے انگریز ملازموں کو قتل کیا تھا ۔ ۱۲ اپریل کو اس نے رولیٹ ایکٹ کے خلاف مظاہرہ کی سکیم بنانے کے لئے ایک سکول میں جلسہ منعقد کیا اور اس کی صدارت بھی کی ۔ اسی نے یہ اعلان کیا کہ وہ جلیانوالہ باغ میں ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کے پیغامات سنائے گا ۔ یہی شخص ۱۳ اپریل کو جلیانوالہ باغ کے جلسے کا منتظم بھی تھا ۔

لیکن اس کے باوجود اس کی گرفتاری عمل میں نہ آئی۔ اسے کمیشن کے سامنے سلطانی گواہ بنا کر پیش کیا گیا اور اس نے ایک انگریز خاتون مس شروڈ پر حملہ کرنے والوں کی شناخت بھی کی لیکن مارشل لاء ٹریبونل نے اسے رہا کر دیا۔

باب ۱۴

تحریکِ خلافت و عدمِ تعاون

ترک ۱۹۱۴ء تک بہت سے علاقوں سے محروم ہو چکے تھے۔ ترکی کی پہلی جنگِ عالمگیر میں شرکت اور اُس کے بعد بہت سے علاقوں سے محرومی نے ہندوستان کے مسلمانوں کو متفکر کر دیا تھا۔ مسلمان یُوں بھی زیادہ فکرمند تھے کہ ترکی، دنیا بھر میں مسلمانوں کی تنہا آزاد حکومت تھی اور شکست کی صورت میں مسلمانوں کا یہ مرکز بھی ختم ہو جاتا ـــــ وہی بات ہُوئی جس کا اندیشہ تھا۔ جرمنی کو شکست ہُوئی، ترکی اس کا حلیف تھا لہٰذا شکست کے اثرات قدرتی طور پر ترکی پر بھی مرتب ہوئے۔ صلح کے ایک ہنگامی معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے ذریعے ترکی کے لئے یہ شرائط تھیں کہ وُہ اپنی تمام فوج ختم کر دے گا، اس کے جنگی جہاز ضبط کر لئے جائیں گے، ایشیائے کوچک اور عرب میں سرحدات کے علاوہ ملک کا اندرونی انتظام ترکی کے پاس رہے گا اور ریلوے کی نگرانی اور استعمال کے مستحق اتحادی ہوں گے۔

یہی وہ حالات تھے جن کی وجہ سے مسلمان بے حد پریشان نظر آتے تھے۔ مسلمانوں کو اِس بات کا بھی بے حد رنج تھا کہ جنگ میں انہوں نے مسلمان بھائیوں کے خلاف ہاتھ اٹھایا۔ لیکن اس کے باوجود انگریز کے رویے میں معمولی سا فرق بھی نہ آیا تھا۔ جس وقت صلح کا ہنگامی معاہدہ ہُوا، محمد علی اور شوکت علی بدستور نظر بند تھے۔ قسطنطنیہ اور موصل پر انگریزوں کی حاکمیت نے ہندوستان کے مسلمانوں کے زخموں پر مزید نمک پاشی کی۔ مدراس لکھنؤ اور دتی کے علاوہ ہندوستان کے اور بہت سے مقامات پر احتجاجی جلسے منعقد ہوئے۔ اسی دوران بمبئی کے کچھ

متحمل لوگوں نے مجلسِ خلافت کے نام سے ایک انجمن قائم کر دی۔ اسی انجمن کو لکھنؤ کی مسلم کانفرنس میں آل انڈیا سنٹرل خلافت کمیٹی کا نام دے دیا گیا۔ مسلم کانفرنس نے اس کمیٹی کا مرکز بمبئی بنایا۔ کمیٹی کے صدر سیٹھ چھوٹانی اور سیکرٹری حاجی احمد صدیق کھتری منتخب ہوئے۔

خلافت کانفرنس کا پہلا اجلاس نومبر ۱۹۱۹ء میں دلی میں منعقد ہوا جس کی صدارت فضل الحق نے کی۔ اس کانفرنس میں پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالوی اور گاندھی بھی شریک ہوئے۔ کانفرنس میں کچھ قراردادیں منظور کی گئیں اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر اتحادی فوجوں کے انسانیت سوز اقدامات کی شدید مذمت کی گئی۔ صلح کا جو جشن منایا جا رہا تھا مسلمانوں کو اس میں شرکت سے باز رہنے کی ہدایت تھی۔ قرارداد میں کہا گیا کہ اگر صلح کانفرنس کا فیصلہ مسلمانوں کی مرضی کے برعکس ہوا تو غیر ملکی مال کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے گا۔ لیکن گاندھی نے اس قرارداد کی مخالفت اس بنیاد پر کی کہ ولائتی مال کا بائیکاٹ اس مسئلے کا مناسب حل نہیں۔ مولانا حسرت موہانی کو اس پر اصرار تھا۔ بہرحال دوسرے دن یہ قرارداد منظور کر لی گئی۔

کانفرنس کا ایک خاص اجلاس بھی منعقد ہوا جس کی صدارت گاندھی نے کی۔ اس اجلاس کے لئے آصف علی کی طرف سے جاری کردہ دعوت نامے میں گئو رکھشا پر غور کرنے کے مسئلہ کا پیوند بھی لگایا گیا۔ لیکن گاندھی اس مسئلہ کی نزاکت کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ہندو ایک مذہبی معاملہ میں اپنی ہمدردیاں پیش کر کے کسی سودا بازی کو عزت کی بات نہیں سمجھتے۔ اگر اس کانفرنس میں کچھ ہندو ایسے خیالات لے کر آئے ہوں تو چاہئے کہ انہیں دل سے نکال دیں۔ لیکن اس کے بعد جب بھی صلح کانفرنس ہوئی تو ہندوؤں نے ترکِ گاؤ کشی کا مطالبہ ضرور کیا۔

دو یا تین دن بعد مسلمان علماء کا ایک اجلاس دلی میں منعقد ہوا، جس میں جمعیت العلمائے ہند کا قیام عمل میں لایا گیا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس امرتسر میں ہوئے۔ دوسرے دن خلافت کانفرنس کا دوسرا اجلاس اور تیسرے دن جمعیت العلماء کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ اسی دوران مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات منظور ہوئیں۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی رہا کر دیئے گئے۔ وہ جیل سے نکلتے ہی امرتسر پہنچے اور تمام رہنماؤں سے خلافت کے مسئلے پر بات چیت شروع کر دی۔ خلافت کانفرنس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ خلافت اور جزائر عرب کے بارے میں مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے لئے مولانا محمد علی کی قیادت

میں ایک وفد انگلستان جائے، نیز خلافت فنڈ کے لئے ۱ لاکھ روپیہ جمع کیا جائے۔ اس وفد کے انگلستان جانے سے پہلے مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک مشترکہ وفد ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو وائسرائے ہند سے ملا۔ وفد نے وائسرائے کو مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا اور یہ مطالبہ کیا کہ ترکی کی سالمیت اور خلیفہ کی حیثیت کو ہر حال میں قائم رکھا جائے۔ اگر حکومت برطانیہ نے ترکی کے بارے میں اپنے تمام وعدے پورے نہ کئے تو برطانیہ کا اخلاقی وقار بری طرح مجروح ہوگا۔

وائسرائے نے وفد کو مایوسیوں کے سوا کچھ نہ دیا۔ آخر ایک بیان میں مسلمانوں نے واضح طور پر بتادیا کہ اگر صلح کے معاہدے کی شرائط، مسلمانوں کے مذہبی جذبات کے برعکس ہوئیں تو مسلمان حکومتِ برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداریاں زیادہ دیر تک قائم نہ رکھ سکیں گے۔ بیان میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ بہرحال سلطان ترکی کے اختیار اور انتظام میں رہنے چاہئیں۔

فروری ۱۹۲۰ء میں خلافت کانفرنس کا تیسرا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس میں انگلستان بھیجے جانے والے وفد کا معاملہ بھی طے ہونا تھا۔ چنانچہ اجلاس نے ایک نہایت اہم قرارداد منظور کی اور حکومتِ برطانیہ کو انتباہ کیا کہ مسلمانوں کا جو وفد مطالبات لے کر انگلستان جا رہا ہے اگر ان میں کوئی کمی کی گئی تو مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو سخت ٹھیس پہنچے گی، ان مطالبات میں نہ صرف ہندوستان کے مسلمان بلکہ ہندو بھی برابر کے شریک ہیں اور اگر کوئی غلط فیصلہ کیا گیا تو اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔

مطالبہ یہ تھا کہ برطانوی اور اتحادی، جنگ کے وقت کئے گئے تمام وعدوں کو حرف بحرف پورا کریں۔

وزیر اعظم سے ملاقات

خلافت وفد مارچ ۱۹۲۰ء میں انگلستان روانہ ہوگیا۔ وفد میں مولانا محمد علی، حسن محمد حیات، مولانا سید سلیمان ندوی، مولوی ابوالقاسم، محمد شعیب قریشی، عبدالرحمان صدیقی اور مشیر حسن قدوائی شامل تھے۔ مولانا محمد علی قائد اور حسن محمد حیات وفد کے سیکرٹری تھے۔ وزیر ہند کے نمائندہ فشر کے بعد وفد کی ملاقات برطانیہ کے وزیر اعظم لائڈ جارج سے ہوئی مولانا محمد علی نے

وزیر اعظم کو ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا لیکن لائڈ جارج نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ یہ جواب دیا کہ جن اصولوں پر عیسائی ممالک کے ساتھ معاملہ کیا گیا ہے ۔ انہی اصولوں کی بنیاد پر ترکوں کے ساتھ معاملہ طے پائے گا۔ جو علاقے ترکی نہیں ہیں اُن پر قبضہ بدستور رہے گا تاہم ترکی کو اپنی سرزمین پر دنیاوی اختیارات کے استعمال کی اجازت ہوگی۔

دوسرے الفاظ میں وزیر اعظم برطانیہ لائیڈ جارج نے ہندوستان کے مسلمانوں کو کورا جواب دے دیا تھا۔ اس طرح برطانیہ نے اپنے تمام گذشتہ اعلانات اور مواعید کو فراموش کرکے اپنی قدیم روایات و قائم رکھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمان انگریزوں سے سخت نفرت کرنے لگے ۔ خلافت کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو انگریز کی اس مکاری کے احتجاج کے طور پر یوم ماتم منایا جائے ۔ اس روز عام ہڑتال ہو، دعائیں کی جائیں اور مسلمان روزے رکھیں۔

کشمکش کا آغاز

۱۹ مارچ کو مولانا شوکت علی نے ایک قرارداد تیار کی جس میں کہا گیا تھا کہ اگر صلح کی شرائط مسلمانوں کی توقعات پر پوری نہ اُتریں تو مسلمان تاج برطانیہ کے ساتھ اپنی وفاداری ختم کردیں گے ۔ اس قرارداد کے جواب میں حکومت کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا کہ ۱۹ مارچ کو "یوم ماتم" کی تقریبات میں کوئی سرکاری ملازم شرکت نہیں کرسکتا۔ امرتسر کی خلافت کانفرنس میں کئے گئے اس وعدے کی روشنی میں کہ اگر خلافت کے سلسلے میں ہندو مسلم مشترکہ تحریک چلانے کا وقت آیا تو تحریک کی قیادت گاندھی کریں گے، وقت آگیا، گاندھی نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اعلان کیا کہ اگر ترکی کو صلح کی ایسی شرائط پر دستخط کرنے پر مجبور کیا جائے جو ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کے برعکس ہوں تو عدم تعاون کی تحریک شروع کی جائے گی ۔ اگلے دن انہوں نے عدم تعاون کے بارے میں بتایا کہ یہ فیصلہ باقی ہے کہ اگر مسلمانوں کے مطالبات پورے نہ ہوئے تو عدم تعاون کے لئے کیا انداز اختیار کیا جائے، جنگ کھلی ہو یا چھپی ہوئی، بہرحال انسانی تقاضوں کے تحت عدم تعاون کے لئے عدم تشدد کا انداز اختیار کیا جائے۔ جب کسی کے مذہبی جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی جائے تو عدم تعاون فرض ہو جاتا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ انگلستان تو ہندوستانیوں کے حقوق کو پامال کرتا رہے اور ہندوستانی عوام عجز و انکسار کے ساتھ اس پامالی پر سر تسلیم خم کرتے رہیں۔ جو چیز مسلمانوں کے لئے زندگی اور موت کا معاملہ ہے اسے کسی صورت بھی اور کوئی بھی قبول کرنے

پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔

گاندھی نے سرکاری ملازموں سے اپیل کی کہ وہ خواہ کسی بھی عہدے پر ہوں، انہیں ملازمت ترک کر دینا چاہئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگ رضاکارانہ طور پر یہ اقدام کریں تاہم فوج کو فی الحال اس اقدام کا مشورہ نہیں دیا جاتا۔ ممکن ہے وہ وقت بھی آ جائے لیکن ابھی اس کا انتظار کرنا ضروری ہے۔

خلافت وفد کی واپسی سے پہلے ہی اتحادیوں کے نمائندوں کا ایک اجلاس پیرس میں ہوا جس نے ترکی کے لئے معاہدے کی شرائط مرتب کیں۔ شرائط کے مطابق سلطان ترکی کو اتحادیوں کی حمایت کے ساتھ قسطنطنیہ پر حکومت کرنا تھی۔ اتحادیوں کو ایشیائی ترکی کے کسی حصے اور آبنائے پر قبضے کا اختیار تھا۔ چھ ریاستوں پر مشتمل ایک نئی ریاست آرمینیا کے قیام کی تجویز تھی۔ حدود کا تعین امریکہ کی مدد سے کیا جانا تھا۔ عرب کے بارے میں ترکی کو اپنے تمام دعاوی سے دست بردار ہونا اور شام، عراق و اُردن کی حکم برداری علی الترتیب فرانس اور برطانیہ کو دی جانا تھی۔ عدلیہ اٹلی کے سپرد اور سمرنا اور مغربی اناطولیہ یونان کے سپرد کیا جانا تھا۔

یہ شرائط انگریز کے انتقام اور اس کی روایتی پستی کی غمازی کر رہی تھیں۔ ان شرائط پر دنیا بھر کے مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا۔ حتیٰ کہ سلطان ترکی نے بھی! لیکن مسلسل دباؤ سے مجبور ہو کر آخر کار ترکی نے بھی ۱۰ راگست ۱۹۲۰ء کو اس معاہدۂ سیورے پر دستخط کر دیئے۔ ۱۴ رمئی ۱۹۲۰ء ہی کو اس معاہدے کی اشاعت ہندوستان میں ہو چکی تھی۔ جب اس پر دستخط ہوئے تو ہندوستان کے عوام میں شدید اضطراب پھیل گیا۔ ۲ رجون کو الہ آباد میں ہندو آل پارٹیز کانفرنس نے بھی باضابطہ طور پر عدم تعاون کی تجویز منظور کر لی۔ گاندھی، سیف الدین کچلو، حاجی محمد صدیق کھتری، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور ابوالکلام آزاد اس کمیٹی کے رکن تھے۔

یہ فیصلہ تو کیا ہی جا چکا تھا کہ حکومت سے تعاون ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ خلافت کمیٹی نے یکم اگست ۱۹۲۰ء کو ملک گیر ہڑتال کرا دی۔ گاندھی نے قیادت سنبھالی اور حکومت کی طرف سے دیئے گئے تمام تمغے واپس کر دیئے۔ گاندھی، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی نے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور لوگوں کو پُرامن رہنے کی تلقین کی۔

تحریکِ عدمِ تعاون

کانگریس نے ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء کو اپنے اجلاس کلکتہ میں اکثریت رائے سے گاندھی کی یہ قرارداد منظور کر لی کہ ہر ہندوستانی خواہ وہ غیر مسلم ہو، کا فرض ہے کہ خلافت کے مسئلہ پر مسلمانوں کا ساتھ دے۔ قرارداد میں حکومت کے اس اقدام کی مذمت بھی کی گئی کہ اس نے ایسے تمام لوگوں کو بری کر دیا جنہوں نے پنجاب میں عوام پر ظلم ڈھایا تھا۔ لہٰذا محسوس ہوتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ اور حکومتِ ہند کو ہندوستان کے لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں۔

اسی دوران کلکتہ ہی میں مسلم لیگ کا اجلاس بھی منعقد ہوا جس کی صدارت محمد علی جناح نے کی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت تک محمد علی جناح بدستور کانگریس کے باقاعدہ رکن تھے۔ انہوں نے انتہائی محتاط رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ محمد علی جناح نے صدارتی تقریر کے دوران کانگریس کی تجاویز کی طرف مسلم لیگی رہنماؤں کی توجہ مبذول کرائی تاہم انہوں نے بذاتِ خود ان تجاویز کے بارے میں خاموشی اختیار کیے رکھی۔

کانگریس کے اجلاس کی صدارت لالہ لاجپت رائے نے کی۔ اس دوران ایک بنگالی ہندو کانگریسی نے گاندھی کی تجاویز میں اس مفہوم کی تجویز بھی شامل کی کہ عدمِ تعاون کے پروگرام میں 'سوراج' کا مقصد بھی شامل کیا جائے۔ گو اس موقع پر بھی گاندھی اسی بات کو دُہرانا چاہتے تھے جو انہوں نے خلافت کانفرنس کے دوران کہی تھی کہ ہندو ایک مذہبی معاملہ میں اپنی ہمدردیاں پیش کر کے سودا بازی کو باعث بات نہیں سمجھتے، لیکن اجلاس کے کچھ مسلمان نمائندوں ہی کی درخواست پر یہ ترمیم منظور کر لی گئی۔ اس طرح خلافت کا مسئلہ اور کانگریس کے مقاصد باہم گڈمڈ ہو گئے۔ اس فیصلے کی توثیق دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے اجلاس ناگپور میں کر دی گئی۔

اس اجلاس میں محمد علی جناح واحد شخص تھے جنہوں نے عدمِ تعاون کی تجاویز کے خلاف تقریر کی۔ اُن کا خیال تھا کہ اس اقدام سے فسادات کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہی وہ مرحلہ تھا جب محمد علی جناح نے کانگریس کی رکنیت سے استعفا دیا اور آخری سانس تک کے لئے مسلم لیگ کے ساتھ منسلک ہو کر رہ گئے۔

عدمِ تعاون کی تحریک تو منظور ہو چکی تھی۔ انہی دنوں جب نئے آئین کے تحت مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو کانگریس کے اجلاس ناگپور کے فیصلے کے

اتباع میں بہت سے امیدواروں نے اپنے کاغذاتِ نامزدگی واپس لے لئے۔ کچھ دنوں بعد نو تشکیل
اسمبلی اپنے کام کا آغاز کر چکی تھی، لیکن دوسری طرف جمعیت العلمائے ہند نے سیکڑوں علماء
کے دستخطوں کے ساتھ یہ فتویٰ شائع کر دیا کہ انگریزوں کے ساتھ عدم تعاون مذہبی فریضہ
اور ہندوستان "دارالحرب" ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ہجرت شروع کر دی۔ اگست ۱۹۲۰ء
میں صوبہ سرحد، سندھ اور پنجاب کے مسلمانوں نے افغانستان کو ہجرت شروع کی۔ مسلمانوں نے
اپنا تمام اثاثہ سستے داموں فروخت کر دیا۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً ۱۸ ہزار مسلمان
افغانستان کی سرحد پر پہنچ گئے لیکن انہیں وہاں بھی امان نہ مل سکی۔ ان کی یہ توقع غلط ثابت ہوئی کہ
افغانستان کی مسلمان حکومت انہیں خوش آمدید کہے گی۔ افغان حکومت نے انہیں سرحدوں ہی پر
روک لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان واپس آنے لگے اور بہت سے لوگ راہ کی صعوبتوں کے باعث
جاں بحق ہو گئے۔

نظریاتی تفریق

گاندھی، مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی تحریکِ خلافت اور "سوراج" کے سلسلے
میں طوفانی دورہ کر رہے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گاندھی اور مولانا شوکت علی کے
نظریات میں ہم آہنگی نہ پائی جاتی تھی۔ ایک بنیادی بات یہ تھی کہ گاندھی ابھی لوگوں کو اس
کے لئے تیار کر رہے تھے کہ بوقتِ ضرورت وہ کسی بھی اقدام کے لئے تیار رہیں نیز رضاکاروں
کی بھرتی پر زور دے رہے تھے، مگر اس کے برعکس مولانا محمد علی یہ سمجھتے تھے کہ عدم تعاون کا
وقت آ چکا تھا اور اب حکومت سے ٹکرانے میں دیر نہیں کرنا چاہئے تھی۔ انہی دنوں حکومت نے
کریمنل لاء امینڈمنٹ ایکٹ منظور کیا اور رضاکاروں کی بھرتی کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔
عدم تعاون تو بنیاد بن ہی چکا تھا لہٰذا گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۲۱ء اور
جنوری ۱۹۲۲ء کے دوران کم از کم ۳۰ ہزار ہندو مسلمان رضاکاروں سے جیلیں بھر چکی تھیں۔
بظاہر یہ اتحاد کا اعلیٰ ترین مظاہرہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس اتحاد میں تصنع کا عنصر غالب تھا۔
شاید مسلمان رضاکار خلافت کی خاطر اور ہندو رضاکار "سوراج" کی خاطر گرفتاریوں کے لئے
پیش ہو رہے تھے۔ اگر دیکھا جائے تو عدم تعاون کی باضابطہ تحریک کے آغاز سے قبل ہی
سول نافرمانی کی مہم شروع ہو چکی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مولانا محمد علی اپنی تقاریر میں

ہندوستان سے انگریز سامراج کے خاتمہ اور مسلمانوں پر ہندوستان کو آزاد کرانے کے فرض کی بات کرتے تو ہندو، مسلمانوں کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگتے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مئی ۱۹۲۱ء میں گاندھی نے اپنے اخبار میں یہ بات کہی کہ اب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں سے غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ختم نہیں ہوئیں۔ ہندو سمجھتے ہیں کہ ہندوستان سے انگریز چلا گیا تو مسلمان بعض دیگر مسلمان طاقتوں کے ذریعے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرلیں گے جبکہ مسلمانوں کا اندیشہ یہ ہے کہ انگریز کے بعد ہندو اکثریت ان پر غلبہ حاصل کرلے گی۔

۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں پھر خلافت کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ کانفرنس نے برطانوی فوج میں مسلمانوں کی شرکت کو مذہبی اعتبار سے ناجائز قرار دے دیا۔ ایک قرارداد میں حکومت برطانیہ کو تنبیہ کی گئی کہ اگر ترکی کے خلاف برطانیہ کی طرف سے کوئی جارحانہ اقدام لیا گیا تو ہندوستانی مسلمان، ہندوستان کی آزادی کا اعلان کردیں گے اور جب کانگریس کا آئندہ اجلاس منعقد ہوگا تو نئی انڈین ری پبلک کا پرچم بلند کردیا جائے گا۔ مولانا کو گرفتار کرکے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں جب پرنس آف ویلز بمبئی پہنچے تو زبردست مظاہرہ کیا گیا۔ فوج نے مظاہرین پر گولی چلائی جس کے نتیجے میں ۵۵ افراد ہلاک ہوگئے۔ ساتھ ہی مدراس میں فسادات شروع ہوئے اور کچھ دنوں بعد مالابار کی پہاڑیوں میں موپلوں نے بغاوت کردی۔ موپلوں نے ہندوستانی فوجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ۱۹۲۱ء رخصت ہو رہا تھا اور لاتعداد مسلمان اور ہندو رہنما جیلوں میں پہنچ چکے تھے۔ فروری ۱۹۲۲ء میں گورکھپور کے ایک قصبے چورا چوری میں عوام اور پولیس میں زبردست تصادم ہوگیا، فائرنگ ہوئی، جب گولیاں ختم ہوگئیں تو پولیس نے تھانے میں پناہ لی اور ہجوم کی آمد کے خوف سے دروازے بند کرلئے۔ عوام نے تھانے کو آگ لگادی، نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس کے سب افراد زندہ جل مرے۔ گاندھی نے تشدد کے اس واقعہ کا اتنا گہرا اثر قبول کیا کہ فوری طور پر کانگریس کی مجلس عاملہ سے سول نافرمانی کی تحریک بند کرنے کا اعلان کرادیا —
۱۳ مارچ ۱۹۲۲ء کو حکومت نے گاندھی کو بھی گرفتار کرلیا۔

یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ گاندھی فی الواقعہ گورکھپور میں تشدد کے اس واقعہ سے اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے سول نافرمانی کا سلسلہ ختم کرادیا یا انہیں مولانا محمد علی کی تقاریر اور دیگر ہندو رہنماؤں کے خدشات کی بنیاد پر اس بات کا احساس ہوا کہ خلافت اور

سوراج' کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کرنا بنیادی طور پر غلط تھا۔ تحریک کیا ختم ہوئی، ہندو اور مسلمانوں کا مصنوعی اتحاد بھی دُودھ کے ابال کی طرح بیٹھ گیا۔ اسس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی بنیاد اور زیادہ مضبوط ہو گئی۔

دوسری طرف جب موپلوں کو خلافت تحریک کی اطلاع ملی تو انہوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کے بعد اپنے ایک رہنما حاجی محمد کی قیادت میں حکومتِ خلافت کے قیام کا اعلان کر دیا۔ جب پولیس موپلوں کی بغاوت فرو کرنے میں ناکام ہو گئی تو فوج ان کے مقابلے پر اتر آئی۔ سو ماہ تک فوج اور موپلوں کے درمیان آنکھ مچولی ہوتی رہی اور تقریباً دو ہزار موپلے اس معرکے میں مارے گئے۔ اس موقع پر انگریز فوج نے ایک بار پھر جلیانوالہ باغ امرتسر میں جنرل ڈائر کی یاد تازہ کر دی۔ ایک فوجی افسر نے تقریباً ۱۱۰ موپلوں کو مال گاڑی کے ایک ڈبے میں بند کر کے کسی دوسری جگہ منتقل کیا۔ بلا کی گرمی پڑ رہی تھی۔ شام کو جب ڈبے کے دروازے کھولے گئے تو ۶۲ موپلے گرمی اور پیاس کی شدت سے مر چکے تھے اور باقی جاں بلب تھے۔ انگریز کے لئے اس سے بہتر موقع کوئی نہ تھا کہ ہندو مسلم اتحاد (گو یہ اتحاد برائے نام تھا) پر کاری ضرب لگائی جائے۔ اس لئے یہ خبر گھڑی کہ دراصل موپلوں نے مذہبی جنون کے تحت ہندو زمینداروں اور دیگر متمول ہندوؤں پر حملے کئے تھے۔ لہذا فوج کو ہندوؤں کی حفاظت کے لئے روانہ کیا گیا تھا۔

اس خبر کے چھپتے ہی ہندوستان میں جگہ جگہ ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے۔

تحریکِ خلافت کا انجام

بہت سے رہنما جیلوں سے آ چکے تھے۔ باہم مشورے کے بعد انہوں نے یہ کوشش شروع کر دی کہ جن اسمبلیوں کا بائیکاٹ کیا گیا تھا وہ ختم کر کے آئندہ انتخابات میں حصہ لیں۔ اس طرح کانگریس نے انتخابات کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔ گاندھی نے کھدر پہننے، چرخہ چلانے اور تشدد و تعصب دور کرنے کی تلقین شروع کر دی۔ مسلمانوں کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ انہوں نے عدم تعاون کو مذہبی فریضہ قرار دیا تھا۔ لہذا وہ انتخابات سے دُور دُور رہے۔ اُدھر ترکی میں مصطفیٰ کمال اتاترک نے جدوجہد شروع کر دی تھی اور سلطان کو علیحدہ کر کے ترکی کو جمہوریہ بنا دیا تھا لہذا خلافت کا نعرہ جو ترکی کے لئے اٹھا تھا، خود ترکی ہی میں ختم ہو کر رہ گیا۔ اس طرح ہندوستان میں خلافت کی تحریک عملی طور پر ختم ہو کر رہ گئی۔

تحریکِ خلافت اور اعتراضات

تحریکِ خلافت کے ختم ہوتے ہی خلافت کمیٹی بھی عملاً معطل ہو کر رہ گئی۔ موقعہ پرست تو
ہی تاک میں تھے۔ انہوں نے تحریکِ خلافت اور اس کے رہنماؤں کے بارے میں طرح طرح
باتیں شروع کر دیں۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ہدفِ تنقید مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی
بایا گیا۔ جب ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کا آغاز ہو گیا تو مخالفین نے اس کی تمام
داری ان پر عائد کی اور دیگر دشواریوں کے لئے بھی تحریکِ خلافت اور اس کے رہنماؤں کو
دار الزام قرار دیا۔

تحریکِ خلافت پر ایک اعتراض تو یہ تھا کہ ترکی کے مسئلہ میں انتہائی دلچسپی کا اظہار اپنے مال
ن کی قیمت پر کیوں کیا گیا اور اس طرح مسلمانانِ ہند کی قوتِ عمل کا ضیاع ہوا۔ دوسرا
اض یہ تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد اور گاندھی کو قائد تسلیم کرنے کے بعد مسلمانوں پر ہندوؤں
برتری قائم ہو گئی۔

جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ مسلمانوں نے ایک غیر ملکی مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنا لیا تو
کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ معترضین بلاشبہ بنیادی اسلامی عقائد اور اسلامی
یات سے بے بہرہ تھے۔ اسلام ایک آفاقی اور عالمگیر مذہب ہے۔ یہ کسی وطن کا نام ہے نہ
مخصوص قوم کا! جب قرآن نے واضح طور پر کہہ دیا کہ تمام مسلمان بھائیوں کی طرح ہیں تو پھر سرزمین،
، نسل یا ایسی کسی دوسری تفریق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسلمان کے لئے ہر وہ زمین مقدس
جہاں اس کا وجود ہے خلافت ترکی کی تھی یا یہ مسئلہ کسی دوسرے اسلامی ملک سے متعلق ہوتا،
ہندوستان کے مسلمانوں ہی کا نہیں بلکہ عالمِ اسلام کا مسئلہ تھا۔ اگر مشکل اور مصیبت کے موقع
سلمان، مسلمان کی مدد نہ کرے تو اسلام کے آفاقی تصور اور اس کی عالمگیریت کا کوئی جواز نہیں
تا۔ علاوہ ازیں جب دشمنوں سے مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کا سوال پیدا ہوا تو کیا ہندوستان یا
کے دوسرے ممالک میں بسنے والے مسلمان یہ کہہ کر جان چھڑا سکتے تھے کہ یہ ان کے وطن کا
مسئلہ نہیں؟ کیا تمام مقاماتِ مقدسہ ہمارے لئے "غیر" ہیں — ؟ اس لئے کہ وہ "مغربی تصور"
تحت ہمارے 'وطن' میں واقع نہیں۔ دراصل معترضین وطنیت کے جس تصور کے تحت یہ
تراض کر رہے تھے، وہ تصور اسلامی نہیں۔ لہٰذا ہندوستان کے مسلمانوں نے مقامات

مقدسہ کی حفاظت اور ترکی کی سرزمین کو بچانے کے لئے جو تحریک چلائی وہ قطعی طور پر اسلامی تحریک تھی نہ کہ اس کا تعلق کسی ذاتی مخاصمت یا دوستی سے تھا۔ یہ تحریک کلیتاً اسلامی عقائد اور مسلمانوں کے لئے درد اور کسک کے تحت چلائی گئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ تحریک خلافت میں ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کے باوجود مولانا محمد علی تمام جلسوں میں برملا کہتے کہ انگریز سامراج سے ہندوستان کو نجات دلانا مسلمانوں کا فرض ہے۔ انہی تقاریر کی بنا پر ہندوؤں میں اس شبہ نے بھی جنم لیا کہ مسلمان، ہندوؤں کو غیر ملکی مسلمان طاقتوں کے ذریعہ مغلوب کرنا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہی تھا تو آخر دم تک گاندھی اور مولانا محمد علی کی تقاریر میں ہم آہنگی کیوں پیدا نہ ہو سکی؛

جہاں تک گاندھی کو قیادت سونپنے کا سوال تھا تو حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ پیکٹ کی بنیاد پر ہندو مسلم اتحاد قائم ہو چکا تھا جس کے سلسلہ میں خود محمد علی جناح نے بھرپور کوشش کی تھی۔ مگر سیاسی حالات تھے کہ الجھتے چلے جا رہے تھے۔ اِدھر مونٹیگو، چیمسفورڈ اصلاحات کی آمد، اُدھر جنگ کا آغاز — قانونِ تحفظ کا نفاذ — ہندو مسلمان رہنماؤں کی گرفتاریاں اور پریس ایکٹ کے تحت زباں بندی کا اقدام — جنگ ختم ہوئی تو رولٹ ایکٹ آ گیا۔ اسی ایکٹ کے خلاف احتجاج ہندوستان میں مارشل لاء کے نفاذ کا سبب ہوا۔ مارشل لاء کے دوران انگریز نے ہندوستانیوں پر جو مظالم ڈھائے وہ ہلاکو اور چنگیز خاں کو بھی شرماتے ہیں۔ اس موقع پر ضرورت اس بات کی تھی کہ ہندوستان کے رہنے والے تمام باشندے، بلا امتیاز مذہب — انگریز سامراج کے خلاف جدوجہد میں مصروف ہو جاتے۔ گاندھی کی ستیہ گرہ تحریک تمہید بن چکی تھی — خلافت کا مسئلہ شروع سے مسلمانوں میں اضطراب کا باعث تھا۔ اگر یہ سب عناصر مل کر — ایک متحدہ محاذ کی صورت میں انگریز کے خلاف ڈٹ گئے تو اس میں برائی کیا تھی۔ یہ بات واضح ہے کہ اس دوران بھی مولانا محمد علی تحریکِ خلافت کے "کمان دار" کی حیثیت میں کام کر رہے تھے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ گاندھی کی قیادت نے ہندو کی برتری قائم کی۔ اگر مسلمانوں نے گاندھی کی قیادت کو اپنے اُوپر مسلط کر لیا ہوتا تو فوراً بعد فسادات نہ ہوتے۔ علاوہ ازیں اس تحریک کے تمام عرصہ میں ایک موقع بھی ایسا نہ آیا جب مسلمانوں نے اپنی قیادت کا دامن جھٹک کر ہندو پر اندھے اعتماد کا مظاہرہ کیا ہو۔ مولانا حسرت موہانی، محمد علی جناح، سردار عبدالرب نشتر، مولانا شوکت علی — اور ایسے متعدد نمایاں مسلمان رہنما — تحریکِ خلافت کے سرگرم رکن رہے۔ انہی لوگوں نے آگے چل کر قوم کے لئے واضح اور ٹھوس خطوط کا تعین کیا

باب

ہندوستان کی سیاست

[illegible]

ہندو مسلم فسادات اور شدھی

تحریک خلافت اپنے انجام کو پہنچی۔ گاندھی نے تحریک عدم تعاون ترک کر دی۔ موپلوں کی بغاوت کچل دی گئی اور ہندو مسلمان میں تفریق پیدا کرنے کے لئے انگریز کی یہ مکاری چل لائی کہ موپلوں نے بغاوت نہیں کی تھی بلکہ ہندوؤں کو نشانہ ستم بنایا تھا۔ لہذا ہندوستان کے کونے کونے میں ہندو مسلم اتحاد کی جگہ فسادات اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہندوؤں نے انگریز کی بات پر ایمان لاتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف مسلح جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ انگریز تو خیر بڑی دیر سے اس وقت کا منتظر تھا کہ مسلمان اور ہندو کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا کر اپنی حکومت قائم رکھے۔ لہذا اس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے متعصب ہندو رہنما سوامی شردھانند کو رہا کر دیا اور اسے شدھی کی تحریک کا از سر نو آغاز کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ سوامی شردھانند جیل سے آتے ہی اپنے مشن میں مصروف ہو گیا۔ ادھر لالہ لاجپت رائے نے ہندو سنگھٹن تحریک کا آغاز کرتے ہی ہندو جوانوں کو دست بدست، لاٹھی یا تلوار کی جنگ کی تربیت دینے کے لئے لاتعداد مراکز قائم کر دیئے سب سے پہلا ہندو مسلم فساد ملتان میں ہوا۔ پھر دیکھتے دیکھتے ہندوستان کا کوئی بڑا شہر ان ہنگاموں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی جائداد لوٹنے میں پہلا جوش د

خروش دکھایا۔

سوامی شردھانند جس کا اصل نام منشی رام تھا، کسی وقت پنجاب پولیس میں سب انسپکٹر ہوا کرتا تھا۔ بعدازاں اس نے کچھ عرصہ وکالت کی اور پھر سنیاسی بن کر ہردوار میں دُھونی رما کر بیٹھ گیا۔ وہیں سے اسے سوامی شردھانند کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ جب رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہرے ہوئے تو اس نے ان میں بھی تھوڑا بہت حصہ لیا۔ اس نے مسلمانوں کے دل میں اپنی مکاری اور چرب زبانی سے اتنا گھر کر لیا کہ رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہروں کے دوران ایک بار مسلمانوں نے اسے اپنے کندھوں پر اُٹھایا اور جامع مسجد میں لے گئے۔ مسلمان بسا اوقات حماقت کی حد تک جذباتی ہو جاتے ہیں۔ شوامی شردھانند کے لئے جامع مسجد دہلی کے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کرنے کا اعزاز بھی مسلمانوں کی اسی حماقت کا نتیجہ تھا۔ تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں حکومت نے اسے جیل بھیج دیا۔ جیل سے معافی ہوتے ہی باہر نکلا تو اس نے اچانک شدھی کا نعرہ لگا دیا۔ اس کے نعرے کی منطق یہ تھی کہ ہندوستان میں جتنے بھی مسلمان موجود ہیں، سب ہندوؤں کی اولاد سے ہیں۔ لہٰذا ہندوؤں کا مقدس فرض یہ ہے کہ ان سب مسلمانوں کو ہندو بنا دیا جائے۔ سوامی شردھانند نے یہ مہم آگرہ کے دیہی علاقوں سے شروع کی، جہاں تقریباً ۷ ہزار ایسے راجپوت موجود تھے جو برائے نام مسلمان اور ہندوانہ رسومات کے پابند تھے۔ اس حقیقت سے فرار نہیں کہ شدھی مہم کی ابتداء میں ان راجپوت قبائل نے بار بار مسلمان مولویوں کو دعوت دی کہ ان کے علاقہ میں آکر جلسے منعقد کریں اور ہندوؤں سے مناظرہ کریں۔ لیکن کسی بھی مسلمان عالم یا مولوی نے ان کی بات پر کان نہ دھرا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ملکانہ راجپوت جو ہندو سے مسلمان ہوئے تھے، دوبارہ ہندو ہو گئے۔ بہرحال ان کے شدھ ہوتے ہی ہندوستان کے مسلمانوں میں شدید بے چینی پیدا ہو گئی۔ کچھ مسلمان تبلیغی جماعتیں بھی قائم کی گئیں۔ غالباً مسلمانوں میں واحد شخص راجہ غضنفر علی خاں تھے، جو ان راجپوتوں کے پاس گئے لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ انہیں دوبارہ دائرہ اسلام میں شامل کرنا بے سُود ہوگا، کیونکہ ہندو اور مسلمان کے جھگڑے میں اور مولویوں کی غفلت اور عدمِ توجہی کے باعث ان راجپوتوں نے ایک عجیب رویہ اختیار کر لیا تھا۔ ان کے پاس کوئی جاتا تو وہ زمینداروں کے قرضوں اور رہن اراضی یا لگان کے بقایاجات کی بات کر کے رقم اینٹھنے کی کوشش کرتے اور ہندو مسلمان دونوں سے یہ کہتے کہ وہ دل سے ان ہی کے مذہب کے ساتھ ہیں۔ اگر شروع میں ہی مسلمانوں کی طرف سے

کوئی اقدام کیا جاتا تو شاید انہیں پیسے کی یہ چاٹ نہ لگتی۔ ابتداء تو اس وقت ہوئی تھی جب سوامی شردھانند کے چیلے جاٹوں نے ان راجپوتوں کو پیسہ کا لالچ دیا اور راجپوتوں نے اس روپیہ کو کمائی کا ذریعہ بنا لیا۔

سوامی شردھانند ایک مسلمانوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترا۔ اس کے قتل کے بعد فسادات اور بلووں میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔

ہندو مہا سبھا، معاہدہ لکھنؤ کے وقت سے اس بات کے لئے کوشاں تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد نہ ہو جائے۔ اس کے سربراہ پنڈت مدن موہن مالویہ تھے۔ ایک اور رہنما لالہ ہردیال بھی تھا جس نے کھلے بندوں یہ نعرہ بلند کیا کہ اگر ہندوؤں نے فوجی تربیت حاصل نہ کی، ہندوستان میں ہندو راج قائم نہ کیا، مسلمانوں کو ہندو نہ بنایا اور افغانستان اور سرحد کے علاقوں کو فتح کر کے وہاں کے عوام کو ہندو مت میں شامل نہ کیا تو ہندوؤں کا مستقبل تاریک ہو کر رہ جائے گا۔ لالہ ہردیال نے کہا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں صرف اس صورت میں رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ ہندوانی نام اختیار کریں۔ ہندوؤں کی مذہبی تقاریب میں شرکت کریں ہندوؤں کے بزرگوں کے ترانے گائیں، ہندوؤں ایسا لباس پہنیں، ان کی رسومات کو اپنائیں اور خود کو مسلمان کہلانا چھوڑ دیں۔ البتہ اگر اس کے بعد بھی وہ اپنے مذہبی عقائد پر قائم رہنا چاہیں تو انہیں اپنے طریق پر عبادت کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے لیکن انہیں "محمدی ہندو" کہلانا ہوگا۔

مسلم لیگ نے ہر موقع پر یہ کوشش کی کہ ہندو اور مسلمان اتحاد کا مظاہرہ کریں۔ لیکن مذکورہ بالا ہندو تحریکوں کی وجہ سے ایسی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے تعصب کا عالم یہ تھا کہ وہ نمایاں کانگریسی مسلمانوں کو بھی برداشت نہ کرتے۔ جب دلی میں مرکزی اسمبلی کے لئے مخلوط بنیادوں پر انتخابات ہوئے تو آصف علی بھی امیدواروں میں شامل تھے۔ وہ خود کٹر کانگریسی تھے اور کانگریس کے اندر بھی انہیں نمایاں مقام حاصل تھا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ نے ان کی شدید مخالفت کی حتیٰ کہ وہ انتخابات ہار گئے۔ اس موقعہ پر گو پنڈت موتی لال نہرو نے ہندو تعصب کے بارے میں ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکالا البتہ یہ کہہ دیا کہ پنڈت مدن موہن نے مخلوط حلقۂ نیابت میں آصف علی کی شدید مخالفت کر کے مخلوط انتخابات کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔

تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدم تعاون کو اچانک بند کر دینے کے بعد گاندھی، ہندو مسلم

اتحاد کا نقاب اتار کر اب اپنے اصل روپ میں ظاہر ہو گئے تھے۔ ہندوؤں کی طرف سے یہ مطالبہ زور پکڑ رہا تھا کہ "گؤ ہتھیا" بند کی جائے۔ گاندھی دو قدم اور بڑھے، انہوں نے یہ نعرہ لگایا کہ اُس وقت تک "سوراج" حاصل نہیں کیا جا سکتا جب تک ہم گائے کے تحفظ کے بارے میں کسی فیصلہ کن مرحلے پر نہیں پہنچ جاتے۔

گاندھی، جو زندگی بھر ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگاتے رہے اور جنہوں نے تحریکِ خلافت کے دنوں میں بڑے اعتماد کے ساتھ یہ بات کی تھی کہ ہندو، مسلمانوں کے مذہبی معاملہ میں اپنی ہمدردیاں پیش کر کے سودا بازی کو عزت کی بات نہیں سمجھتے، نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" میں جو مضمون لکھا وہ ہندو ذہنیت اور گاندھی کے بہروپ کی مکمل نقاب کشائی کرتا تھا۔

"مسلمان یا تو عرب حملہ آوروں کی اولاد ہیں یا وہ لوگ جو ہم میں سے تھے اور اب ہم سے الگ ہو چکے ہیں۔ اگر ہمیں اپنا وقار قائم رکھنا ہے تو ہمیں صرف تین طریقے تلاش کرنا پڑیں گے:

۱۔ مسلمانوں کو اسلام سے الگ کر کے اُن کے پرانے دھرم پر واپس لایا جائے۔

۲۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو مسلمانوں کو ان کے اپنے قدیم علاقے میں واپس بھیج دیا جائے۔ اور

۳۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ان لوگوں کو ہندوستان میں رعایا بنا کر رکھا جائے۔"

گاندھی کے اس مضمون کی اشاعت کے بعد مسلمان رہنما بیحد متفکر ہوئے۔ انہوں نے شدھی کے تدارک کے لئے تبلیغی مشن قائم کرنا شروع کر دیئے۔ ایک انجمن تشکیل کی گئی جس کے سیکرٹری غلام بھیک نیرنگ تھے۔ اس انجمن نے مختلف مقامات پر تبلیغی مشن بھیج کر خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ سیاسی اعتبار سے مسلمانوں میں اپنے حقوق و مفادات کے تحفظ اور حکومتِ خود اختیاری کے قیام کا جذبہ فزوں تر ہو گیا۔ ۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہونا قرار پایا۔ محمد علی جناح نے اس اجلاس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ملک کی اسمبلیوں اور میونسپل اور مقامی اداروں میں مسلمانوں کے لئے نمائندگی کا تناسب اور ملازمتوں میں ان کے لئے فی صد تناسب بہت ضروری ہے۔ انہوں نے کہا کہ مسائل صرف اسی صورت میں حل ہو سکتے ہیں کہ "کچھ دو اور کچھ لو" کے اصول پر عمل کیا جائے۔ جب تک دونوں طرف دوستانہ جذبات اور ایک دوسرے کے مسائل کے حل کا احساس پیدا نہ ہو، عمل نہیں کیا جا سکتا۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں شدھی اور سنگھٹن تحریکوں نے گائے کے ذبیحہ کو ہوا دی اور ملک میں فساد کرایا، مسلمانوں کو قتل کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بیزاری پیدا کر دی۔ اگر "زندہ رہو اور

زندہ رہنے والے جذبے سے کام لیا جائے تو حالات معمول پر آ سکتے ہیں۔

قائد اعظم کی خواہش یہ تھی کہ وہ ایک بار پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایسی شرائط پر مصالحت کرادیں جو مسلمانوں کے لئے بھی قابلِ اعتراض نہ ہو۔ علاوہ ازیں وہ مسلم لیگ کی تنظیم نو کے بعد اس کے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ انہی کی کوششوں سے کئی سال بعد ایک بار پھر مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں مختلف طبقۂ خیال کے مسلم لیگی رہنماؤں نے شرکت کی۔ اس موقعے پر انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں تمام پس منظر اور ناکامی پر روشنی ڈالی۔

اس وقت صورت یہ تھی کہ تحریک عدم تعاون کے خاتمہ کے بعد سے مسلمانوں میں دو گروہ بن چکے تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جس نے مسلم قومیت کے نعرے کو یکسر فراموش کر کے کانگرس کا دامن پکڑ لیا تھا۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو پہلے مسلم قومیت اور مسلمانوں کی عالمی سیاست کے علم بردار تھے۔ یہ لوگ دل وجان سے کانگرس کے ساتھ ہو لئے اور غالباً انہوں نے نازک صورتِ حال کو محسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی جو کانگرس کی پالیسی نے پیدا کر دی تھی اور جو ہندو ــ مسلم اتحاد تو کیا، مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو کلیتاً نظر انداز کر کے ہندو قومیت کے لئے زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کرنے میں مصروف تھی۔ دوسرا گروہ وہ تھا جو اب بھی نہ صرف مسلم قومیت کے تصور کو سینے سے لگائے ہوئے تھا بلکہ ہندو کے غلبہ کے اندیشوں کو بھی محسوس کر رہا تھا۔ یہ درست ہے کہ موخر الذکر گروہ کی وابستگی کانگرس کے ساتھ بھی رہی لیکن اس کے باوجود مسلم قومیت کا جذبہ اس کے دل سے الگ نہ ہو سکا۔ مثلاً مولانا محمد علی جوہرؔ کانگرس کے صدر (۱۹۲۳ء میں) منتخب ہو چکے تھے، مسلم لیگ کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے اور مسلم قومیت کے تصور کو بھی الگ نہ کر سکے۔ مولانا ابو الکلام آزادؔ تو کانگرس کے ہو رہے تھے مگر کچھ نئے لوگ ـــ ایسے بھی تھے جو تازہ خون اور تازہ ولولوں کے ساتھ مسلمانوں کے لئے تڑپ لے کر میدانِ عمل میں اتر آئے تھے۔ اِن میں راجہ غضنفر علی خاں اور میاں فضل حسین قابلِ ذکر ہیں۔ ۲۴۔ مئی ۱۹۲۴ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا جو اجلاس منعقد ہوا ـــ اور اس اجلاس میں مسلمانوں کی طرف سے نئے مطالبات کا جو فارمولہ مرتب کیا گیا وہ میاں فضل حسین کی کاوشوں کا نتیجہ تھے۔

مسلم لیگ کا اجلاس لاہور

۱۹۲۳ء کے انتخابات ہو چکے تھے۔ راجہ غضنفر علی خاں نے بھی ایک طالب علم کی حیثیت سے

ان انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ ان کے مقابلہ میں دو امیدوار تھے اور دونوں ہی مسلمان تھے۔ راجہ غضنفر علی خاں چار ووٹوں سے ہار گئے۔ مگر انتخابی عذرداری داخل کر دی گئی۔ اتفاق یہ کہ جب دن لاہور کے جنتو برسینما میں مسلم لیگ کے اجلاس کا انعقاد ہونا تھا، اسی روز راجہ غضنفر علی خاں کی عذرداری کا فیصلہ تھا۔ راجہ صاحب چار ووٹوں سے ہارے تھے مگر عدالت کی تحقیقات کے بعد ان کے چار ووٹ بڑھ گئے۔ وہ عذرداری جیت گئے اور ان کا حوصلہ بلند ہو گیا۔ لہٰذا وہ مزید عزم و ہمت کے ساتھ اس اجلاس میں شریک ہوئے۔

اجلاس میں میاں فضل حسین، چودھری خلیق الزماں، آصف علی، شیخ عبدالقادر، چودھری شہاب الدین، مولوی ابوالقاسم، ڈاکٹر ضیاء الدین، قدوائی، ملک برکت علی اور دیگر بہت سے رہنما موجود تھے۔ محمد علی جناح نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا:

"ہندوستان میں غیر ملکیوں کی حکومت کی بنا کیوں پڑی اور یہ حکومت اب تک موجود کیوں ہے؟ اس کی واحد وجہ ہندو اور مسلمان میں اتحاد کا فقدان ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ ان کے درمیان عدم اعتماد ہے۔ مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ جس دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ اتحاد پیدا ہو گیا اس دن کم از کم ایک نو آبادی کے درجہ کی حکومت ہندوستان کو نصیب ہو جائے گی۔ اگر ان دونوں کے درمیان کوئی پائیدار سمجھوتہ ہو جائے تو بہت سی مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو انہیں بھی اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے آگے چلنا چاہیے آج کے اجلاس کا بڑا مقصد یہی ہے کہ مسلمانوں کے مطالبات کے بارے میں ایک فارمولہ ترتیب دیا جائے جسے بنیاد بنا کر بالخصوص کانگرس کے ساتھ بات چیت کو آگے بڑھایا جا سکے۔"

محمد علی جناح نے اپنی تقریر کے دوران ملک کی صنعتی، تجارتی اور زرعی سرگرمیاں تیز کرنے پر بھی زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ ملک کے کاشت کاروں اور مزدوروں کے حالات میں انقلاب پیدا کرنے کی شدید ضرورت ہے تاکہ وہ اپنے مفادات کا مکمل تحفظ کر سکیں۔ انہوں نے قومی اہمیت کے دیگر مسائل مثلاً تعلیم، ثالثی کے ذریعہ تنازعات کے فیصلے، ہندوستان کے دفاع اور ہندوستانی فوج میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی افسروں کی بھرتی کی طرف توجہ مبذول کرائی اور اقلیتوں کے حقوق و مفادات کے مکمل تحفظ کی بات بھی کی۔ محمد علی جناح کا خیال تھا کہ اسمبلیوں

ذریعہ قومی اصلاحات کی طرف فوری توجہ مبذول کرنا ضروری ہے اور اگر حکومت کی طرف سے اس سلسلہ میں تسلی بخش رویہ اختیار نہ کیا جائے تو اس صورت میں پارلیمانی رکاوٹیں اور آئینی تعطل پیدا کرنے میں کوئی پس وپیش نہیں ہونی چاہئے۔ محمد علی جناح نے اپنے خطبہ صدارت کے اختتام میں یہ بھی کہا کہ موجودہ آئین کو ختم کر کے ایک ایسا آئین، جو عوام کے نمائندوں کے مشوروں سے ترتیب دیا جائے، اختیار کرنا ضروری ہے اور نئے آئین کے تحت تمام حقیقی کنٹرول اور ذمہ داریاں عوام کے ہاتھ میں آنا ضروری ہیں، تاکہ ہندوستان کے عوام ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اقوام عالم میں ایک نئی اور ذمہ دار حکومت کے قیام کے بعد اپنا مقام حاصل کر سکیں۔

شیخ عبدالقادر کی طرف سے مستقبل کے آئین کے سلسلہ میں کسی بھی سکیم کے لئے مندرجہ ذیل اصولوں پر مبنی قرارداد منظور کی گئی،

۱۔ مرکز وفاقی طرز پر قائم ہو اور صوبوں کو مشترکہ امور کے معاملے میں اختیارات حاصل ہوں۔

۲۔ اگر کسی صوبہ میں آبادی کے اعتبار سے کسی فرقہ کو اکثریت حاصل ہو تو اس اکثریت کو اقلیت یا مساوات کی صورت میں تبدیل نہ کیا جائے۔ یعنی ان دونوں میں توازن قائم نہ کیا جائے۔

۳۔ ہر جگہ جداگانہ طریق انتخاب مروّج ہو۔

۴۔ چھوٹے درجہ کی ایسی اقلیتوں کو جو بآسانی اور خصوصی مراعات کے بغیر نمائندگی حاصل کرنے کے قابل نہ ہوں، مخصوص مراعات دی جائیں (مثلاً پنجاب اور بنگال)

۵۔ مسلمان اکثریت کے خود مختار صوبوں، بشمول صوبہ سرحد کی تعداد تین کی جائے۔

جہاں تک چھوٹے درجہ کی اقلیتوں کی مراعات کا سوال تھا، گو بنگال اور پنجاب کے صوبوں میں تو ہندو اس میں ملوث نہ ہونے تھے لہذا ان صوبوں میں مسلمان اکثریت کو کم کرنے یا ہندو اقلیت کو مخصوص مراعات دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا تاہم یو۔پی کی مسلم اقلیت پر اس کی زد لازماً پڑتی تھی۔ چنانچہ یو۔پی کے نمائندوں نے قرارداد کے الفاظ میں ردّ و بدل کر کے اس وضاحت کی کوشش کی کہ یو۔پی اور اس نوعیت کے دوسرے صوبوں میں مسلمان اقلیت کو ۱۹۱۶ء کے معاہدہ کے تحت جو مراعات حاصل تھیں وہ بدستور رہیں۔ سر فضل حسین کے ایماء پر الفاظ میں ردّ و بدل کیا گیا اور یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ جب عام اجلاس میں قرارداد پر بحث ہو تو یہ ترمیم پیش کر دی جائے۔ دوسرے دن جب قرارداد عام بحث کے لئے پیش کی گئی تو ڈاکٹر ضیاءالدین نے مجوزہ ترمیم پیش کی۔

"مجالس قانون ساز اور تمام منتخب اداروں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا ایسا طریق کار اختیار کیا جائے کہ اقلیتوں کو ہر صوبہ میں مناسب اور مؤثر نمائندگی حاصل ہو جائے۔ تاہم یہ اصول اپنی جگہ موجود رہے کہ کسی اکثریتی فرقہ کو اقلیتی فرقہ میں تبدیل ہونے دیا جائے۔ یا اُسے اکثریتی فرقہ کی سطح پر نہ آنے دیا جائے۔"

مولانا محمد علی اس ترمیم کے مخالف تھے۔ ان کے خیال میں یہ ترمیم انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کرتی تھی کیونکہ انصاف تو یہی ہے کہ تمام صوبوں میں تمام فرقوں کو اپنی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے البتہ بہت چھوٹی اقلیتوں کو خاص مراعات دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن ترمیم کے حق میں سر فضل حسین کا یہ کہنا تھا کہ اس مطالبہ کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کسی ناانصافی کا پہلو ہرگز نہیں نکلتا کیونکہ کسی صوبہ کی اکثریت کو اس کی اقلیت یا اس کے ساتھ اقلیت کے توازن میں تبدیل نہیں کیا جا رہا اور یہ اصول بیک وقت مسلم اور ہندو اکثریت دونوں کے لئے ہے۔ اگر یہ اصول بھی قائم رہے اور اقلیتی فرقوں کو مراعات بھی دی جا سکیں تو مضائقہ کیا ہے؟ مثلاً پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اگر ان صوبوں میں مسلم اکثریت کو اقلیت یا توازن میں تبدیلی کئے بغیر اقلیتوں کو کوئی رعایت مل جائے، تو مسلمانوں کو کوئی انکار نہ ہوگا۔ اسی طرح یوپی، جہاں ہندو اکثریت، پنجاب اور بنگال میں مسلمان اکثریت کے مقابلے میں تقریباً ۳۰ فیصد زیادہ تھی وہاں قدرتی طور پر اقلیتوں کو محض مراعات دینے کے لئے مزید گنجائش پیدا ہوتی تھی۔ سر فضل حسین کو یہ اعتراض بھی تھا کہ اگر مولانا محمد علی اس قرارداد پر اس وقت اظہار خیال کرتے جب وہ کانگرس کے زیر غور آتی تو بہتر تھا کیونکہ مولانا محمد علی خود کانگرس کے صدر بھی تھے لیکن مولانا محمد علی کا کہنا یہ تھا کہ وہ مسلم لیگ کے رکن بھی تھے۔ لہذا انہیں حق پہنچتا تھا کہ وہ اس اجلاس کی بحث میں شرکت کرتے۔

آخر اجلاس نے یہ ترمیم شدہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور کر لی۔ جب مولانا محمد علی دلی پہنچے تو انہوں نے اخبارات میں اپنا ایک بیان شائع کرایا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ لاہور کے اجلاس مسلم لیگ میں مسلمانوں کے مطالبات کی صحیح نمائندگی نہیں کی گئی۔

مسلم لیگ نے اپنے اس اجلاس میں کانگرس کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد ایک مشترکہ قابلِ قبول آئین مرتب کرنے کی جو تجویز پیش کی تھی، ہندو رہنماؤں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے موقف پر قائم رہے۔ مورخ مجمدار نے اس بارے میں اپنی تصنیف "تاریخِ تحریکِ آزادی" میں یوں اظہارِ خیال کیا۔

" اس امر میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ہندو رہنماؤں نے جان بوجھ کر تاریخ کے ٹھوس حقائق کو ٹھکرا دیا۔ انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی، سماجی اور سیاسی تفریق کو محسوس کرنے سے بھی انکار کر دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندو رہنماؤں کی طرف سے اس اصل مسئلہ کو حل کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہ کی گئی جو ہندوستان کے سامنے پیش تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو بیک وقت ایک ریاست کے اراکین کی حیثیت سے یکجا کرنا کیونکر ممکن بنایا جائے۔"

کوہاٹ کے فسادات

ستمبر ۱۹۲۴ء میں صوبہ سرحد کے شہر کوہاٹ میں زبردست ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ ہندو رہنماؤں کو بظاہر تشویش اس بات پر ہوئی کہ فساد میں ہندوؤں کا جانی نقصان زیادہ ہوا تھا۔ فساد کی بنیاد یہ تھی کہ ہندوؤں نے ایک نظم پر مشتمل کتابچہ شائع کیا، جس میں خانۂ کعبہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نازیبا الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ یہ کتابچہ کوہاٹ کی سناتن دھرم سبھا کی طرف سے شائع کیا گیا۔ اس سبھا کے سیکرٹری کو پہلے تو گرفتار کر لیا گیا لیکن جب ہندوؤں نے مظاہرہ کیا تو رہا کر دیا گیا۔ اس کی رہائی سے مسلمانوں میں غصہ قدرتی تھا۔ جب مسلمانوں نے جلوس نکالا تو ۹ ستمبر کو ہندوؤں نے اس پر فائرنگ کر دی جس سے کئی مسلمان موقع پر ہلاک ہو گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اسی دن سے ایک دوسرے کو قتل کرنے، جائداد جلانے، آتش زنی کرنے اور لوٹ مار کے واقعات عام ہو گئے۔ ہندو، مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ تعداد میں ہلاک ہوئے۔ بہت سے ہندو جان بچانے کے لئے خود کو مسلمان ظاہر کرنے لگے اور بہت سوں نے مسلمانوں کے گھروں میں پناہ بھی لی۔ کچھ ہندو عارضی طور پر راولپنڈی چلے آئے۔ ہندو رہنماؤں نے بات کا بتنگڑ بناتے ہوئے یہ فتنہ کھڑا کر دیا کہ ہندوؤں کو نقل مکانی پر مجبور کیا گیا اور زبردستی مسلمان کیا گیا۔

مولانا شوکت علی اور گاندھی اس واقعہ کی تحقیقات کی غرض سے کوہاٹ روانہ ہوئے۔ لیکن دونوں کو وہاں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔ وہ راولپنڈی میں کیمپ لگا کر بیٹھ گئے، شہادتیں لی گئیں۔ اور ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں نے اتنے متضاد بیانات دیئے کہ واقعات میں مزید الجھاؤ پیدا ہو گیا۔ ان حالات میں یہ کہنا بڑا مشکل تھا کہ سچا کون ہے۔ تاہم مذکورہ بالا کتابچہ کی اشاعت بجائے خود ایک واضح ثبوت تھا، جو سناتن دھرمیوں کے اقدام کی شہادت دے رہا تھا۔

امن کے دیوتا، ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے پرچارک اور اہنسا کے پجاری گاندھی جی نے اپنی میٹھی زبان میں فسادات کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کر دی اور یہ بھی فرمایا " میں یہ بات وشواس کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ پہلی گولی کس نے چلائی؛ لیکن اگر میں یہ بھی فرض کر لوں کہ پہلی گولی ہندوؤں کی طرف سے چلی تھی، تب بھی یقینی طور پر اس کی وجہ ہندوؤں میں خوف و ہراس یا اپنی جان کی حفاظت کا جذبہ تھا۔ اس لئے اگر ہندوؤں کی یہ حرکت غلط بھی تھی یا اس کی کوئی وجہ تھی اس صورت میں بھی ہندوؤں کا یہ اقدام قابلِ معافی ہے۔ حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید مسلمانوں ہی کی طرف سے ہندوؤں کو ایسے اقدام پر مجبور کر دیا گیا ہو"

مولانا شوکت علی کو گاندھی کے اس بیان سے سخت دُکھ ہوا اور انہوں نے کہا،

"کوہاٹ کے فسادات کسی یک طرفہ کارروائی کا نتیجہ نہیں، میں ان کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو موردِ الزام قرار دیتا ہوں، تاہم ایک مسلمان کی حیثیت سے میں یہ محسوس کر سکتا ہوں کہ مسلمانوں پر زیادہ الزام عائد کروں کیونکہ وہ تعداد اور طاقت کے اعتبار سے ہندوؤں کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط تھے لہذا انہیں زیادہ سے زیادہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا"

مولانا شوکت علی نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ ہندوؤں کو بھائی سمجھتے ہوئے ان سے اچھا سلوک کریں اور ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ اچھے ہمسایوں کی طرح رہتے ہوئے انہیں اپنا سچا دوست اور مددگار سمجھیں۔

دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ " مہاتما جی " جنہوں نے اب تک دیگر علاقوں میں مسلمانوں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں اور ان کے کشت و خون اور ان کی اقتصادی و تعلیمی پسماندگی کے بارے میں اپنے ہونٹوں پر مہرِ سکوت ثبت کر رکھی تھی، کوہاٹ کے حادثہ سے اتنے دلگیر ہوئے کہ ۱۷ ستمبر ۱۹۲۴ء سے ۲۱ دن کا برت رکھنے کا اعلان کر دیا۔ مزید دلچسپ بات یہ تھی کہ ان دنوں وہ دلی میں مولانا شوکت علی کے بھائی، کانگرس کے صدر اور ایک محبِ وطن مسلمان مولانا محمد علی جوہر ہی کے مہمان تھے۔ اس موقع پر بہت سے ہندو اور مسلمان رہنماؤں نے انہیں برت رکھنے سے منع کیا۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ شاید ہندو اور مسلمان رہنما ان کے پہلے برت سے یا ان کی جسمانی حالت کے پیشِ نظر متفکر تھے۔ لیکن بعد ازاں جب وہ قدم قدم پر گاندھی کے برت کے عادی ہو گئے تو انہوں نے کبھی پروا نہ کی۔ برت کا یہ سیاسی ہتھیار گاندھی نے پہلی بار استعمال کیا تھا۔

اتحاد کانفرنس

مولانا محمد علی نے محسوس کیا کہ گاندھی کے برت سے حالات میں خاصی کشیدگی پیدا ہو سکتی تھی لہٰذا انہوں نے کانگرس کے صدر کی حیثیت سے تمام سیاسی جماعتوں اور فرقوں کے نمائندوں کو تار روانہ کئے اور دلّی کی مجوزہ کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ کانفرنس کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ ماحول کی کشیدگی کو کم کرنے کی کوشش کی جائے۔ ۲۶۔ ستمبر ۱۹۲۴ء کو کانفرنس ہوئی اور تقریباً تین سو نمائندوں نے شرکت کی۔ پنڈت موتی لال نہرو نے اس کی صدارت کی۔

اتحاد کانفرنس نے خاصی بحث و تمحیص کے بعد مزید غور و فکر کے لئے کچھ ضمنی کمیٹیاں بھی تشکیل کیں۔ یہ کانفرنس کامیاب رہی۔ کچھ قرار دادوں کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور ایک دوسرے کی مذہبی رسومات کے احترام پر زور دیا گیا، کچھ اصول وضع کئے گئے، آخری عام اجلاس میں عوام سے اتحاد کی اپیل کی گئی۔ اس کے بعد گاندھی کو یہ خوشخبری سنانے کا فیصلہ کیا گیا کہ وہ جس اصول کے علمبردار تھے اسی اصول کی بنیاد پر ہر فرقہ کے نمائندہ لوگوں میں اتحاد قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ گاندھی کو کانفرنس کی کامیابی کی خوشخبری سنائی گئی لیکن خوشخبری سنانے والوں کو سخت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ گاندھی جی نے دو ٹوک الفاظ میں برت توڑنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنا برت ۸۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو توڑا۔ کانفرنس تو بلاشبہ کامیاب ہوئی تھی کانفرنس کے فیصلوں کو کامیابی نصیب نہ ہو سکی اور مختلف مقامات پر فسادات کا سلسلہ جاری رہا۔

مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی

دسمبر ۱۹۲۴ء میں مسلم لیگ کا ساتواں سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا جس کی صدارت سیّد رضا علی کر رہے تھے۔ اجلاس نے کوہاٹ میں جان و مال کی تباہی کی مذمت کی لیکن اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ کوہاٹ میں جو کچھ ہوا اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ہندوؤں کی طرف سے شدید صدمہ پہنچایا گیا تھا اور ہندوؤں ہی نے مسلمانوں پر ہاتھ اٹھانے میں پہل کی تھی یہ درست ہے کہ ہندوؤں کو زیادہ نقصان اٹھانا پڑا لیکن اس امر میں بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ مسلمان بھی نقصان سے محفوظ نہ رہ سکے تھے۔ مسلم لیگ نے کوہاٹ کے مسلمانوں سے یہ اپیل بھی کی کہ وہ ان مقامی ہندو شہریوں کو جو نقل مکانی کر کے راولپنڈی چلے گئے تھے، دوبارہ گھر آنے کی دعوت

دیں اور ان کے ساتھ اپنے اختلافات کو نہایت خوشگوار ماحول میں ختم کر دیں۔ اس طرح کہا گیا کہ آئندہ ہندو، مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ مسلمان تشدد سے باز رہیں گے اور کسی تنازعہ کی صورت میں ثالثی کے ذریعہ اختلافات کو ختم کرنے کی سعی کی جائے گی۔

اسی قرارداد میں مسلم لیگ نے مؤثر اقدام نہ کرنے پر سرکاری حکام کی مذمت بھی کی۔

ایک اور قرارداد میں مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کے اس مطالبہ کو دہرایا گیا کہ حکومت صوبہ سرحد میں اصلاحات کرے اور اس صوبہ کو ملک کے دوسرے بڑے صوبوں کی سطح پر لایا جائے۔

سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے مختلف صوبوں کے نمائندوں پر مشتمل رہنماؤں کی ایک خاص کمیٹی بھی تشکیل کی گئی جس میں ۳۲ رہنما شامل تھے۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ ملک کی مجالس قانون ساز اور دوسرے منتخب اداروں، نیز سول ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کے سلسلہ میں مطالبات مرتب کرے۔

اسی اجلاس میں گورنر جنرل کی طرف سے ۱۹۲۴ء کے کریمنل لاء امینڈمنٹ آرڈی نینس کے نفاذ کی مذمت بھی کی گئی کیونکہ یہ آرڈی نینس انفرادی آزادی پر براہِ راست حملہ کے مترادف تھا۔ اس طرح انتظامیہ کو نہ صرف بے گناہ شہریوں کے ساتھ زیادتیوں بلکہ آئینی دائرے میں سیاسی سرگرمیوں میں بھی مداخلت کا موقع ملتا تھا۔

اجلاس نے سیاسی صورتِ حال کی ذمہ داری حکومت پر عائد کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ہندوستانی عوام کے جو حقوق ایک مدت سے غصب کئے جا رہے تھے وہ فوری طور پر بحال کئے جائیں کیونکہ اسی طریق سے "سوراج" قائم ہو سکتا تھا۔

آل پارٹیز کانفرنس

مولانا محمد علی نے ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان اتحاد قائم کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ انہوں نے کانگرس کے صدر کی حیثیت میں تمام سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو بمبئی آنے کی دعوت دی، جہاں ۲۱۔ نومبر ۱۹۲۴ء سے کل ہند کانگرس کا اجلاس شروع ہو رہا تھا۔ اس اتحاد کی علامت کے طور پر انہوں نے ایک پارسی سر ڈنشا پٹیٹ سے صدارت کرائی۔ گاندھی چاہتے تھے کہ یہ اتحاد کانفرنس بمبئی میں منعقد ہونے کے دو ماہ بعد پھر دتی میں طلب کی جائے۔ لیکن وہ اتحاد کانفرنس کے "منصوبوں" کو یکسر مختلف انداز دے رہے تھے۔ ان کا مقصد

…مذہبی… 'واحد منظم سیاسی جماعت' کی حیثیت دے دی جائے۔ وہ
چاہتے تھے کہ تمام جماعتیں کانگرس کے پلیٹ فارم پر متحد ہو جائیں اور سوراج اور ہندو مسلم
اتحاد کے لئے کوئی لائحہ عمل مرتب کریں جس کے بارے میں تفصیلی رپورٹ ۳۱ مارچ ۱۹۲۵ء تک
…میں پیش کر دی جائے۔

کمیٹی کا اجلاس ۲۳ جنوری ۱۹۲۵ء کو پروگرام کے مطابق دلّی میں منعقد ہوا۔ صدارت
گاندھی کر رہے تھے۔ محمد علی جناح، علی برادران (مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی)، ڈاکٹر
انصاری، سر محمد شفیع، ڈاکٹر کچلو، سر عبدالقیوم، پنڈت موتی لال نہرو، مسز اینی بیسنٹ،
مولانا آزاد، مدن موہن مالویہ، مسز سروجنی نائیڈو، آئینگر، راجندر پرشاد، لالہ لاجپت رائے،
پٹیل، جے کار اور بپن چندر پال موجود تھے۔ گاندھی نے اپنی تقریر میں 'سوراج'، تمام پارٹیوں
کے اتحاد اور کانگرس کے پلیٹ فارم پر ان کے اجتماع کی بات کو دہرایا۔ انہوں نے ایک اور
ضمنی کمیٹی کی تشکیل کی تجویز پیش کی تاکہ یہ کمیٹی اتحاد کے خطوط کا تعین کر سکے۔ یہ کمیٹی قائم ہوئی جس کے
چالیس اراکین تھے۔ کمیٹی کے مقاصد یہ تھے:

۱۔ ایسی سفارشات — جن کے تحت تمام جماعتوں کو کانگریس کے پلیٹ فارم یک جا کیا
جا سکے۔

۲۔ تمام فرقوں کی نمائندگی کے لائحہ عمل کی ترتیب — اور مجالس قانون ساز و دیگر منتخب اداروں
میں 'سوراج' کے تحت ان کی تقسیم۔

۳۔ سول ملازمتوں میں تمام فرقوں کی مناسب نمائندگی اور اس کا طریق کار۔

۴۔ اور ملک کی ضروریات کے مطابق 'سوراج' کی سکیم کی ترتیب۔

اس موقع پر محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی نمائندگی کی۔ ہندو نمائندوں کو مسلم لیگ کے
اجلاس لاہور کے مطالبات کا علم تو تھا ہی۔ لہٰذا ہندو مہاسبھا کے نمائندوں لالہ لاجپت رائے،
سوامی شردھانند اور پنڈت مدن موہن مالویہ نے اس کانفرنس میں مسلم لیگ کے مطالبات کا
تذکرہ آنے سے قبل ہی پیش قدمی کی۔ مدن موہن مالویہ نے اپنی تقریر کے دوران کہا کہ مسلمانوں کے
ہر مطالبہ پر غور کیا جا سکتا ہے مگر وہ کسی قیمت پر آئینی مسلم اکثریت (مسلم اکثریتی صوبوں میں) کو تسلیم
نہیں کریں گے۔ مالویہ کا موقف یہ تھا کہ وہ فرقہ کی بنیادوں پر نمائندگی کے قائل نہیں۔ اگر اس پر
اصرار کیا گیا تو لکھنؤ پیکٹ سے آگے ایک قدم بھی نہ بڑھایا جائے گا۔ بالفاظ دیگر مدن موہن مالویہ

یہ کہہ رہے تھے کہ مسلمان یا تو مخلوط انتخاب کے اصول کو مان لیں یا پھر اقلیتی حیثیت پر قائم رہیں مگر محمد علی جناح نے جوابی تقریر میں کہا کہ :

"کیا ہندو ـــ اتنے علاقوں میں اکثریت میں ہونے کے باوجود ـــ صرف پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی برائے نام اکثریت پر بھی اعتماد نہیں کر سکتے ـــ؟ اور اس عدم اعتماد کے باوجود وہ مسلمانوں سے اس امر کی توقع رکھیں گے کہ مسلمان ان پر اندھا اعتماد کرتے چلے جائیں۔ جہاں تک معاہدۂ لکھنؤ کا تعلق ہے وہ ایک مکمل خود مختار حکومت کے قیام کی طرف مجوزہ سکیم کا اولین اہم اقدام تھا۔ نیز یہ بات بھی قطعاً طے نہ پائی تھی کہ معاہدۂ لکھنؤ کو مستقل حیثیت حاصل ہو گی۔"

پنجاب اور بنگال میں مخلوط انتخابات کا حوالہ دیتے ہوئے محمد علی جناح نے کہا :

"مسلمانوں کا کہنا یہ تھا کہ اس طریقِ انتخابات کے تحت ان کی قوت رائے دہی نہ ہونے کے برابر رہ جائے گی، وہ دس یا پندرہ فیصد نشستیں بھی حاصل نہ کر سکیں گے علاوہ ازیں مختلف فرقوں کے درمیان مفاہمت کے باوجود لوگوں کے دلوں سے مذہبی جذبات کو ختم نہیں کیا جا سکا۔ انتخابات میں انہوں نے اپنے ہم مذہب امیدواروں ہی کو ووٹ دیئے۔ نیز جب سے کانفرنس نے 'سوراج' کے قیام کی بات کی ہے، تو یہ ضروری ہو گیا ہے کہ معاہدۂ لکھنؤ پر بھی نظرِ ثانی کی جائے۔"

حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے پر صحیح معنوں میں اعتماد نہ تھا۔ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کا احساس یہ تھا کہ ان کی اکثریتی حیثیت بہرحال بحال کی جانی چاہئے۔ محمد علی جناح نے بھی کانفرنس میں اسی خیال کا اظہار کیا کہ معاہدۂ لکھنؤ کا مقصد ہی یہ تھا کہ اقلیتوں کو دو طریقوں سے تحفظ دیا جائے۔ لہٰذا پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کی اکثریتی حیثیت کو اقلیتی حیثیت میں تبدیل نہ کیا جائے اور جہاں تک دوسرے صوبوں کا تعلق ہے تو معاہدۂ لکھنؤ کے تحت اقلیتوں کے تحفظ کے لئے دونوں اصولوں پر عمل کیا جائے۔ نیز سول ملازمتوں کے سوال کو علیحدہ سوال کی حیثیت میں تسلیم کیا جائے۔

مگر لالہ لاجپت رائے بدستور علیحدہ قومیت کی نفی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ ان کا مؤقف یہی تھا کہ فرقہ وارانہ نمائندگی کے ذریعہ قومیت کے مجموعی تصور کی نفی ہو گی اور ملک عملاً تقسیم ہو کر رہ جائے گا۔ لالہ لاجپت رائے نے تمام حقائق اور حالات کو یکسر انداز کرتے ہوئے یہی کہا کہ

اس سوال کو ہندوؤں یا مسلمانوں کے مفادات کے پیشِ نظر نہیں بلکہ ایک متحد قوم کے وسیع تر مفادات سے پیشِ نظر حل کرنا چاہئے تاکہ یہ متحد قوم ۔۔ ان لوگوں کے خلاف نبرد آزما ہو سکے ۔ جو ہندوستانیوں کو خود مختار حکومت دینے سے کترا رہے تھے ۔

جو ضمنی کمیٹی قائم کی گئی تھی اُسے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ۔ ایک کا کام "سوراج" کیلئے سکیم کا ڈھانچہ تیار کرنا اور دوسری کا کام ہندوؤں ۔۔ مسلمانوں کے مسئلہ کا حل تھا ۔ اوّل الذکر کمیٹی نے نو دوایوانی مقننہ کے سامنے جواب دہ کابینہ او (DOMINION STATUS) پر مبنی آئین کی سکیم کا ڈھانچہ مرتب کر لیا ۔ یہ دو ایوانی مقننہ ، صوبائی مجالس قانون ساز ۔ مقامی اداروں ، تعلیمی اداروں ، ایوان ہائے تجارت ، زمینداروں کی انجمنوں ، ٹریڈ یونینوں وغیرہ کی طرف سے بالواسطہ منتخب کی جانی تھی ۔ مگر جہاں تک اس کمیٹی کا سوال تھا جسے ہندو مسلم مسائل کا حل تلاش کرنا تھا ، بالکل ناکام رہی کیونکہ ہندو مندوبین کسی صورت بھی اس معاملہ میں دلچسپی لینے پر آمادہ نظر نہ آتے تھے ۔ چند ہندو رہنماؤں نے تو اس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت بھی نہ کی اور بہانے تراشنے لئے ۔

چنانچہ جب کسی نتیجہ پر نہ پہنچا جا سکا تو تعطل پیدا ہو گیا او کوشش کے باوجود ختم نہ کیا جا سکا آخر ۵ مارچ ۱۹۲۸ء کو کانفرنس کے کنوینر ، گاندھی اور موتی لعل نہرو نے کانفرنس کو غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا اور یہ کہا کہ کانفرنس میں حاضری اتنی کم تھی کہ کسی فیصلہ پر پہنچنا ناممکن ہو گیا تھا ۔ نیز حتمی نتائج پر پہنچنے کے لئے امکانات بھی روشن نظر نہ آتے تھے ۔

اس ناکامی کے بعد ہندو رہنماؤں نے محمد علی جناح پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ ان کے نقطۂ نگاہ میں تبدیلی آ چکی تھی اور اب ان پر فرقہ وارانہ رنگ غالب تھا ۔ اس الزام کا جواب محمد علی جناح نے یہ دیا کہ انہوں نے کانفرنس میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ ان کے ذاتی خیالات قطعاً نہ تھے بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خیالات تھے ۔

تاہم ۔۔ ہندو کے تعصب نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کے دروازے ایک بار پھر اور ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے ۔

صوبہ سرحد کے لئے اصلاحات

۱۶ فروری ۱۹۲۶ء کو مرکزی اسمبلی میں ایک مسلمان رکن سیّد مرتضیٰ نے یہ قرار داد

پیش کی کہ مجلسِ قانون ساز اور وزیروں کی تقرریوں کے بارے میں صوبۂ سرحد میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کی مجوزہ شقوں کے نفاذ کے لئے گورنر جنرل سے درخواست کی جائے تاکہ اس طرح اقلیتوں کو تحفظ دیا جا سکے۔

یہ بڑی دلچسپ بات تھی کہ تمام صوبوں میں صرف ایک صوبۂ سرحد تھا جہاں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کے اطلاق کو کسی نہ کسی بہانے ٹالا جارہا تھا کیونکہ صوبہ سرحد، مسلم اکثریت کا صوبہ تھا لہٰذا ہندو اور انگریز مل کر یہ کوشش کر رہے تھے کہ اس ایکٹ کا اطلاق صوبہ سرحد پر نہ ہو۔

سید مرتضٰی، کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے اور اسمبلی میں 'سوراج' پارٹی کے بھی رکن تھے۔ اس پارٹی کی قیادت پنڈت موتی لعل نہرو کے ہاتھ میں تھی۔ جب انہوں نے یہ قرارداد پیش کی تو ان کی اپنی پارٹی کے اراکین نے اس بناء پر مخالفت شروع کر دی کہ ایک طرف ہندوستان کے لئے 'سوراج' کا مطالبہ جاری تھا تو دوسری طرف صوبہ سرحد پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کے اطلاق کی تائید کیسے کی جاسکتی تھی لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہی پارٹی ان صوبوں میں، جو ہندو اکثریت کے صوبے تھے، اسی ایکٹ کے اطلاق پر معترض نہ تھی۔ اس پارٹی کے متعصب ہندو رہنماؤں نے تو یہاں تک کہا کہ صوبۂ سرحد میں پہلے ہی فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے ہیں لہٰذا وہاں پر اکثریت کو ایسے اختیارات کیونکر تفویض کر دیئے جائیں کہ وہ اقلیت کو مزید سراسیمہ کرے۔

راجہ غضنفر علی خاں نے بھی اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے قرارداد کے حق میں بات کی اور مخالفت کرنے والوں سے یہ سوال کیا کہ اگر صوبہ سرحد میں فرقہ وارانہ فساد کی بناء پہ اکثریت کو اختیارات سونپنے میں تامل تھا تو وہ کون سا صُوبہ تھا جہاں فسادات نہیں ہوئے تھے۔ کیا یہی فسادات یو پی کے اس صوبے میں نہیں ہوئے جو خود پنڈت موتی لعل نہرو کا وطن تھا اور کیا اس اعتبار سے یو پی کے لوگوں کو آزادی سے محروم کر دیا جانا چاہئے تھا؟

اسی دوران سوراج پارٹی نے اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سید مرتضٰی، جنہوں نے صوبۂ سرحد کے بارے میں قرارداد پیش کی تھی، سوراج پارٹی سے اس امر کی اجازت طلب کی کہ جب تک اسمبلی کے اندر ان کی قرارداد پر بحث ہو وہ اجلاس میں شریک رہیں۔ لیکن پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لعل نہرو نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مدراس کے سید مرتضٰی نے واضح الفاظ میں یہ بتا دیا کہ وہ اس قرارداد پر بحث میں ضرور حصہ لیں گے خواہ انہیں پارٹی سے نکال ہی کیوں نہ دیا جائے۔

جب قرارداد پر بحث کا آغاز ہوا تو محمد علی جناح نے واضح الفاظ میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس سوال میں فرقہ وارانہ معاملے کو کسی قیمت پر بھی شامل نہ کیا جائے انہوں نے کہا کہ فسادات صوبہ سرحد میں ہوں یا کسی اور صوبے میں، بہرحال قابلِ مذمت ہوں گے۔ لیکن اس بات میں کوئی استدلال نہیں کہ صوبہ سرحد کے سوال کو ان خطوط پر نہ دیکھا جائے جن خطوط پر دوسرے صوبوں کے معاملات کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس نوعیت کے فسادات صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ غیر ممالک میں بھی ہونے رہے ہیں۔ کینیڈا میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان فسادات پر لارڈ ڈرہم کی رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے جناح نے کہا کہ یہ فسادات دو پارٹیوں میں مختلف خیالات یا حکومت کے سلسلے میں مختلف متقاصد کی بنا پر نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ دو نسلوں کا تصادم تھا جو ایک دوسرے سے نفرت کر رہی تھیں اور سیاست سے الگ تھلگ ہو کر سماجی زندگی میں خلل پیدا کر رہی تھیں وہاں حالت یہ ہو گئی تھی کہ مختلف معاشروں کے لوگ صرف ایک دوسرے سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اگر بچے بھی آپس میں جھگڑتے تو دو پارٹیاں بن جاتیں، یعنی ایک انگریز اور دوسری فرانسیسی پارٹی! محمد علی جناح نے کہا ہندوستان کے حالات مذکورہ واقعات سے بھی بدتر تھے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جسے ہندوستان کے تمام لوگ مل کر ہی حل کر سکتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے صوبۂ سرحد کے مسئلے پر بات کی اور کہا کہ سر ڈینی بریے نے صوبۂ سرحد کی جس تحقیقاتی کمیٹی کی صدارت کی تھی اس کی رپورٹ میں انہوں نے خود تسلیم کیا تھا کہ صوبۂ سرحد کے لوگ ہندوستان کے دوسرے لوگوں سے انتظامی صلاحیتوں اور ذہانت میں کسی صورت بھی پیچھے نہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس تجویز کا حوالہ دیا جس کے تحت صوبہ سرحد کو پنجاب میں مدغم کرنے کے لئے کہا گیا تھا تاکہ اس طرح ہندو اقلیت کی حیثیت بہتر ہو جائے۔ محمد علی جناح نے کہا کہ صوبہ سرحد کے لوگ پنجاب کے لوگوں سے مختلف تھے اور انہیں زبردستی پنجاب کے ساتھ منسلک کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ علاوہ ازیں صوبۂ سرحد کوئی چھوٹا سا صوبہ نہ تھا وہاں ۳۰ لاکھ افراد کی آبادی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں یورپ میں ایسی آزاد ریاستیں موجود ہیں جن کی مجموعی آبادی ۲۰ لاکھ سے زائد نہ تھی۔ انہوں نے سرحد کے لئے اصلاحات کو ناگزیر قرار دیا اور یہ سوال بھی کیا کہ صوبہ سرحد کے عوام کے لئے اصلاحات نافذ کرنے سے کیا فائدہ پہنچے گا اور اصلاحات کے نفاذ کی صورت میں ہندوؤں کو کیا نقصان پہنچے گا؟ محمد علی جناح نے ایک انگریزی روزنامے کے اداریہ کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ صوبہ سرحد کے

لوگوں پر افسر شاہی کی دست درازیاں ظلم وستم کی حد تک پہنچ چکی تھیں اور اسی وجہ سے صوبہ سرحد
کی حکومت پر عام طور پر تنقید کی جا رہی تھی۔ اگر عوام کے نمائندے یہی چاہتے تھے کہ صوبہ سرحد کے
لوگ اس ظلم وستم کے مسلسل شکار ہیں تو یہ ایک علیحدہ بات ہو گی۔ محمد علی جناح نے حکومت سے یہ
مطالبہ بھی کیا کہ وہ صوبہ سرحد میں اصلاحات کے نفاذ کے سوال کا حتمی جواب دے کیونکہ اس کی خاموشی
کی صورت میں مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ حکومت ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی اور شائد
ہندوؤں سے خائف بھی!

محمد علی جناح کے دلائل اتنے مضبوط تھے کہ یہ قرارداد اسمبلی میں منظور کر لی گئی۔ لیکن اس کے
باوجود ہندو تنظیموں کے مظاہروں اور حکومت کی بے حسی کے باعث آئندہ مزید کئی سال تک صوبہ سرحد
کے مسلمان ان اصلاحات سے محروم رہے۔

مسلمانوں کا اتحاد

۲۴- مئی ۱۹۲۵ء کو علی گڑھ یونیورسٹی کے پچاس سال پورے ہو چکے تھے اور دسمبر
۱۹۲۵ء میں یونیورسٹی کی طرف سے گولڈن جوبلی منانے کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ مسلمان ہندوستان
کے کونے کونے سے علی گڑھ پہنچ رہے تھے۔ اسی دوران علی گڑھ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل
کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس بھی منعقد ہونا قرار پائے۔ یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی میں
ہزار مہمان شریک ہوئے۔ اب تک ہندوستان میں مسلمانوں کا اس سے بڑا کوئی اجتماع نہیں ہوا
تھا۔ اجلاس کی صدارت یونیورسٹی کی چانسلر اور ریاست بھوپال کی حکمران ہز ہائی نس سلطان جہاں بیگم
نے کی۔ اس تقریب میں مسلمانوں کے ہر طبقۂ خیال اور ہر سیاسی جماعت سے متعلق مسلمانوں نے
شرکت کی۔ برطانیہ اور آئرلینڈ کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی شریک ہوئے۔ ایک وقت
وہ تھا جب ۱۸۷۵ء میں اینگلو اورینٹل کے نام سے یہاں ایک چھوٹی سی درس گاہ قائم کی گئی تھی اور
کالج میں صرف سات پروفیسر اور گیارہ طالب علم تھے لیکن اب یہی چھوٹی سی جگہ ایک عظیم یونیورسٹی
بن گئی تھی جہاں دو ہزار طالب علم تھے۔ یونیورسٹی کی اپنی عالیشان عمارات تھیں۔ اس موقع پر
پونے دو لاکھ روپے بطور عطیہ جمع ہوئے اور تقریباً تین لاکھ روپے کے عطیات کا وعدہ کیا گیا کہ
وہاں انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کا باقاعدہ کالج قائم کیا جائے۔

مسلم لیگ کا اجلاس علیگڑھ

کیونکہ ہندوستان بھر کے مسلمان اس تقریب میں موجود تھے ، لہٰذا مسلمانوں کے مسائل پر غور و خوض کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی وقت نہ تھا۔ اسی ہفتے مسلم لیگ نے اپنا ۱۰واں اجلاس علی گڑھ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس کی صدارت کلکتہ کے سر عبدالرحیم کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا:

"ہندو اور مسلمان، عیسائیوں کے دو فرقوں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک کی طرح نہیں ہیں بلکہ وہ دو مختلف قوموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کی قدیم روایات ، ان کی سماجی زندگی ، ان کا تہذیب و تمدن ، ان کی تاریخ اور مذہب اور اخلاقی اقدار سبھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کے درمیان اتنا فاصلہ ہے کہ وہ ایک ہزار سال سے ایک جگہ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ماحول کو نہیں اپنا سکے ۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اس مقصد کے لئے ان پر سیاسی اقتدار قائم کرنے کی کوشش کی ۔ بہت کم صوبے ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کو واضح اکثریت حاصل ہے۔ لہٰذا ان کے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ وہ ہر جگہ سے مخلوط انتخاب میں حصہ لیں۔ موجودہ حالات میں ہم یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ مسلمانوں کے لئے مخلوط انتخابات قابل قبول ہو سکتے ہیں اور اگر مخلوط انتخابات میں مسلمانوں کے لئے کچھ نشستیں محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی تو مسلمانوں کے لئے یہ اقدام مزید قابل اعتراض ہوگا۔ اگر مسلمانوں کو تمام مجالس قانون ساز اور دیگر خود مختار اداروں کے لئے منتخب نہ کیا گیا تو وہ ایسے ہر اقدام کے خلاف ، جو اُن کے مفادات میں نہ ہو، کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے ۔ اگر کچھ مسلمان مخلوط حلقہ ہائے انتخابات سے منتخب ہو بھی جائیں گے تو وہ قطعی طور پر اپنے انتخابات میں ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ وہ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ نہیں کر سکیں گے اور نہ ہی مسلمانوں کی خواہشات کا احترام کر سکیں گے۔"

اس کے بعد سر عبدالرحیم نے مسلمانوں سے متحد ہونے کی اپیل کی۔ انہوں نے کہا کہ اگر مسلمانوں نے صوبائی اسمبلیوں میں کسی متحدہ جماعت کی تشکیل نہ کی تو جداگانہ انتخابات کا مقصد فوت ہو کر رہ

جائے گا۔ جداگانہ انتخابات کی ضرورت محض اس لئے نہیں کہ مسلمان مل بیٹھ کر فرقہ وارانہ معاملات پر تبادلۂ خیال کریں بلکہ اصل مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ، ان کی قوت اور ان کی سیاسی سوچ کا ارتقاء ہے۔

مسلم لیگ نے اپنے اجلاس علی گڑھ میں یہ قراردادیں منظور کیں :

۱۔ ملک کی تمام صوبائی اسمبلیوں اور دیگر منتخب اداروں میں مؤثر اور مناسب نمائندگی کا حتمی اصول تسلیم کیا جائے اور کسی صوبے میں اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کیا جائے اور نہ ہی اقلیت کو اکثریت کے مقابلے میں توازن دیا جائے۔

۲۔ موجودہ طریقِ کار کے ذریعہ فرقہ وارانہ گروہوں کی نمائندگی جداگانہ انتخابات کے ذریعے جاری رہے اور کسی بھی فرقے کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ جداگانہ انتخاب سے کسی وقت بھی دست بردار ہو کر مخلوط انتخاب کے حق میں ہو جائے۔

۳۔ اگر کسی وقت کہیں بھی علاقائی ردّ و بدل ضروری خیال کیا جائے تو پنجاب، بنگال اور صوبۂ سرحد کی مسلمان اکثریت پر کسی صورت کوئی اثر نہ پڑے۔

۴۔ تمام فرقوں کے لوگوں کو مکمل مذہبی، تعلیمی اور اظہارِ خیال کی آزادی مہیا کی جائے۔ کسی صوبائی اسمبلی یا دوسرے منتخب ادارے میں کوئی بل یا قرارداد اس وقت تک منظور نہ کی جائے جب تک اس بل یا قرارداد کی مخالفت کسی فرقہ کے تین چوتھائی اراکین کر رہے ہوں کیونکہ اس صورت میں ایسی کسی قرارداد یا بل یا ان دونوں کے کسی حصے کی منظوری اُس مخصوص فرقے کے لئے مضر ثابت ہوگی۔ ایسے معاملات سے نمٹنے کے لئے کوئی دوسرا ممکن العمل طریقہ دریافت کیا جائے۔

ان قراردادوں کو محمد علی جناح کی تائید حاصل تھی، تاہم مولانا محمد علی، مولانا شوکت، محمد ساقی اور مولانا عبدالباری نے ان کی مخالفت کی۔ مولانا محمد علی نے یہ مطالبہ کیا کہ ایک گول میز کانفرنس طلب کی جائے جس میں تمام فرقوں اور سیاسی جماعتوں کے نمائندے شریک ہوں تاکہ اس کانفرنس میں 'سوراج' کے لئے آئین وضع کیا جا سکے۔

یہ پہلا موقع تھا جب مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس ضمن میں جو قرارداد منظور کی گئی اس میں کہا گیا کہ بمبئی کے ساتھ سندھ کو منسلک رکھنے کا جغرافیائی یا کوئی اور جواز نہیں۔ ماضی کے تجربات شاہد تھے کہ سندھ کے لوگوں کو اس بنا پر شدید

ملتان پہنچا اور اس کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں۔ لہذا سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔
ان تمام قراردادوں کے بارے میں مسلم لیگ نے دوسری جماعتوں اور فرقوں کے ساتھ مفاہمت بات چیت کے دروازے کھلے رکھے۔ ایک کمیٹی بھی قائم کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ آئینی ارتقاء کیلئے سکیم مرتب کرے جو شاہی کمیشن کے سامنے پیش کی جائے اور جس میں مسلمانوں کے مفادات کا خیال رکھا جائے۔ یہ کمیٹی ۱۹۔ ارکین پر مشتمل تھی۔

اصلاحات کی تحقیقاتی کمیٹی:

فروری ۱۹۲۴ء میں مرکزی اسمبلی کے ایک رکن دیوان بہادر رنگ چاری نے مرکزی اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی جس میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر نظرِ ثانی کا مطالبہ کیا گیا تاکہ ہندوستان کے لئے سلطنت برطانیہ کے دائرے میں رہتے ہوئے مکمل خود مختار حیثیت اور صوبائی خودمختاری کے جلد از جلد حصول کا جائزہ لیا جا سکے۔ سوراج پارٹی کے قائد پنڈت موتی لعل نہرو نے اس قرارداد میں ایک ترمیم پیش کی جس کے ذریعے جلد از جلد ایک گول میز کانفرنس بلانے کا مطالبہ کیا گیا تاکہ ہندوستان کی اہم اقلیتوں کے مفادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے لئے آئین کی ایک اسکیم مرتب کی جا سکے اور اس کے بعد مرکزی مقننہ کو ختم کر کے مجوزہ اسکیم کو ایک نئی منتخب ہندوستانی مقننہ کے سامنے پیش کیا جائے۔ اسی سکیم کو برطانوی پارلیمان کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ وہ اسے آئینی صورت دے۔ ہوم ممبر سر مالکم ہیلی نے اس قرارداد اور ترمیم کے بارے میں بتایا کہ حکومت اس سلسلے میں تحقیقات کرنے پر آمادہ تھی اور اگر تحقیقات کے بعد فی الواقعہ یہ محسوس کیا گیا کہ ایکٹ میں خامیاں موجود ہیں اور اس ایکٹ کے اندر آگے بڑھنے کے لئے لچک اور امکانات موجود ہیں تو اس قسم کی سفارشات ضرور پیش کی جائیں گی۔ لیکن اگر تحقیقات سے یہ واضح ہوا کہ آئین میں ترمیم کئے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں تو اس صورت میں اس مسئلہ کو لازماً ایک علیحدہ مسئلہ کی حیثیت دینا ضروری ہوگا اور حکومت کسی صورت بھی پابند نہ ہو گی۔

محمد علی جناح نے تقریر کرتے ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء میں حکومت کی طرف سے ترمیم اور نظرِ ثانی کی ضرورت کو تسلیم کر لینے پر خوشی کا اظہار کیا تاہم انہوں نے مالکم ہیلی کی اس بات سے اتفاق نہ کیا کہ محکمانہ تحقیقات کی جائے۔ محمد علی جناح نے گول میز کانفرنس کے انعقاد کی تائید بھی کی تاکہ اس کانفرنس میں حکومت کے مشورے سے ایک آئین بھی مرتب کیا جائے۔

پنڈت موتی لعل نہرو کی ترمیم اسمبلی میں منظور کر لی گئی۔ آئینی ارتقاء سے متعلق حکومت ہند نے اصلاحات کی ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کر دی۔ لیکن اس کمیٹی کے جو مقاصد بیان کئے گئے اُن میں وہ لچک موجود نہ تھی جس کے بارے میں مالکم ہیلی نے اسمبلی میں یقین دلایا تھا۔ اس کمیٹی میں مندرجہ ذیل افراد شامل تھے:

سر الیگزینڈر (چیئرمین)، سر محمد شفیع، مہاراجہ بردوان، سر آرتھر فروم، سر ہنری مونکریف، سر تیج بہادر سپرو، سر سیوا سوامی آئر، محمد علی جناح اور ڈاکٹر پرانجپائی۔

کمیٹی نے اپنا کام شروع کر دیا اور ہندوستانی وزراء اور ایگزیکٹو کونسلوں کے اراکین کے علاوہ بہت سے دیگر نمایاں لوگوں کے بیانات بھی قلم بند کئے۔ مگر یہ کمیٹی متفقہ رپورٹ مرتب نہ کر سکی۔ کمیٹی کے پانچ اراکین کی ایک رپورٹ تھی اور چار اراکین کی دوسری۔ محمد علی جناح چار آدمیوں کی رپورٹ پر دستخط کرنے والوں میں ایک تھے۔ جہاں تک پانچ اراکین کی رپورٹ کا تعلق تھا تو لب لباب یہ تھا کہ ایکٹ میں شامل دوعملی حکومت کی سکیم کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے بعض سفارشات کی گئی تھیں تاہم ان میں دوعملی آئین کی خامیوں کے بارے میں کوئی تذکرہ موجود نہ تھا۔ اس رپورٹ پر دستخط کرنے والے پانچوں اراکین اس بات پر متفق تھے کہ ہندوستان میں ذمہ دار حکومت کے لئے مناسب تربیت ممکن ہو سکتی ہے۔

اس کے مقابلے میں چار اراکین اس بات پر متفق تھے کہ موجودہ آئین میں بہت سے نقائص موجود تھے۔ لوگوں کو محفوظ اور منتقل محکمہ جات کے انتظام و انصرام اور پالیسیوں کے ردعمل پہ شدید اعتراض تھا۔ اس رپورٹ میں کہا گیا کہ وزراء مقننہ کے سامنے پوری طرح ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ محکمہ خزانہ جو ایک محفوظ محکمہ تھا، تمام اخراجات پر کنٹرول کرتا تھا۔ اور بعض وزراء اور ایگزیکٹو کے اراکین کے درمیان بہت سے اختلافات پیدا ہو جاتے تھے۔ اس کمیٹی نے واضح الفاظ میں یہ کہا کہ دوعملی نظام قطعی طور پر ناکام ثابت ہوا تھا اور مستقبل میں اس نظام کے تحت بہتر نتائج کی توقع رکھنا عبث تھا۔

دو سال بعد یعنی ۱۹۲۷ء میں حکومت برطانیہ نے ایک کمیشن قائم کیا۔ قیام کا مقصد یہ تھا کہ آئینی اصلاحات کے تمام مسائل پہ غور کیا جائے۔ اس کمیشن میں کیونکہ کوئی ہندوستانی شامل نہ کیا گیا لہذا ہندوستان میں اس بات پر شدید مزاحمت کی گئی۔

دوسرا مسئلہ ہندوستانیوں کے لئے فوجی تربیت کا تھا۔ فروری ۱۹۲۵ء میں ایک

ہندو رکن اسمبلی نے مرکزی اسمبلی میں اس امر کی قرارداد پیش کی کہ کسی مناسب جگہ اور فوری طور پر ایک ملٹری کالج کھولا جائے جہاں ہندوستان کی فوج میں ہندوستانی کمیشنڈ افسروں کے عہدوں کی تربیت کے لئے انتظام ہو۔ محمد علی جناح اس سے پہلے بھی یہی مطالبہ کر چکے تھے۔ انہوں نے صاف طور پر یہ کہا تھا:

"ہم ڈیڑھ سو سال سے تمہاری حکومت کے محکوم ہیں۔ تمہاری انگریز حکومت نے ہندوستان کے عوام کو ہتھیاروں سے محروم کر رکھا ہے، سوال یہ ہے کہ تم نے کیا کیا ہے؟ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ برطانوی اور ہندوستانی فوجوں میں سب افسر انگریز ہیں۔ صرف دو تین سال پہلے ہیں دو معمولی سی مراعات دی گئیں کہ ۱۰ طالب علموں کو سینڈ ہرسٹ بھیجا گیا۔ ڈیڑھ سو سالہ حکومت میں یہ پہلا موقع ہے کہ تم نے چند لوگوں کو کنگ کمیشن دیا۔ آج پوری فوج خواہ وہ انگلستان کی ہو یا ہندوستان کی، انگریزوں سے بھری پڑی ہے۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ ہندوستان کی فوج میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی ہوں۔"

اس مفہوم کی قرارداد منظور کر لی گئی اور اسمبلی نے ہندوستان میں ہندوستانی افسروں کی تربیت کے لئے ایک ملٹری کالج قائم کرنے کی غرض سے اقدامات کرنے اور حالات کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیٹی قائم کرنے کی سفارش کی۔ جولائی ۱۹۲۵ء میں ایک انڈین سینڈ ہرسٹ کمیٹی قائم کی گئی جس میں لیفٹیننٹ جنرل سر اینڈریو سکین، کیپٹن نیرجی، پی سٹینا، سردار جوگندر سنگھ، سر عبد القیوم، محمد علی جناح، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، دیوان بہادر رام چندر راؤ، کیپٹن ہیرا سنگھ، کیپٹن گل محمد خاں، پنڈت موتی لعل نہرو اور ای برڈن شامل تھے۔ اس سال اگست میں اس کمیٹی نے اپنا کام شروع کر دیا۔ بعد ازاں ایک سب کمیٹی تشکیل کر دی گئی جس کے قائد محمد علی جناح تھے۔ اس کمیٹی نے پورے یورپ کا دورہ کیا اور وہاں مختلف فوجی کالجوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا۔ کمیٹی نے ۱۹۲۷ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اسمبلی میں "سکین کمیٹی" کی سفارشات کو مؤثر بنانے کے لئے ایک قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے محمد علی جناح نے بتایا کہ وہ یورپ میں جہاں بھی گئے، ہندوستان میں فوجی کالج کی تجویز کا خیر مقدم کیا گیا لیکن صرف سینڈ ہرسٹ کالج نے اس کی مخالفت کی۔ محمد علی جناح نے کہا کہ اگر انگریزوں کے نیچے تعاون کرنے کے لئے تیار رہیں اور اگر وہ اس ملک میں یہ حیثیت اور صلاحیت کے مطابق عہدے حاصل کرنا نہیں چاہتے تو اگست ۱۹۱۷ء کا اعلان

ابھی اور یہیں پھاڑ دیا جائے نیز ہندوستان کے عوام کو صاف بتا دیا جائے کہ انگریز اس ملک میں صرف حکومت کرنے کی غرض سے آئے ہیں۔ محمد علی جناح نے بڑے کھلے الفاظ میں یہ بھی کہا کہ یہ انگریز کا وہی تعصب ہے جو اس نے سول ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی بھرتی اور مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے نفاذ کے وقت برتا تھا۔ سول ملازمتوں میں ہندوستانیوں کو جگہ دینے کی بات آئی تو انگریز افسروں نے یہ کہا کہ اگر ہندوستانیوں کو شامل کیا گیا تو وہ سب استعفا دے دیں گے کیونکہ وہ ہندوستانیوں کے غلام بن کر نہیں رہنا چاہتے اور جب اصلاحات کی باری آئی تو بہت سے انگریزوں نے یہ کہہ دیا کہ وہ ان اصلاحات کو تسلیم کرنے کی بجائے اس ملک کو چھوڑ دینا پسند کریں گے لیکن آج یہی دھمکی دینے والے اسمبلی کی بنچوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔

سائمن کمیشن

آئینی مشینری کی تطہیر کے لئے مختلف سیاسی جماعتوں کے مسلسل مطالبے سے مجبور ہو کر برطانوی حکومت نے ۸۔ نومبر ۱۹۲۷ء کو ایک کمیشن قائم کر دیا جس کا کام گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کی کارکردگی کے بارے میں تحقیقات کرنا اور تبدیلیوں کے لئے سفارش کرنا تھا۔ اس کمیشن کے چیئرمین سر جان سائمن تھے۔ یہ فعلی طور پر ایک پارلیمانی کمیشن تھا جس میں برطانوی ایوانِ عوام کے پانچ اور ایوانِ بالا کے دو اراکین شامل تھے۔ کمیشن کے قیام کے بعد ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں سے کہا گیا کہ وہ کمیشن کے سامنے پیش کرنے کے لئے تجاویز مرتب کریں اور اس سلسلے میں کمیٹیاں قائم کریں۔ ہندوستان کے تمام سیاسی رہنماؤں اور عوام کو اس بات پر شدید اعتراض تھا کہ کمیشن کے تمام اراکین انگریز تھے اور اس میں کسی ہندوستانی کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اسی لئے کوئی بھی شخص کمیشن کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ نظر نہ آتا تھا۔

کانگریس کا بائیکاٹ

کانگریس نے کمیشن کا بائیکاٹ کر دیا اور محمد علی جناح نے مسلم اور غیر مسلم رہنماؤں کے نام ایک مراسلہ روانہ کیا۔ انہوں نے تمام نمایاں رہنماؤں سے درخواست کی کہ وہ اپنا نام اس مسودے پر دستخط کرنے والوں کی فہرست میں شامل کرنے کا اختیار دیں۔ محمد علی جناح کو اس مقصد میں نمایاں کامیابی نصیب ہوئی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے علاوہ سیاسی اور غیر سیاسی جماعتوں

نے بھی انہیں اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔

اس وقت مسلمانوں میں اتنا افتراق پیدا ہو چکا تھا کہ پنجاب کے میاں محمد شفیع نے اپنے گروہ کے ساتھ سائمن کمیشن سے تعاون کرنے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے لاہور میں ایک اجلاس بھی بلا لیا اور سائمن کمیشن کے ساتھ تعاون کی قرارداد بھی منظور کرائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندوستان میں دو مسلم لیگیں قائم ہو گئیں۔ حالانکہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل نے دسمبر ۱۹۲۷ء کے آخری ہفتے میں مسلم لیگ کا اجلاس لاہور طلب کرنا چاہا تھا لیکن اس کے بعد کونسل نے یہ اجلاس کلکتہ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح ۱۹۲۷ء میں مسلم لیگ کے دو اجلاس منعقد ہونے یعنی ایک لاہور میں اور دوسرا کلکتہ میں۔ تاہم کلکتہ کے اجلاس میں زیادہ لوگوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس کی صدارت مراد آباد کے مولوی محمد یعقوب نے کی۔ اجلاس نے ایک قرارداد بھی منظور کی اور اعلان کر دیا کہ ہندوستان بھر کے مسلمان کمیشن سے کوئی تعاون نہیں کریں گے۔ ایک اور قرارداد میں میاں محمد شفیع کی طرف سے لاہور میں مسلم لیگ کا غیر آئینی اجلاس منعقد کرنے کی بھی شدید مذمت کی گئی اور پنجاب کی صوبائی مسلم لیگ کو ختم کر کے پنجاب کے مسلمانوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے صوبے کے لئے ایک نمائندہ صوبائی مسلم لیگ کی تشکیل کریں۔

مسلم لیگ کی قرارداد

مسلم لیگ نے ہندوؤں کا یہ بہانہ ختم کرنے کے لئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد میں جداگانہ انتخاب رکاوٹ تھے، کچھ اور قراردادیں بھی منظور کیں؛

۱۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک الگ صوبے کی آئینی حیثیت دی جائے۔

۲۔ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں بھی اسی سطح کی اصلاحات کا نفاذ کیا جائے جو دوسرے صوبوں میں موجود ہیں۔

۳۔ اگر ایسا کیا گیا تو مسلمان ان نئے صوبوں میں مخلوط انتخاب کے لئے تیار ہو جائیں گے اور سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد میں ہندو اقلیتوں کو بھی وہی مراعات دینے پہ آمادہ ہوں گے جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے دی جائیں گی۔

۱۹۲۴ء میں لارڈ برکن ہیڈ وزیر امور ہند تھے۔ انہوں نے بارہا یہ کہا تھا کہ ہندوستانی اس قابل نہیں کہ وہاں نوآبادیاتی درجے کی حکومت خود اختیاری دی جائے۔ بہتر یہ ہوگا کہ انگریز، برطانیہ کی طاقت کی خاطر اور ہندوستان کی بھلائی کے لئے ہندوستان میں رہے۔ جب ہندوستانیوں نے سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا تو لارڈ برکن ہیڈ نے صاف طور پہ کہہ دیا کہ ہندوستانی ہمیشہ حکومت کے خلاف تخریبی نقطۂ نظر سے بات کرتے ہیں وہ اپنی طرف سے آئین کے لئے کوئی متحدہ سکیم پیش کیوں نہیں کرتے؟

باب ۱۹

نہرو رپورٹ اور تجاویز دلی

۱۹۲۴ کے اجلاسِ لاہور سے مسلم لیگ جو مطالبات کر رہی تھی وہی مطالبات اس نے اپنے اجلاس علی گڑھ منعقدہ دسمبر ۱۹۲۵ میں دُہرائے۔ مسلم لیگ نے کانگریس کے ساتھ مفاہمت کے سلسلے میں جو کوششیں کی تھیں وہ بھی بار آور نہ ہو سکیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۲۶ میں دلی میں شیخ عبدالقادر کی زیرِ صدارت منعقد ہوا اور ایک بار پھر لاہور اور علی گڑھ کے مطالبات کا اعادہ کیا گیا۔ مسلم لیگ کا مقصد یہی تھا کہ کسی طرح حکومت جلد از جلد ہندوستان کو ایک خود مختار نو آبادیاتی حکومت کا درجہ دینے کی طرف پیش قدمی کرے۔

دلی کے اجلاس میں محمد علی جناح نے خود ایک قرارداد پیش کی اور کہا:

"مسلمانوں کے بارے میں کانگریس کا رویہ اب تک غیر یقینی ہے کیونکہ اس لمحہ تک کوئی ذمہ دار کانگرسی یا ہندو رہنما ٹھوس تجاویز کے ساتھ سامنے نہیں آیا اور ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہی مناسب نہیں سمجھا۔ ملک کے اندر فرقہ واریت بدستور موجود ہے اور اس کو بات چیت کے ذریعہ ختم نہیں کیا جا سکتا نہ ہی مخلوط انتخابات کے ذریعے قومیت کو ایک سطح پہ لایا جا سکتا ہے۔ ہمارے سامنے کینیڈا کی مثال

موجود ہے۔ یہاں جداگانہ انتخابات ایک نمائندہ حکومت کی نشوونما میں کبھی حائل نہیں ہوئے۔ ہماری خواہش تو صرف اتنی ہے کہ ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت ہوجائے اور اختلافات ختم ہوجائیں، تو ایک ذمہ دار اور خود مختار حکومت کے قیام کے سلسلے میں ہمارا نصف سفر طے ہوجائے۔"

محمد علی جناح نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے سلسلے میں اپنی کوشش جاری رکھی۔ اس موقع پر پنڈت موتی لعل نہرو نے محمد علی جناح کو ذاتی حیثیت سے یقین دلایا کہ اگر مسلمانوں نے مخلوط انتخاب کو تسلیم کر لیا تو وہ کانگریس کو مسلمانوں کے باقی تمام مطالبات ماننے پر مجبور کر سکتے تھے۔ چنانچہ محمد علی جناح نے یہ مناسب خیال کیا کہ پنڈت موتی لعل نہرو کی اس پیش کش کی بنیاد کو بھی آزما لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ انہوں نے ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دلی ہی میں مختلف طبقۂ خیال کے مسلمانوں کی ایک کانفرنس طلب کی اور انہیں تاروں کے ذریعہ دعوت نامے روانہ کر دیئے۔ یہ کانفرنس محمد علی جناح کے گھر پر ہی منعقد ہوئی، جس میں سر محمد شفیع، سر علی امام، مفتی کفایت اللہ، راجہ غضنفر علی خاں، سر محمد نواز، صاحبزادہ عبدالقیوم، میاں شہنواز، مہاراجہ محمود آباد، مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، مولوی شفیع داؤدی، ڈاکٹر عبداللہ سہروردی، سید مرتضیٰ، عبدالمتین چودھری اور انوار العظیم نمایاں تھے۔ کانفرنس کے سیکرٹری راجہ غضنفر علی خاں اور صدر محمد علی جناح تھے۔ کئی نشستوں اور دو دن کے غور و خوض کے بعد کانفرنس نے ایک فارمولہ تیار کیا جو یہ تھا:

۱۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔

۲۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات کا نفاذ کر کے دونوں صوبوں کو دوسرے صوبوں کا درجہ دیا جائے۔

۳۔ مسلمان صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان میں ہندو اقلیتوں کے لئے وہ تمام مراعات دینے پر تیار ہوں جو مسلمانوں کو ہندو اکثریتی صوبوں میں دی جائیں گی۔

۴۔ پنجاب اور بنگال میں نمائندگی کا تناسب آبادی کی مطابقت سے ہو۔

۵۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

۶۔ اگر یہ تجاویز منظور کر لی جائیں تو مسلمان مخلوط انتخابات پر تیار ہوجائیں گے۔

۱۰۔ مارچ ۱۹۲۷ء کو یہ فارمولہ شائع کر دیا گیا اور مختلف مسلمان رہنماؤں نے یہ فارمولہ
ح کرنے پر محمد علی جناح کی ذہانت کی بہت تعریف کی۔ لیکن سر محمد شفیع، جو اس کانفرنس
شریک تھے، جب لاہور واپس پہنچے تو انہوں نے ایک بیان میں اس فارمولہ سے اختلاف
ظہار کیا۔ یہ فارمولہ اتنا واضح اور منصفانہ تھا کہ ہندوؤں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں
نا چاہئے تھا۔ صورت یہ تھی کہ مجموعی طور پر ہندوستان میں مسلمان، اقلیت میں تھے۔ لیکن
دی کی تقسیم اس طرح تھی کہ وہ پانچ صوبوں میں اکثریت کے حامل تھے جبکہ ہندوؤں کو
ات صوبوں میں اکثریت حاصل تھی۔ یہ قدرتی بات تھی کہ اگر ہندو اپنی اکثریت کے
ات صوبوں میں مسلمانوں کو کچھ مراعات دیتے تو مسلمان اپنے اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں
بھی مراعات دیتے۔ مرکز میں مسلمانوں نے اپنے لئے ایک تہائی نشستوں کی تخصیص
مطالبہ اس لئے کیا تھا کہ وہ اپنی نمائندگی محسوس کرا سکیں۔ اس فارمولہ کے تحت ہندو یا
سلمان کسی ایک سے بھی ناانصافی نہ ہوتی تھی۔ لیکن ان تجاویز سے اتفاق نہ کیا گیا۔ ہندو
خبارات نے اس فارمولہ پر شور مچایا۔ سر فضل حسین نے بھی پس پردہ مخالفت شروع کر دی۔
ہندو چاہتے تھے کہ مسلمان، مخلوط انتخاب کو غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیں اور مسلمانوں پر ہندوؤں
غلبہ برقرار رہے۔ علامہ اقبال اس وقت صوبائی کونسل کے رکن تھے۔ انہوں نے
سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ بھی اس فارمولہ کے خلاف اور سر فضل حسین کے
م نوا تھے (سر فضل حسین پس پردہ اس فارمولہ کے مخالف تھے) سر فضل حسین اس بات پر
مصر تھے کہ صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کے ذریعے اکثریت قائم ہو
ونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ انگریز محدود حق رائے دہی کی جگہ بالغ رائے دہی کا اصول کبھی قبول
کرے گا اور محدود حق رائے دہی کی صورت میں رائے دہندگان کی فہرست میں صرف
الیس فیصد مسلمان آتے تھے انہیں مزید اندیشہ یہ تھا کہ بالغ رائے دہی کی صورت میں
بی انتخابات کے دوران ہندو اپنی دولت سے اثر انداز ہوں گے۔ کانگریس کے صدر
سری نواس آئینگر نے اس فارمولے پر غور کرنے کے لئے کانگریس کا اجلاس طلب کر لیا۔

محمد علی جناح نے ان تجاویز کی مزید وضاحت کے لئے مارچ ۱۹۲۷ء میں ایک بیان
جاری کیا انہوں نے کہا:

"نئی تجاویز کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ "کچھ لو اور کچھ دو" صرف

[illegible] انتخابات جداگانہ ہوں
یا مخلوط، یہ کسی مقصد کے حصول کی بات نہیں۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ قومی حکومت کے قیام تک عبوری دور میں مسلمانوں پر کوئی اکثریتی فرقہ زیادتی نہ کر سکے۔ دونوں فرقوں میں سیاسی توازن ضروری ہے اور یہ تجاویز اُس توازن کو بہرحال قائم رکھتی ہیں۔ اگر ہندو اور مسلمان دونوں ان تجاویز کو تسلیم کر لیں تو سمجھوتہ ہونے میں کوئی تاخیر نہیں ہوگی۔ میں خود جداگانہ انتخابات کا حامی نہیں۔ مگر مسلمان اس طریقِ انتخاب کو اپنی حفاظت کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جداگانہ انتخاب میں اچھائیاں اور برائیاں دونوں موجود ہیں۔ لیکن اصل مدعا یہ ہے کہ اقلیتوں کو اپنے تحفظ کا احساس ہوگا۔"

سر فضل حسین کو اندیشہ یہ تھا کہ کہیں کانگریس اس فارمولہ کو تسلیم نہ کر لے۔ کیونکہ اگر کانگریس نے ایسا کیا تو حکومت بھی اسے تسلیم کر لے گی۔ اس طرح جو لوگ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے اکثریت چاہتے تھے انہیں شکست ہو جائے گی۔ مئی ۱۹۲۷ء میں سر محمد شفیع نے لاہور میں مسلمانوں کے ایک جلسۂ عام کی صدارت کی جس میں علامہ اقبال نے تجاویز دہلی کے خلاف ایک قرارداد پیش کی اور پھر جلسے اور مظاہرے شروع ہو گئے۔ مدراس، پٹنہ، کلکتہ اور ہندوستان کے بہت سے دوسرے بڑے شہروں میں بھی احتجاجی جلسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین جو اس فارمولہ کے خلاف تھے، فرانس میں آغا خاں سے ملے اور انہیں سر فضل حسین کا یہ پیغام دیا کہ اگر ہندوستان میں تجاویز کے خلاف مسلمانوں کا کوئی بڑا جلسہ منعقد کیا گیا تو آغا خاں اس کی صدارت کریں گے۔

کانگریس کا ردِّعمل

مئی ۱۹۲۷ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا جس نے تجاویز دہلی کی توثیق کر دی۔ اسی سال دسمبر میں کانگریس کا سالانہ اجلاس مدراس میں منعقد ہوا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے سوال پر ایک قرارداد منظور کی جو تقریباً انہی خطوط پر تھی جن پر دہلی تجاویز کا اعلان کیا گیا تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد ہی کانگریس نے ان تجاویز کو مسترد کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ حالانکہ کچھ عرصہ قبل ہی مسز سروجنی نائیڈو نے اپنی تقریر میں اس

امر کا اعتراف کیا تھا کہ اتحاد کا ایک بہت بڑا مورچہ فتح کر لیا گیا ہے، اور اس کامیابی کا سہرا اتحاد کے پیغامبر محمد علی جناح کے سر ہے۔

سوال یہ ہے کہ کانگریس نے اچانک یہ پلٹا کیوں کھایا؟ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ گاندھی کے ایما پر ہوا۔ کانگریس نے اپنی ورکنگ کمیٹی کے فیصلے پر لبیک کہنے کی جگہ مجلس عاملہ کو یہ حکم دیا کہ وہ ایک آل پارٹیز کانفرنس بلائے اور تجاویز دلی اور دیگر پارٹیوں کی تجاویز کو سامنے رکھ کر ملک کے لئے کوئی متفقہ آئین تیار کرے۔ دیگر پارٹیوں کی تجاویز کا مطلب یہ تھا کہ آل پارٹیز کانفرنس میں تقریباً ۷۰ پارٹیوں کی تجاویز پر غور ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ان سب پر اتفاق ناممکن تھا۔

کانفرنس اور نہرو رپورٹ

۱۲۔ فروری ۱۹۲۸ء کو دلی میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس کانگریس کے زیر اہتمام شروع ہوا جو ۱۱۔ مارچ ۱۹۲۸ء تک جاری رہا۔ اس دوران کانفرنس کے ۲۵ اجلاس منعقد ہوئے۔ کانفرنس میں ہندوستان میں رہنے والی اقوام کی تمام انجمنوں کے نمائندے شریک تھے۔ طے یہ ہوا کہ ہندوستان میں مکمل ذمہ دار حکومت کے قیام کو پیش نظر رکھتے ہوئے آئندہ آئین پر بات چیت کی جائے اور یہ بھی طے کیا جائے کہ تمام فرقوں کا باہمی تعلق اور تناسب کیا ہو۔ لیکن ۲۵ اجلاس منعقد کرنے کے باوجود کانفرنس ناکام رہی اور کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکی۔

ناکامی کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا تھا کہ آل پارٹیز کانفرنس نے جو تجاویز پیش کیں، وہ مسلم لیگ کی قراردادوں سے کوئی مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ قرارداد میں اس امر پر بھی اظہار افسوس کیا گیا کہ ہندو مہاسبھا نے ان تجاویز کو عملاً مسترد کر دیا تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ نے ایک کمیٹی تشکیل کی جس کا کام یہ تھا کہ وہ دوسری جماعتوں کے نمائندوں کے ساتھ بات چیت کرے اور انہیں مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ (دسمبر ۱۹۲۷ء) کی تجاویز قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے۔

دلی میں آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس کی ناکامی کے بعد کانگریس نے بمبئی میں دوبارہ کانفرنس طلب کی جو ۱۹ مئی سے شروع ہوئی۔ مسلمانوں اور دیگر سیاسی انجمنوں میں ہندوؤں کے رویہ کے خلاف اتنی بیزاری پیدا ہو چکی تھی کہ بمبئی کانفرنس میں چند لوگوں کے سوا کسی نے شرکت

نہ کی۔ مسلم لیگ کا بھی کوئی مسلمہ نمائندہ شریک نہ ہوا۔ حاضری کی کمی کی وجہ سے گاندھی نے پھر یہ تجویز پیش کی کہ کانفرنس ملتوی کر دی جائے۔ کچھ اراکین تو اس حد تک مایوس ہو چکے تھے کہ انہوں نے کانفرنس کا ارادہ ہی ترک کر دینے کی تجویز پیش کی۔ اسی دوران برطانوی وزیر امور ہند لارڈ برکن ہیڈ نے تمام ہندوستانی جماعتوں سے واضح الفاظ میں یہ کہہ دیا کہ وہ متفقہ طور پر کوئی آئین تیار کیوں نہیں کرتیں؟ تمام ہندوستانیوں کے لئے لارڈ برکن ہیڈ کی اس بات کو ایک چیلنج سمجھا گیا اور اس مقصد کے لئے کوشش شروع کر دی گئی۔ مسلم لیگ نے دہلی تجاویز کی صورت میں پہل کر دی تھی، لیکن ہندوؤں کی ذہنیت اور مسلمانوں پر غلبہ کا خیال انہیں کسی نتیجے پر پہنچانے کے راستے میں بری طرح حائل تھا۔ چنانچہ اس بار کانگریس نے نیا راستہ اختیار کیا۔ ایک کمیٹی تشکیل کی جس کا مقصد ہندوستان میں نوآبادیاتی درجے کی حکومت کے لئے ایک آئینی سکیم تیار کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے صدر پنڈت موتی لعل نہرو تھے۔ دیگر اراکین میں ایم۔ ایس آنے، سبھاش چندر بوس، سر تیج بہادر سپرو، سردار منگل سنگھ، ایم۔ آر جیکر، جی آر پردھان، محمد شعیب قریشی، سر علی امام اور این ایم جوشی شامل تھے۔ کمیٹی کے اراکین کے ناموں سے ظاہر تھا کہ اس میں مسلمانوں کی نمائندگی نہایت نامناسب تھی۔ دو مسلمان رکن تو ایسے تھے جن کا تعلق کسی بھی مسلمان جماعت سے نہ تھا۔

نہرو رپورٹ میں مسلمانوں کے تمام مطالبات کو کچھ اس انداز میں پس پشت ڈال دیا گیا جیسے ہندوستان میں انہیں کوئی حیثیت حاصل نہ تھی۔ اس رپورٹ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کانگریس مسلمانوں کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ رپورٹ کے اہم پہلو یہ تھے؛

- جداگانہ انتخابات قومی روح اور اس کی نشوونما کے منافی ہوں گے۔
- مخلوط انتخابات کے تحت کسی بھی فرقے کے لئے نشستوں کی تخصیص نہ ہوگی۔
- پنجاب اور بنگال میں آبادی کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے نشستوں کی تخصیص کا مطالبہ رد کر دیا گیا (ان دو صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی علی الترتیب ۵۶ اور ۵۵ فیصد تھی۔ مسلمان ان صوبوں میں تعلیمی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے پسماندہ تھے۔ صوبائی کونسلوں میں ان کی نمائندگی بہت کم تھی اور انہیں اندیشہ تھا کہ آئندہ اس میں مزید کمی واقع ہو جائے گی)
- صرف ہندو اکثریتی صوبوں میں مسلمان اقلیتوں کے لئے آبادی کی بنیاد پر اور مخلوط انتخابات

کے تحت نشستوں کی تخصیص کی جائے گی۔

- معاہدہ لکھنؤ اور مونٹیگ چیمسفورڈ اصلاحات کے تحت مسلمانوں کو جو توازن (WEIGHTAGE) دیا گیا تھا وہ حاصل نہ ہوگا۔
- مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نمائندگی کا مطالبہ مسترد کر دیا گیا اور آبادی کے اعتبار سے ۲۵ فیصد نشستوں کی تخصیص اور مزید نشستوں کے لئے مقابلے کا حق دینے کی سفارش۔
- مرکز کے لئے وحدانی شکل تجویز کی گئی۔
- صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لئے دوسرے صوبوں کے برابر آئینی درجہ کا مطالبہ مسترد کر دیا گیا۔
- سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے کا مطالبہ بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔

اس سلسلہ میں یہ بڑا عجیب و غریب موقف اختیار کیا گیا کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک الگ صوبہ بنا دیا جائے بشرطیکہ تحقیقات کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ:

ا۔ سندھ مالی اعتبار سے خود کفیل ہے۔

ب۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ سندھ مالی اعتبار سے خود کفیل نہیں تو سندھ کے عوام کے سامنے تمام مالی اور انتظامی پہلوؤں کو رکھا جائے اور اگر اُن کی اکثریت سندھ کی علیحدگی کے حق میں رائے دے اور اس امر پر آمادہ ہو کر وہ نئے صوبے کی تشکیل کی صورت میں تمام مالی ذمہ داریاں قبول کرے گی تو سندھ کو علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے۔

ج۔ اس صورت میں سندھ کا طرزِ حکومت آئین کے تحت دوسرے صوبوں کی طرح ہو۔

د۔ سندھ کی غیر مسلم اقلیت کو صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں نمائندگی کے لئے وہی مراعات دی جائیں جو نہرو رپورٹ کے تحت مسلمان اقلیتوں کو دی گئیں۔

سندھ کے بارے میں اس کمیٹی نے جن خیالات کا اظہار کیا اس کی منطق بہت دلچسپ تھی،

" مسلمان، ہندوستان میں ہندوؤں کے مقابلہ میں کم ہونے کی وجہ سے ڈرتے ہیں کہ ہندو اکثریت اُن پر غلبہ حاصل کر لے گی یا اُن کو سراسیمہ کرے گی۔ لہٰذا مسلمانوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمانوں کو کم از کم ہندوستان کے کچھ صوبوں میں غلبہ حاصل ہونا چاہئے۔ ہم اس مطالبے پر اس لئے تنقید نہیں کرتے کہ اس

میں کافی حد تک اور موجودہ فرقہ وارانہ ماحول کے تحت سچائی موجود ہے۔ دوسری طرف، گو ہندو پورے ہندوستان میں اکثریت کے حامل ہیں لیکن وہ پنجاب، بنگال، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد میں اپنی اقلیت اور پورے ہندوستان میں اکثریت کے باوجود مذکورہ بالا صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت کے باعث اُن کے غلبہ سے خوف زدہ ہیں۔"

ہندو کی پست ذہنیت اور تنگ دلی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؛ ایک طرف تو وہ پورے ہندوستان میں ہندوؤں کی واضح اکثریت کے باوجود صرف پانچ صوبوں میں مسلمانوں سے ان کی اکثریت کے باعث خائف نظر آتا ہے لیکن سات صوبوں میں اپنی اکثریت کے باوجود مسلمانوں کے اندیشوں کو خاطر میں نہیں لانا چاہتا۔

نہرو رپورٹ میں مرکز کو تمام اختیارات تفویض کرنے اور مرکز میں مسلمانوں کو ایک چوتھائی نشستیں دینے کا واضح مطلب یہ تھا کہ مرکز پر بہرحال ہندوؤں کا غلبہ رہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ صوبوں میں قدرتی طور پر ہندوؤں کو غلبہ حاصل رہے گا خواہ وہ مسلم اکثریت کے صوبے کیوں نہ ہوں۔

یہ رپورٹ اُسی پنڈت موتی لعل نہرو کی تھی جس نے محمد علی جناح سے وعدہ کیا کہ اگر مسلمان مخلوط طرز انتخاب پر تیار ہو جائیں تو اُن کے باقی تمام مطالبات تسلیم کر لئے جائیں گے۔ لیکن جب دلی تجاویز کے تحت مخلوط انتخاب کو تسلیم کر لیا گیا تو موتی لعل نہرو اپنے تمام وعدوں سے منحرف ہو گئے۔

کلکتہ کنونشن

نہرو رپورٹ جو اب تک محض ایک تجویز تھی، اب دسمبر ۱۹۲۸ء میں آل پارٹیز کنونشن کے سامنے پیش ہونا تھی کنونشن کا انعقاد کلکتہ میں ہونا تھا اور اس کے ساتھ ہی کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی۔ ادھر مسلم لیگ (سر محمد شفیع گروپ) نے ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس کی تیاری شروع کر دی اور صدارت کے لئے آغا خان کو منتخب کیا۔ محمد علی جناح اکتوبر ۱۹۲۸ء میں انگلستان سے ہندوستان واپس آئے تو انہوں نے نہرو رپورٹ پر کڑا کسیلا تبصرہ کرنے کی جگہ ایک اخباری بیان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے

رہنماؤں سے متحد ہونے کی درخواست کی اور اس توقع کا اظہار کیا کہ ہندو مسلمان رہنما نہرو رپورٹ میں ترامیم اور تجاویز دلی سے اس کی ہم آہنگی کے لئے پوری قوت صرف کریں گے۔

کلکتہ کنونشن کا اجلاس ۲۲ دسمبر کو شروع ہو گیا جس میں مسلم لیگ کی طرف سے محمد علی جناح، مہاراجہ محمود آباد، محمد کریم چھاگلہ، مولوی عبدالحمید، مولوی مجیب الرحمن، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ملک برکت علی، ڈاکٹر سید محمود، مولانا محمد اکرم خاں، سیٹھ یعقوب حسن، مولوی حسام الدین، مولانا ظفر علی خاں، غازی عبدالرحمن، سید عبداللہ، چودھری خلیق الزماں، مولوی منظر علی، تصدق احمد خاں شیروانی، نواب زادہ لیاقت علی خاں، شاہ محمد زبیر، مولوی عبدالغنی، مولوی فیض نور علی، مولوی محمد اسلم اور مولوی عبدالکریم شامل ہوئے۔ محمد علی جناح اس وفد کے قائد تھے۔

اس موقع پر محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی طرف سے تقریر کرتے ہوئے نہرو رپورٹ میں یہ ترامیم تجویز کیں کہ:

۱۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو مجموعی نشستوں کی ایک تہائی نشستیں دی جائیں۔

۲۔ پنجاب اور بنگال کی نشستیں آبادی کی بنیاد پر مخصوص کی جائیں۔

۳۔ آئین، وفاقی حیثیت کا حامل ہو اور اختیارات عابقی مرکز کی جگہ صوبوں کو حاصل ہوں۔ نیز مرکز اور صوبوں کے محکموں پر نظر ثانی کی جائے۔

۴۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کیا جائے اور ہندو کمیٹی کی آئینی سکیم کے مطابق صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات حکومت کے قیام پر منحصر نہ ہوں۔

کنونشن کی سب کمیٹی نے محمد علی جناح کی یہ تمام تجاویز مسترد کر دیں۔ اس کے باوجود محمد علی جناح ۳۰ دسمبر ۱۹۲۸ء کو کنونشن کے کھلے اجلاس میں شریک ہوئے۔ اس موقع پر انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"مجھے افسوس ہے کہ نہرو کمیٹی نے اپنی سفارشات میں انتہائی تنگ نظری سے کام لیا جس کی بنا پر ہندوستان کے مسلمان اپنے سیاسی مستقبل کے بارے میں پُر اعتماد نہیں ہو سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ نہیں ہوتا، اس وقت تک ترقی کا خیال دل میں لانا بھی فضول ہے۔ اکثریت ظلم اور جبر کا رجحان رکھتی ہے اور اقلیت اپنے نقصان سے

خوف زدہ رہتی ہے۔ لہٰذا مسلم اقلیت کے ساتھ انصاف ضروری ہے اور اس سے بھی زیادہ ضروری ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد !"

محمد علی جناح نے جس استدلال کے ساتھ تقاریر کیں اور اعتراضات کے جواب دیئے۔ اُن کی تائید سر تیج بہادر سپرو اور مولانا محمد علی جوہر نے بھی کی۔ سر تیج بہادر نے تو یہاں تک کہا کہ:

"محمد علی جناح نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے لئے جو کچھ کیا، میں اس احسان کے صلہ میں کسی دلیل کے بغیر اُن کی ہر بات ماننے پر تیار ہوں۔"

لیکن کنونشن میں جو ۱۲۰۰ نمائندے موجود تھے اُن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس صورت میں اکیلے سر تیج بہادر سپرو کیا کرتے؛

ہندو مہا سبھا کے ایک نمائندے نے تو یہاں تک کہا کہ:

"جناح ایک ضدی بچہ ہے جس کا دماغ کانگریس کے لاڈ پیار سے بالکل خراب ہو چکا ہے"

ہندو مہا سبھا کے اس نمائندے نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ محمد علی جناح کس کی نمائندگی کر رہے ہیں؛ کیونکہ مسلمان تو کانگریس کے ساتھ ہیں یا جمعیت العلمائے ہند کے ساتھ!

اسی موقع پر مولانا محمد علی بھی ہندوؤں کے پست رویّے سے بہت بددل ہوئے جب کنونشن میں یہ بات زیر بحث آئی کہ ہندوستان کا درجہ کیا ہو؛ تو مولانا محمد علی نے ہندوستان کو نو آبادیاتی درجہ دینے سے اختلافات کرتے ہوئے مکمل آزادی کی حمایت کی۔ انہوں نے کہا کہ جو لوگ ہندوستان کی مکمل آزادی کے مخالف ہیں، وہ بزدلی کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ مولانا کی اس بات پر شدید ہنگامہ ہوا اور ہندوؤں نے بار بار نعرہ لگایا "بیٹھ جاؤ" گو مولانا نے اپنی تقریر اس ہنگامے میں جاری رکھی لیکن اس کے بعد وہ احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے۔ اس کے بعد انہوں نے دوبارہ کنونشن کا رُخ کیا نہ ہی کانگرس کا!

محمد علی جناح نے اپنے طور پر حالات کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ مسلم لیگ کے مجوزہ اجلاس کا فی الحال کوئی فائدہ نہیں لہٰذا انہوں نے اجلاس ملتوی کر دیا اور خود بمبئی چلے گئے ـــ مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس مارچ ۱۹۲۹ء میں دلی میں ہونا قرار پایا۔

کلکتہ کنونشن میں مسلمانوں کے مطالبات مسترد کرنے کے بعد کانگرس نے اس شرط پر

نہرو رپورٹ کو قبول کر لیا کہ اگر ۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۹ء تک برطانوی پارلیمان نے نہرو رپورٹ کی سفارشات کو قبول نہ کیا اور انہیں آئندہ آئین کی بنیاد کے طور پر بھی تسلیم نہ کیا تو کانگریس مکمل آزادی کے لئے سول نافرمانی اور ٹیکسوں کی عدم ادائیگی کا سلسلہ شروع کر دے گی۔ دراصل کانگریس یہ دھمکی اس لئے دے رہی تھی کہ انگریزی حکومت دباؤ میں آ کر ہندوؤں کے مطالبات کو تسلیم کر لے اور مسلمان بے بس ہو کر رہ جائیں۔ یہ صورت حال خاصی نازک تھی۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے دلی میں ایک آل انڈیا کانفرنس منعقد کرنے کا پروگرام بنایا۔ کانفرنس کے لئے ۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۸ء مقرر کی گئی۔

مولانا محمد علی ہندوؤں سے اس حد تک بددل ہو چکے تھے کہ انہوں نے نہرو رپورٹ کے بارے میں یہ کہا کہ ایک دن آئے گا جب حکومت کسی نئے حکم کا اعلان اس طرح کیا جائے گا:

"خلق خدا کی ——— ملک برطانیہ کا ——— حکم مہاسبھا بہادر کا۔"

باب ۱۷

جناح کے ۱۴ نکات

آل پارٹیز مسلم کانفرنس

کلکتہ کنونشن میں ہندوؤں کی بہانہ تراشیوں اور حیلہ سازیوں کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان بد دل ہو چکے تھے حتیٰ کہ مسلمان قوم پرستوں کا خیال بھی یہ تھا کہ کانگریس نے متعصب ہندو مہاسبھا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ اسی صورت حال سے فکر مند ہو کر مولانا محمد علی نے ۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۸ء کو دلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی تھی۔ دراصل یہ وہی کانفرنس تھی جو مسلم لیگ کے دوسرے دھڑے (سر شفیع گروپ) نے طلب کی تھی۔ اس کانفرنس کی صدارت آغا خاں نے کی جس میں خلافت کمیٹی، جمعیت العلمائے ہند، مسلم لیگ (شفیع گروپ) اور دیگر مسلمان جماعتوں نے شرکت کی۔ تاہم آل انڈیا مسلم لیگ (جناح گروپ) اس کانفرنس میں جماعتی حیثیت میں شریک نہ ہوئی۔

اس کانفرنس میں سر محمد شفیع نے ایک قرارداد پیش کی جس کی تائید علامہ اقبال نے کی۔ دیگر تائید کنندگان میں سر محمد یعقوب، مولانا شفیع داؤدی، مولانا محمد علی اور مفتی کفایت اللہ شامل تھے۔ قرارداد یہ تھی:

"ہندوستان کی وسعت، جغرافیائی اور علاقائی تقسیم اور لسانی امور کے پیش نظر ہندوستان کے لئے صرف وفاقی نظام ہی سود مند ہو سکتا ہے۔ جس میں

تمام ریاستوں کو مکمل خود مختار رہنا اور باقیائی اختیارات حاصل ہوں۔ مرکزی
حکومت کو صرف ایسے مشترکہ امور پر کنٹرول ہو جو اسے آئین کے تحت دیئے گئے ہوں
کوئی بل، قرار داد، تحریک یا ترمیم جس کا تعلق فرقہ وارانہ معاملات سے ہو اس
وقت تک مرکزی یا کسی صوبائی اسمبلی میں پیش نہ کیا جائے یا اس پر بحث نہ
کی جائے یا اسے منظور نہ کیا جائے، جب تک اس اسمبلی میں ہندوؤں یا
مسلمانوں کے اراکین کی تین چوتھائی اکثریت اس کے حق میں نہ ہو — مختلف
صوبائی اسمبلیوں کے لئے مسلمانوں کے نمائندوں کا انتخاب بہر حال جداگانہ ہونا
ضروری ہے جو مسلمانوں کا حق ہے۔ اب مسلمانوں کو اُن کی مرضی کے بغیر اس
حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ ایک حقیقی نمائندہ جمہوری حکومت کے قیام
کے لئے یہ بات نہایت ضروری ہے کہ جب تک ہندوستان کے موجودہ حالات
قائم رہتے ہیں، تمام اسمبلیوں اور خود مختار اداروں میں مسلمانوں کا انتخاب ان کے
اپنے جداگانہ حلقہ ہائے نیابت کے ذریعہ کیا جائے۔ جب تک مسلمانوں کو
اس بات کا مکمل یقین اور اطمینان نہیں ہو جاتا کہ اُن کے حقوق و مفادات کا
مکمل تحفظ آئین کے ذریعہ کر دیا گیا ہے۔ وہ مشروط یا غیر مشروط، کسی صورت
میں بھی مخلوط انتخابات کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے — مسلمانوں کو مرکزی
اور صوبائی وزارتوں میں اُن کا مناسب حصہ ملنا ضروری ہے — مختلف صوبائی
اسمبلیوں اور خود مختار اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی لازمی طور پر ایک ایسے
منصوبے پر ہونی چاہیئے جس کے تحت اُن صوبوں میں جہاں مسلمان، آبادی کے
اعتبار سے اکثریت میں ہیں، اُن کی اکثریتی حیثیت متاثر نہ ہو اور ایسے صوبوں میں
جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، کسی صورت بھی ان کی نمائندگی میں فرق نہ آئے۔
یعنی ان کی نمائندگی کا تناسب وہی رہے جو موجودہ قوانین کے تحت ہے —
یہ کانفرنس اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ مسلمانوں کو مرکزی اسمبلی میں ۳۳ فیصد
نمائندگی ملنی چاہیئے۔ یہ توثیق ہندوستان کے مسلمانوں کے تحفظِ اجتماعی
کے سلسلے اور ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے متفقہ مطالبے کے تحت کی جاتی
ہے — تعددِ قومی، لسانی، جغرافیائی اور انتظامی بنیادوں پر سندھ کی

بمبئی کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں ہے۔ لہذا اس کی علیحدہ اسمبلی اور انتظامی مشینری اُن ہی خطوط پر قائم کی جائے جن خطوط پر دوسرے آئینی صوبوں کی اسمبلیاں اور انتظامی مشینریاں قائم ہیں۔ جہاں تک سندھ کی ہندو آبادی کا تعلق ہے تو اسے آبادی کے تناسب سے اتنی ہی نمائندگی دی جائے جتنی ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان اقلیت کے لئے ہو۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات، دوسرے صوبوں کی سطح پر نافذ کی جائیں۔ کیونکہ اُن کا نفاذ نہ صرف ان صوبوں کے مفاد میں ہے بلکہ ہندوستان کی آئینی پیش قدمی کے لئے بھی بہت ضروری ہے۔ ان صوبوں میں ہندو اقلیت کو بھی اُتنی ہی مناسب اور موثر نمائندگی دی جائے جتنی ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان اقلیت کو دی جاتی ہے۔ مسلمانوں کو سول سروسوں اور انتظامی اداروں میں لازمی طور پر مناسب نمائندگی ملنی چاہئے۔ ہندوستان کے سیاسی حالات کے پیش نظر انتہائی ضروری ہے کہ ہندوستان کے آئین میں مسلمانوں کی تعلیم، زبان، مذہب، اسلامی قانون اور مسلمانوں کے سماجی اداروں کو مکمل تحفظ دیا جائے اور اُن کی امداد کے لئے مناسب حصہ مقرر کیا جائے۔ ہندوستان کے آئین میں مرکزی مقننہ اس وقت تک کوئی تبدیلی نہ کرے جب تک ہندوستانی وفاق میں شامل دیگر تمام ریاستوں کو اتفاق نہ ہو۔ یہ کانفرنس واضح طور پر اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ ایسا کوئی آئین، خواہ وہ کسی کی طرف سے تجویز کیا گیا ہو۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول نہ ہوگا جب تک وہ اس قرارداد کے اصولوں سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔"

گروہ بندی ختم کرنے کی کوشش

محمد علی جناح اس کانفرنس میں شریک نہ تھے تاہم انہوں نے حالات کا جائزہ لیا۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد اخبارات کے ذریعے پڑھی۔ کنونشن کے بعد کانگریس کا جو سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا، اس کی کارروائی پر بھی غور کیا۔

محمد علی جناح نے محسوس کیا کہ کانگریس کی سرپرستی میں مسلمانوں کا ایک گروہ اس غرض سے

منظور ہو رہا تھا کہ مسلمانوں کو نہرو رپورٹ منظور کرنے پر آمادہ کرتا دوسری طرف لاہور میں سر محمد شفیع گروپ تھا جس نے متوازی مسلم لیگ بنائی تھی۔ چنانچہ انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کو بہرحال ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنا ضروری ہوگا۔ اس مقصد کے لئے محمد علی جناح نے مارچ ۱۹۲۹ء میں دہلی میں مسلم لیگ کا اجلاس طلب کرنے کا فیصلہ کیا اور اس دوران اُن تمام لوگوں سے بات چیت جاری رکھی جنھوں نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد کی حمایت کی تھی۔ محمد علی جناح نے بات چیت کے دوران ان مسلمان رہنماؤں سے یہ طے کر لیا کہ سر محمد شفیع کی صدارت میں جو متوازی مسلم لیگ قائم ہوگئی تھی، اسے ختم کر دیا جائے اور جب مسلم لیگ کے دونوں دھڑے متحد ہو جائیں تو مسلم لیگ اُن تمام مطالبات کو تسلیم کرے جو آل پارٹیز کانفرنس نے اپنی قرارداد میں پیش کئے تھے۔

مسلم لیگ کے اجلاس میں ہنگامہ

مارچ ۱۹۲۹ء کے آخری ہفتے میں جب مسلم لیگ کا یہ اجلاس منعقد ہونے میں کچھ دیر رہ گئی تھی اور محمد علی جناح ابھی حکیم اجمل خاں کے مکان پر مختلف مسلمان رہنماؤں کے ساتھ مصالحت کی بات چیت میں مصروف تھے کہ کانگریسی مسلمانوں نے محمد علی جناح کی آمد میں تاخیر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہنگامہ کرا دیا۔ دراصل ان لوگوں کی کوشش تو یہ تھی کہ کسی طرح مسلم لیگ کے اس جلسے پر ہی قبضہ جمالیں، مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ البتہ انہوں نے اسٹیج پر قبضہ کر لیا لیکن انہیں بہت بے آبرو ہو کر جلسہ گاہ سے نکلنا پڑا۔

ہوا یوں کہ بہت سے مسلم لیگی کارکن، رہنما اور عوام جلسہ گاہ میں جمع ہو چکے تھے۔ کانگریس کے پٹھو مسلمان بھی وہاں موجود تھے۔ محمد علی جناح حکیم اجمل خاں کے مکان پر گفت و شنید میں مصروف تھے۔ کانگریسی مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا اور چند منٹ کے بعد یوسف امام سٹیج پر آگئے۔ انہوں نے صدارت کے لئے ڈاکٹر محمد عالم کا نام تجویز کیا اور تصدق احمد خاں شیروانی نے اس تجویز کی تائید کی۔ ڈاکٹر محمد عالم بھاگ کر سٹیج پر آگئے اور محمد علی جناح کے لئے مخصوص کرسی پر براجمان ہو گئے۔ فوراً بعد اس خود ساختہ صدر نے غازی عبدالرحمٰن سے قرارداد پیش کرنے کو کہا۔ غازی عبدالرحمان نے جلدی سے سٹیج پر آکر ایک قرارداد پڑھی جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ جلسہ نہرو رپورٹ کے اصولوں کی تائید کرتا ہے۔ اتنی دیر میں سٹیج کے ارد گرد لوگ جمع ہونا شروع

ہوگئے۔ ڈاکٹر محمد عالم نے جلدی سے لوگوں کی رائے معلوم کئے بغیر یہ کہہ دیا کہ قرارداد منظور ہوگئی۔ اتنی دیر میں لوگوں نے شور مچا دیا، کرسیاں توڑنا شروع کردیں۔ کچھ لوگوں نے شیروانی کو دھکے دے کر نیچے گرا دیا اور ڈاکٹر محمد عالم کو اٹھا کر سٹیج سے نیچے پٹخ دیا۔ جب ڈاکٹر عالم کو یہ لوگ اٹھا کر جلسہ گاہ سے باہر "باعزت" طور پر لے جا رہے تھے تو اتنی دیر میں محمد علی جناح، راجہ غضنفر علی خاں کے ساتھ جلسہ گاہ میں داخل ہوئے۔ جناح زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے اور پھر جلسہ گاہ میں موت ایسی خاموشی طاری ہوگئی۔ محمد علی جناح کی عظیم شخصیت اور دبدبے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں ان کے لئے بے پناہ عقیدت اور محبت کا اس سے بڑا مظاہرہ کسی دوسرے ہندو یا مسلمان رہنما کے لئے دیکھنے میں نہیں آیا۔

۱۴ چودہ نکات

محمد علی جناح سٹیج پر آئے۔ انہوں نے سب سے پہلے اُن لوگوں کی مذمت کی جنہوں نے جلسے میں گڑبڑ کی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد اجلاس دوسرے دن پر ملتوی کر دیا۔

دوسرے دن اجلاس شروع ہوا اور وہ تجاویز سامنے رکھی گئیں جو محمد علی جناح نے دوسرے مسلمان رہنماؤں کے ساتھ مل کر مرتب کی تھیں۔ ان تجاویز کا خیر مقدم ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے کیا۔ البتہ آصف علی، ڈاکٹر سید محمود، تصدق احمد خاں شیروانی، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر محمد عالم اور خلیق الزماں جیسے کانگریسی مسلمانوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

قرارداد یہ تھی:

مسلم لیگ نہایت دیانتدارانہ غور و خوض کے بعد اس امر پر اصرار کرتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے آئندہ آئین کی ایسی کوئی سکیم اس وقت تک قابلِ قبول نہ ہوگی جب تک آئین میں مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں کو مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کی خاطر شامل نہیں کیا جاتا۔

۱۔ آئندہ آئین وفاقی حیثیت کا حامل ہو اور صوبوں کو ما بقائی اختیارات حاصل ہوں۔

۲۔ تمام صوبوں کو مساوی سطح پر خودمختاری حاصل ہو۔

۳۔ ملک کی تمام اسمبلیوں اور دوسرے منتخب اداروں کی تشکیل، ہر صوبے میں اقلیتوں کے لئے موثر اور مناسب نمائندگی کے اصولوں پر کی جائے اور کسی اکثریت کو

کسی صوبے میں نہ تو اقلیت میں تبدیل کیا جائے اور نہ ہی اس کا توازن اقلیت کے ساتھ قائم کیا جائے۔

۴۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے۔

۵۔ فرقہ وارانہ گروہوں کے لئے علیحدہ انتخابات کا موجودہ طریقہ جاری رہے۔ ہر فرقے کو اس امر کی اجازت ہو کہ وہ جب چاہے، علیحدہ انتخاب کے طریقے سے کنارہ کش ہو کر مخلوط انتخاب کے طریق کار کو اپنا لے۔

۶۔ اگر کبھی علاقائی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی جائے تو اس صورت میں کسی قیمت پر بھی پنجاب، بنگال اور صوبہ سرحد کے مسلمان متاثر نہ ہوں۔

۷۔ تمام گروہوں کے لئے عقیدے، عبادات، اجتماع، انجمن سازی، تعلیم اور پراپیگنڈہ کی ضمانت دی جائے۔

۸۔ کوئی ایسا بل یا کسی بل کا کوئی حصہ کسی اسمبلی یا کسی دوسرے منتخب ادارے میں منظور نہ کیا جائے، بشرطیکہ یہ بل جس فرقے سے متعلق ہو، وہ فرقہ اُسے اپنے لئے مفید خیال نہ کرتا ہو اور ایسے بل کا مخالف ہو۔ نیز اس متعلقہ گروہ کے تین چوتھائی نمائندوں نے اس کی مخالفت کی ہو اور نہ ہی کوئی ایسا بالواسطہ طریق اختیار کیا جائے جس کے ذریعے ایسے کسی بل کی منظوری کے اسباب پیدا ہوتے ہوں۔

۹۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر دیا جائے۔

۱۰۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دوسرے صوبوں کی سطح پر اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۱۱۔ آئین میں یہ گنجائش پیدا کی جائے کہ دوسرے ہندوستانیوں کی طرح مسلمانوں کو بھی سول ملازمتوں اور مقامی خود مختار اداروں میں ان کا مناسب حصہ مل سکے۔

۱۲۔ آئین میں مسلمانوں کی ثقافت، تعلیم، زبان، مذہب، قوانین اور مسلمانوں کے فلاحی اداروں کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔

۱۳۔ مرکز یا اسمبلی ایسی کوئی کابینہ نہ بنائی جائے جس میں مسلمان ایک تہائی سے کم تعداد میں ہوں۔

۱۴۔ ہندوستانی وفاق میں شامل ریاستوں کی مرضی کے بغیر مرکزی اسمبلی آئین میں کوئی

تبدیلی نہ کرے۔

اس قرارداد کو بعد ازاں " محمد علی جناح کے ۱۴ نکات " کا نام دیا گیا۔ ان ہی نکات کی بنیاد پر آئندہ کئی برسوں تک مسلمانوں اور حکومت اور دیگر غیر مسلم سیاسی جماعتوں کے درمیان بات چیت ہوتی رہی۔

باب ۱۸

۱۹۲۹ء — ایک ہنگامہ پرور سال

۱۹۲۹ء خاصا ہنگامہ پرور اور اہم سال تھا۔ جنوری میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس ختم ہوئی اور اس نے اہم فیصلے کئے۔ بعدازاں مارچ ۱۹۲۹ء ہی میں مسلم لیگ کا اجلاس دلی منعقد ہوا۔ جس میں آل پارٹیز کانفرنس کے فیصلوں کی مطابقت سے ۱۴ نکات منظور کئے گئے جو آئندہ کئی برسوں تک حکومت اور غیر مسلم سیاسی جماعتوں کے ساتھ مسلم لیگ کے مذاکرات کی بنیاد بنے رہے۔ اسی سال محمد علی جناح کی کوششوں سے مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں (جناح گروپ اور شفیع گروپ) کو قریب آنے کا موقع ملا۔ مارچ ہی میں کانگریسی مسلمانوں نے سازش کرکے مسلم لیگ کے اجلاس کو درہم برہم کرنے کی کوشش میں منہ کی کھائی اور انہیں محسوس ہوگیا کہ مسلمان اب ایک متحد قوم کی حیثیت رکھتے تھے اور اُن کو کسی طرح بھی ہندوؤں کے جال میں پھنسایا نہیں جا سکتا۔ ۱۹۲۹ء کے آغاز سے ذرا پہلے ۳۰۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء کو جب سائمن کمیشن نے مختلف صوبوں کا دورہ شروع کیا تو لاہور ریلوے اسٹیشن پر مظاہرین کا زبردست اجتماع تھا۔ انہوں نے سیاہ جھنڈیاں اٹھا رکھی تھیں اور "سائمن کمیشن — واپس جاؤ" کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ قیادت کانگریسیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اسٹیشن اور لنڈے بازار کے درمیان اس جلوس کا پولیس کے ساتھ تصادم ہوگیا۔ پولیس نے لوگوں پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔ ایک پولیس افسر سکاٹ کا ایک ڈنڈا کانگریسی رہنما لالہ لاجپت رائے کے دل پر پڑا اور وہ کچھ عرصہ بیمار رہنے کے بعد ۱۷ نومبر کو انتقال کر گئے۔ اُن کی وفات سے کانگریسیوں

میں سخت اشتعال پیدا ہوگیا۔ انہوں نے انگریز افسر سکاٹ سے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ اتفاقاً ایک دن جب سکاٹ اور سانڈرس اکٹھے کھڑے تھے تو کسی شخص نے سانڈرس کو سکاٹ سمجھ کر گولی ماردی۔ اس واقعے کے بعد سکاٹ کو بڑی خاموشی کے ساتھ انگلستان روانہ کر دیا گیا۔

اسمبلی پر بم

۸ اپریل ۱۹۲۹ء کو مرکزی اسمبلی میں بم پھینکنے کی واردات ہوئی۔ کچھ دنوں پہلے اسمبلی میں حکومت کی طرف سے ایک پبلک سیفٹی بل پیش کیا گیا تھا۔ حکومت کو خطرہ تھا کہ کمیونسٹ مزدوروں کو بھڑکا کر ملک میں ہنگامہ کرانا چاہتے تھے۔ ابھی یہ بل اسمبلی میں زیر بحث تھا کہ ۲۰ مارچ کو پولیس نے ہندوستان کے بہت سے صنعتی شہروں سے مزدور رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ۸ اپریل کو جب اسمبلی میں اسی بل پر شدید ہنگامہ ہونے کی توقع تھی کہ حالات نے اچانک پلٹا کھایا۔ اس دن سائمن کمیشن کے صدر سر جان سائمن بھی اجلاس کی کارروائی سننے کے لئے اسمبلی میں موجود تھے۔ اسمبلی کی تھوڑی سی کارروائی ہوئی تھی کہ سرکاری بنچوں کے پاس ایک بم گرتے ہی زبردست دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا۔ فوراً بعد دو گولیاں چلیں جو اسمبلی کے ایک ستون پر لگیں۔ اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہو گیا اور پولیس نے فوری طور پر اسمبلی کے دروازوں کی ناکہ بندی کر کے عمارت کا محاصرہ کر لیا۔ تماشائیوں کی گیلری سے پولیس نے ایک شخص بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی دت کو گرفتار کر لیا۔ بم سے ایک پارسی رکن اسمبلی دلال زخمی ہو گئے تھے۔ اسمبلی کے اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے اشتہار بھی نظر آئے جن پر ہندوستان کی سوشلسٹ ریپبلک فوج کے کمانڈر بلراج کی طرف سے انگریزوں کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ فوراً ہندوستان سے باہر چلے جائیں۔

دوسرے دن وائسرائے نے پبلک سیفٹی بل کا نفاذ ایک آرڈیننس کے ذریعے کر دیا۔ بھگت سنگھ اور دت پر مقدمہ چلا۔ ان دونوں نے خود ہی جرم کا اقرار کر لیا۔ ملزموں نے یہ بھی کہا کہ ان کا ارادہ قتل کا نہ تھا بلکہ وہ حکومت تک ہندوستانیوں کی آواز پہنچانا چاہتے تھے۔ اگر وہ چاہتے تو سر جان سائمن کو آسانی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔ ان دونوں کو عمر قید اور کالے پانی کی سزا دی گئی۔ بعد ازاں بھگت سنگھ پر پولیس افسر سانڈرس کے قتل کا ایک اور مقدمہ قائم کر دیا گیا جس میں بھگت سنگھ کو سزائے موت دی گئی۔

ایک اور ہنگامہ

۹۔ اپریل ۱۹۲۹ء کو ایک مسلمان نے ایک ہندو ناشر کتب راج پال کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہوا یہ کہ راج پال نے ایک کتاب شائع کی جس میں رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیات طیبہ کے بارے میں نہایت نازیبا انداز اختیار کیا گیا تھا۔ کتاب اسی موضوع پر تھی اور اس کا نام "رنگیلا رسول" رکھا گیا تھا۔ کچھ دن بعد مسلمانوں کو اس کتاب کی اشاعت کے بارے میں علم ہوا اور مسلمانوں نے احتجاجی مظاہرے شروع کر دیئے۔ حکومت نے ناشر کتب راج پال کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ ملزم کو مقامی عدالت سے سزا ہوئی لیکن جب سیشن میں اپیل ہوئی تو اس کی سزا میں کمی کر دی گئی ملزم نے ہائی کورٹ میں اپیل کی اور ایک سکھ جج کنور دلیپ سنگھ نے یہ فیصلہ سنایا کہ کتاب دفعہ ۱۵۳ (ا) یا کسی دیگر قانونی دفعہ کے تحت قابل تعزیر نہیں۔ اس فیصلہ نے مسلمانوں کو اور مشتعل کر دیا مسلمانوں کے ایک وفد نے گورنر سے ملاقات کی تو گورنر نے مزید تحقیقات کا یقین دلایا اور اگر قانون میں سقم محسوس کیا گیا تو حفظ ما تقدم کے طور پر اس میں بھی ترمیم کر دی جائے گی۔ ہندو۔۔۔ایک طرف تو گلا پھاڑ پھاڑ کر ہندو مسلم اتحاد اور "ایک قومیت" کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ مگر اس دوران کسی نے بھی راج پال کی مکروہ حرکت کی مذمت نہ کی۔۔۔ مذمت تو در کنار۔۔۔ مقامی ہندوؤں نے وائسرائے ہند کو ایک احتجاجی تار روانہ کیا اور گورنر پنجاب نے مسلمانوں سے جو وعدہ کیا تھا اس پر احتجاج بھی کیا۔

دوسرا دلچسپ پہلو یہ تھا کہ ایک مقامی وکیل نے جب سکھ جج کے فیصلے پر ایک مضمون مقامی مسلمان روزنامہ میں شائع کرایا تو عدالت نے روزنامہ کے مدیر اور طابع دونوں کو سزا سنا دی۔ اس حرکت کے باعث ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے احتجاج شروع کر دیا۔ لاہور اور دلی میں مسلمانوں نے ہڑتالیں کیں۔ بعد ازاں ایک اور مقدمہ کے فیصلے میں ایک جج براڈوے نے سکھ جج کنور دلیپ سنگھ کی رائے سے بھی اختلاف کیا۔ ادھر راجپال ۔۔۔ کچھ سزا کاٹنے کے بعد بری ہو کر دوبارہ اپنی دکان کی گدی پر آ بیٹھا۔ ۹۔ اپریل ۱۹۲۹ء کو جب راجپال دکان پر بیٹھا تھا کہ ایک شخص علم الدین نے اس پر خنجر سے پے در پے وار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ علم الدین کو سزائے موت ہوئی۔

علم الدین کے جنازے پر پھر جھگڑا شروع ہو گیا۔ حکومت چاہتی تھی کہ اسے خاموشی سے

دفن کر دیا جائے۔ مگر مسلمان جلوس کی صورت میں جنازہ لے جانا چاہتے تھے۔ ایک وفد سر محمد شفیع کی قیادت میں گورنر پنجاب سے ملا۔ سر محمد شفیع نے گورنر سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ مسلمان تجہیز و تکفین کے بعد پُرامن طور پر منتشر ہو جائیں گے اور اگر یہ بھی منظور نہ ہو تو اس کے بعد وہ حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے مسلمانوں سے کبھی کچھ نہ کہہ سکیں گے۔ گورنر مان گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے خوف زدہ ہو کر دکانیں بند کر دیں۔ لاکھوں مسلمان جنازے میں شریک ہوئے۔

فروری ۱۹۲۹ء ہی میں مزدوروں کی یورش کے بعد بمبئی میں ایک شوشہ یہ چھوڑا گیا کہ پٹھان بچوں کو اغوا کر رہے ہیں۔ پٹھان چوکیداروں پر حملے شروع ہوئے تو پٹھانوں نے ہندوؤں پر مسلح حملے شروع کر دیئے۔ کوئی بیس ہندو قتل کر دیئے گئے۔

انقلابی سرگرمیوں کا آغاز

اپریل ہی میں پولیس نے لاہور میں چھاپے مارے اور تین افراد کو گرفتار کر لیا۔ اور الزام عائد کیا کہ انہوں نے بم بنانے کا "کارخانہ" قائم کر رکھا تھا۔ بعد ازاں مزید دو درجن افراد گرفتار کر لئے گئے۔ کچھ لوگ روپوش ہو گئے۔ ان سب کے بارے میں شبہ تھا کہ بھگت سنگھ کو بھی انہی نے بم مہیا کیا تھا۔

جن دنوں سائمن کمیشن مختلف صوبوں کا دورہ کر رہا تھا تو اس کی ٹرین کو بھی بم سے اڑانے کی سازش کی گئی مگر عین وقت پر پولیس پر اس سازش کا انکشاف ہو گیا۔ اسی ماہ لاہور میں نیشنل بنک پر ڈاکہ ڈالنے کی سازش کے الزام میں کچھ ملزموں کو سزائیں ہوئیں۔

۲۳ دسمبر ۱۹۲۹ء کو جب وائسرائے ہند سفر پر تھے تو نظام الدین سٹیشن (دلّی کے کوئی ۹ میل) پر ان کی ٹرین کے قریب دھماکہ ہوا۔ گاڑی کو بھی نقصان پہنچا۔ تاہم وائسرائے ہند بچ گئے۔ تفصیلات سے علم ہوا کہ کچھ دن پہلے کوئی جوگی اس غیر آباد علاقے میں آ بیٹھا تھا۔ انہی دنوں کسی ٹوکری میں بم چھپا کر اسے مہیا کئے گئے۔ اس کے بعد جوگی نے لائن کے نیچے زمین کھود کر بم دبا دیئے۔ اور اس سے تار لگا کر جھونپڑی میں پہنچا دی۔ تار ایک بیٹری سے لگائی تاکہ بر وقت کارروائی کی جا سکے۔ بہرحال لارڈ ارون کی جان لینے کا منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔

جون ۱۹۲۹ء میں جب برطانوی کنزرویٹو پارٹی کو شکست ہوئی اور لیبر پارٹی کے ہاتھوں میں اقتدار آ گیا تو کانگرسی خوشی سے تالیاں بجانے لگے کیونکہ لیبر ہمیشہ سے کانگریس کے

ہموار رہے تھے۔ وزیر اعظم میکڈانلڈ تو کانگریس کے ساتھ اپنی ہمدردیوں کے باعث خاصے "بدنام" تھے۔

۱۹۔ جون کو محمد علی جناح نے نئے وزیر اعظم کو ایک خط روانہ کیا اور یہ بات صاف طور پر لکھ دی کہ ہندوستان کے عوام کے دلوں سے برطانیہ کے مواعید کا اعتماد ختم ہو چکا ہے۔ اگر برطانوی حکومت تمام نمایاں ہندوستانی رہنماؤں کی کانفرنس انگلستان میں منعقد کرے اور خود وزیر اعظم اس سلسلہ میں دعوت نامہ بھیجیں ۔۔۔ تو اس کی تعمیل کی جائے گی۔ محمد علی جناح نے ۱۵۔ اکتوبر کو اسی نوع کا ایک خط سر جان سائمن کو لکھا۔ موخر الذکر ان دنوں اپنی رپورٹ مرتب کر رہے تھے۔

وائسرائے ہند لارڈ ارون اسی ضمن میں مشورے کے لئے ۱۳ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو انگلستان پہنچے۔ واپسی پر انہوں نے ایک اعلان کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ۱۹۱۹ء کے آئین کے بارے میں نہ صرف ہندوستان بلکہ برطانیہ میں بھی شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ مگر حکومت برطانیہ کے تفویض کردہ اختیار کے تحت وہ یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء کے آئین کا مقصد واضح طور پر ہندوستان کے لئے نوآبادیاتی درجہ کا حصول ہے۔

کانگریس اور دیگر ہندو تنظیموں کے لئے یہ اعلان بہرحال پسندیدہ اور ان کی توقعات کے عین مطابق تھا۔ اس اعلان پر پسندیدگی کا اظہار کیا گیا اور اس سلسلہ میں دستخطوں کے ساتھ ایک تحریر وائسرائے کو روانہ کی گئی۔

کانگریس نے اجلاس کلکتہ میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ۳۱۔ دسمبر ۱۹۲۹ء تک نہرو رپورٹ کو ہندوستان کے آئندہ آئین کے طور پر منظور نہ کیا تو وہ سول نافرمانی کی تحریک چلائے گی۔ یہ وقت بھی قریب تھا۔ مگر جب کانگرس نے یہ دیکھا کہ انگلستان میں گول میز کانفرنس متوقع ہے تو اس نے پینترا بدلا اور دسمبر ۱۹۲۹ء میں کامل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دے دیا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ کانگریس گول میز کانفرنس میں شرکت نہ کرے گی۔ مجالس مقننہ کا بائیکاٹ بھی کیا گیا ۔۔۔ اور کانگرسی اراکین کو مستعفی ہونے کی ہدایات جاری کر دی گئیں۔ کانگریس کمیٹی کو سول نافرمانی اور ٹیکسوں کی عدم ادائیگی ۔۔۔ جب چاہے، کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک حکومت نہیں بلکہ مسلمانوں کے خلاف تھی۔ اسی لئے مسلمانوں سے محمد علی جوہر نے اپیل کی کہ وہ اس مہم میں کانگرس کا ساتھ نہ دیں۔

غرضیکہ اس طرح ۱۹۲۹ء کا سال نہایت ہنگامہ پرور سال ثابت ہوا۔

باب ۱۹

گول میز کانفرنس

گاندھی بطور نمک ساز

برطانیہ میں کنزرویٹو پارٹی کی جگہ لیبر پارٹی برسر اقتدار آ چکی تھی۔ نئے وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ کو متعدد رہنماؤں کی طرف سے یہ مشورہ دیا گیا کہ آئین سازی سائمن کمیشن کی رپورٹ کی بنیاد پر نہ کی جائے کیونکہ ہندوستان کے عوام نے کمیشن کا خیر مقدم بھی کرنا گوارا نہ کیا تھا۔ بہتر یہ ہوگا کہ مسودہ آئین کی تیاری سے قبل مختلف ہندوستانی رہنماؤں کے ساتھ افہام و تفہیم ہو جائے تاکہ بعد ازاں آئین سازی میں آسانیاں پیدا ہو سکیں۔ خود سر جان سائمن نے بھی وزیر اعظم میکڈانلڈ کو یہی مشورہ دیا تھا۔ محمد علی جناح نے بھی میکڈانلڈ کو ایک خط کے ذریعہ اس نوعیت کی بات چیت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ میکڈانلڈ نے ان مشوروں کو تسلیم کر لیا۔ لہٰذا جب وائسرائے ہند لارڈ ارون انگلستان سے لوٹے تو انہوں نے اکتوبر کے آخری ہفتہ میں ایک اعلان شائع کیا جس کی بنیاد یہ تھی:

۱۔ حکومت برطانیہ کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستان کو جو خود مختاری اور سیاسی آزادی دی جائے۔ وہ نوآبادیاتی درجہ کی ہو۔

۲۔ سائمن کمیشن کی رپورٹ ملتے ہی ہندوستانی رہنماؤں اور والیان ریاست یا اُن کے نمائندوں کو انگلستان مدعو کرے تاکہ مسودۂ آئین کے ضمن میں اس نوع کی تجاویز پیش

کی جائیں جو قبول عام حاصل کر سکیں۔

مسلم لیگ اور کچھ دیگر رہناؤں نے وائسرائے کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا۔ کانگریس نے حسب روایت مول تول شروع کر دیا۔ انہوں نے باہم مشورے کے بعد پہلے تو وائسرائے کے اعلان کو خوش آمدید کہا لیکن ساتھ ہی کچھ شرائط بھی عائد کر دیں:

۱۔ تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔

۲۔ انگلستان کی مجوزہ گول میز کانفرنس میں کانگرس کو موثر نمائندگی دی جائے۔

۳۔ کانفرنس میں صرف نوآبادیاتی درجہ کے آئین کی ترتیب پہ بات ہوگی ـــ نہ کہ آئین کے آئندہ اصولوں پر بحث کریں۔

۴۔ جلد از جلد اس امر کی کوشش کی جائے کہ ہندوستان میں عملاً نوآبادیاتی درجہ کے اصولوں کی مطابقت سے حکومت کے کام کا آغاز ہو سکے۔

کانگریس کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح اختیارات ایک ایسی کابینہ کے ہاتھوں میں چلے جائیں گے جو صرف عوامی نمائندوں کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ہوگی لہذا قدرتی طور پر اس کابینہ کو آسانی کے ساتھ تشکیل بھی کیا جاسکے گا اور توڑا بھی جاسکے گا۔ کانگرس نے یہ بات کرتے وقت اس امر کی طرف کوئی اشارہ نہ کیا کہ اختیارات کا مرکز ـــ مرکزی اسمبلی ہوگی اور صوبے اس کے زیر اثر ہوں گے یا مرکز اور صوبوں کے اختیارات کی تخصیص ہوگی ـــ ، کانگرس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ آئین بعد میں بھی بن جائے گا۔ مگر حکومت فوری طور پر کانگرس کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔

۲۳۔ دسمبر ۱۹۲۹ء کو ۵ رہناؤں نے وائسرائے ہند لارڈ اِروِن سے ملاقات کی تاکہ گاندھی کی طرف سے عائد کردہ چار شرائط کے پیش نظر کوئی درمیانی صورت نکالی جائے۔ لارڈ اِروِن نے یہ شرط قبول کر لی کہ تمام سیاسی قیدیوں کو فوراً رہا کر دیا جائے۔ مگر انہوں نے باقی شرائط کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کانگرس کے پاس سال بھر قبل دیئے گئے اس چیلنج کا جواز تو موجود رہی تھا کہ دسمبر ۱۹۲۹ء تک "نہرو رپورٹ" منظور کر لی جائے ورنہ سول نافرمانی کی جائے گی۔ لہذا ۳۰ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو، یعنی وائسرائے ہند سے بات چیت ٹوٹنے کے صرف ایک ہفتہ بعد ـــ لاہور میں کانگرس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی صدارت موتی لعل نہرو کے صاحبزادے جواہر لعل نہرو نے کی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ "نہرو رپورٹ" کی منظوری کے سلسلہ میں دی گئی مہلت ختم ہو چکی لہذا حکومت سے بھڑ جانے کا وقت آ گیا ہے۔ اس اقدام سے کانگرس کا مطلب ایک طرف

حکومت کو مرعوب کرنا تھا۔ دُوسری طرف مسلمانوں کی طرف سے گول میز کانفرنس میں غیر مشروط شرکت کے ارادے کو ناکام بنانا تھا۔ ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا گیا کہ:

اب کانگریس نوآبادیاتی درجہ کی بجائے مکمل آزادی کو نصب العین بنائے گی۔

اس کے ساتھ ہی کمیٹی کو یہ اختیار سونپ دیا گیا کہ وہ جب مناسب سمجھے، سول نافرمانی کا حکم دے دے۔ فروری ۱۹۳۰ء میں کانگریس کمیٹی نے سول نافرمانی کا فیصلہ کر لیا اور اس کا پروگرام "مرن برت اور سول نافرمانی و عدم تعاون کے ہیرو" گاندھی کی مرضی کے تابع کر دیا۔ گاندھی نے یہ لائحہ عمل مرتب کیا کہ وہ اپنی قیام گاہ سابرمتی سے ڈانڈی تک پیدل سفر کریں گے اور منزل پر پہنچ کر نمک بنانا شروع کر دیں گے (نمک سازی ممنوع تھی) گاندھی نے کہا کہ یہ جنگ فیصلہ کن ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعد ازاں گاندھی کو اس جنگ سے پیچھا چھڑانا مصیبت ہو گیا۔ در اصل اُن کا خیال تو یہ تھا کہ حکومت پہلے ہی دن اُن کو گرفتار کر لے گی۔ مگر گاندھی نے پیدل سفر کیا۔ اپنے جلو میں سینکڑوں، ہزاروں لوگوں کو لے کر سفر کیا۔ حکومت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ گاندھی، ڈانڈی پہنچے۔ نمک سازی شروع کر دی۔ ایک ماہ تک صنعتِ نمک سازی میں مصروف رہے۔ مگر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر کب تک نمک بناتے رہیں گے؟ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ آخر کوئی ۹ ہفتہ بعد ان کی دیرینہ اُمید بر آئی، گرفتار کر لئے گئے۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک سول نافرمانی اپنے انجام کو پہنچی۔

مئی میں سائمن کمیشن کی رپورٹ شائع کر دی گئی۔ ۱۱۔ ستمبر ۱۹۳۰ء کو گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والوں کے ناموں کا اعلان کر دیا گیا۔ ان میں کانگریس کا کوئی نمائندہ شامل نہ تھا۔ کانفرنس کے لئے ۱۲۔ نومبر ۱۹۳۰ء مقرر کی گئی۔ اس میں مولانا محمد علی جوہر کا نام بھی شامل تھا۔ اس وقت مولانا کی حالت یہ تھی کہ نقل و حرکت سے بھی معذور تھے۔ تاہم انہوں نے قوم کی خاطر یہ زحمت اٹھائی کہ ہزاروں میل کا سفر گوارا کر لیا۔

پہلی گول میز کانفرنس

پہلی گول میز کانفرنس میں مجموعی طور پر ۸۹ ہندوستانی مندوبین نے شرکت کی۔ ان میں ۱۶ مسلمان تھے اور اسی قدر ہندوستانی ریاستوں کے نمائندے! مسلمان مندوبین میں ہز ہائی نس آغا خاں، محمد علی جناح، مولانا محمد علی جوہر، نواب چھتاری، راجہ شیر محمد خاں ڈومیلی، سر شاہ نواز،

اے۔ کے فضل الحق، حافظ ہدایت حسین، سر غلام حسین ہدایت اللہ، سر اے۔ کے غزنوی، صاحبزادہ سر عبدالقیوم خاں، میاں محمد شفیع، سید سلطان احمد، ڈاکٹر شفاعت احمد، چودھری ظفر اللہ خاں اور بیگم شاہنواز شامل تھے۔

ریاست کے نمائندوں میں مہاراجہ بڑودہ، راجہ بیکانیر، مہاراجہ پٹیالہ، نواب بھوپال، راجہ ریوا اور جام نگر شامل تھے۔ ان کے علاوہ کچھ دیگر والیان ریاست بھی شریک ہوئے۔ ہندو مندوبین میں سری نواس شاستری، سر تیج بہادر سپرو، سر رام سوامی آئیر، سر چمن لال، ایم آر جیکر، دیوان بہادر، راؤ سوامی، ڈاکٹر امبیدکر اور مسٹر بارویان اور پارسی مندوبین میں فیروز سیٹھنا، سر کاؤس جی جہانگیر اور مسٹر ایچ۔ پی مودی شامل تھے۔

برطانیہ کی نمائندگی وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ، لارڈ چانسلر، لارڈ سانکے، وزیر امور ہند ویج ووڈ بین، سر سیموئل ہور، لارڈ ریڈنگ اور لارڈ پیل کر رہے تھے۔

کانفرنس کا اجلاس ۱۲ نومبر ۱۹۳۰ کو ہاؤس آف لارڈز میں شروع ہوا۔ افتتاحی اجلاس سے شاہ جارج پنجم نے خطاب کرتے ہوئے کہا،

"میں کانفرنس کی کارروائی کا جائزہ نہایت دلچسپی، ہمدردی اور قربت کے ساتھ لیتا رہا ہوں گا۔ اس دوران اعتماد شامل رہے گا جہاں تک ہندوستان میں میری رعایا کے مادی معاملات کا تعلق ہے میں ان سے متاثر رہا ہوں اور یہ معاملات ہمیشہ ہی میرے خیالات میں جاگزیں رہیں گے۔ میرے ذہن میں اقلیتوں اور اکثریتوں، مردوں اور عورتوں، شہریوں اور کسانوں، زمینداروں اور کاشتکاروں، غریبوں اور امیروں، نسلوں اور ذاتوں اور کمزور اور طاقتور سبھی کے جائز اور مناسب مطالبات موجود رہے ہیں کیونکہ انھی سے اجتماعی سیاست کی تشکیل ہوتی ہے۔ مجھے ان سب اور ان سب کے معاملات کا مکمل احساس ہے۔ مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ حکومت خود اختیاری کی صحیح بنیاد ان لوگوں اور ان کے مطالبات کو تسلیم کرنے اور انہیں ٹھوس حیثیت دینے میں مضمر ہے مجھے توقع ہے کہ ان بنیادوں پر قائم ہونے والی ہندوستان کی آئندہ حکومت ایسی تمام امنگوں اور خواہشات کا احترام کرتی رہے گی۔"

شاہ انگلستان کی تقریر کے بعد مختلف مندوبین نے تقاریر کیں۔ ان سے قبل وزیر اعظم
ریمسے میکڈانلڈ نے اس توقع کا اظہار کیا کہ :

"وقت آگیا ہے کہ ہم محنت شاقہ سے کام لیں۔ ماضی میں بہت کچھ کہا جاتا رہا ہے
خواہ وہ غصہ میں تھا یا غلطی کی بنا پر یا جذبات میں آکر، بہرحال بہتر یہ ہوگا کہ اس
میز پر بیٹھنے کے بعد ہم گزشتہ تمام باتوں کو بھلا دیں۔ مستقبل کے بارے میں
کیا کہانی جنم لیتی ہے۔ اسے بہرحال اس میز پر ہی جنم لینا چاہئے اور یہ بھی یقین
رکھئے کہ یہ کہانی ضرور لکھی جائے گی۔ آیئے ہم سب مل کر بہترین سیاسی ذہانت کا
ثبوت دیں۔ وہ ذہانت جو ہمارے عوام کے شایانِ شان ہو اور دونوں قوموں
کی عزت و توقیر کو دنیا کی نظروں میں دوبالا کر سکے"۔

تقریر شاہ انگلستان کی تھی یا وزیر اعظم برطانیہ کی نیت اور ارادے دونوں سے عیاں
ہے۔ جونہی مندوبین کی تقاریر کا آغاز ہوا، کانفرنس وہی منظر پیش کرنے لگی جو گزشتہ کئی
سال سے ہندوستان میں تھا۔ مولانا محمد علی نے انتہائی علالت کے باعث اپنی نشست پر بیٹھ کر
تقریر کی۔ اسی موقع پر انہوں نے وہ تاریخی الفاظ زبان سے ادا کئے کہ :

"میں اپنی انتہائی علالت کے باوجود ہزاروں میل کا سفر طے کر کے اس کانفرنس
میں یہ تہیہ کر کے آیا ہوں کہ اگر میرے ساتھ آزادی کی دولت ہوئی تو میں اپنے
وطن واپس جاؤں گا۔ اگر میں یہ دولت ساتھ نہ لے جا سکا تو یقیناً اس
غلام ملک میں جانے کی بجائے غیر ملک میں مرنا پسند کروں گا۔ کم از کم یہ ملک
آزاد تو ہے۔ اگر تم مجھے میرے ملک کے لئے آزادی نہیں دے سکتے تو قبر
کے لئے چند گز جگہ تو دے سکتے ہو"

آزادی نہیں مل سکی تھی، محمد علی جوہر نے اپنی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پورے
کر دکھائے۔ وہ وہیں فوت ہوئے اور انہیں یروشلم میں سپرد کیا گیا۔
مولانا محمد علی جوہر نے سائمن کمیشن کی رپورٹ کو ایک مایوس کن دستاویز قرار دیا۔
انہوں نے حکومت برطانیہ کو انتباہ کیا کہ وہ ایک آزاد ملک میں واپس جانا چاہتے ہیں نہ کہ
ایسے ملک میں، جس کا وجود بھی تسلیم کرنا مشکل ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ :

"مہربان ملکہ مادر وکٹوریہ کے پوتے جارج پنجم کے دور کی تاریخ شاید یوں لکھی جائے

کہ جارج سوئم نے امریکہ گنوا دیا، جارج پنجم نے ہندوستان جیت لیا۔"
جب مولانا محمد علی جوہر سے یہ پوچھا گیا کہ وہ سیاست میں ہندو مسلمان کا سوال کیوں پیدا کر دیتے ہیں تو انہوں نے اپنے روایتی انداز تخاطب میں جواب دیا:

"جب آپ لوگ سیاست کو مذہب سے خارج کر دیتے ہیں تو یقیناً آپ مذہب کے غلط تصور کو جنم دیتے ہیں۔ میری سیاست کا تمام تار و پود اسلام میں ہے۔ اگر آپ مجھ سے یہ کہیں کہ میں آپ کی سلطنت میں یا آپ کی قوم میں اس تار و پود، اس ثقافت، اس ضابطۂ اخلاق اور اس سیاست کو چھوڑ کر داخل ہو جاؤں تو میں ایسا کبھی نہ کروں گا۔"

مولانا محمد علی جوہر نے مزید کہا کہ ہندوستان کے ہندوستانی سپاہی بھی آزادی کے حق میں ہیں اور اگر حکومت چاہے تو استصواب رائے کرا لے، نتیجہ خود معلوم ہو جائے گا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ فوج کو بہرحال ہندوستانیوں کے ماتحت ہونا چاہئے۔

گو کانگرس اس کانفرنس میں شریک نہ تھی، لیکن حکمران لیبر پارٹی کے وزراء جو بات بھی کرتے، محسوس یہ ہوتا کہ کانگریسی رہنما بات کر رہے ہیں۔ جہاں تک وزیر اعظم کا تعلق تھا تو ان کی باتوں سے بھی محسوس ہوتا تھا گویا ہندوستان کی آزادی اور قومیت کی علمبردار صرف کانگریس ہے۔ لہذا ہندوستان کے تمام مسائل برطانیہ اور کانگرس میں طے پانے چاہئیں۔ گو انہوں نے کسی لمحہ بھی اقلیتوں کے عدم تحفظ کی بات نہ کی لیکن ہر بار "ہندوستانی قومیت" کا نام لے کر ملک کے مجموعی مفاد کی بات کرتے رہے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ سب لوگ کانگرس کے موقف کو بلاکم و کاست تسلیم کر لیں۔

گول میز کانفرنس نے مختلف سب کمیٹیاں بنا کر ان کے ذمہ مختلف امور کر دیئے تھے۔ ایک سب کمیٹی وفاقی نظام پر غور و خوض سے متعلق تھی جس میں محمد علی جناح اور سر شفیع بھی شامل تھے۔ دوسری سب کمیٹی اقلیتی مسائل سے متعلق تھی۔ محمد علی جناح نے اس میں شمولیت سے انکار کر دیا تھا۔ سر محمد شفیع نے یہ اعلان کیا کہ وہ بحث میں تو شریک ہوں گے لیکن سفارشات کو آخری صورت دینے کے لئے اس وقت تک تعاون نہ کریں گے جب تک اقلیتوں کا مسئلہ تسلی بخش طریق پر حل نہیں ہو جاتا۔ سر محمد شفیع کی اس بات سے واضح تھا کہ مسلمان پہلے اپنے مسائل کا حل چاہتے تھے اور اس کے بعد ہی نئے آئین کے بارے میں کوئی بات ممکن تھی۔ یہ

حقیقت بھی تھی کہ ایسا آئین بنانے کا کوئی فائدہ نہ تھا جو ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے لئے ناقابلِ قبول ہوتا۔

بنیادی مسائل

اس کانفرنس کے دوران دو اہم مسائل پیشِ نظر تھے۔ ایک تو یہ کہ کل ہند وفاق کی تشکیل کیونکر ہو اور ہندوستان کی ریاستیں اس وفاق میں کن بنیادوں پر شامل ہوں؟ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا تو انہیں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد اور محمد علی جناح کے ۱۴ نکات کی روشنی میں وفاق پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ تاج برطانیہ کے زیر سرپرستی کانگرس کی خواہشات کے مطابق جس وفاق کی بات کی جا رہی تھی وہ مسلمانوں کے لئے قابل اعتراض تھی۔ اس پر ایک اعتراض تو یہ تھا کہ یہ مختلف وحدتوں پر مشتمل ایسا وفاق نہ ہوگا جس کے سیاسی اور آئینی ڈھانچے یک رنگ ہوں اور دوسرے یہ کہ ریاستوں کی خود مختاری بلاشبہ مرکز کی ذمہ دار حکومت کی نشوونما میں حائل ہوگی۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ایک اور اعتراض یہ بھی تھا کہ بیشتر ہندو والیان ریاست کی شمولیت کے باعث کل ہند سکیم میں مسلمانوں کی حیثیت کمزور پڑ جائے گی۔

محمد علی جناح نے بھی وفاقی ڈھانچہ کی سب کمیٹی میں اس خیال کا اظہار کہ یہ بات اب تک واضح نہیں ہوئی کہ برطانوی ہندوستان میں کس قسم کا وفاق ہوگا۔ جہاں تک صوبوں کا تعلق تھا ایک خیال یہ ظاہر کیا جاتا تھا کہ برطانوی ہند میں صوبوں کو خود مختار ریاستوں ایسی حیثیت حاصل ہوگی۔ اگر یہ خیال درست تھا تو اس صورت میں ان صوبوں کی وفاق میں شمولیت ویسی ہی ہو جائیگی جیسے ہندوستانی ریاستوں کی! لہذا صرف ایک وفاق ہوگا یا دو وفاق یا وفاق در وفاق! —
محمد علی جناح نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ دیکھنا یہ ہوگا کہ ہندوستانی ریاستیں کن بنیادوں پر وفاق میں شمولیت پسند کریں گی اور کیا ان کی شمولیت کے بعد وفاق اس حد تک کمزور نہیں ہو جائے گا کہ اسے وفاق بھی نہ کہا جا سکے۔ چنانچہ سوال یہ ہے کہ وہ کون سے امور ہوں گے جنہیں ہندوستان کی ریاستیں وفاقی امور تسلیم کریں گی۔ اگر پہلے یہ فیصلہ ہو جائے تو یہ سوال بعد میں پیدا ہوگا کہ یہ ریاستیں صوبوں کی سطح پر کس حد تک آ سکیں گی؟ محمد علی جناح نے ریاستوں کے نمائندوں سے بھی یہ بات واضح طور پر پوچھی کہ وہ ایک حقیقی وفاق کے قیام اور اس میں شمولیت کی صورت میں ہندوستان کے مجموعی مفادات کے لئے کس حد تک قربانی دے سکیں گے۔

انہوں نے یہ نکتہ بھی اٹھایا کہ موجودہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت ایک وحدانی طرز حکومت کی بنیاد نظر آتی ہے جس میں صوبے خود مختار نہیں لہذا ہندوستان کے وفاق کے سوال پر غور کرنے کے لئے کچھ باتوں کو ذہن نشین کرنا ضروری ہوگا۔ بنیادی بات یہ تھی کہ وفاق کے مقصد کے لئے صوبوں کو خود مختار ریاستوں کے طور پر تسلیم کر لیا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ یہ ریاستیں کس حد تک وفاق کا جزو بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ محمد علی جناح نے اس امر کی بھی وضاحت کی کہ جب تک ہندوستانی ریاستیں اپنے کچھ اختیارات رضاکارانہ طور پر وفاق کے سپرد کرنے پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ اس وقت تک اس بات پر غور کرنا عبث ہوگا کہ صوبوں کے کون سے امور وفاق میں شامل ہوں گے اور صوبے کس حد تک اپنے اختیارات وفاق کے حوالے کریں گے!

محمد علی جناح نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی کہ آزاد ہندوستان میں برطانیہ کو تحفظات دیئے جائیں۔ اس سلسلہ میں ان پر مختلف طریقوں سے خاصا دباؤ ڈالا گیا لیکن وہ اپنے مؤقف سے ایک انچ بھی ہٹنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

"آزاد ہندوستان میں برطانوی تجارتی تحفظات کے بارے میں آغا خاں کی وساطت سے محمد علی جناح پر شدید دباؤ ڈالا گیا مگر وہ مضبوطی کے ساتھ اپنے قدموں پر رہے۔ انہوں نے یہ سب کچھ ہندوستان کے عظیم مقاصد کے لئے کیا۔ اس دوران وزیراعظم برطانیہ ریمزے میکڈانلڈ نے محمد علی جناح کو خوبصورت رشوتیں پیش کرنے کی کوشش میں یہ لالچ دیا کہ نئے ہندوستان کے مختلف صوبوں کی گورنریاں ممتاز ہندوستانیوں کو دی جائیں گی۔ غالباً وزیراعظم برطانیہ کے اس اشارہ کا مقصد یہ تھا کہ اگر محمد علی جناح ایک تابع فرمان بچے کی طرح ان کی بات مان لے تو اسے بھی کسی صوبہ کی گورنری تھما دی جائے گی۔ لیکن جناح کی اس بات کی داد دینا پڑتی ہے کہ انہوں نے اپنے مؤقف سے ہٹنا پسند نہ کیا۔"

یہ تھے وہ الفاظ جو معروف ہندو رہنما کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب "انڈیا فائٹس فار فریڈم" میں لکھے۔

یہ گول میز کانفرنس برطانوی نمائندوں کے ہتھکنڈوں کے باعث ناکام ہو گئی —— کانفرنس میں مسلمان وفد کے قائد ہز ہائی نس آغا خاں نے بھی مجبوراً اس خیال کا اظہار کیا کہ کانفرنس کے انگریز مندوبین نے حقائق اور ہندوستان کے حالات کو پس پشت ڈال دیا تھا

اس لئے کانفرنس کوئی مقصد حاصل نہ کر سکی ۔ یہ کانفر نس ناکام ہو گئی۔

گاندھی کی رہائی

یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ گول میز کانفرنس کے انعقاد سے پہلے گاندھی کے ایما پر گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیا گیا اور وہ خود سول نافرمانی کے الزام میں جیل چلے گئے ۔ لیکن کانفرنس کے آخری دن وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ کے اعلان سے صرف چار دن قبل گاندھی نے وائسرائے ہند لارڈ اروِن کی کس ادا کو پسند کرتے ہوئے مصالحانہ رویّہ اختیار کیا ؟ ۵ جنوری ۱۹۳۱ کو گاندھی اور کانگریس کی کمیٹی کے ارکان جیل سے باہر آ گئے ۔ گاندھی — اروِن ملاقاتیں ہوئیں ۔ اس دوران گاندھی خود کو "عوامی رہنما" ثابت کرنے کے لئے روزانہ وائسرائے کی قیام گاہ تک پیدل جاتے رہے ۔ نتیجتاً ایک صلح نامہ پر دستخط ہوئے ، جسے گاندھی ۔ اروِن پیکٹ کا نام دیا گیا ۔ ساحلی علاقوں پر رہنے والوں کو سمندر سے نمک نکالنے کی اجازت مل گئی ۔ مگر سیاسی نوعیت کا کوئی قابلِ ذکر سمجھوتہ نہ ہوا ۔ دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس نے شرکت پر آمادگی کا اظہار کر دیا ۔ اس دوران ایک مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ حکومت ، کانفرنس میں کانگریسی وفد کو ایک تہائی سے زائد نمائندگی دینے پر آمادہ نہ تھی ۔ بہر حال گاندھی نے یہ سوچ کر کہ کانگریس ، دوسری کانفرنس میں بھی شرکت سے محروم نہ ہو جائے یہ راستہ چنا کہ وہ کانگریس کی طرف سے تن تنہا شریک ہوں گے ——— اس کے باوجود وہ یہ اصرار بھی کرتے رہے کہ ہندو مہاسبھا کی نمائندگی پنڈت مدن موہن مالویہ اور عورتوں کی نمائندگی مسز سروجنی نائیڈو کو دی جائے اور مسلمان نیشنلسٹوں کی نمائندگی ڈاکٹر انصاری اور سید علی امام کریں ۔ جب یہ معاملہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں پیش ہوا تو کونسل کے ایک رکن سر فضل حسین نے ڈاکٹر انصاری کے نام کی شدید مخالفت کی ۔ لہٰذا ان کا نام فہرست سے خارج کر دیا گیا ۔ گاندھی آخر وقت تک یہ کوشش کرتے رہے کہ کسی نہ کسی طرح ڈاکٹر انصاری مندوبین میں شامل ہو جائیں لیکن ان کی امید بر نہ ہو سکی ۔

اب گاندھی کی تمام تر کوشش ہندوستان کی خود مختاری اور ہندو مسلم مسئلہ کو اپنی منشا کے مطابق حل کرانے پر مرکوز تھی ۔ جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے گاندھی کا نام کانگریس کے اجلاس کراچی میں توثیق کی غرض سے زیرِ بحث آیا تو گاندھی نے وہاں اس خیال کا اظہار کیا کہ سب سے پہلے ہندو مسلم مصالحت ضروری تھی اور یہ واحد طریق تھا جس سے ہندوستان کا

مسئلہ حل ہو سکتا تھا اور اگر کانفرنس سے پہلے یہ مسئلہ حل نہ ہوا تو ان کا کانفرنس میں شرکت کرنا بے سود ہوگا۔

کانگرس کے بارے میں دلچسپ ترین بات یہ تھی کہ جب اسے کچھ نہ سوجھتی تو گاندھی کو ہر معاملہ میں کلی اختیارات دے کر ڈکٹیٹر بنا دیتی۔ اور جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتے تو کانگرس کی مجلس عاملہ فوراً برعکس قرار داد منظور کر دیتی اور گاندھی اس فیصلہ کے سامنے سرِتسلیم خم کر دیتے، ساتھ ہی اپنی مجبوری کا اظہار بھی۔ اوقت آتا تو وہ کانگرس سے پھر کسی معاملہ پر اختلاف کر کے دھونی رما بیٹھتے۔ کانگرسی رہنما انہیں سمجھانے لگتے۔۔۔ گاندھی مان جاتے۔۔۔ اور پھر وہی ڈکٹیٹر شپ۔۔۔ کانگرس کمیٹی کے وہی فیصلے۔۔۔ گاندھی کی وہی مجبوریاں۔۔۔ وہی روٹھنا اور پھر مان جانا ۔۔۔ غرضیکہ عجب اندازِ دلربائی تھا۔

اُدھر گاندھی نے ہندو مسلم اتحاد کو آزادی کی بنیاد قرار دیا اور اِدھر کانگرس نے کراچی میں ایک قرار داد منظور کر دی جو اقلیتوں کے تحفظ اور ان کے بنیادی حقوق سے متعلق تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ نمائندگی کا تناسب ملک بھر میں مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ قائم رکھا جائیگا لیکن یہ تناسب ان اقلیتوں کے لئے ہوگا جو آبادی کے ۲۵ فیصد کم ہوں تاہم وہ زائد نشستوں کے لئے انتخاب لڑ سکیں گی۔ ظاہر ہے کہ اس فیصلہ کے بعد گاندھی کے ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ ختم ہو گیا؛ تاہم وہ اس سمجھوتہ کے لئے بدستور سرگرمِ عمل رہے۔ انہوں نے دلّی میں جمعیت العلمائے ہند کے سالانہ اجلاس میں پھر وہی نعرہ لگایا کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں مصالحت نہیں ہو جاتی، ان کا لندن جانا بے سود ہوگا۔ اس کے بعد انہوں نے نہایت فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ پیشکش کی کہ ہندو مسلم مفاہمت کی خاطر وہ مسلمانوں کو "کورا چیک" دینے پر بھی آمادہ ہیں۔ مگر اس "کورے چیک" کے ساتھ ایک شرط بھی تھی، یہ کہ مسلمان جو مطالبہ کریں اس پر کانگرسی مسلمان بھی صاد کریں۔ کیونکہ گاندھی کو معلوم تھا کہ کانگریسی مسلمان وہی کریں گے جو گاندھی خود چاہیں گے۔ چنانچہ کانگرسی مسلمان اور مسلم کانفرنس کے تین نمائندوں کے درمیان پہلا اجلاس بھوپال اور دوسرا شملہ میں منعقد ہوا۔ لیکن اختلافات اتنے تھے کہ کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل تھا۔ کانگریسی مسلمان مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کو مخلوط انتخاب کی بنیاد پر آبادی کے تناسب کے اعتبار سے زیادہ ایک نشست بھی دینے پر آمادہ نہ تھے اور ان کا موقف وہی تھا جو کانگریس کا، یعنی زائد حلقوں میں انتخاب لڑنے کا حق! مسلم کانفرنس کا

مطالبہ یہ بھی تھا کہ ایسے صوبوں میں مسلمان اقلیتوں کو معاہدۂ لکھنؤ کے مطابق اور جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ نمائندگی دی جائے۔ یہ بات چیت کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکی۔ چنانچہ اب گاندھی کیلئے سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ وہ لندن کیسے جائیں ؛ کیونکہ وہ تو یہ کہہ چکے تھے کہ جب تک مفاہمت نہ ہو ان کا لندن جانا بے مقصد ہوگا۔

اس موقع پر پھر اسی نازبرداری سے کام لیا گیا جو کانگرس ہمیشہ سے گاندھی کے لئے کرتی آئی تھی۔ یعنی کانگرس نے گاندھی کی بات بھی رکھی اور ان کے لندن جانے کے لئے زمین بھی ہموار کر دی۔ جون ۱۹۳۱ء میں کانگرس نے یہ قرارداد منظور کی کہ اگر بدقسمتی سے فرقہ وارانہ مصالحت نہ ہو سکے۔ تب بھی گاندھی کو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے ضرور جانا چاہئے تاکہ کانفرنس کو کانگرس کا نقطۂ نظر معلوم ہو جائے۔ اب گاندھی کی باری تھی۔ انہوں نے کہا:

"میں ایک جمہوریت پسند انسان ہوں۔ لہذا کانگریس کمیٹی کے فیصلہ کو تسلیم کئے بغیر اور چارہ بھی کیا ہے ؛ بہرحال میں سمجھوتہ کے لئے اپنی ہر کوشش جاری رکھوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ ۱۹ر اگست ۱۹۳۱ء کو کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے روانہ ہوگئے۔

باب ۲۰

مسلم لیگ کا اجلاس الٰہ آباد [illegible]

۲۹- دسمبر ۱۹۳۰ء کو جب پہلی گول میز کانفرنس کے اختتام میں ایک دن رہتا تھا تو آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ، الٰہ آباد میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس موقعہ پر انہوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا ـــ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل مختلف تھا۔ اس خطبہ میں انہوں نے مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کے نظریہ پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو صرف کچھ عقائد ہی نہیں دیئے بلکہ انہیں ایک خاص سیاسی معاشرہ بھی عطا کیا ہے۔ اگر معاشرتی یک جہتی اور اجتماعی جذبے کے اعتبار سے ہندوستان میں کوئی گروہ واحد قوم کی صورت میں موجود ہے تو وہ اس ملک کے مسلمانوں کا گروہ ہے۔ علامہ اقبال کے اس تاریخی خطبہ کا مکمل متن یہ ہے:

"اس حقیقت سے انکار کیسے ہو کہ ایک اخلاقی نصب العین اور نظامِ سیاست کے اعتبار سے اسلام ہی کے باعث ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کی تاریخ ایک مخصوص سانچے میں ڈھلی۔ نظامِ سیاست سے میری مراد وہ جماعت ہے جس کا نظم و ضبط ایک نظامِ قانون کے تحت قائم ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک اخلاقی روح کارفرما ہوتی ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس کے باعث ہندوستانی مسلمانوں کے سینوں میں وہ رُوح پیدا ہوئی جس رُوح پر جماعتوں کی زندگی منحصر ہوتی ہے۔ اس روح کی بیداری کے باعث بکھرے ہوئے افراد تسبیح کے

دانوں کی طرح ایک لڑی بن جاتے ہیں اور پھر جب یہ منتشر افراد ایک قوم کی صورت اختیار کر جاتے ہیں تو وُہ ایک مخصوص اخلاقی نظام ، اخلاقی شعور کو ہمراہ لے کر چلتے ہیں۔ اگر میں مبالغہ آمیزی سے کام نہیں لے رہا تو یہ کہوں گا کہ شاید اس خطۂ ارضی میں صرف ہندوستان ہی وُہ ملک ہے جس میں اسلامی وحدت کی بے پناہ طاقت ایک نمونہ بن کر سامنے آئی ہے۔ جمعیت اسلام کی ترکیب اسی اسلام کی رُوح کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ہمارے تمدن ، اسلامی تمدن میں وہی مخصوص اخلاقی شعور اور روح موجود ہے ، جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ اس وقت افکارِ مغرب تمام دنیائے اسلام ، بشمول ہندوستان چھائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک انقلابی کیفیت ہے اور ہماری نوجوان نسل ان افکارِ سیاسی کی طرف پوری دلچسپی کے ساتھ کھنچتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن ان نوجوانوں نے اس کے پسِ منظر پر غور کرنے کی سعی کبھی نہیں کی۔ انہوں نے اس بات کو فراموش کر دیا کہ آخر ان افکار کے مغرب میں پروان چڑھنے کی وجوہات کیا تھیں ؟ نوجوان نسل نے اس حقیقت کو بالائے طاق رکھ دیا کہ مغرب میں مسیحیت محض ایک رہبانی نظام کے وجود کا نام تھا ، پھر کلیسائی حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ یہی وُہ کلیسائی حکومت تھی جس کے خلاف لوتھر نے احتجاج کیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوتھر کا یہ احتجاج بالکل درست تھا۔ ممکن ہے اس وقت لوتھر کو بھی اس بات کا احساس نہ ہوا ہو کہ اس نے جن حالات میں اپنی تحریک کا آغاز کیا ، وہ تحریک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عالمی نظامِ اخلاق نہیں بلکہ مغرب کے لاتعداد اخلاقی نظاموں پر منتج ہو گا۔ ہر اخلاقی نظام ایک مخصوص قوم سے متعلق ہو گا۔ اس طرح مختلف محدود دائرے پیدا ہو جائیں گے۔ کیا اسی لئے لوتھر اور روسو کی تحاریک نے عیسائیت کی دنیا کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے تقسیم در تقسیم پر نہیں پہنچایا۔ اسی لئے نوعِ انسانی کے مجموعی مرکز سے مغرب کی نظریں پلٹ گئیں اور مختلف اقوام کے تنگ بھنور میں پھنس کر رہ گئیں۔ لوتھر اور روسو نے انہیں جو تخیلِ حیات دینا چاہا تھا مغرب اس سے الگ ہو کر ایک مادّی احساسِ وطنیت کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ اس وطنیت کے احساس

کی نشو و نما ہوئی تو مختلف سیاسی نظام سامنے آئے یہ سب قومی جذبات کی
گود میں پروان چڑھے اور یہ عقیدہ راسخ ہو گیا کہ اتحادِ سیاسی، وطنیت کے
عقیدے کی اساس پر ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اگر مذہب کا تصور یہ ہے تو
وہ اس دنیا کے لئے نہیں بلکہ آخرت کے لئے ہے۔ مسیحی دنیا میں انقلاب ایک
قدرتی بات تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جو عالمگیر نظامِ اخلاق تھا،
اب اس کا وجود نہیں ہے۔ اب جو بھی نظام ہے وہ یا تو اخلاقی اساس پر ہے یا
سیاسی اساس پر! اور ہر نظام ایک "قومی نظام" ہے۔ لہذا اگر مغرب کے
لوگ مذہب کو فرد کی ذات تک محدود کر دیں اور فرد کی دنیاوی زندگی کو مذہب سے
الگ کر دیں تو اور بات ہے لیکن اسلام ایک فرد کو ایک وحدت قرار دیتا ہے
اسلام روح اور مادہ کو یکجا کرتا ہے۔ اسلام کی رُوح کے تحت تو خدا کی
ذات اور پوری کائنات، ریاست اور کلیسا اور مادہ اور رُوح ایک چیز کے
اجزائے ترکیبی ہیں۔ اسلام کے تحت انسان کسی الگ تھلگ اور غیر پاکیزہ دنیا کا
باشندہ نہیں۔ اسلام اس دنیا سے علیحدگی کا سبق بھی نہیں دیتا۔ اسلام تو
مادہ کو بھی روح کی ایک شکل قرار دیتا ہے۔ روح جس کا اظہار مکان و زماں کی
قید میں ہوتا ہے مگر مغرب نے ان دونوں میں حدِ فاصل قائم کر دی ہے۔ مگر
آج پھر مغرب کا مفکر اس دنیاوی غلطی پر ماتم کناں ہے۔ لیکن وہ مجبور ہے کہ
سیاست دان اس اصول سے چمٹے ہوئے ہیں۔ یہ سب نتائج روحانی اور
دنیاوی زندگی کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنے کی وجہ سے برآمد ہو رہے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ یورپ کی ریاست تو مسیحی ہے مگر عملی طور پر وہ مذہب کو خیرباد
کہہ چکی ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ چند بے ربط ریاستوں کا قیام عمل میں
آتا، سو آیا۔ اب ان بے ربط ریاستوں میں کیا ہے۔ وہاں قومی جذبہ موجود
اور انسانی جذبہ ندارد ہے۔ چنانچہ اگر آج یہی ریاستیں چاہتی ہیں کہ یورپ
متحد ہو جائے تو یہ ایک ناممکن سی بات ہو گی۔ جب مذہبی عقائد اور اخلاقی اقدار
کی بنیاد ہی نہیں تو اتحاد کس اساس پر قائم ہو گا؟ قومی اساس پر —— ؟
یعنی اب مغرب کے لوگ اپنے ہی ہاتھوں تباہ کردہ عمارت کی تعمیرِ نو کا خواب

دیکھ رہے ہیں۔ یہ عمارت انہیں کلیسا نے دی تھی۔ مگر مغرب نے اس کی تعمیر ایک
عالمی تصور، یعنی اخوتِ انسانی کی بنیاد پر کرنے کی جگہ لوتھر کے فلسفے کی بنیاد پر
کی۔ بہرکیف عالمِ اسلام میں کوئی لوتھر پیدا نہیں ہوگا کیونکہ اسلام میں کلیسا کی
طرح کوئی نظام نہیں جو ازمنۂ وسطیٰ کے مسیحی نظام کی طرح ہو۔ اسلام کا نظمِ ر
یاست عالمگیر ہے۔ اس کی بنیاد وہی ہے، ضرورت صرف اتنی ہے کہ ہم
اس عمارت کی تعمیر کریں۔ ہمارے فقیہ عملی زندگی سے دور ہیں، نئے دور کے
تقاضوں سے بیگانہ ہیں۔ یہ کام ہمیں خود کرنا ہے تاکہ ہم ایک مضبوط اور
خوب صورت عمارت تعمیر کر سکیں۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس وقت نوجوان نسل
مغرب کے نظریۂ قومیت کو جس تیزی کے ساتھ ذہنوں میں جگہ دے رہی ہے اس کا
انجام آخر کیا ہوگا؟ ہمارے سامنے دو چیزیں ہیں۔ اول تو یہ کہ فکرِ مغرب یعنی
قومیت کا تصور خود اسلام میں جذب ہو کر نئی صورت اختیار کرے گا، جیسے
قبل ازیں مختلف النوع تصورات اسلام میں جذب ہو گئے اور ان کی ہیئت بدل گئی
ــــ یا اسلام میں کوئی تبدیلی آ جائے گی۔ چند روز کی بات ہے ہالینڈ
کے پروفیسر ونسنک نے ایک خط میں مجھے لکھا کہ اسلام آج اس نازک موڑ پر
ہے جہاں مسیحیت تین سو سال پہلے موجود تھی۔ لیکن سو سال سے زائد گزر جانے کے بعد
ابھی یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ مسیحیت آخر کیا رُخ اختیار کرے گی۔ اسلام تو
ابھی اس نازک موڑ پر پہنچا ہے، لہٰذا اس کے بارے میں کچھ کیسے کہا جا سکتا ہے
مسلمان بھی قوم اور نسل، وطن اور خون کے تصورات میں اُلجھے ہوئے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی سے عمل کا تعلق ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ایسا ہوتا رہا
تو شاید اسلام کی صورت ہی بدل جائے۔

میں امید کرتا ہوں کہ عملی بحث کے لئے مجھے معاف کر دیا جائے گا۔ بہرکیف
جس شخص کو آج آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے اعزاز سے
نوازا ہے وہ اب بھی اسلام کو ایک زندہ طاقت سمجھتا ہے۔ وہ طاقت جو
انسان کے ذہن کو وطن اور نسل کے تصور کی قید سے نجات دلا سکتی ہے۔
اسلام ــــ ریاست اور فرد دونوں کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے ــــ

اسلام کا عقیدہ ہے کہ اس کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے اور کوئی دوسرا
ہاتھ اس تقدیر کا رُخ نہیں پلٹ سکتا۔ چنانچہ ہر سوچ اس عقیدے کے تحت
ہوتی ہے۔ میں جدھر اشارہ کر رہا ہوں اس کی حیثیت صرف نظری نہیں ہے،
یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ دستورِ حیات ہے، ایک نظام ہے اور اسلام اس سے
متاثر ہوتا ہے۔ بس یہی وہ بات ہے کہ ہم اگر اسے پالیں تو مستقبل میں ہندوستان
کی ایک نمایاں تہذیب کے علمبردار بن سکتے ہیں۔ آج اسلام ایک ایسی
آزمائش سے دوچار ہے کہ اِس سے قبل وہ کبھی اتنے کڑے وقت سے دوچار
نہیں ہوا۔ یہ حق تو ہر قوم کو حاصل ہے کہ وہ اپنے اصولوں میں تبدیلی کر سکتی ہے،
کچھ نئے اصولوں کو بھی اپنا سکتی ہے لیکن اس سے قبل یہ بھی ضروری ہے کہ نتائج
پر ہر پہلو سے مکمل غور کر لیا جائے۔ اگر کچھ حضرات کو میرے ان نظریات سے
اتفاق نہیں ہے تو اس سے بے سُود بحث یا کشمکش کو جنم نہیں لینا چاہئے۔
ہم مسلمان ہیں اس اجلاس میں سب مسلمان ہیں۔ از روئے دین ہمارے
مقاصد ایک ہیں، ہماری دینی تعلیم ایک ہے۔ میں نے جن خیالات کا اظہار
کیا ہے اُن کا واحد مقصد یہ ہے کہ دینی عقائد کی روشنی میں ہمارے سیاسی راستے
جگمگا اٹھیں۔

سوچنا یہیں یہ ہے کہ فی الواقعہ مذہب ہمارا ذاتی معاملہ ہے؟ اور کیا ہم
اسے ذاتی معاملہ قرار دے کر اسلام کو بھی سیاسی و اخلاقی نصب العین میں
اس منزل پر پہنچانا چاہتے ہیں جو قبل ازیں مغرب میں مسیحیت کے ساتھ ہو چکا ہے؟
دُوسری صورت یہ ہے کہ اگر ہم ایک طرف اسلام کو بدستور اخلاقی تخیل کے
طور پر رہنے دیں مگر اسلامی نظامِ سیاست کی جگہ ایسے کسی قومی نظام کو
اپنا لیں جس کے تحت مذہب درمیان میں نہ آتا ہو ـــ تو کیا یہ ممکن ہے ـــ؟
ہندوستان میں ہم مسلمانوں کے لئے یہ سوال زیادہ ہی اہمیت کا حامل ہے
وجہ یہ ہے کہ ہم اقلیت میں ہیں۔ ہم مسیحیت کی طرح رہبانیت کے قائل نہیں ہیں
کیونکہ قرآن کریم میں اس کا اظہار موجود ہے۔ ہمارا عقیدہ مختلف ـــــ
بالکل مختلف ہے۔ یہ ایک فرد اور اس کی ذات تک محدود معاملہ نہیں ہے

بلکہ یہاں تو ہر فرد ایک وحدت ہے اور اس سے عظیم نظام ترتیب پاتے ہیں ۔ لہذا ہمارے ہاں ایک ایسے سیاسی نظام کی بنیاد پڑی جس میں قانونی مضمرات بھی تھے ۔ یہ اس لئے اہم ہیں کہ ان کی بنیاد الہام اور وحی پر ہے ۔ لہذا اسلام کا معاشرتی نظام اور اس کا نصب العین مختلف نہیں ہیں ۔ یہ ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں ۔ ان میں کسی ایک کا دامن تھام کر آگے قدم بڑھانا مشکل ہے ۔ ہاں دونوں کی قید سے آزاد ہو کر جو چاہے کیجئے ۔ مگر وہاں اسلام خارج از بحث ہو جاتا ہے ۔ اس انداز میں کم از کم میرے خیال میں کوئی مسلمان سوچنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا ۔ یہی مسئلہ آج ہم ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے ہے ۔ معروف فرانسیسی مفکر دانیاک کے قول سے انسان ، نسل یا مذہب کی قیود برداشت نہیں کر سکتا ۔ دریاؤں کی تندی بھی اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی ۔ سلسلۂ کوہ کے رُخ بھی اس دائرہ عمل کو محدود نہیں کر سکتے بلکہ یہ متوازن ذہن کے عوام کا اجتماع ہے ، ان کے دل گرم ہیں تو ان میں وہ اخلاقی شعور یقیناً پیدا ہو گا جسے قوم کے لفظ سے پکارا جاتا ہے ۔ مجھے اس اجتماع اور اس ہیئت سے انکار نہیں ، مگر یہ عمل طویل ہے ۔ اس دوران قدم قدم پر برداشت اور صبر کے امتحان بھی ہیں ۔ اس عمل میں حیاتِ انسانی ایک نئے عملی سانچے میں ڈھلنا شروع ہوتی ہے ۔ اگر شہنشاہ اکبر کے دین الٰہی یا کبیر کی تعلیم عوام میں گھر کر جاتی تو عین ممکن تھا ہندوستان میں ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی مگر تجربہ شاہد ہے کہ ہندوستان میں جتنے بھی مذاہب ہیں ان میں ان کے کوئی جراثیم موجود نہیں ہیں کہ وہ انفرادیت کو ختم کر کے اجتماعیت کو اپنا لیں مگر اس اجتماعیت کو قائم رکھنے یا وہ اخلاقی شعور جو قوم کی تخلیق کے لئے ضروری ہے ، بہت امتحانات اور قربانیاں طلب کرتا ہے ، اور اس کے لئے پورے ہندوستان میں کوئی بھی قوم تیار نظر نہیں آتی ۔ ہندی قومیت کے اتحاد سے ہم ان تمام جماعتوں کی نفی نہیں کرنا چاہتے بلکہ اس اتحاد کی اساس ان کا باہمی تعاون اور ہم آہنگی نہیں ہو سکتی ۔ تدبّر تو اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ حقائق ، حقائق ہیں ، وہ خوشگوار ہیں یا تلخ ، ہم

وسیع القلبی سے اُن کا اعتراف کریں۔ امن کی راہیں سخت ہوتی ہیں۔ ہم
مفروضوں پر چل کر اپنے مقاصد کے حصول میں کیونکر کامیاب ہو سکتے ہیں۔
ہمارے لئے حالات و واقعات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ہندوستان ہو
یا ایشیا، اُن کی قسمت ہندی قومیت کے اتحاد کے اصول پر مبنی ہے۔ ہم
ہندوستان کو ایک چھوٹا ایشیا بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہند کے لوگوں کا ایک حصّہ
ایسا بھی ہے جو اپنی تہذیب و تمدّن میں اقوامِ مشرق سے خاصی مشابہت رکھتا
ہے۔ مگر ایک دوسرا حصّہ ایسا بھی ہے جو مغربی یا وسطی ایشیا میں آباد اقوام
سے مشابہ ہے۔ چنانچہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر ہندوستان ہی میں
باہمی اشتراک کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو ہندوستان میں کسی بنیادی
قباحت کی وجہ سے نہیں بلکہ جغرافیائی اعتبار سے جو باشندے تختۂ مشق بنتے
چلے آ رہے ہیں اُن میں صلح ہو جائے گی۔ نہ صرف صُلح ہو جائے گی بلکہ پُورے
ایشیا کی گُتھی بھی سُلجھ جائے گی۔ مگر افسوس ہے کہ اس ضمن میں ہم نے اب تک جو
مساعی کی ہیں وہ بار آور نہیں ہو سکیں۔ سوچنا یہ ہے کہ ہماری ناکامی کا سبب
کیا ہے۔ اس کا ہمارے پاس ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ شاید ہم
ایک دُوسرے پر اعتماد نہیں کر پاتے اور دُوسرے بلکہ ہم ایک دُوسرے پر
غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ بھی
امکان ہے کہ ہم اتحاد کے عظیم مقصد کے لئے اپنے اپنے مفادات کی قربانی
دے دیں۔ ہم ایک نقاب اوڑھے ہُوئے ہیں۔ گو بظاہر ہمارا نعرہ ایک ہے
مگر ہم فرقوں اور ذاتوں کے بھنور میں بدستور پھنسے ہُوئے ہیں۔ ہم اس اصول
کو کیونکر تسلیم کر لیں کہ اپنے اپنے حق کے تحت ہر جماعت اپنی تہذیب، اپنے
تمدّن کو پروان چڑھاتی رہے اور آسانی سے سرگرمِ عمل رہے۔ ہماری ناکامیوں
کی وجوہات جو کچھ بھی ہیں مگر میں مایوس نہیں ہُوا۔ حالات کے تحت بظاہر
ـــــ ظاہر و باطن ایک ہیں۔ مسلمانوں کے بارے میں تو میں بلا تامل کہہ
سکتا ہُوں کہ اگر اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان
کے مسلمان اپنی قدیم روایات اور اپنی تہذیب، تمدّن کے تحت ہندوستان

میں آزادی کے ساتھ آگے بڑھ سکتے ہیں تو وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے ہر ممکن قربانی دینے کے لئے تیار ہوں گے۔ کسی کو ان کے عقائد کے اصول پر ـــــ خواہ وہ فرد ہو یا جماعت ، ترقی کرنے کی اجازت دینا تنگ نظری نہیں ـــ یہ فرقہ داریت نہیں ـــ۔ فرقہ داریت بھی کئی اقسام کی ہوا کرتی ہے۔ ایک وہ ہے جو دوسروں کو نفرت کا سبق دیتی ہے ، اُن کو ختم کرنا چاہتی ہے ـــ ایسی فرقہ داریت کی پستی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ میں ہر دیگر قوم کے تہذیب و تمدّن، اُس کی رسومات ، اُس کے قانون اور اُس کے طرزِ معاشرت کی عزّت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ بطور مسلمان بھی مجھ پر ان کی عزّت کا فرض عائد ہوتا ہے۔ وقت پڑنے پر میں قرآن کریم کے احکامات کی تعمیل میں ان کے معبدوں کی حفاظت بھی کروں گا۔ مگر مجھے اس جماعت سے بھی عشق ہے جو بلا شبہ میری زندگی کا سرچشمہ ہے جس جمعیت کے دین و حکمت ، جس کے ادب و تمدّن نے مجھے بلندیاں عطا کیں ۔ جو میری زندگی کی تکمیل کی ذمہ دار ہیں ۔ اسی لئے میرا ماضی حیاتِ نو سے دوچار ہو گیا ۔ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرم عمل ہے جن لوگوں نے نہرو رپورٹ کی تبلیغ کی ہے وہ بھی فرقہ داریت کے اس پہلو کے معترف ہیں "

(سندھ کی علیحدگی کے مسئلے پر بحث سے اقتباس)

" اگر یہ کہا جائے کہ قومیت کے نقطۂ نگاہ کے تحت فرقے پر مبنی کسی صوبے کا قیام نا مناسب ہے تو یہ اُس دعوے کی طرح ہے کہ بین الاقوامی تقاضوں کے تحت مختلف اقوام کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ گو یہ دو باتیں کافی حد تک اپنے پہلو میں صداقت رکھتی ہیں مگر بین الاقوامی نصب العین کے شدّت سے حامی بھی یہ تسلیم کریں گے کہ اگر ہر قوم کو مکمل آزادی دے دی جائے تب ہی بین الاقوامی ریاست کا قیام عمل میں آ سکتا ہے ۔ اس چیز کا اطلاق ہر قوم کی مکمل تہذیبی ، تمدّنی آزادی پر ہوتا ہے ۔ اپنی اصلی حیثیت میں فرقہ داریت صرف تمدّن کا دوسرا نام ہے ۔"

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں ہم آہنگ قوم کی نشو و نما کی

مانند مختلف ملتوں کا وجود ضروری ہے۔ مغربی ملکوں اور ہندوستان میں ایک فرق ہے۔ وہاں کی طرح یہاں صرف ایک قوم کے آباد رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ یہاں مختلف زبانیں ہیں، یہاں مختلف نسلیں ہیں، مختلف مذاہب ہیں۔ ان کے فعل یکساں کیسے ہو سکتے ہیں؟ ان میں ایک نسل کی طرح کے جذبات اور سوچ کیسے پیدا ہو سکتی ہے! خود ہندو ایک قوم نہیں۔ ان حالات میں ہندوستان کے اندر مغربی انداز جمہوریت کیسے ممکن ہو۔ اسی لئے آج مسلمان یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے اندر ہی ایک اسلامی ہندوستان کا قیام عمل میں لایا جائے۔ یہ مطالبہ بالکل درست ہے۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرار دادیں بھی اسی نصب العین کی غمازی کرتی ہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ تمام اقوام کے وجود کو ختم کئے بغیر اُن سے ایک ہم آہنگ قوم تیار کی جائے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ ہمارا یہ اجتماع اس قرارداد میں موجود تمام مطالبات پر صاد کرے گا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں کچھ اور آگے جانا چاہتا ہوں میں تو چاہتا ہوں کہ پنجاب، صوبہ شمال مغربی سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست کی صورت دے دی جائے، چاہے پھر یہ ریاست برطانوی ہند ہی کے اندر اپنی خود مختار حکومت کا قیام عمل میں لائے یا اس سے باہر! مگر میرا احساس ہے کہ آخرکار شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ اسلامی ریاست لازماً قائم کرنا پڑے گی۔ یہی تجویز نہرو کمیٹی میں پیش کی گئی تھی مگر کمیٹی کے اراکین نے اسے محض اس وجہ سے رد کر دیا کہ ایسی وسیع ریاست کے قیام کی صورت میں اُس کا انتظام مشکل ہو جائے گا۔ جہاں تک رقبہ کے اعتبار سے ریاست کی وسعت کا خیال ہے تو یہ خدشہ درست ہے۔ مگر آبادی کے اعتبار سے اس ریاست کی آبادی برطانوی ہند کے بعض صوبوں کے مقابلے میں بھی کم ہو گی۔ اگر انبالہ یا ایسے اضلاع جہاں ہندو اکثریت موجود ہے، الگ کر دیا جاتا تو انتظامی دشواریوں اور وسعت میں نہ صرف کمی ہو جائے گی بلکہ غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت بھی بہتر طریق سے کی جا سکے گی۔ یہ تجویز انگریز اور ہندو کسی کے لئے بھی پریشانی کا باعث نہیں بننی چاہئے۔ ہندوستان میں مسلمان دنیا بھر کے مقابلے میں اکثریت میں ہیں۔ لہذا ہماری خواہش ہے کہ اسلام کو ایک تمدنی طاقت بن کر زندہ رہنا چاہئے اور اس مقصد کے لئے اسے مرکزیت قائم کرنا ہو گی۔ ہندوستانی مسلمانوں نے برطانوی حکومت کی چیرہ دستیوں کے باوجود انگریز کو اس ملک پر حکومت کرنے کے قابل بنایا کیونکہ اس میں

فوج اور پولیس نے خدمات سرانجام دیں۔ لہٰذا اب بھی یہ طبقہ تمام مسائل کو حل کر سکتا ہے اس طرح مسلمانوں پر ایک ذمہ داری آن پڑے گی اور اس کا احساس فزوں تر ہو جائے گا۔ اس میں حُبِّ وطن پیدا ہوگی۔ اگر فی الواقعہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمان اس ریاست کے قیام میں کامیاب ہوتے ہیں تو وہ بیرونی جارحیت کے خلاف بھی پُوری قوت سے دفاع کر سکیں گے۔ اس وقت پنجاب میں مسلمان، آبادی کے اعتبار سے ۵۶ فیصد ہیں مگر پورے ہندوستان کی فوج میں ہم ۵۴ فیصد ہیں۔ علاوہ ازیں اگر برطانوی فوج سے اُن ۱۹ ہزار نیپالی گورکھوں کو خارج کر دیا جائے تو مسلمان ۷۰ فیصد ہو جاتے ہیں۔ اس میں وہ ۶ ہزار لوگ شامل نہیں ہیں جنہیں صوبۂ سرحد اور بلوچستان سے فوج کے لیے بھرتی کیا جاتا ہے۔ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی صلاحیتوں کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ یہی وہ صلاحیتیں ہیں جو ہندوستان کو غیر ملکی جارحیت سے تحفظ دے سکتی ہیں۔ سری نواس شاستری کے خیال میں شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ اسلامی ریاستوں کے قیام کا مطالبہ دراصل مسلمانوں کی اس خواہش کا اظہار ہے کہ حکومت ہند پر دباؤ پڑ سکے۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں۔ ہمارا مقصد تو محض اتنا ہے کہ ہم آزادانہ ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکیں کیونکہ ایسا ہم اس مرکزی حکومت کے تحت ہرگز نہیں کر سکتے۔ جس پر قوم پرست ہندوؤں کا غلبہ ہو اور دوسری اقوام پر بھی وہ حاوی رہے۔

ہندوؤں کو یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہیے کہ آزاد اسلامی ریاستیں قائم ہو گئیں تو مذہبی حکومت کا قیام عمل میں آ جائے گا۔ اسلام میں مذہب کا مفہوم وہ نہیں جو ہندو سمجھتے ہیں۔ اسلام ایک ریاست ہے، کلیسائی نظام ہرگز نہیں۔ اسلامی ریاست کا دارو مدار ایک اخلاقی نصب العین پر ہوتا ہے۔ اس کے عقائد میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ انسان ایک درخت یا ایک پتھر کی طرح ہے جو پاک سرزمین سے وابستگی رکھتا ہے۔ اس کے عقائد میں تو یہ بات شامل ہے کہ انسان ایک روحانی وجود ہے وہ ترکیب اجتماعی کے ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے جس کے کچھ حقوق ہیں اور جس پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ٹائمز آف انڈیا نے اسلامی ریاست کی نوعیت کے بارے میں لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست پر فرض ہوتا تھا کہ وہ سود کے بارے میں قوانین وضع کرے مگر اسلام میں گو سود لینا حرام ہے اس کے باوجود اسلامی حکومت نے کوئی پابندی عائد نہ کی۔ میں جس اسلامی ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں وہ نہ صرف

ہندوستان بلکہ اسلام کی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر ہے۔ اگر اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آگیا تو نہ صرف ہندوستان میں طاقت کا توازن پیدا ہوگا بلکہ مکمل امن بھی قائم ہوگا۔ نیز اسلام، عرب شاہنیت کے اب تک موجودہ اثرات سے آزاد ہو کر اس جمود کو توڑنے میں کامیابی حاصل کر لے گا جو اسلامی تمدن، اسلامی تعلیمات اور شریعتِ اسلامی پر سینکڑوں برسوں سے طاری ہے۔ یہ جمود ٹوٹے گا، تو یہ صرف تجدید ہوگی بلکہ موجودہ دور کی روح بھی قریب ہو جائے گی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ بات واضح ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں، عقائد اور معاشرت میں اختلافات کی خلیج حائل ہے ان کے پیشِ نظر مستقل و مستحکم حکومت کے قیام کی ایک ہی صورت ہے کہ ہندوستان میں مختلف آزاد ریاستیں قائم کر دی جائیں جو تاریخ، مذہب، نسل اور اقتصادی مفادات کے اشتراک پر مبنی ہوں۔ سائمن رپورٹ میں وفاق کا جو تصور ہے، اس کے تحت یہ ضروری ہے کہ مرکزی مقننہ کا انتخاب عوام نہ کریں بلکہ وہ وفاقی ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں۔ میں نے جو اصول بتائے ہیں وہ سائمن رپورٹ سے خاصی حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ ان میں یہ بھی شامل ہے کہ تمام صوبوں کی تقسیم ازسرِنو کی جائے ــــ میں خود ان دونوں تجاویز کی تائید کرتا ہوں۔ میں یہاں تک کہوں گا کہ ان صوبوں کی تقسیم سے پہلے دو شرائط کو بھی پورا کیا جائے۔ ایک تو یہ کہ تقسیم نئے دستور سے پہلے مکمل ہو، دوسرے یہ کہ اس کے تحت تمام فرقہ وارانہ مسائل کو مکمل طور پر حل کیا جائے۔ صوبوں کی تقسیم کے لئے اگر صحیح اصول وضع کر لئے گئے تو مخلوط اور جداگانہ انتخابات کا مسئلہ بھی مستقل حل تلاش کر لے گا۔ کیونکہ میرے خیال میں آئے دن کے تنازعات کی تمام بنیاد موجودہ صوبوں کی غلط تقسیم ہے۔ ہندو کہتے ہیں کہ جداگانہ انتخابات قومیت کی نفی کرتے ہیں۔ شاید وہ قومیت کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام لوگ اس طرح شیر و شکر ہو جائیں کہ کسی انفرادی ملت کا شائبہ بھی نہ رہے۔ مگر ہمیں اس سے اختلاف ہے ہندوستان میں متعدد اقوام آباد ہیں اور متعدد مذہبوں سے وابستہ لوگ رہتے ہیں مسلمان معاشی اعتبار سے پسماندہ ہیں۔ پنجاب کے مسلمان بالخصوص قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ بعض صوبوں میں وہ اقلیت میں ہیں۔ محض انہی وجوہات کی بنا پر ہندوستان کے مسلمان جداگانہ انتخاب چاہتے ہیں۔ موجودہ حالات میں یہ توقع کہ علاقائی انتخابات کے ذریعے ہر قوم اور اس کے مفادات کی مکمل نمائندگی

ہو جائے گی، عبث ہے۔ بس یہ ہوگا کہ ہر اقلیت پر ہندو کو غلبہ حاصل ہو جائے گا۔ ہاں اگر صوبوں کی تقسیم کسی ایسے اصول کے تحت کر دی جائے کہ اس صوبے میں قریبًا ایک ہی نوعیت کی اقوام رہتی ہوں، وہ نسلاً اور مذہبًا یا تہذیب و تمدن یا لسانی اعتبار سے ایک ہوں تو پھر مسلمانوں کو مخلوط انتخابات پر بھی بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؛

جہاں تک تعلق ہے مرکزی وفاقی ریاست کا اور اس کے اختیارات کا تو ہندو اور انگریز کے تیار کردہ دستورِ حکومت سے اُن دونوں کے مابین مقاصد کے اختلافات کا علم ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے پنڈت یہ نہیں چاہتے کہ مرکزی حکومت کے پاس جو موجودہ اختیارات ہیں ان میں ذرا برابر کمی بیشی ہو۔ وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ یہ اختیارات مرکزی مجلس مقننہ پر چھوڑ دیئے جائیں۔ شاید اس لئے کہ وہاں بھی انہی کی اکثریت ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اراکین کی نامزدگیاں ختم ہوں گی تو اور بھی اکثریت ہو جائے گی۔ دوسری طرف فرنگیوں نے محسوس کیا کہ اگر مرکز میں جمہوری اصول ور آئے تو ان کے مفادات پر ضرب پڑے گی، اختیارات ہندوستانیوں کے ہاتھ میں چلے جائیں گے اور وہ اقتدار سے محروم ہو جائے گا۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ انہوں نے وفاق کے اصولوں پر عمل کرنے کے خیال کا اظہار کیا ہے اور اس ضمن میں کچھ تجاویز بھی پیش کر دی ہیں مگر ان کا زاویۂ نظر خاصا مختلف ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے زاویۂ نظر میں انگریز کے زاویۂ نظر کے مقابلے میں فرق ہے۔ اگر مسلمانوں نے وفاق کا مطالبہ کیا ہے تو اس لیے کہ فرقہ وارانہ مسائل کے حل کا ایک ہی ذریعہ ہے جبکہ شاہی کمیشن کے اراکین، فیڈریشن کا مختلف تصور لیتے ہیں۔ ان کا تصوّر اصولاً خواہ کتنا ہی صحیح اور مستحکم ہو مگر اس کے تحت وفاقی ریاستوں میں حکومتِ خود اختیاری کا قیام مشکل ہے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں جمہوریت کے اصولوں کا جو نعرہ بلند ہوا ہے اور اس نعرے سے جو حالات پیدا ہو گئے ہیں اس سے کس طرح بھی نجات حاصل کی جا سکے۔ انہوں نے فرقہ واریت کے مسائل کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ سائمن رپورٹ میں حقیقی وفاق کی نفی کی گئی ہے۔ نہرو رپورٹ نے اس خیال سے کہ مرکزی مجلس مقننہ میں بہرحال ہندوؤں کو اکثریت حاصل ہوگی، ایک وحدانی نظام کی تجویز پیش کر دی کیونکہ اس طرح ہندوستان بھر میں ہندوؤں کا غلبہ ہو جائے گا۔ سائمن رپورٹ نے جس وفاق کی بات کی ہے وہ ایک لفظ تک محدود ہے فدنہ اُس کے

تحت برطانوی اقتدار پہلے کی طرح قائم رہتا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ انگریز اس اقتدار سے الگ ہونا پسند نہیں کرتے وہ یہ بھی سوچتے ہیں کہ فرقہ وارانہ معاملات کا طے ہونا مشکل ہے اور اس طرح اُسے ہندوستان کی سرزمین پر قدم جمائے رکھنے میں آسانیاں پیدا ہوجائیں گی۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہندوستان میں وحدانی حکومت قائم ہو۔ ما بقائے اختیارات صرف آزاد ریاستوں کا حق نہیں۔ کم از کم میں ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ رائے نہیں دے سکتا کہ وہ برطانوی یا ہندوستانی نظامِ حکومت پر صاد کریں۔ ایسا نظام جو صحیح معنوں میں وفاق کے اصول پر قائم نہ ہو یا جس کے تحت مسلمانوں کے الگ سیاسی وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔

مرکزی حکومت میں فرنگیوں کی طرف سے بنیادی تبدیلیاں کرنے کے لئے اقدامات سے پہلے ہی یہ محسوس ہو گیا تھا کہ یہ تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ اسی لیے گول میز کانفرنس میں ریاستوں کے حکمرانوں کی شرکت کو ضروری سمجھا گیا۔ مگر ہندوستان کے لوگوں اور خاص طور پہ اقلیتوں کو یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرتے ہی ریاستوں کے والیان کے موقف میں کتنی تیزی کے ساتھ تبدیلی پیدا ہوئی اور وہ ہندوستان کے وفاق میں شرکت کے لئے تیار ہو گئے۔ علاوہ ازیں وہ ہندو مندوب جنہوں نے اب تک وحدانی حکومت کے حق میں بات کی تھی فوراً وفاق کے اصول پر متفق ہو گئے۔ کچھ دن پہلے مسٹر شاستری نے سائمن کی وفاقی سکیم کی بھرپور مخالفت کی تھی مگر والیانِ ریاست کے نام دعوت ناموں کے ساتھ ہی وہ بھی اس کے حق میں ہو گئے۔ انہوں نے بلاتاخیر کانفرنس کے اوّلین اجلاس ہی میں اپنی تائید کا اظہار کر دیا۔ اسی لئے وزیر اعظم برطانیہ نے آخری تقریر میں کچھ اشارات کئے۔ بات یہ ہے کہ جب فرنگیوں نے والیانِ ریاست کو وفاق میں شرکت کی دعوت دی تو ہندو بلا چون وچرا متفق ہو گئے۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمان والیانِ ریاست کی تعداد ہندو والیانِ ریاست سے کم ہے۔ لہٰذا اس طرح نہ صرف یہ کہ والیانِ ریاست ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو قائم رکھے رہنے میں معاون و مددگار ثابت ہوں گے بلکہ ہندوؤں کو بھی وفاقی اسمبلی میں اُن کی وجہ سے اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ فرنگی، ہندو اور مسلمان رہنماؤں کے درمیان مرکزی حکومت کی ہیئت پہ اختلاف سے والیانِ ریاست کو درمیان میں لاکر فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ والیانِ ریاست کو تو یہ فائدہ ہے کہ وفاق میں شمولیت کے باعث

اُن کی استبدادی حکومت مزید مضبوط ہو جائے گی۔ میں یہ بات واضح کر دوں کہ اگر مسلمان اس چکر میں آگئے تو طویل تر مدت میں ان کا سیاسی وجود نہ ہونے کے برابر رہ جائے گا۔ ایسے وفاق میں ہندو یا والیانِ ریاست کی اکثریت ہوگی اور وہ من مانی کارروائیاں کرتے رہیں گے۔ وہ ہمیشہ برطانوی حکمرانوں کی ہاں میں ہاں ملائیں گے۔ ملک کے اندر بہرحال وہ ہندو کے اقتدار کے قیام کے لئے کوشاں رہیں گے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دراصل یہ سکیم حکومتِ برطانیہ اور ہندوستان کے ہندوؤں میں ایک گٹھ جوڑ ہے۔ انگریز چاہتا ہے کہ ہندو کے ذریعے ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم رکھے اور ہندو کو اس کا یہ معاوضہ دے کہ مسلمان پر اس کا غلبہ ہو جائے۔
ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد مسلمان ریاستوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ مسلمانوں کو مرکزی وفاقی اسمبلی میں ۳۳ فیصد نشستیں دی جائیں، اسی ایک ایوان یا دیگر ایوانوں میں کس طرح پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے؟ جب کہ یہ ایوان ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی ہند کے نمائندوں پر مشتمل ہوں گے۔ ہم ایسی وفاقی حکومت کا مطلب اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس وقت گول میز کانفرنس میں یہ مسئلہ زیرِ غور ہے۔ کل ہند وفاق میں ابھی مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ نہیں آیا۔ مگر خبر رساں ایجنسی رائٹر کے مطابق موجودہ رپورٹ میں دو دیوانوں کی سفارش کی گئی ہے۔ ان میں برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندے شامل ہوں گے تاہم ان نمائندوں کی تعداد کے معاملہ پر اس وقت بات ہوگی جب کمیٹی ان پر غور کرے گی اور جنہیں ابھی سب کمیٹی کے سپرد نہیں کیا گیا۔ ہمارے خیال میں نمائندگی کے تناسب کا سوال کچھ کم اہم نہیں ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اسمبلی کی ہیئت ترکیبی کے ساتھ ہی اس پر غور ہوتا۔ جہاں تک میری فہم کا تعلق ہے تو سب سے اچھی صورت تو یہ تھی کہ ابتدائی مرحلہ میں وفاق صرف برطانیہ کے علاقوں تک ہوتا۔ کوئی ایسی وفاقی سکیم جو جبر و استبداد اور جمہوریت کے گٹھ جوڑ کی بنیاد پر ہو، صرف یہی رنگ لا سکتی ہے کہ برطانوی ہندوستان، حسبِ سابق وحدانی حکومت کا تختۂ مشق بنا رہے۔ یہ وحدانی حکومت فرنگی کے لئے سود مند ہو سکتی ہے —— یا ریاستوں کے حکمرانوں اور ہندو اکثریت کے لئے فائدہ مند ہو سکتی ہے۔ مگر اس سے بھلا مسلمان کس فائدے کی توقع رکھ سکتے ہیں؟ یہ تو تبھی ممکن ہے کہ مسلمانوں کو ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے ۵ میں مکمل مابقائی اختیارات اور اکثریتی حقوق حاصل ہوں۔ نیز مرکزی وفاقی اسمبلی کے اراکین کی مجموعی تعداد کا ۳۳ فیصد نہیں حاصل ہو۔ یہ برطانوی ہندوستان کے صوبوں

کے لئے ناکافی اختیارات کے سلسلہ میں نواب آف بھوپال جناب اکبر حیدری اور محمد علی جناح
قطعی طور پر درست اور مناسب موقف کے حامی ہیں۔ کیونکہ اب ریاستوں کے حکمرانوں کو بھی
وفاق میں شریک کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ مرکزی مجلس کے بارے میں ہمیں بھی اپنے مطالبات پر
نظرثانی کرنا ہوگی۔ اب یہ صرف برطانوی ہند کی اسمبلی میں تناسب کی بات نہیں بلکہ اب کل ہند
وفاق میں مسلمانوں کی نمائندگی کی بات ہے۔ چنانچہ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ وفاق میں شامل
ہونے والی اسلامی ریاستوں کو چھوڑ کر وفاق میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستوں کا
ملنا ضروری ہے۔

ہندوستان میں وفاقی حکومت کے قیام کے سلسلہ میں دفاع کے مسئلہ کو نظر انداز نہیں
کیا جا سکتا۔ شاہی کمیشن نے ان معاملات کو پیش نظر رکھا ہے اس لئے کہ دفاع بہرحال برطانوی
حکمرانوں کے ہاتھوں میں رہنے۔ ان کے مطابق "ہندوستانی اور برطانوی تعلقات کی نوعیت
کے باعث ہندوستان کے دفاع کے مسئلہ کو اب یا بعد ازاں خالصتاً ہندوستان کا مسئلہ
نہیں سمجھا جا سکتا۔ افواج کا نظم و نسق ہمیشہ برطانیہ کے ہاتھوں میں رہنا ضروری ہے۔"

اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہندوستان خود (برطانوی فوجوں اور افسروں کے بغیر) اپنی
سرحدوں کی حفاظت کی قوت حاصل کرے یا ہندوستان میں خالصتاً ایک ذمہ دار حکومت کا قیام
ناممکن ہے ۔۔۔؟ اس وقت جو حالات ہیں ان کے پیش نظر اس سے انکار کچھ ممکن نہیں ہے کہ
فی الواقعہ ہندوستان کی آئینی ترقی میں سد راہ ہے۔ لیکن اگر نہرو رپورٹ میں شامل اس
اصول سے اتفاق کر لیا جائے کہ جب ہندوستان کو مکمل اختیارات حاصل ہوں گے تو اس کی
افواج کی عنان منتخب مجلسِ مقننہ کے ہاتھوں میں ہوگی ۔۔ لہذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ مرکزی
حکومت ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان کی روشنی میں ترقی کرتی رہے، وہ ناممکن ہو جائے گی۔
اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ہندوستان میں مختلف نسلوں اور مذاہب کی وجہ سے ان
سب کی صلاحیتوں اور قوتوں میں اختلاف ہے۔ اس کے ساتھ یہ کہہ کر معاملہ کو مزید الجھا دیا
گیا ہے کہ

"بلاشبہ ہمارے عام استعمال میں "ہندوستانی" ایک قوم نہیں کیونکہ ہندوستان
کی جنگجو اقوام اور دیگر اقوام میں نمایاں فرق ہے۔"

شاید ان امور پر اس لئے زور دیا گیا ہے کہ انگریز یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ ہندوستان کی

حفاظت نہ صرف بیرونی جارحیت سے کر رہے ہیں بلکہ اندرونی استحکام و امن و امان کے غیر جانبدار محافظ بھی ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس طرح وفاق میں ہندوستان کے صرف بیرونی تحفظ کا مسئلہ باقی رہ جائے گا۔ صوبائی افواج سے قطع نظر۔ کیونکہ یہ ہمارے ملک کے اندر امن و امان کے لئے ضروری ہیں۔ ہندوستان کی وفاقی جماعت، صوبہ سرحد میں ایک طاقتور فوج بھی متعین کر سکتی ہے۔ اس میں مختلف صوبوں کے لوگ بھی شامل ہوں گے اور ان کی کمان مختلف اقوام کے تجربہ کار افسروں کو دی جائے گی۔ یہ بات درست ہے کہ ہندوستان میں لائق فوجی کمان نہیں ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر کمیشن یہ کہتا ہے کہ افواج کی عنان برطانیہ کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے۔ مگر اس نے اپنی ہی رپورٹ میں یہ بھی کہا ہے کہ:

"اس وقت کوئی ہندوستانی کمیشنڈ افسر، اعلیٰ فوجی عہدے پر نہیں۔ ہندوستانی کپتانوں کی کل تعداد بیس سے ۲۵ رجمنٹوں میں ہیں۔ ان میں کچھ کی عمر اتنی ہے کہ اگر وہ محکمانہ امتحانات میں کامیاب بھی ہو جائیں تو ان کی مزید ترقی ممکن نہیں۔ ان میں سے اکثر سینڈہرسٹ کالج میں نہیں گئے۔ انہیں کمیشن ملا۔ مگر جنگِ عظیم کے دوران۔!"

اس خواہش کے تحت کہ حالات میں تبدیلی آنا ضروری ہے۔ مخلصانہ اور سچی ہی کیوں نہ ہو مگر سکین کمیٹی کے الفاظ بھی ملاحظہ ہوں، جس کے صدر اور فوجی سیکرٹری برطانوی اور تمام رکن ہندوستانی ہیں۔

"ترقی کا دارومدار ہر مرحلہ پر کامیابی میں نہیں ہے۔ یا جنگی قابلیت کے قیام میں تسلسل نہیں ہے۔ یوں تو ترقی کی رفتار سست پڑ جائے گی۔ اس وقت ہندوستانی فوجی اعلیٰ عہدوں پر نہیں ہیں۔ ان کا تجربہ بھی محدود ہے۔ لہٰذا وہ قلیل مدت میں اعلیٰ عہدوں پر نہیں پہنچ سکتے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان امیدواروں میں اضافہ ہو اور ہم اس اضافے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ کم از کم چھوٹی رجمنٹوں کے تمام افسر ہندوستانی ہوں۔ اس وقت تک فوج کو ہندوستانیوں کے حوالے کر دینا غلطی ہوگی، حتیٰ کہ اگر تمام فوج ہندوستانیوں پر مشتمل ہو تب بھی اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک طویل مدت درکار ہوگی۔"

سوال یہ ہے کہ ان حالات کا ذمہ دار کون ہے؟ یہ خرابی ہماری لڑاکا قوم میں ہے یا فوجی تربیت کی سست رفتاری کی۔ ہماری لڑاکا اقوام کی صلاحیتوں سے انکار کون کر سکتا ہے۔ میں فوجی امور کا ماہر تو نہیں ہوں مگر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس دلیل کا انداز ظاہر کرتا ہے کہ یہ نام نہاد "ترمیمی عمل" جاری رہے گا اور ہندوستان ہمیشہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہے گا۔ اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ نہرو رپورٹ کی تجاویز کی روشنی میں سرحدی فوجوں کا انتظام ایک وفاقی کمیٹی کے ذمہ کر دیا جائے اور اس کمیٹی کے اراکین جو بھی فیصلہ کریں وہ باہمی افہام و تفہیم کے ذریعہ ہو۔

یہ بات خاصی دلچسپ ہے کہ سائمن رپورٹ میں ہندوستان کی خشکی کی سرحدوں کو کمال درجہ اہم سمجھا گیا ہے۔ مگر سمندری سرحدوں کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے ہمیں اعتراف ہے کہ ہندوستان پر جب بھی کوئی حملہ ہوا خشکی کے راستوں ہی سے ہوا مگر فرنگی اس بات کو نظر انداز کیوں کر گئے کہ وہ خود ہندوستان کے ان ساحلوں کی طرف ہی آئے تھے۔ جو غیر محفوظ تھے اور پھر ہندوستان پر قابض ہو گئے تھے۔ چنانچہ ہم خود مختار ہندوستان کے لئے بری حفاظت کے ساتھ ساتھ بحری دفاع کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتے ہیں۔

اگر وفاقی ریاست کا قیام عمل میں آ گیا تو مجھے یقین ہے کہ مسلم وفاقی ریاستیں ہندوستان کی حفاظت میں ایک غیر جانب دار ہندوستانی فوج کے قیام میں جو بر و بحر، دونوں جگہ موجود ہے، تمام تر امداد کریں گی۔ دورِ مغلیہ میں اس نوع کی غیر جانب دار افواج موجود تھیں۔ شہنشاہِ اکبر کے دور میں ان تمام سرحدی فوجوں کے افسر بھی ہندو تھے۔ لہٰذا میرا یقین ہے کہ اگر وفاقی نظامِ حکومت میں ایک غیر جانب دار فوج قائم کر دی گئی تو مسلمانوں کے جذباتِ حبِ وطن کو مزید تقویت ملے گی اور بیرونی جارحیت کی صدارت میں ہندوستان کے مسلمان دیگر مسلمانوں سے مکمل اشتراک و تعاون کریں گے۔

میں اختصار کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ ہندوستان کے دو آئینی مسائل پر مسلمانوں کا طرزِ عمل کیا ہو؟ ہمارا اولین مطالبہ تو یہی ہے کہ ہندوستانی صوبوں کی تقسیم از سرِ نو کی جائے تاکہ فرقہ وارانہ مسائل کا حل نکل آئے۔ لیکن اگر مسلمانوں کے اس مطالبے کو منظور نہیں کیا جاتا تو میں پوری شدت سے ان مطالبات پر قائم ہوں جن کا اعلان کل ہند مسلم کانفرنس اور کل ہند مسلم لیگ کر چکی ہے۔ ہم مسلمان ایسی کوئی آئینی تبدیلی تسلیم نہ کریں جس کے تحت ہم بنگال اور پنجاب میں جداگانہ انتخابات کے ذریعے اکثریت حاصل نہ کر سکیں یا ہمیں مرکزی مجلس میں ایک تہائی نشستیں حاصل نہ ہوں یہ مسلمانوں

کے سیاسی رہنما ایک تو اس دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں جو لکھنؤ کا مسترد میثاق ہے اور جس کی ترتیب ہندی قومیت کے بالکل غلط تصور پر کی گئی۔ اس طرح مسلمان اپنی سیاسی طاقت کے قیام کے ہر موقعہ سے محروم ہو کر رہ جاتے۔ دوسری دلدل پنجاب کی نام نہاد دیہی آبادی کے نام پر اتحادِ ملت اسلامیہ کی وہ بھینٹ ہے جس کے تحت پنجاب کا مسلمان محض ایک اقلیت بن کر رہ جاتا۔ مسلم لیگ کا فرض اولین ہے کہ وہ میثاقِ لکھنؤ اور موخرالذکر تجویز دونوں کی بھرپور مذمت کرے۔

سائمن رپورٹ میں بنگال اور پنجاب میں ہم مسلمانوں کے لئے کسی آئینی اکثریت کی سفارش نہیں کی گئی۔ دوسرے الفاظ میں مسلمان میثاقِ لکھنؤ کی پابندی کریں یا مخلوط انتخابات کا راستہ اختیار کرلیں۔ ہندوستان کی حکومت نے سائمن رپورٹ پر مبنی جو یادداشت بھیجی ہے اس میں وہ معترف ہے کہ مسلمان نے دونوں تجاویز کو مسترد کر دیا ہے۔ اس بات کو درست قرار دیا گیا ہے اور کہا ہے کہ بنگال اور پنجاب میں آبادی کے تناسب کے اعتبار سے مسلمانوں کو نمائندگی کا حق ملنا ضروری ہے۔ یہ کہہ کر کہ دوسرے صوبوں میں انہیں توازن حاصل رہے، اس خسارے کا ازالہ کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ مگر افسوس کہ اس کے باوجود یادداشت میں مسلمانوں سے انصاف روا نہیں رکھا گیا۔ پنجاب کے بارے میں جو سکیم ہے، ہندوستانی حکومت نے اسے نہایت متوازن سکیم قرار دیا ہے۔ یہ سکیم پنجاب کونسل کے سرکاری اراکین نے مرتب کی تھی۔ اس کے تحت پنجاب میں مسلمانوں کو مجلس میں ۴۹ فیصد نمائندگی ملتی ہے۔ اس طرح وہ ہندو اور سکھ اراکین سے صرف ۲ فیصد آگے رہتے ہیں۔ کیا پنجاب کے مسلمان کسی ایسی سکیم کو قبول کرلیں گے؟ ہرگز نہیں! انہیں پوری مجلس میں قطعی اکثریت کی ضرورت ہے۔ لارڈ اروِن اور ان کی حکومت اس بات پر متفق ہے کہ ہندوستان کی اقلیتیں اس وقت تک فرقہ وارانہ انتخابات کو قائم رکھنے کی مجاز ہوں گی جب تک رائے دہندگی میں اتنی وسعت نہ پیدا ہو جائے کہ ہر قوم کا تناسب آبادی اس کے نمائندوں کے ذریعے واضح صورت اختیار کرلے اور مسلمان اتفاق رائے سے علیحدہ نمائندگی کے حق سے دستبردار نہ ہو جائیں۔ لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ حکومتِ ہند اگر مسلمانوں کی شکایت کو بجا سمجھتی ہے تو اس میں بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کو آئینی اکثریت کی سفارش کرنے کی جرأت کیوں پیدا نہیں ہوئی۔

ہندوستان کے مسلمان ایسی تبدیلیوں سے بھی متفق نہ ہوں گے جن کے تحت سندھ الگ صوبہ نہ ہو اور شمال مغربی صوبہ سرحد کو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مساوی درجہ

دیا جائے۔ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک الگ اور نیا صوبہ قائم ہو سکتا ہے۔ بمبئی کے علاقے اور سندھ میں آخر کیا چیز مشترک ہے؟ کمیشن کے اراکین نے تسلیم کیا ہے کہ "سندھ کے لوگ عراقی اور عربی تمدن کے حامل ہیں۔ معروف جغرافیہ دان مسعودی نے کافی عرصہ قبل سندھ اور عرب کی اس مشابہت کا تذکرہ کیا تھا۔ مسعودی کے مطابق " سندھ ایسا ملک ہے جو اسلامی مملکت سے بے حد نزدیک ہے۔" اموی خلیفہ اول نے کہا تھا کہ "مصر کی پشت افریقہ کی طرف اور چہرہ عرب کی طرف ہے۔" معمولی ترمیم کے بعد ہم سندھ کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سندھ کی پشت ہندوستان کی طرف ہے اور چہرہ وسط ایشیا کی جانب! سندھ کے زرعی مسائل سے بمبئی کی حکومت کو بالکل دلچسپی نہیں ہے مگر سندھ کی تجارتی صلاحیتوں کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ ایک دن کراچی ہندوستان کا دوسرا دارالخلافہ بن سکتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ سندھ کی ترقی میں متعدد مالی مشکلات موجود ہیں۔ اگر اس بیان کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سندھ جہاں ہے اسے وہیں رہنے دیا جائے اور اس کی ترقی کو نظر انداز کر دیا جائے۔ کیا اس کی مدد کرنا ضروری نہیں؟ جہاں تک تعلق ہے صوبۂ سرحد کا تو کتنی افسوسناک بات ہے کہ کمیشن نے اس صوبے کی اصلاحات کا حق دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ جس کونسل کی تجویز پیش کی گئی ہے وہ صرف اور صرف چیف کمشنر کو ایک مطلق العنان شخص بنائے رکھنے کے لئے کافی ہے۔ افغانوں کا یہ حق کہ وہ سگریٹ جلائیں، صرف اس لئے ختم کر دیا گیا ہے کہ وہ بارود خانوں میں رہنے والے لوگ ہیں۔ کیا یہ دلیل مطمئن کر سکتی ہے؟ سیاسی اصلاحات روشنی دیتی ہیں آگ کے شعلے نہیں۔ افغان ایک نہایت شجاع اور ذہین قوم ہے۔ وہ سخت کوش ہے اور اپنے لئے ہر مصیبت برداشت کرتی ہے۔ وہ اپنی ترقی کے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو ریت کی دیوار کی طرح گرا دے گی۔ ہندوستان بلکہ انگلستان سے افغانوں کو مطمئن کرنا نہایت ضروری ہے۔ گزشتہ دنوں اس صوبے میں جو کچھ ہوا۔ وہ امتیازی رویئے اور اسی بدترین سلوک کے باعث ہوا۔ کیا برطانوی مدبر ہمیشہ خود کو اس دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں کہ صوبۂ سرحد میں جو کچھ ہوتا ہے، خارجی اثرات کے تحت ہوتا ہے؟

حکومت ہند کی یادداشت میں صوبۂ سرحد کے لئے جو اصلاحات بتائی گئی ہیں وہ بہت ہیں۔ وہ سائمن رپورٹ سے قدرے زیادہ ضرور ہیں کیونکہ ان میں ایک منتخب کونسل اور نیم منتخب نیم نامزد کابینہ کی تجاویز رکھی گئی ہیں مگر حکومتِ ہند اس صوبے کو دیگر صوبوں کا درجہ نہیں

دے سکی۔

اب میں گول میز کانفرنس سے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں ذاتی طور پر اس کانفرنس سے توقعات وابستہ نہیں کر سکتا۔ یہ ضرور سوچا جا سکتا تھا کہ فرقہ وارانہ گرماگرمی سے الگ تھلگ ہو کر عقل وخرد سے کام لیا جا سکے گا مگر حقائق اس کے برعکس ہیں۔ فرقہ وارانہ مسائل پر لندن میں جو بات چیت ہو چکی ہے اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تہذیبی و تمدنی اختلافات نمایاں ہو چکے ہیں۔ انگلستان کے وزیراعظم یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں کہ ہندوستان میں یہ مسئلہ بین الاقوامی نوعیت کا ہے، قومی نوعیت کا نہیں۔ انہوں نے پارلیمان کے سامنے جداگانہ انتخابات کی تجاویز پیش کرنے کو ایک مشکل بات کہا ہے کیونکہ فرنگی وزیراعظم کے خیال میں مخلوط انتخابات فرنگیوں کی جمہوریت پسندی سے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن اس بات کو یکسر نظرانداز کر دیا گیا کہ ہندوستان میں ایک نہیں متعدد اقوام آباد ہیں اور ان کو برطانوی قوم کی سطح پر لاکر سوچنا غلط ہوگا۔ یہ مسئلہ جغرافیائی اصولوں پر حل کرنا ضروری ہے۔ اقلیتوں کے لئے جو سب کمیٹی قائم کی گئی ہے میں اس سے بھی کوئی امید وابستہ نہیں کرتا۔ آخرکار یہ مسئلہ برطانیہ کی پارلیمان میں جائے گا۔ شاید انگریز اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں کوئی منصفانہ حل تلاش کر سکیں اور انہیں یہ احساس ہو جائے کہ اگر ہندوستان میں امن درکار ہے تو فرقہ وارانہ معاملات کا حل تلاش کرنا پڑے گا۔ اگر انہوں نے بھی یہ سوچا کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم یعنی ہندوستانی آباد ہیں یا ہندوستان میں بھی برطانوی جمہوریت پسندی کے جذبات کے اصولوں پر کچھ اصول اپنا لئے جائیں تو یہ ان کی غلطی ہوگی۔ اس طرح وہ صرف ہندوستان بھر میں خانہ جنگی کے لئے اصول نافذ کریں گے۔ میرے نزدیک واحد حل یہ ہے کہ ہندوستان کی ہر قوم ماضی سے تعلق ختم کئے بغیر نئے اصولوں کے تحت اپنی آزادی اور ترقی کی منازل کی طرف قدم بڑھائے۔

مجھے مسرت ہے کہ مسلمان مندوبین کو اس مسئلے کی اہمیت اور حل کا مکمل احساس ہے جسے ہم بین الاقوامی مسئلہ کہہ رہے ہیں۔ یہ مطالبہ درست ہے کہ مرکزی حکومت میں ذمہ داریوں کے تعین کے تصفیہ سے قبل فرقہ وارانہ معاملات کا تصفیہ ہونا ضروری ہے۔ ہندو فرقہ واریت کو پراپیگنڈے کے طور پر استعمال کر رہا ہے اور مسلمان سیاسی رہنما اس طرز کی پروا نہیں کرتے ہے۔ وہ اس لفظ سے انگلستان کے ان جذبات جمہوریت پسندی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے جس کا ذکر برطانوی وزیراعظم نے کیا ہے اور درحقیقت اس کا ہندوستان میں کوئی وجود نہیں ہے۔

رے مفادات اس وقت نہایت پُرخطر دور سے گزر رہے ہیں ہندوستانی مسلمانوں کی
مداد سات کروڑ ہے اور ہم دوسری اقوام کے مقابلے میں زیادہ یک رنگ قوم ہیں ہندوستان
ں اگر کوئی قوم فی الواقعہ قوم ہے تو وُہ مسلمان ہے۔ ہندو ہم سے دیگر معاملے میں لاکھ آگے ہو
ں اس میں مسلمانوں جیسی یک رنگی موجود نہیں ہے اور جب تک ان میں یہ یک رنگی نہیں
تی، ہندو خود ایک قوم نہیں بن سکتا۔ مسلمان کو تو یہ یک رنگی اس کے دینِ اسلام کی طرف سے
طا ہوئی ہے۔ ہندو چاہتے تو ہیں کہ ایک قوم کی صورت اختیار کرلیں مگر اس کا مطلب یہ ہے
روہ اپنا ماضی جھاڑ کر نئی ترتیب و ترکیب کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ ہندوؤں کو اس مقصد
ے لئے اپنا نظامِ معاشرت بھی بدلنا ہوگا۔ مسلمان رہنماؤں کو اس فرقہ وارانہ دلیل سے کوئی تاثر
ہیں لینا چاہئے۔ ترکی، ایران اور دیگر ممالک اسلامیہ قوم پسندی کے اصول ہی پر چل رہے
ں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت مختلف ہے، ایران، ترکی یا دیگر اسلامی ممالک
ں کل آبادی قریباً مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ وہاں اگر اقلیتیں ہیں تو اہل کتاب ہیں۔ اور
ل کتاب اور مسلمانوں میں معاشرتی فرق کا درجہ نہیں ہے۔ کوئی اہل کتاب یعنی عیسائی، یہودی
پارسی مسلمان کے کھانے کو ہاتھ لگا دے تو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔ اسلامی شریعت ان میں
ک دوسرے سے نکاح کو بھی جائز قرار دیتی ہے۔ یہ وہ پہلا قدم تھا جو اسلام کی طرف سے
تحاد نوعِ انسانی کے لئے اٹھایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں کا سیاسی نصب العین یکساں ہے
ہ باہم مل جائیں۔ یہ قرآنِ پاک کے ارشادات ہیں۔ مگر اقوام مغرب کی زیادتیوں اور مسلمانوں
اہلِ کتاب کے درمیان جنگ نے اتحاد کے یہ مواقع پیدا نہ ہونے دیے۔ تاہم اسلامی ملکوں میں
ج یہ مقصد اسلامی قوت کی صورت میں اُبھرا ہے۔

ہم اپنے مندوبین کی کامیابی کے بارے میں کوئی اندازہ گول میز کانفرنس کے دوران
ن کی طرف سے قرارداد دہلی کے مطالبات کو غیر مسلم مندوبین سے منظور کرا لینے کے پیمانے سے
ر سکتے ہیں۔ اگر قرارداد دہلی کے مطالبات نامنظور کر دیے گئے تو ہندوستان کے مسلمانوں کو
تحد ہوکر آزاد سیاسی اقدام کرنا ہوگا۔ اگر آپ اپنے مطالبات پر قائم ہیں تو اس اقدام
کے لئے تیار رہنے۔ یہ ہمارے ہمراہ لوگوں کے غور و فکر ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم نے ان لوگوں کو پہچان
لیا جو مل کر مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ اپنی مرضی سے کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ فیصلہ ہندوستان میں
ور ہندوستان سے باہر بھی ہم پر اثر انداز ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ اس غور و فکر نے ہم میں اتنی

قابلیت پیدا کر دی ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو ہم متذکرہ اقدام کے لئے خود کو تیار پائیں۔ میں بغیر لاڈلیبیٹ کے یہ کہوں گا کہ ہم سرما کم ہیلی اور لارڈ ارون کی تشخیص پر پورے اترے ہیں۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں کہا تھا کہ ملتِ اسلامیہ کوئی رہنما پیدا نہیں کر سکی۔ " رہنماؤں " سے میری مراد وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ خدا کی مدد ہوتی ہے۔ یا وہ اپنے وسیع تجربے کی بنا پر ادراک کے مالک ہوں اور جانتے ہوں کہ تعلیمات اسلامی کی روح کیا، ان کی تقدیر کیا ہے۔ ساتھ ہی ان میں بدلتے ہوئے حالات کی رفتار کا صحیح اندازہ ہو۔ ایسے ہی رہنماؤں میں کسی قوم کے عمل کا انحصار ہوتا ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہم میں اطاعت کا جذبہ نا پید ہے، اسی لئے آج افراد منتشر ہیں۔ یا مختلف جماعتوں میں منقسم ہیں۔ اس سے ہمارے عام افکار اور سرگرمیوں پر تو کوئی اثرات مرتب نہیں ہوتے کیونکہ ہم نے جو طرزِ عمل مذہب میں اختیار کیا ہے وہی سیاست میں ہو گیا ہے۔ مگر مذہبی فرقہ بندی سے اس لئے نقصان نہیں پہنچتا کہ ان سے کم از کم ذہنی تربیت کے اصول پر انحصار سے دلچسپی قائم رہتی ہے۔ نیز اس اصول کے تحت کوئی قوم اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں ہو سکتی۔ مگر سیاسی زندگی میں اختلافات کو روا نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ ملی مفاد کے پیشِ نظر عمل میں اتحاد ضروری ہے۔ اور اگر عمل کا اتحاد نہ ہو تو اثرات مہلک ہوتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کا علاج ہمارے پاس کیا ہے؟ جہاں تک حقیقی معنوں میں ایک " رہنما " کا سوال ہے تو وہ ہمارے بس سے باہر ہے۔ رہی دوسری بات تو ہمارے پاس اس کا تدارک ہے۔ میں نے اس ضمن میں مخصوص رائے قائم کر رکھی ہے مگر اس کا اظہار اسی وقت ممکن ہو گا جب حالات پُر خطر ہو جائیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہو گیا تو پھر اتحادِ عمل ناگزیر ہو جائے گا۔ پھر محض قراردادوں سے بات نہ بنے گی بلکہ عمل کی راہ کا تعین کرنا پڑے گا۔

ہندوستان کے مسلمان اس وقت نہایت نازک موڑ پر کھڑے ہیں۔ اتحادِ عمل، اتحادِ قول اور اتحادِ عزم کی شدید ضرورت ہے۔ اگر ہمیں ہندوستان کے مفاد اور اپنے ملی وجود کی خواہش ہے تو یہ اتحاد ضروری ہوگا۔ ہندوستان سیاسی اعتبار سے غلام ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو پورے ایشیا کے لئے مشکلات و مصائب کا ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائیگا اس سیاسی غلامی نے ہمیں ایک ارفع تمدن کی مسرتوں سے محروم کر دیا ہے۔ ہندوستان کی طرف سے ہم پر کچھ فرض عائد ہوتا ہے۔ ہندوستان ہمارا وطن ہے ہماری حیات و موت یہیں ہے۔ دوسرا فرض ہم پر ایشیا اور اسلامی ایشیا کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔ ایشیا کے

کسی اسلامی ملک میں ۸ کروڑ مسلمان موجود نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے ایک جگہ سات کروڑ مسلمانوں کی موجودگی دنیائے اسلام کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اسی اعتبار سے ہمیں آج کے ہندوستان کے مسائل پر اسلامی اور ہندوستانی مسلمانوں، دونوں کے نقطۂ نظر سے غور کرنا ہوگا۔ ہندوستان اور ایشیا کی طرف سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے ہم اس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جب تک ہم ایک مقصد، ایک منزل کا تعین نہیں کرتے۔ اگر ہمیں دیگر اقوام میں ہندوستان کا وجود قائم رکھنا ہے تو اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم متحد ہو جائیں۔ اسی عدم اتحاد کی بنا پر مسائل سلجھنے کی جگہ الجھتے چلے جا رہے ہیں۔ میں پوری شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ آزادانہ جدوجہد کا وقت سر پر ہے اور اس کے لئے پوری قوم کا اتحاد لازم ہے۔ ہمیں لوگوں میں یہ جذبہ پیدا کرنا ہوگا — وہ اتحاد و عزم پیدا کرنا ہوگا — جس کی نشو ونما خود ہوتی ہے۔ ہم فرقہ بندیوں کی قید سے آزاد ہو کر یقیناً ایسا کر سکتے ہیں۔ مادی اغراض کے ساتھ روح سے قریب تر ہونا ہوگا۔ روح ایک روشنی ہے، ایک زندگی ہے، ایک وحدت ہے۔ یہ وہ سبق ہے جو مجھے "تاریخ اسلام نے سکھایا ہے اور ہر آڑے وقت میں اسلام نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا ہے — مسلمان — اسلام کی حفاظت نہیں کرتا بلکہ جب بھی مسلمان اپنے آپ کو اسلام پر مرکوز کر دیتا ہے تو اس کی تمام گم شدہ قوت از سرِ نو مجتمع ہو جاتی ہے۔ پھر یہ وجود بربادیوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں آتا ہے" ہمارے نزدیک موت و حیاتِ ملت کا مسئلہ ایک فرد کے مسئلہ کی طرح ہے"۔ کیا ہمارے لیے یہ دعویٰ ممکن نہیں ہے کہ ہم مسلمان ہی اس اعلیٰ و ارفع تصورِ انسانیت پر عمل پیرا ہوئے۔ ہمارے لئے ایک اجتماع انا پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس وقت ہم سب پر سب کچھ روشن اور عیاں ہو جائے گا۔"

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ○

ردِ عمل

علامہ اقبالؒ نے جو تجاویز مسلمانوں کے سامنے رکھی تھیں ان کا فوری طور پر ردِ عمل نہ ہو سکا یہ تجاویز مسلمانوں کی فوری توجہ کی مستحق تھیں مگر ایسا نہ کیا گیا۔ جہاں تک تو مسلمانوں کے لئے علیحدہ قومیت کی نظریاتی تشریح کا سوال تھا تو وہ فوری طور پر مسلمانوں کے ذہن نشین ہو گئی کیونکہ یہ نظریہ پہلے سے دیگر مسلمان رہنماؤں کی وساطت سے مسلمانوں تک پہنچ چکا تھا لیکن جس حد تک

صوبوں کی نئی حد بندی کے بارے میں ان کی تجاویز کا تعلق تھا تو فوری طور پر وہ توجہ کا مرکز نہ ہو سکیں نہ ہی فوری طور پر انہیں تائید حاصل ہو سکی۔ شاید وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک مسلمانوں کے ذہن میں ایک وفاق کا تصور تھا حالانکہ علامہ اقبال کی تجویز میں بھی اس وفاق کا تصور موجود تھا لیکن مسلمانوں کے لئے پنجاب کی تقسیم ایک عجیب سی بات تھی۔ اسی طرح مسلمان اپنے اکثریتی صوبوں کے ادغام کے خلاف تھے۔

صوبہ سرحد ــــــ ۱۹۲۰ء میں

ایک طرف تو مسلمان رہنما صوبہ سرحد میں اصلاحات اور اس صوبے کو دوسرے صوبوں کی سطح پر لانے کی کوششوں میں مصروف تھے تو دوسری طرف ۱۹۲۰ء میں صوبہ سرحد کے اندر حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ یہ مسلمان صوبہ کانگرسی سیاست کے جال میں پھنس گیا۔

انگریز حکومت کے زیر اثر آنے کے بعد بھی صوبہ سرحد، پنجاب کا ایک حصہ تھا۔ ۱۹۰۰ء میں اس صوبے کو پنجاب سے علیحدہ کر کے صوبہ شمال مغربی سرحد کا نام دے دیا گیا۔ کیونکہ اس صوبے کی انتہائی زیادہ اہمیت تھی۔ قبائلی انگریزوں کے خلاف مسلسل نبرد آزما تھے۔ نیز اس کی سرحد افغانستان سے ملتی تھی۔ لہذا انگریز ان تمام وجوہات کی بنا پر اس صوبے کو زیادہ سے زیادہ فوجی اثر و رسوخ میں رکھنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے صوبوں میں تو اصلاحات کا نفاذ ہوتا رہا لیکن صوبہ سرحد مسلسل مطالبات کے باوجود اصلاحات سے الگ تھلگ رکھا گیا۔ جس وقت دوسرے صوبوں میں نظم و نسق کا بیشتر نظام، منتخب وزراء کے ذریعے کونسلوں کے ماتحت کر دیا گیا تو سرحد میں منتخب میونسپل کمیٹی تک موجود نہ تھی۔ جہاں تک قبائلی علاقوں کا تعلق تھا تو وہاں پولیٹیکل ایجنٹ اس غرض سے موجود تھے کہ قبائلی سرداروں کو ہاتھ میں رکھیں تاکہ قبائلی عوام ان کے ہاتھ میں رہیں۔ دوسرا علاقہ وہ تھا جو چیف کمشنر کے ماتحت اضلاع پر مشتمل تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ بھی اسی چیف کمشنر کے ماتحت ہوتے تھے غرضیکہ ایسے ہی حالات تھے جن کی بنا پر سرحد ہمیشہ پسماندہ رہا اور یہاں کے عوام اپنے جائز حقوق سے زندگی کے ہر شعبہ میں محروم رہے۔

خدائی خدمت گار اور فسادات

صوبہ سرحد کے ایک شخص سید قاسم نے ستمبر ۱۹۲۹ء میں "افغان جرگہ" قائم کیا جس کا

مقصد کسانوں کی مدد، اُن کی اخلاقی اصلاح اور اقتصادی ترقی کی طرف توجہ دینا تھا۔ یہ ایک
یہ سیاسی تنظیم تھی جس نے مختلف دیہاتوں میں اپنے رضاکار مقرر کئے اور انہیں خُدائی خدمتگار کا
نام دیا۔ رضاکاروں کی سرخ قمیصوں کی وجہ سے انہیں سُرخ پوش بھی کہا جانے لگا۔ اس تنظیم کو
مختصر ترین عرصہ میں خاصی مقبولیت حُوئی۔ جب دسمبر ۱۹۲۹ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور
میں ہوا تو اس تنظیم کے کچھ اراکین بھی اجلاس میں شامل ہُوئے۔ اُن کی حیثیت صرف ایک عام
شخص کی طرح تھی۔ ان میں خان عبدالغفار خاں (باچا خاں)، جنہیں بعد میں سرحدی گاندھی بھی
کہا جانے لگا، شامل تھے۔ صوبہ سرحد میں واپس پہنچتے ہی ان لوگوں نے شراب کی دُکانوں کو
تباہ کرنا شروع کر دیا۔ حکومت اس تنظیم کو سیاسی تنظیم سمجھ رہی تھی لہٰذا اس نے موقع پاتے
ہی اس کے گیارہ افراد کو، جن میں عبدالغفار خاں بھی شامل تھے، گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں کی
گرفتاری پر لوگوں نے شدید احتجاج کیا اور تھانے کے باہر سینکڑوں اشخاص جمع ہو گئے۔ حکومت
نے ان کی طرف سے تشدد کے مظاہرے کے بغیر فوج طلب کر لی۔ فوجی گاڑیوں کو ہجوم کے اوپر
سے گزرنے کا حکم دے دیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بارہ افراد گاڑیوں تلے کُچلے گئے۔ باقی لوگ مزید مشتعل
ہو گئے۔ انہوں نے فوجی گاڑیوں پر حملہ بول دیا۔ جواب میں فوج نے فائر کھول دیئے۔ کئی گھنٹے
تک یہی حالت رہی۔ آخر ہجوم نے فوجی گاڑیوں کو نذرِ آتش کر دیا۔ خیال ہے کہ اس تمام کار۔۔وائی
میں کوئی دو سو پٹھان ہلاک ہوئے۔ فائرنگ کے بعد بھی ہجوم منتشر نہ ہوا۔ انگریزوں نے
دو فوجی پلٹنیں طلب کر لیں اور انہیں ہجوم پر گولی چلانے کا حکم دے دیا لیکن فوجیوں نے
صاف انکار کر دیا۔ انگریز اس بات کی توقع بھی نہ کرتے تھے۔ آخر فوج بارکوں میں واپس
بھیج دی گئی اور کئی دن تک پشاور شہر ہنگاموں کا مرکز بنا رہا۔ ۱۵ دن بعد شہر میں انگریز فوج
داخل ہو گئی، خان عبدالغفار خاں اور کچھ دوسرے لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا اور مختصر سماعت کے
بعد انہیں قید کی سزائیں دی گئیں۔ صوبہ سرحد کے واقعات سے بہت سے دوسرے صوبوں میں
بھی گڑبڑ ہُوئی۔ قبائلیوں نے بار بار سرکاری چوکیوں پر مسلح حملے کئے جن کے جواب میں فوج نے
ان پر بمباری کی۔

مارشل لاء کا نفاذ

اگست ۱۹۳۰ء میں پشاور کو مارشل لاء کے جہنم میں دھکیل دیا گیا۔ یہ مارشل لاء

۲۰۔ جنوری تک قائم رہا۔ نتیجتاً صوبہ سرحد کے لئے اصلاحات کا مطالبہ تو دھرا کا دھرا رہ گیا اور وہاں کانگریس کی طرف سے سول نافرمانی کا آغاز کر دیا گیا۔ اسی موقع پر ۱۹۳۰ء میں گاندھی اور عبدالغفار خاں کے درمیان پہلی بار ملاقات ہوئی۔ عبدالغفار خاں نے یہی مناسب سمجھا کہ اگر پٹھانوں کو انگریز کے ظلم و ستم سے نجات دلانا مقصود ہے تو کانگریس کی جدوجہد آزادی میں شمولیت ضروری ہوگی۔ کانگریس بھی ایسے موقعے کی تاک میں تھی۔ اس نے افغان جرگہ کی ہر ممکن مدد کی اور اُسے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ۱۹۳۱ء سے خان عبدالغفار خاں نے سرحدی علاقوں اور مواضعات کا دورہ کر کے تنظیم کو مضبوط کر دیا۔ اس طرح سرحد کے ۹۵ فیصد مسلمان کانگریس کی گود میں چلے گئے۔

باب ۲۱

کمیونل ایوارڈ، دوسری گول میز کانفرنس

صرف ہندوؤں کے باپو

۱۹ راگست ۱۹۳۱ء کو گاندھی لندن روانہ ہوگئے تاکہ ستمبر ۱۹۳۱ء میں شروع ہونے والی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرسکیں۔ پہلے وہ شملہ پہنچے پھر ایک خاص گاڑی کے ذریعے بمبئی، تاکہ وہاں سے بحری جہاز سے لندن پہنچ سکیں۔

اپریل ۱۹۳۱ء میں لارڈ اِروَن کے عہدہ کی میعاد ختم ہوچکی تھی اور اُن کی جگہ لارڈ وِلنگڈن آچکے تھے۔ نئے وائسرائے نے اس بات کی پُوری کوشش کی کہ دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس بھی شریک ہو۔ مگر گاندھی کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ ہندو مسلم اتحاد کا تھا ——

لندن پہنچنے کے بعد گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو کے ساتھ اُس ہوٹل میں پہنچے جہاں آغا خاں مقیم تھے۔ ان کے درمیان جو گفتگو ہُوئی وہ نہ صرف خاصی دلچسپ تھی بلکہ اس نے گاندھی کے اُس نعرے کی قلعی بھی کھول دی کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی دو آنکھوں کی طرح سمجھتے ہیں اس بات چیت کا ذکر خود آغا خاں نے اپنی سرگزشت میں یُوں کیا ہے:

آغا خاں: گاندھی جی! اگر آپ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی حقیقی اولاد کی طرح سمجھ لیں اور اُن سے باپ کی طرح مشفقانہ سلوک کریں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان بھی آپ کی جدوجہدِ آزادی میں آپ سے اپنے تمام تر وسائل

اور صلاحیت کے ساتھ تعاون کریں گے۔

گاندھی: میں فی الحال دل کی گہرائی کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے میرے پاس باپ ایسی محبت اور شفقت موجود ہے۔ ہاں اگر آپ سیاسی تقاضوں اور ضرورتوں کی بنیاد پر کچھ کہیں تو میں انتہائی تعاون کے جذبے سے بات چیت کرونگا کیونکہ میں کسی قسم کے جذبے میں ملوث نہیں ہونا چاہتا۔

آغا خاں نے لکھا:

"حقیقت یہ ہے کہ اگر اس وقت گاندھی فراخدلی سے کام لیتے تو یقینی طور پر مسلمان اپنی تمام تر حمایت ان کے لئے وقف کر دیتے اور گاندھی کی طرف سے پدرانہ شفقت کے مظاہرے کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ دلی طور پر مسلمانوں کے تمام جائز اور مناسب حقوق کو تسلیم کرتے ہیں۔ افسوس کہ ایسا نہ ہوا۔ گاندھی نے بات چیت کے آغاز ہی میں جس کورے پن کا مظاہرہ کیا اس کی تلخی تمام بات چیت کے دوران شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی رہی۔ میں نے جتنے کھرے اور سچے جذبات کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر گاندھی بھی ایسا ہی کرتے تو ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہو سکتا تھا"

بات چیت کئی نشستوں میں ہوئی لیکن گاندھی کے رویّہ کی بنا پر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ گاندھی نے مختلف فرقوں کے درمیان لسانی، معاشرتی اور ثقافتی فرق کو محسوس کرنے سے واضح طور پر انکار کر دیا اور یہی کہتے رہے کہ ہندوستان میں رہنے والے سب لوگ صرف ایک قوم ہیں لہذا آئندہ تمام بات چیت اور فیصلے اسی تصوّر کے تحت ہونا ضروری ہیں۔

مشروط بات چیت پر اصرار

اس دوران مسلمان رہنماؤں کی طرف سے ہندو مسلم اتحاد کے لئے جتنی بھی تجاویز پیش کی گئیں، گاندھی نے ان پر بات چیت کی جگہ پیشگی شرائط عائد کر دیں۔ پہلی شرط تو یہ تھی کہ مسلمان کسی معاملہ پر ضمانت حاصل کرنے سے پہلے "سوراج" کے اس مفہوم کو بلاکم و کاست قبول کر لیں جو مفہوم کانگریس کے نزدیک ہے گاندھی کی اس شرط کا جواب محمد علی جناح نے بڑے موثر اور مدلل انداز میں یہ دیا:

"اگر یہ شرط گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے والے دوسرے ہندو

ہندو بھی پر ساد نہیں کی جا رہی تو مسلمانوں ہی پر اس شرط کے تحت بات کرنے پر اصرار کیوں ؟"

گاندھی اس شرط پر صرف اس لئے مصر تھے کہ کانگریس کے نزدیک "سوراج" کے تصور کی بنیاد قطعی طور پر ایک قومی نظریہ پر تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان سب سے پہلے تو اپنی جداگانہ قومیت اور پھر سیاسی حیثیت سے دست بردار ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان یہ شرط کسی قیمت پر بھی تسلیم نہیں کر سکتے تھے۔

گاندھی کی دوسری شرط یہ تھی کہ مسلمان ہندو بین پسماندہ طبقوں اور اچھوتوں کے حقوق اور مطالبات کی نمائندگی نہیں کریں گے اور ان کے لئے علیحدہ نمائندگی کی بات تو بالخصوص زبان پر بھی نہ لائیں گے۔ اچھوتوں کی بستیوں میں رہنے والے اور قدم قدم پر ان کی نمائندگی اور انسانی حیثیت کا مظاہرہ کرنے والے "مہاتما" کا یہ نعرہ ہی یہ مطالبہ اس کے باطن کا ایک شفاف عکس پیش کر رہا تھا۔ گاندھی کے اس مطالبے کا جواب مسلمان رہنماؤں کی طرف سے یہ دیا گیا کہ پس ماندہ طبقوں اور اچھوتوں کے مطالبات کی مخالفت مسلمان نہیں کر سکتے اور اگر گاندھی براہِ راست اچھوتوں کے ساتھ معاملہ طے کر لیں تو مسلمان ان کی راہ میں کوئی روڑہ بھی نہیں اٹکائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود گاندھی وعدہ لینے پر اصرار کرتے رہے۔

گاندھی نے پھر پرانا کھیل کھیلا اور کانگریس کو درمیان میں گھسیٹ لائے۔ انہوں نے کہا کہ جہاں تک مسلمانوں کے مطالبات کا تعلق ہے تو وہ ذاتی طور پر ان کے بارے میں غور کرنے پر تیار ہیں لیکن وہ اس کی کوئی ضمانت اس لئے نہیں دے سکتے کہ کون جانے کانگریس انہیں قبول کرے یا رد کرے۔ جب علامہ اقبالؒ نے یہ مشورہ دیا کہ وہ تار کے ذریعے کانگریس کی منظوری حاصل کر لیں، تو گاندھی نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی :

"مجھے معلوم ہے کہ اس معاملے میں کانگریس مجھے پورے اختیارات نہیں دے گی"

گاندھی کو اقلیتی کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا لیکن اپنی اسی قیل و قال کی پالیسی کے باعث وہ کمیٹی میں کوئی مسئلہ حل نہ کرا سکے۔ کمیٹی کے آخری اجلاس میں انہوں نے وزیر اعظم برطانیہ کی موجودگی میں یہ کہا :

"مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ اقلیتی کمیٹی کے اجلاس کے انعقاد کا یہ مناسب

موقع نہ تھا ۔ کیونکہ فرقہ وارانہ مسائل 'سوراج آئین' میں سرِ فہرست تو ہو سکتے ہیں لیکن انہیں 'سوراج آئین' کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ فرقہ وارانہ اختلافات میں جو اضافہ ہوا وہ بلاشبہ غیر ملکی حکومت کی وجہ سے ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ اختلاف آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی اس کی حدت سے پگھل جائے گا۔"

اس کے بعد وزیر اعظم برطانیہ کانگریس کے حامی ہونے کے باوجود یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

"مسٹر گاندھی! دیانت داری سے کام لیجئے اور حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت پیدا کیجئے۔ فرقہ وارانہ مسئلہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ بتایئے کہ آیا ہندوستان میں فرقہ واریت ہے یا نہیں؟ اس کا جواب میں نہیں دوں گا بلکہ آپ کی دیانتداری پر چھوڑتا ہوں۔ اپنے ہی دل سے پوچھئے اور اگر آپ کا دل تسلیم کرتا ہے کہ فرقہ واریت موجود ہے تو پھر یہ فیصلہ کیجئے کہ اسے ہندوستان میں یا یہاں کیونکر حل کیا جا سکتا ہے؟ جب تک مختلف فرقوں کی نمائندگی، مختلف فرقوں کے حقوق اور مختلف فرقوں کے تحفظ کے مسائل حل نہیں ہو جاتے ہندوستان کا آئین کیسے مرتب ہو گا؟"

گاندھی کے اسی رویّہ کے بارے میں معروف ہندو رہنما کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب میں لکھا:

"لندن کی گول میز کانفرنس میں پسماندہ طبقوں اور فرقہ وارانہ مسائل کا حل آسانی سے تلاش کیا جا سکتا تھا۔ لیکن مشکل تو یہ تھی کہ گاندھی جی پر برلا، پنڈت مالویہ اور جیکر جیسے متعصب ہندوؤں کا بہت اثر تھا۔"

آخر سر محمد شفیع نے دیگر اقلیتی نمائندوں کے ساتھ گفت وشنید کر کے ۱۲ نومبر ۱۹۳۱ء کو وزیر اعظم برطانیہ ریمزے میکڈانلڈ کے سامنے ایک سمجھوتہ پیش کر دیا۔ اس سمجھوتے میں صرف سندھ شامل نہ تھے۔ ہندوؤں کے ساتھ جو اختلاف موجود تھا، گاندھی کی ضد کی بنا پر جوں کا توں رہا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۳۱ء کو گاندھی نے اقلیتی سب کمیٹی کے اجلاس میں یہ اعلان کیا کہ انہوں نے سمجھوتے کے لئے خلوص کے ساتھ جو کوشش کی وہ ناکام ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

غیر ملکی حکومت ہندو اور مسلمان کے درمیان پھوٹ ڈلوا رہی ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ملک آزاد ہو جائے تو ہندو اور مسلمان اور دیگر تمام اقلیتیں پھر سے شیر و شکر ہو جائیں گی۔ گاندھی کا مطلب صرف یہ تھا کہ ملک کانگریس کے حوالے کر دیا جائے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔

اسی تقریر میں گاندھی نے یہ بھی کہا کہ برطانوی حکومت کی طرف سے جن مسلمانوں کو یہاں نمائندگی کے لئے بلایا گیا ہے وہ مسلمانوں کے صحیح نمائندہ ہی نہیں۔ شاید گاندھی کے خیال میں پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے سچے نمائندے، گاندھی کے خاص چیلے ڈاکٹر انصاری تھے جنہیں اس کانفرنس میں لانے کے لئے گاندھی نے سر توڑ مگر ناکام کوشش کی تھی۔ سر محمد شفیع نے آخر میں مسلمان مندوبین کے اس موقف کو دہرایا کہ:

"پنجاب میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ حلقہ ہائے انتخابات کے ذریعے کل نشستوں کا ۴۹ فیصد مسلمانوں کو دیا جائے لیکن مخلوط حلقوں سے بھی خاص مفادات کی نمائندگی کی خاطر مسلمانوں کے لئے گنجائش پیدا کی جائے تاکہ مسلمانوں کو ایوان میں مجموعی طور پر ۵۱ فیصد نمائندگی حاصل ہو جائے۔ بنگال میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخابات کے ذریعے کل نشستوں کا ۴۸ فیصد مسلمانوں کو دیا جائے نیز خاص مفادات کے تحت مخلوط حلقہ ہائے انتخابات کے ذریعہ انہیں اکثریت حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ مسلم اقلیتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کو جداگانہ انتخابات کے ذریعے ہی نمائندگی کا تناسب معاہدہ لکھنؤ کے تحت دیا جائے۔"

سول نافرمانی

گاندھی کے قیام لندن کے دوران صوبہ سرحد اور صوبہ متحدہ (یوپی) میں حالات خانہ جنگی تک پہنچ چکے تھے۔ جواہر لال نہرو نے یوپی میں کسانوں کو اس بات پر اکسایا کہ وہ حکومت کو مالیہ کی ادائیگی نہ کریں کیونکہ حکومت نے مالیہ کے سلسلہ میں جو رعایات دی تھیں وہ بہت کم تھیں۔ بنگال میں بھی حالات کافی خراب ہو چکے تھے۔ گاندھی ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کو ہندوستان واپس پہنچے تو انہوں نے حالات دیکھتے ہوئے لارڈ ولنگڈن کے نام ایک تار روانہ کیا اور ملاقات کی

اجازت طلب کی۔ انہوں نے تار میں لکھا:

"صوبہ سرحد اور یو۔پی کے نئے آرڈی ننس، صوبہ سرحد میں فائرنگ اور دونوں صوبوں میں میرے دوستوں کی گرفتاریاں سب کچھ اچانک اور غیر متوقع انداز میں ہوا۔ میں ان حالات کے لئے خود کو تیار نہ پاتا تھا۔ فی الحال میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان حالات کو حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے خاتمہ کی علامت قرار دوں یا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ سے مل کر یہ رہنمائی حاصل کروں کہ مجھے عمل کے لئے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ اور کانگریس کو کیا مشورہ دینا چاہئے۔"

گاندھی پُرامید تھے کہ وائسرائے کی طرف سے تسلی بخش جواب آئے گا اور بات چیت کا موقع ملے گا۔ شاید گاندھی نے لارڈ ولنگڈن کو بھی لارڈ اِرون سمجھا تھا لیکن ان دونوں کی طبیعت میں نمایاں فرق تھا۔ لارڈ اِرون جتنے نرم دل اور صلح جُو تھے۔ لارڈ ولنگڈن اتنے ہی سخت گیر اور طاقت پر یقین رکھنے والے شخص تھے۔ گاندھی کو بہت مایوسی ہوئی کیونکہ وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے جو جواب آیا، وہ بہت خشک تھا۔

"حضور وائسرائے کا ارشاد ہے کہ وہ تمام سیاسی جماعتوں کے ساتھ اپنی حکومت کے دوستانہ تعلقات کے خواہشمند ہیں لیکن جہاں تک صوبۂ سرحد اور یو۔پی میں کانگریس کی سرگرمیوں کا تعلق ہے تو یہ سرگرمیاں ایسے دوستانہ تعلقات کی سراسر نفی کرتی ہیں نیز ہندوستان کے مفادات کے خلاف بھی ہیں۔"

یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو گاندھی نے وائسرائے کے نام ایک اور تار روانہ کیا جس میں دوبارہ ملاقات کی خواہش کا اظہار اور کانگریس کی سرگرمیوں کو درست قرار دینے کی کوشش کی گئی تھی، نیز حکومت پر بھی کچھ الزامات عائد کئے گئے تھے۔ اس تار کا جواب بھی نہایت مایوس کُن تھا — وائسرائے نے نہ صرف ملاقات سے انکار کر دیا بلکہ یہ بات بھی واضح کر دی کہ اگر کانگریس کی سرگرمیاں ختم نہ کی گئیں تو نتائج کی تمام تر ذمہ داری کانگریس اور گاندھی پر عائد ہو گی۔ نیز ایسی سرگرمیوں سے نمٹنے کے لئے حکومت اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لائے گی۔

کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک کو دوبارہ پُوری تن دہی کے ساتھ شروع کر دیا لیکن حکومت نے ان سرگرمیوں کو زیادہ تُندی کے ساتھ دبا دیا۔ گاندھی سمیت تمام کانگریسی رہنماؤں کو

جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ اس دوران کانگریس نے مسلمانوں کے ساتھ قطعی علیحدگی کا رویّہ اختیار کئے رکھا اور ان کے مطالبات پر بھی کوئی توجہ نہ دی۔ کانگریس خود کو ہندوستان بھر کے عوام کی واحد نمائندہ اور آزادی کی علمبردار سمجھتی رہی مگر اس نے مسلمانوں یا دیگر اقلیتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی اب گاندھی کا وہ نعرہ بھی ختم ہو گیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر سب سے پہلے "سوراج" کا حصول ضروری ہے۔

کمیونل ایوارڈ

۴۔ اگست ۱۹۳۲ء کو وزیر اعظم برطانیہ ریمزے میکڈانلڈ کی طرف سے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو سکون نصیب ہوا، اس اعلان میں فی الحال صوبائی نشستیں شامل تھیں اور مرکزی اسمبلی کی نشستوں کے بارے میں فیصلہ باقی تھا۔ ۲۰ اگست کو مسلم کانفرنس کا اجلاس دلّی میں ہوا جس میں وزیر اعظم کے فیصلوں پر گو عدم اطمینان کا اظہار کیا گیا تاہم اسے قبول کر لیا گیا اور اس بات پر اصرار کیا گیا کہ فیصلہ طلب امور پر بھی جلد از جلد غور کیا جائے۔ نیز اس توقع کا اظہار کیا گیا کہ باقی ماندہ امور کا فیصلہ مسلمانوں کے جائز مطالبات کے مطابق ہوگا۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو کمیونل ایوارڈ کے باقی حصّہ کے بارے میں بھی اعلان کر دیا گیا۔ صوبائی نشستوں کے لئے مسلمانوں، سکھوں اور ہندوستانی عیسائیوں کو جداگانہ انتخابات کا حق دیا گیا۔ مختلف صوبائی اسمبلیوں میں مسلمانوں کے لئے نمائندگی کا تناسب یہ تھا:

بمبئی ــــــ ۳۰ ، مدراس ــــــ ۲۹ ، بنگال ــــــ ۱۱۹ ،
یو۔ پی ــــــ ۶۶ ، پنجاب ــــــ ۸۶ ، بہار اور اڑیسہ ــــــ ۴۲ ،
سی۔ پی ــــــ ۱۴ ، آسام ــــــ ۳۴ ، صوبہ سرحد ــــــ ۳۶ ،
اور سندھ ــــــ ۳۴ ۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بمبئی میں نشستوں کی مجموعی تعداد ۱۷۵ ، بنگال میں ۲۵۰ ، یو۔پی میں ۲۲۸ ، پنجاب ۱۷۵ ، بہار اور اڑیسہ میں ۱۷۵ ، سی۔پی میں ۱۱۲، آسام میں ۱۰۸ ، صوبہ سرحد میں ۵۰ اور سندھ میں ۶۰ تھی۔

اس اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ سراسر ناانصافی کی گئی تھی۔ مسلمانوں کو مسلم اقلیتی صوبوں میں توازن (WEIGHTAGE) کا حق دیا گیا تھا۔ لیکن بنگال اور پنجاب کے دو بڑے

صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی میں تخفیف کر دی گئی تھی۔ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی ۵۵ فیصد تھی اور پنجاب میں ۵۷ فیصد! لیکن ان کے لئے مندرجہ بالا ایوارڈ کے تحت اسمبلیوں میں علی الترتیب ۴۹، ۴۷ اور ۴۹ فیصد نشستیں رکھی گئی تھیں۔ پنجاب کے زمینداروں کو وہ نشستیں دی گئی تھیں کیونکہ پنجاب کے زمینداروں کی اکثریت مسلمان تھی۔ لہٰذا ان کے لئے صوبائی اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لینا معمولی بات تھی۔ دوسرے دو مسلمان اکثریتی صوبوں میں غیر مسلم اقلیتوں کو زیادہ توازن دیا گیا۔ مثلاً سندھ کی ۲۰ فیصد غیر مسلم آبادی کو ۴۲ فیصد اور صوبہ سرحد کی غیر مسلم آبادی کو ۲۰ فیصد نمائندگی دی گئی۔

گاندھی جیل میں تھے لیکن مسلمانوں اور اچھوتوں کے حقوق غصب کرنے کا خیال وہاں بھی ان کے ذہن سے خارج نہ ہو سکا۔ انہوں نے اچھوتوں کو علیحدہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ نمائندگی دینے پر شدید احتجاج کیا اور ساتھ ہی اپنے روایتی ہتھیار "مرن برت" کا استعمال شروع کر دیا گیا۔ کچھ ہندوؤں نے گاندھی اور اچھوت رہنما ڈاکٹر امبیدکر میں مصالحت کی کوشش کی۔ آخر دونوں ایک فارمولے پر رضامند ہو گئے۔ اچھوتوں کے لئے کچھ مزید نشستیں مخصوص کر دی گئیں، لیکن ان کے انتخابی حلقوں کو ہندوؤں کے انتخابی حلقوں کے ساتھ منسلک کر کے مخلوط صورت دے دی گئی۔ حکومت نے بھی اس فارمولے کو تسلیم کر لیا اور اس طرح گاندھی کا مرن برت بھی ختم ہو گیا۔

کانگرس کو اپنی اس تحریک سول نافرمانی میں، جس نے بہت سے کانگرسی رہنماؤں اور گاندھی کو جیل بھیجا تھا، بری طرح ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۹۲۱ء میں گاندھی نے پہلی نافرمانی اس وقت اچانک ختم کر دی جب وہ اپنے عروج پر تھی۔ دوسری سول نافرمانی گاندھی اور وائسرائے ہند لارڈ اروِن کے سمجھوتہ کے تحت ختم ہوئی۔ مگر تیسری تحریک نافرمانی پر نہ کوئی سمجھوتہ ہوا اور نہ اسے بند کرنے کا کوئی جواز تھا بلکہ عملی طور پر یہ تحریک رفتہ رفتہ اپنی موت آپ مر گئی۔ گاندھی نے اس آخری نافرمانی کو ختم کرنے کے سلسلے میں وائسرائے ہند سے بات چیت کا جو انتظام کرنے کی بار بار کوشش کی لیکن ہر بار حکومت کی طرف سے یہی جواب ملا کہ پہلے غیر مشروط طور پر تحریک ختم کی جائے۔ اس کے بعد حکومت سے بات چیت [illegible]

[illegible] (WEIGHTAGE) [illegible]

مسلم لیگ کی صفوں میں انتشار

مسلم لیگ کی صفوں میں اب بھی کسی حد تک انتشار موجود تھا۔ ۱۹۳۲ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ ۱۹۳۳ء میں مسلم لیگ کے اندرونی استحکام کو مزید صدمہ پہنچا۔ ہوا یہ کہ ۱۱ مارچ ۱۹۳۳ء کو مسلم لیگ کے قائم مقام صدر میاں عبدالعزیز نے کمیٹی میں معاملہ پیش کئے بغیر اپنے طور پر سیکرٹری کا عہدہ خالی قرار دے دیا۔ مسلم لیگ کے سیکرٹری مولوی محمد یعقوب خاموشی کے ساتھ اپنے عہدہ سے دست بردار ہو گئے۔ لیکن مسلم لیگ کونسل نے ان کے اس اقدام کی مذمت کرتے ہوئے مولوی محمد یعقوب پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا۔ اس کے باوجود میاں عبدالعزیز نے مولوی محمد یعقوب کو مسلم لیگ کے نئے صدر کے انتخاب کے لئے اجلاس طلب کرنے سے منع کر دیا جس کی وجہ سے تعطل پیدا ہو گیا۔ چنانچہ کونسل کے ممبروں نے اکثریت رائے سے اجلاس طلب کیا اور میاں عبدالعزیز کے خلاف، جو اجلاس میں موجود تھے، عدم اعتماد کی قرارداد منظور کر دی۔ دو دن بعد کونسل کے اجلاس نے فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ کا آئندہ سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۳۳ء میں دلی میں، کانپور کے حافظ ہدایت حسین کی زیر صدارت منعقد کیا جائے اس اجلاس میں مسلم لیگ نے کمیونل ایوارڈ قبول تو کر لیا لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے مطالبات کو منظور کرانے کی کوششیں جاری رکھنے کی قرارداد بھی منظور کی۔ اسی اجلاس میں ایک اور اہم قرارداد منظور کی گئی کہ محمد علی جناح اور آغا خاں کے مشوروں سے مسلم لیگ کی صفوں میں دوبارہ اتحاد پیدا کیا جائے۔

تیسری گول میز کانفرنس

نومبر ۱۹۳۲ء میں حکومت برطانیہ نے تیسری گول میز کانفرنس طلب کی۔ یہ کانفرنس دوسری کانفرنس کے عارضی فیصلوں اور کمیونل ایوارڈ کی بنیاد پر انگلستان کے لئے ایک نئے آئینی ڈھانچہ کی تیاری کی غرض سے طلب کی گئی۔ اس کانفرنس میں محمد علی جناح شریک نہ تھے۔ کانفرنس نے اڑھائی تین ماہ میں نئے آئین کی تفصیلات طے کر لیں۔ بعد ازاں یہ تفصیلات ایک قرطاس ابیض کی صورت میں (مارچ ۱۹۳۳ء میں) شائع کر دی گئیں۔ جو آئین تجویز کیا گیا تھا اس کے تحت صوبوں اور وفاقی مرکز میں اختیارات کی تقسیم، صوبائی حکومتوں میں عوام کی نمائندہ وزارتیں

اور ان وزارتوں کا صوبائی امور پر کنٹرول اور وفاقی حکومت میں گورنر جنرل کا زیادہ سے زیادہ عمل دخل شامل تھا۔ جہاں تک محمد علی جناح کا تعلق تھا وہ اس آئین سے مطمئن نہ تھے کیونکہ ان کے خیال میں ہندوستان کی آزادی کے پہلو سے یہ آئین محض اشک شوئی کے مترادف تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اس آئین کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوشش ہی نتیجہ خیز ثابت ہوسکتی ہے۔ کیمونل ایوارڈ آچکا تھا اور اس کی بنیاد پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مصالحت کی راہ ہموار ہوچکی تھی لیکن یہ ضروری تھا کہ کانگریس اس سلسلہ میں مسلمانوں سے تعاون کرتی ۔۔۔ ۱۹۳۴ء میں جب کانگریس کی سول نافرمانی اپنی موت آپ مرگئی تو قدرتی طور پر کانگریس کی تمام تر توجہ دوبارہ آئینی جدوجہد کی طرف ہوگئی۔

دوسری طرف مسلمان رہنماؤں میں اس بات کا احساس شدت سے موجود تھا کہ مسلم لیگ کی صفوں کو جلد از جلد منظم کیا جائے اور اس مقصد کے لئے مسلم لیگی رہنماؤں کی نگاہیں صرف محمد علی جناح پر جاتی تھیں جو دوسری گول میز کانفرنس کے بعد سے انگلستان میں مقیم اور وکالت کررہے تھے۔ بہرحال مسلمان انہیں ہندوستان واپس لانے میں کامیاب ہوگئے۔

باب ۲۲

مسلم لیگ کی تنظیم نو

۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک مسلمانوں میں بہت سی سیاسی تنظیموں کے باوجود مسلمان باہمی افتراق میں مبتلا ہو چکے تھے۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی۔ کہ ہر مسلمان تنظیم خود کو مسلمانوں کی نمائندہ سمجھتی تھی۔ لیکن ان میں ایک بھی ایسی نہ تھی۔ جو فی الواقعہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ کہلانے کی مستحق ہوتی۔ مسلمان تنظیمیں یہ تھیں۔

۱۔ نیشنلسٹ

۲۔ جمعیت العلمائے ہند (دو دھڑے)

۳۔ مجلس احرار اسلام

۴۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس یا آل انڈیا مسلم کانفرنس

۵۔ آل انڈیا مسلم لیگ (دو دھڑے)

اس کے علاوہ بہت سے مسلمان کانگرس کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ اور کانگرس کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ محمد علی جناح ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۹ء تک مسلم لیگ کے صدر رہے۔ اس دوران مسلم لیگ ایک باوقار جماعت بن گئی۔ لیکن محمد علی جناح کے جاتے ہی اس کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ مسلمانوں کو محمد علی جناح کی کمی شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگی تیسری گول میز کانفرنس کے وقت ہندوستان کے ممتاز سیاسی رہنماؤں نے اس

امر کی پوری کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح محمد علی جناح کو لندن سے مستقل طور پر ہندوستان واپس لے آئیں۔ تاکہ مسلم لیگ کے وقار کو بحال کیا جا سکے۔ محمد علی جناح کا یہ فیصلہ کہ وہ لندن میں قیام کریں متعدد وجوہات کی بنا پر تھا۔ ہندو کی مسلمان دشمنی نے بھی ان پر گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ انہوں نے انتہائی برداشت سے کام لیتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کے لئے طویل جدوجہد کی۔ لیکن ہر قدم پر ہندو کی تنگ نظری نے انہیں نیا صدمہ دیا اس کی وجہ صرف یہ تھی۔ کہ ہندو کسی قیمت پر مسلمان کو برداشت نہ کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے ۸ کروڑ مسلمان ایک ایسے گیند کی مانند ہو جائیں جو میدان میں لڑھکتا پھرے اور اسے کبھی قرار نصیب نہ ہو سکے۔ لندن میں قیام کے دوران انہوں نے بعض ہندو مسلمانوں کے کردار کے بارے میں بھی اس بات کا اظہار کیا کہ وہ مسلمانوں کے لئے مخلصانہ جدوجہد کی بجائے دوغلی پالیسی کا مظاہرہ کرتے ہیں انہوں نے کہا کہ بعض مسلمان تو ایسے بھی ہیں جو ان سے بات کرنے سے قبل ضلع کے ڈپٹی کمشنر سے مشورہ حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے درمیان ان کی کیا جگہ ہو سکتی تھی۔

گو محمد علی جناح پہلی گول میز کانفرنس کے بعد سے انگلستان ہی میں مقیم رہے لیکن وہ ہندوستان کے سیاسی حالات کی اُلٹ پلٹ سے کبھی غافل نہ رہ سکے۔ ہندوستان کے میدان سیاست میں جو کھیل کھیلے جاتے رہے۔ محمد علی جناح نے ایک زیرک تماشائی کی حیثیت سے ان کا جائزہ لیا۔ اگست ۱۹۳۱ء میں جب وہ ہندوستان آئے تو انہوں نے سب سے زیادہ زور اسی بات پر دیا کہ ہندوستان کے مسلمان متحد ہو کر آزادی کی جنگ میں بھرپور اور والہانہ حصہ لیں۔ الہ آباد کی آل انڈیا مسلم کانفرنس میں بھی انہوں نے مسلمانوں کو ایک متحدہ محاذ کے قیام کی ضرورت کا احساس دلانے کی کوشش کرتے ہوئے دردمندانہ اپیل کی کہ وہ فوری طور پر باہمی تنازعات کو ختم کر کے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جائیں۔ انہوں نے اس توقع کا اظہار بھی کیا۔ کہ اُن کی لندن روانگی سے قبل ہی مسلمانوں کے تمام دھڑے متحد ہو جائیں گے اور وقت کی انتہائی نزاکت کو شدت کے ساتھ محسوس کریں گے۔ محمد علی جناح نے زور دیا کہ وہ سب سے پہلے مسلمانوں میں اتحاد اور ان کے درمیان تمام تنازعات پر مکمل مصالحت اور اس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت پسند کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں وہ نازک وقت بحث و تمحیص کا تھا نہ ہی پراپیگنڈہ کا، اس وقت فرقہ وارانہ احساسات و جذبات کو ہوا دے کے

ان میں مزید تلخی پیدا کرنا بھی نہایت خطرناک تھا۔ اس لئے کہ دشمن دروازے پر دستک دے رہا تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی مفاہمت نہ ہو پائی تو انگریز کو مصالحت کرانی پڑے گی۔ اور جب کوئی مصالحت کراتا ہے تو وہ یقیناً اپنے لئے اختیارات اور بالادستی کا حق محفوظ رکھتا ہے محمد علی جناح نے اس اپیل میں کہا۔ "گاندھی جی خود کہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو وہ سب کچھ دینا پسند کریں گے جو مسلمان ان سے مانگیں گے۔ اور محمد علی جناح کا گناہ صرف اتنا ہے۔ کہ وہ ہندوؤں سے مسلمانوں کے لئے صرف ۱۴ نکات طلب کرتا ہے۔ حالانکہ یہ چودہ نکات اس کورے چیک کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ جو گاندھی نے مسلمانوں کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مسلمانوں کو کسی کورے چیک کی ضرورت نہیں اس کی جگہ ان کو چودہ نکات کیوں نہیں دے دیئے جاتے؟ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ جواہر لال نہرو، پٹیل اور گاندھی سب نے ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے۔ یہی کہ "ہمیں کورا چیک دیدو ہم سودیشی قلم سے سودیشی کاغذ پر دستخط کر دیں گے۔" اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تینوں انتہائی غیر جانبدار اور غیر فرقہ وارانہ ذہنیت کے لوگ ہیں۔ لیکن فرقہ وارانہ ذہنیت رکھنے والا کوئی شخص ہے تو محمد علی جناح! ہندوؤں سے بھی اپیل کی جاسکتی ہے۔ کہ وہ ہر شخص کے بارے میں غلط تاثر قائم نہ کریں۔ آخر میں انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا۔ کہ اگر آپ بھی خواہش ہو تو مفاہمت کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔"

محمد علی جناح کی اس اپیل کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے لوگوں نے باہم اتحاد پیدا کر کے مشترکہ تجاویز مرتب کیں۔ لیکن جہاں تک نیشنلسٹ مسلمانوں کا تعلق تھا وہ پھر بھی کانگریس کے ہمنوا رہے۔ گاندھی تو ہمیشہ ہی مسلمانوں کے مطالبات کو نظرانداز کرتے رہے۔ مسلمان جماعتوں میں تنظیم کے اسی فقدان کے باعث ان کی آواز دبتی رہی۔ جب مسلم لیگ نے دلی میں سالانہ اجلاس طلب کیا تو بہت کم لوگوں نے اس میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں چوہدری ظفر اللہ خان کو مسلم لیگ کا صدر منتخب کرنے کی تجویز پر دلی میں شدید مزاحمت کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ اجلاس نئی دلی کے ایک مکان میں منعقد کرنا پڑا۔

جب محمد علی جناح اپریل ۱۹۳۴ء میں بمبئی پہنچے تو انہوں نے سب سے پہلے مختلف دھڑوں میں بٹی ہوئی مسلم لیگ کو متحد کیا۔ جو متحدہ مسلم لیگ کونسل کی صورت میں سامنے آئی۔ انتخاب کرایا گیا اور کونسل نے محمد علی جناح کو مستقل صدر چن لیا۔ حافظ ہدایت حسین اس متحدہ کونسل کے سیکرٹری منتخب کئے گئے۔ اس کونسل نے سب سے پہلے ایک قرارداد منظور کی جو

یہ تھی ـــــ

"جب تک مختلف جماعتوں اور فرقوں میں مفاہمت نہیں ہو جاتی۔ مسلم لیگ کونسل کیمونل ایوارڈ کو اس کی موجودہ صورت میں قبول کرتی ہے۔ تاکہ ملک کے لئے قابل قبول آئین کی ترتیب کی طرف پیش قدمی کی جاسکے۔"

اس کے بعد محمد علی جناح نے ایک پریس کانفرنس طلب کی اور کہا کہ اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ اس مجوزہ آئین سے، جو ہندوستانیوں پر ٹھونسا جارہا تھا، کیونکر نجات حاصل کی جائے۔ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مکمل مفاہمت نہیں ہو جاتی اور دونوں کو ایک دوسرے کا تعاون حاصل نہیں ہو جاتا، اس آئین سے چھٹکارا مشکل ہوگا۔ مسلم لیگ کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو۔ مسلم لیگ کونسل نے جو قرارداد پاس کی ہے۔ وہ اس بنیاد کی نشاندہی کرتی ہے۔ جس بنیاد پر اتحاد ممکن ہوسکتا ہے۔ جہاں تک ملک کی آئندہ سیاسی ترقی کا تعلق ہے تو اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ میں کوئی فرق نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ مسلمان کیمونل ایوارڈ پر مُصر ہیں۔ کیونکہ وہ کیمونل ایوارڈ میں موجود تحفظات کو آئین آزادی میں شامل کئے جانے کے بارے میں اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

محمد علی جناح کا بلامقابلہ انتخاب

۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے۔ محمد علی جناح (جو اس وقت انگلستان میں تھے) کی عدم موجودگی میں بمبئی سے ان کے کاغذات نامزدگی داخل کر دیئے گئے۔ اور وہ بلا مقابلہ منتخب ہو گئے۔ یہ انتخاب ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو عمل میں آیا۔ انتخابات کے دوران کیمونل ایوارڈ سے متعلق کانگرس کا رویہ خاصا دلچسپ تھا۔ کانگرس کے انتخابی منشور میں کہا گیا تھا کہ کانگرس کیمونل ایوارڈ کو منظور بھی نہیں کرتی اور نامنظور بھی نہیں کرتی۔ اس وقت کانگرس میں بھی کیمونل ایوارڈ کی وجہ سے دو دھڑے بن چکے تھے۔ ایک تو وہ جو کیمونل ایوارڈ کا مخالف اور اس کی دوٹوک مخالفت پر یقین رکھتا تھا۔ دوسرا وہ جو مخالف تو ضرور تھا۔ لیکن اس مرحلہ پر غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے کے حق میں تھا۔

نیشنلسٹ پارٹی نے ان انتخابات میں سوراج پارٹی کے مقابلہ پر حصہ لیا۔ لیکن سوراج پارٹی کے ۴۴ اور نیشنلسٹ پارٹی کے صرف ۱۱ امیدوار کامیاب ہوسکے۔

مسلم یونٹی بورڈ

کانگرس کے مسلمان اراکین میں ایک چوہدری خلیق الزمان نے گاندھی کی اشیرباد حاصل کی اور سوراج پارٹی سے علیحدہ ایک مسلم یونٹی بورڈ قائم کر دیا اور اسی بورڈ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے لئے کمر باندھ لی۔ یونٹی بورڈ میں کچھ کانگرسی مسلمان، کچھ غیر کانگرسی مسلمان اور کچھ جمعیت العلمائے ہند کے اراکین تھے۔ اس بورڈ نے کمیونل ایوارڈ کی حمایت اور مجوزہ آئین کی جگہ آئین آزادی کا نعرہ لگایا۔ یو۔ پی میں بورڈ کے امیدواروں کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی لیکن جب اس بورڈ کے کامیاب امیدوار اسمبلی کے اندر پہنچے تو سوراج پارٹی کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب کمیونل ایوارڈ کا مسئلہ آیا تو اس بورڈ نے محمد علی جناح کا ساتھ دیا۔

اسمبلی میں انڈیپنڈنٹ پارٹی کی قیادت محمد علی جناح کر رہے تھے۔ اسمبلی میں اس پارٹی کے ۲۲ نمائندوں میں ۱۸ مسلمان تھے۔ اسمبلی میں کانگرس کے ۴۴ اور نیشنلسٹ پارٹی کے ۱۱ نمائندے موجود تھے۔ علاوہ ازیں کانگرس کے دونوں دھڑوں کی مجموعی قوت ۵۵ تھی۔

جہاں تک محمد علی جناح کی انڈیپنڈنٹ پارٹی کا سوال تھا تو مسلمان اراکین اس میں تیزی سے شامل ہو رہے تھے اس طرح یہ پارٹی حقیقتاً مسلم پارٹی کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھی اسمبلی میں سوراج پارٹی نے نیشنلسٹ پارٹی کی حمایت سے ایک کانگرسی مسلمان تصدق احمد خان شیروانی کو سپیکر کے عہدہ کے لئے منتخب کیا۔ ان کے مقابلہ میں محمد علی جناح نے سر عبدالرحیم کو کھڑا کیا۔ سر عبدالرحیم ۶۲ ووٹ کے مقابلہ میں ۷۰ ووٹوں سے منتخب ہو گئے۔ اسمبلی میں محمد علی جناح کی یہ پہلی اور بہت بڑی فتح تھی۔

نئے آئین پر بحث

۴ فروری ۱۹۳۵ء کو ہندوستان کا نیا آئین اسمبلی میں زیر بحث آیا۔ جو برطانوی پارلیمان کی مجلس منتخبہ کی رپورٹ کی صورت میں تھا۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے تین حصوں پر مشتمل ایک ترمیم پیش کی۔

۱۔ یہ ایوان کمیونل ایوارڈ کو منظور کرتا ہے۔

۲ - آئین کے صوبائی حصّہ کو اس کے قابلِ اصلاح اور پُر سقم ہونے کے باعث اس کی اصلاح کا مطالبہ کرتا ہے۔

۳ - مجوزہ آئین کا وفاقی مرکز کی ساخت سے متعلق حصّہ بنیادی طور پر ناقص اور ہندوستان میں رہنے والوں کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ ایوان حکومت برطانیہ کو مشورہ دیتا ہے کہ مذکورہ بالا حصّہ سے متعلق تجاویز آئین میں شامل نہ کی جائیں۔ اور مرکز کی ساخت پر دوبارہ غور کیا جائے۔ نیز ہندوستانی عوام کے مشورے سے نئی تجاویز مرتب کی جائیں۔

ان ترامیم پر تین دن بحث جاری رہی۔ کمیونل ایوارڈ کی منظوری سے متعلق ترمیم کے حق میں سرکاری بلاک تھا اور ترمیم کے خلاف نیشنلسٹ پارٹی! ترمیم کے حق میں ۶۸ اور اس کے خلاف ۱۵ ووٹ پڑے۔ کانگرس غیر جانبدار رہی۔

مجوزہ آئین کے صوبائی حصّہ کے پُرسقم اور قابلِ اصلاح ہونے کی ترمیم سے متعلق پوزیشن یہ تھی۔ کہ اگر اسمبلی کثرت رائے سے اسے حذف کر دیتی تو مجموعی اعتبار سے کمیونل ایوارڈ منظور ہو جاتا۔ بالفاظِ دیگر اسمبلی اسے کسی تنقید کے بغیر قبول کر لیتی۔ اور صرف مرکزی حصّہ کو مسترد کر دیتی۔ چنانچہ کانگرسی اور نیشنلسٹ پارٹی کے نمائندے مجبور ہو گئے کہ اس ترمیم کے دوسرے حصّہ کو سرکاری ووٹوں کی اکثریت سے مسترد ہونے سے بچا لیں۔ جہاں تک ترمیم کے تیسرے حصّہ کا تعلق تھا۔ یعنی آئین کے مرکزی حصّہ کا کلّی استرداد، تو اس مسئلہ پر سب متفق تھے۔ لہٰذا محمد علی جناح کی ترمیم کے دوسرے اور تیسرے حصّوں پر مشترکہ رائے شماری ہوئی۔ سرکاری بنچوں نے مخالفت کی، کانگرس اور نیشنلسٹوں نے حق میں ووٹ دیئے۔ لہٰذا دونوں حصّے ۵۸ کے مقابلے میں ۷۴ ووٹوں کی اکثریت سے منظور ہو گئے۔

ہندوؤں اور اُن کے نمائندہ اخبارات کو محمد علی جناح کی اس نمایاں کامیابی نے بوکھلا دیا ہندو اخبارات نے یہ الزام عائد کیا کہ محمد علی جناح نے اپنی پارٹی کی پوزیشن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قومی مفاد کو نظر انداز کر دیا اور فرقہ وارانہ خلیج حائل کرنے کی کوشش کی۔ ہندو اخبارات نے یہ دلچسپ بات بھی لکھی کہ محمد علی جناح لاکھ بار یہ سمجھیں کہ انہیں فتح حاصل ہوئی ہے۔ مگر ان کی یہ فتح اسمبلی کے اندر اور اُن کی ذات تک محدود ہے۔ در اصل یہ ملک کی شکست کے مترادف ہے۔

باب ۲۳

مسجد شہید گنج کا ہنگامہ

مجلس احرار اسلام ۱۹۳۰ء میں قائم ہوئی تھی اس کا نصب العین مسلمانوں کے حقوق
کی حفاظت تھا۔ اس جماعت نے کشمیر کے مسلمانوں کی تحریک آزادی میں بھی سرگرمی سے
حصہ لیا۔ تحریک کی قیادت شیخ عبداللہ کر رہے تھے۔ سیالکوٹ، جہلم اور راولپنڈی کے راستوں
سے مسلمانوں کے بہت سے جتھے "کشمیر چلو" کا نعرہ لگا کر ریاست کی حدود میں داخل ہونے
کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ کیونکہ کشمیر کی سکھ حکومت نے مسلمانوں کے داخلہ پر پابندی
عائد کر دی تھی لہٰذا ان جتھوں کو عام طور پر ریاست کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے ہی
پنجاب کی پولیس گرفتار کر لیتی اور اگر کچھ لوگ بچ بچا کر کشمیر میں داخل ہو بھی جاتے تو وہاں
ڈوگرہ پولس انہیں حراست میں لے لیتی۔ چنانچہ پولیس اور عوام میں تصادم کی صورت بھی پیدا
ہو جاتی۔ ۱۹۳۱ء میں اس مہم میں جماعت احمدیہ بھی شامل ہو گئی۔ لیکن جلد ہی یہ محسوس کیا گیا
کہ جماعت احمدیہ کا مقصد تحریک آزادی میں مسلمانوں کی مدد نہیں بلکہ اپنی تبلیغ تھا۔ نتیجہ یہ نکلا
کہ غیر احمدی اور احمدی جماعت کشمیر کمیٹی سے الگ ہو گئے۔ لاہور میں ایک جلسہ عام
ہوا جس میں علامہ اقبال نے صدارت کی [illegible] بھی کشمیر کمیٹی سے الگ ہو گئے۔ انہوں
نے ایک نئی کشمیر کمیٹی بنا لی تو احمدی جماعت نے اپنی کشمیر کمیٹی کا نام تبدیل کر کے تحریک کشمیر
رکھ لیا۔ احمدیوں کے خلاف مجلس احرار[1] اسلام بھی میدان میں آ گئی۔ اس طرح احمدیوں کی
تحریک کشمیر آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء میں جب چوہدری ظفر اللہ خان کو وائسرائے

کی کونسل کے عارضی رکن کے طور پر منتخب کیا گیا تو احراریوں کو اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ ان کے خیال میں چودھری صاحب کو یہ عہدہ دلانے میں سر فضل حسین نے اہم کردار ادا کیا تھا نتیجہ یہ نکلا کہ چودھری صاحب کی جگہ سر فضل حسین احراریوں کی کڑوی کسیلی تنقید کا نشانہ بنے۔

۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مجلس احرار نے لالہ ہرکشن لال کے ایک لڑکے کو اپنا امیدوار منتخب کیا جس نے کچھ عرصہ پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بعدازاں وہ پھر ہندو ہو گیا۔ اور تقسیم ملک کے وقت بھارت چلا گیا۔ اس کا اسلامی نام خالد لطیف گابا تھا گابا کو یونینسٹ پارٹی کے امیدوار کے مقابلے میں کھڑا کیا گیا۔ جیت گابا کی ہوئی اور اس طرح سر فضل حسین مجلس احرار اسلام کی مزید تنقید کا نشانہ بنے۔ کیونکہ احرار اسلام کے خیال میں گابا کے مقابلے پر جو امیدوار کھڑا کیا گیا تھا وہ بھی سر فضل حسین کے اشارے پر میدان میں آیا تھا۔

۱۹۳۵ء کے وسط میں پنجاب کا امن وامان شدید خطرے میں پڑ گیا لاہور کی ایک مسجد پنجاب میں سکھوں کے مختصر دورِ حکومت میں اُن کے قبضے میں چلی گئی تھی۔ مسجد پر قبضہ کرنے کے بعد سکھوں نے قریب ہی ایک گوردوارہ تعمیر کر دیا اور اس کے گرنتھی نے مسجد کو اپنا مکان بنالیا مسجد کے ساتھ جو دکانیں تھیں وہ ان کا کرایہ بھی وصول کرتا رہا۔ اس گرنتھی کی اولاد نے مسجد کو ذاتی ملکیت قرار دے دیا۔ مسجد تقریباً سو سال پُرانی تھی۔ سکھوں نے ایک دوبار اسے مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اُس کا کوئی خریدار پیدا نہ ہو سکا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے قریباً پچاس سال بعد ایک مسلمان نے خود کو مسجد کا متولی ظاہر کیا۔ اور سکھوں کے خلاف دیوانی مقدمہ دائر کر دیا لیکن عدالت نے یہ مقدمہ اس بنا پر خارج کر دیا کہ اُس پر ایک سو سال سے زاید عرصہ سے سکھوں کا قبضہ تھا۔

جب ۱۹۲۵ء میں سکھ گوردوارہ ایکٹ بنایا گیا تو حکومت نے تمام گوردوارے اور اُن کی جائداد سکھوں کی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کرنے کے لئے ضابطے وضع کئے جب اس سلسلے میں ٹربیونل قائم ہوا تو مسجد شہید گنج پر قابض سیواداروں نے اسے ذاتی ملکیت قرار دیا لیکن اس کے ساتھ ہی انجمن اسلامیہ کے سکریٹری نے بھی یہ دعویٰ کیا کہ یہ گوردوارہ دراصل مسجد تھی لہٰذا اس پر مسلمانوں کا حق ہے لیکن ٹربیونل نے سکھوں کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ انجمن اسلامیہ کی طرف سے کوئی اپیل نہ کی گئی آخر مارچ ۱۹۳۵ء میں یہ مسجد پربندھک کمیٹی کے سپرد کر دی گئی جون ۱۹۳۵ء میں پنجاب کے مختلف علاقوں کے سکھ لاہور پہنچنا شروع ہو گئے۔

اور انہوں نے مسجد کو شہید کرنے کا پروگرام بنا لیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ مسجد کے گرائے جانے سے
پہلے ہی ایک سکھ راج مسجد کی بوسیدہ دیوار کے اچانک گرنے سے ہلاک ہو گیا۔ اس کی ہلاکت کی
وجہ سے مختلف قسم کی افواہیں پھیل گئیں اور مسلمان بھی اس مسجد کے باہر کثیر تعداد میں جمع ہونا شروع
ہو گئے۔ ڈپٹی کمشنر اور سٹی مجسٹریٹ موقع پر پہنچ گئے اور ۲۸ جون ۱۹۳۵ء کو یہ حکم دیا گیا کہ
سکھ مسجد کی عمارت کو گرانے کی کوشش نہ کریں۔ اس کے بعد سکھوں اور مسلمانوں کے جلسوں
جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا کبھی کبھار لاٹھی چارج بھی ہو جاتا۔ ۶ جولائی کو پنجاب کے گورنر
ایمرسن شملہ سے لاہور پہنچ گئے۔ مسلمانوں کے ایک وفد نے اُن سے ملاقات کی اور مطالبہ کیا کہ
مسجد کو محکمۂ آثارِ قدیمہ کے سپرد کر دیا جائے نیز شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کی جائے تاکہ مسجد کے انہدام
کو روکا جا سکے۔ مسلمانوں نے سکھ رہنماؤں سے بھی ملاقات کی۔ انہوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ
جب تک گوردوارہ پربندھک کمیٹی مسلمانوں کی تجاویز پر غور نہیں کر لیتی مسجد کو شہید نہیں کیا جائے گا لیکن
یہ بات چیت جاری تھی کہ ۷ جولائی کو سکھوں نے اچانک رات کے وقت مسجد گرانا شروع کر دی
دلچسپ بات یہ ہے کہ اس موقع پر مسلح پولیس موجود تھی تاکہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک
سکے۔ صبح تک مسجد ایک میدان میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اگلے دن جب حالات میں انتہائی کشیدگی
پیدا ہو گئی تو گورنر نے دو انگریز پلٹنیں چھاؤنی سے بُلا کر مسجد کے پاس متعین کر دیں، آئندہ شب کے
لئے کرفیو نافذ کر دیا اور اخبارات پر سنسر لگا دیا۔ تین دن تک کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔ اس دوران میں
عبدالعزیز کے مکان پر مسلمانوں کے اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ حکومت نے سوچا کہ شاید معاملہ
ختم ہو چکا ہے۔ ایک فوجی پلٹن واپس بھیج دی گئی۔ اور کرفیو میں بھی نرمی کر دی گئی۔ اس دوران
حکومت نے ایک چال یہ چلی کہ مسلمانوں کو شاہ چراغ کی عمارت دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ عمارت
بھی کسی وقت مسجد ہوا کرتی تھی۔ ۱۴ جولائی کو ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس سے مولانا ظفر علی خاں
نے خطاب کیا۔ اُنہوں نے شاہ چراغ کی عمارت کے بارے میں حکومت کے فیصلے کا خیر مقدم کیا۔
لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ مسلمان مسجد شہید گنج لئے بغیر کبھی نہ ٹلیں گے اور اس مقصد کے لئے سول نافرمانی
کی تحریک چلائی جائے گی۔ حکومت نے فوری طور پر مولانا ظفر علی خاں، ملک لال خاں، میاں فیروز الدین
اور سید حبیب کو گرفتار کر کے لاہور سے باہر بھیج دیا مسلمانوں نے کرفیو کی پروا کئے بغیر جلوس
نکالا۔ ۱۵ جولائی کو اُن پر لاٹھی چارج کیا گیا۔ ۱۷ جولائی کو گورنر نے صوبائی مقننہ کے سامنے اپنی
صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا کوئی اثر قبول نہ کیا گیا۔ ۱۹ جولائی کو بادشاہی مسجد

میں نمازِ جمعہ کے بعد مولانا ظفر علی خان کے صاحبزادے اختر علی خان نے ایک تقریر کی جس کی وجہ سے مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا ہو گیا۔ لوگ شاہی مسجد سے نکل کر مسجد کے دروازے تک پہنچ گئے اور ساری رات وہیں بیٹھے رہے۔ دوسرے دن پولیس نے زبردستی لاٹھی چارج کیا اور پانی چھوڑ دیا۔ لیکن مسلمان گرتے اور آگے پہنچنے کی کوشش میں مصروف رہے ان پر بار بار گولی چلائی گئی۔ اور ہزاروں نوجوانوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

محمد علی جناح کی آمد

۲۰ فروری ۱۹۳۶ء کو محمد علی جناح لاہور پہنچ گئے۔ انہوں نے مسلمان رہنماؤں اور گورنر سے ملاقات کی۔ گورنر یہ وعدہ کر چکا تھا کہ اگر مسلمان سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دیں تو گرفتار شدہ لوگوں کو رہا کر دیا جائے۔ مسلمانوں نے محمد علی جناح کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے تحریک ختم کر دی اور تمام مسلمانوں کو رہا کر دیا گیا۔ انہوں نے سکھ رہنماؤں سے بھی ملاقات کی اور انہیں سمجھایا کہ مسلمان اور سکھوں کے درمیان اس قسم کا اختلاف دونوں میں کسی کے حق میں بھی اچھا نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں ملک کے لئے آزادی کی جدوجہد میں بھی مشکلات پیدا ہوں گی۔ سکھ رہنما محمد علی جناح کے اندازِ مصالحت سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ انہیں مسجد کا معائنہ کرانے کے لئے لے گئے۔ محمد علی جناح کو فوری طور پر امن بحال کرانے میں کامیابی ہوئی۔ انہوں نے مسلمانوں اور سکھوں دونوں پر زور دیا کہ وہ پُرامن اور آئینی طریقوں سے مصالحت کی کوشش کریں۔ محمد علی جناح کی ان کوششوں سے مسلمان، ہندو اور سکھ اس حد تک متاثر ہوئے کہ انہوں نے محمد علی جناح کی اعلیٰ خدمات کو سراہنے کے لئے ایک جلسۂ عام منعقد کیا۔ ۷ مارچ ۱۹۳۶ء کو محمد علی جناح لاہور سے چلے گئے لیکن جانے سے پہلے انہوں نے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں پر مشتمل ایک مصالحتی کمیٹی قائم کر دی تاکہ وہ باہمی تبادلۂ خیال سے مسجد کے تنازع کا کوئی پُرامن حل تلاش کر سکے۔ انہوں نے کمیٹی کو اپنے مخلصانہ تعاون کا یقین بھی دلایا۔ گورنر پنجاب نے بھی اس موقع پر محمد علی جناح کی [illegible] خدمات [illegible] کی تحسین پیش کی [illegible] بعض [illegible] کمیٹی [illegible] لیکن [illegible] [illegible] مسجد شہید گنج [illegible] مسلمانوں [illegible] گرا دیا۔

جناح پرشاد بات چیت

جب مرکزی اسمبلی نے کمیونل ایوارڈ کی منظوری کا فیصلہ کر لیا تو کچھ لوگوں نے بمبئی میں مسٹر
مد علی جناح اور کانگریس کے صدر راجندر پرشاد نے بات چیت کے لئے فضا ہموار کی لیکن اس
ت چیت میں اس بنا پر تعطل پیدا ہوا کہ اگر ان دونوں میں مفاہمت کی کوئی صورت نکل بھی آئے تو
یا راجندر پرشاد اس بات کی ذمہ داری قبول کریں گے کہ ہندو مہاسبھا بھی پابندی کرے گی؟ نیز
مکتوں کا ردِ عمل کیا ہوگا؟ لیکن راجندر پرشاد ان دونوں باتوں کی ذمہ داری نہ لے سکے۔

اسی دوران کانگریس نے یہ پراپیگنڈہ پوری شدت کے ساتھ شروع کر دیا کہ محمد علی جناح
ور راجندر پرشاد کے درمیان مفاہمت ہو چکی تھی اور انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان
تحاد کے لئے ایک فارمولا تیار کر لیا تھا۔ اور اب یہ فارمولا فریقین کے سامنے توثیق کے لئے پیش
ہونا تھا لیکن محمد علی جناح کی وجہ سے یہ بات چیت کامیاب نہ ہو سکی محمد علی جناح نے اس بات کو
بے بنیاد اور غیر ذمہ دارانہ قرار دیا۔

باب ۲۴

صوبائی انتخابات ، کانگرسی حکومت

۱۹۳۵ء میں برطانوی پارلیمان کی طرف سے منظور کئے جانے والے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت پہلے صوبائی انتخابات ۱۹۳۷ء میں منعقد ہوئے۔ اس ایکٹ کے تحت کیبونل ایوارڈ اور صوبائی خودمختاری دی گئی۔ گو یہ صوبائی خودمختاری محدود تھی جس کے تحت ہندوستان کے تمام صوبوں کا وفاق قائم ہونا تھا۔ بعض شرائط کے ساتھ اس وفاق میں ہندوستانی ریاستوں کو بھی شمولیت کا حق دیا گیا تھا۔ صوبوں میں ذمہ دار حکومت قائم ہونا تھی اور صوبائی گورنر، وزیروں کے مشوروں پر عمل کرنے کے پابند تھے۔ مگر چند معاملات میں گورنروں کو قانون کی رُو سے وزیروں کے مشوروں کے برعکس عمل کرنے کا حق بھی حاصل تھا۔ صوبوں سے دوعملی ختم کر دی گئی لیکن وفاقی مرکز میں اسے رائج کر دیا گیا۔

اس ایکٹ کے بارے میں مسلمانوں کی سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے آئین میں خاص دفعات شامل نہ کی گئی تھیں اور اقلیتوں کا تحفظ صوبائی گورنروں اور گورنر جنرل کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا (ایکٹ ۱۹۳۵ء کی تفصیل کے لئے دیکھئے باب
۱۹۳۶-۳۷ء میں جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر تھے۔ انہوں نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو غلامی کی نئی زنجیر قرار دیا۔ گو وہ اسے قطعی طور پر مسترد کر دینے کے حق میں تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے آئندہ صوبائی انتخابات میں، جو اسی آئین کے تحت ہونا تھے، کانگریس کے شمولیت کی مخالفت نہ کی۔ اور یہ نیا نعرہ لگا دیا کہ کانگریس صوبائی وزارتوں میں حصہ نہ لے

، نے صوبائی حکومتوں میں کانگریس کی شمولیت کو ایک مہلک غلطی سے تعبیر کیا۔ ان کے خیال
بتوں میں کانگریس کی شمولیت کا مطلب برطانوی سامراج سے تعاون کے مترادف تھا۔ مگر
سے کانگریسی موقع کی تاک میں بیٹھے تھے اور اقتدار پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔
ے اجلاس پر کانگریس نے ایک قرارداد کے ذریعے فیصلہ کیا کہ وہ صوبائی اسمبلیوں میں اپنے
ب اُمیدوار تو ضرور بھیجے گی لیکن ایکٹ سے تعاون کرنے کی غرض سے نہیں، بلکہ اس کے
متصادم ہونے اور اُسے ختم کرنے کے لئے! جہاں تک حکومتوں میں شرکت کا سوال تھا تو
نتخابات کے بعد تک کے لئے اُٹھا رکھا گیا۔ کانگریس نے کمیونل ایوارڈ کی مذمت کی مگر ساتھ
نعرہ بھی لگایا کہ فرقہ وارانہ مسائل کے تسلی بخش حل کے لئے ہندوستان کے بڑے فرقوں کے
خیر سگالی اور تعاون کے ذریعے ہی کام لیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ کانگریس کا روائتی کھوکھلا
نعرہ اس لئے اجنبی محسوس نہ ہُوا۔

کانگریس اور انتخابات

انتخابات میں حصہ لینے کے لئے کانگریس پورے ساز و سامان کے ساتھ میدان میں کود
اُس کے پیچھے موٹے موٹے ہندو سیٹھوں کا سرمایہ تھا۔ کانگریس نے برطانیہ کے خلاف
گاندھی کے لئے ووٹ" کے جذباتی نعرے لگائے۔ حالانکہ گاندھی ۱۹۳۴ء ہی میں کانگریس
عدہ رکنیت سے الگ ہو چکے تھے۔ ہندو اُنہیں دیوتا اور مہاتما سمجھتا تھا۔ لہٰذا گاندھی
م پر ہندو سے ووٹ حاصل کرنا کانگریس کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی انتخابات میں کانگریس
۴۰ فی صد نشستیں حاصل کیں (مجموعی نشستیں ۱۵۸۵ تھیں، کانگریس کو ۷۱۱ ملیں) مدراس،
سی پی اور اڑیسہ کے پانچ صوبوں میں کانگریس کو واضح اکثریت حاصل رہی۔ بمبئی میں اُسے
نصف نشستیں اور آسام میں ۱۰۸ میں سے ۳۵ کانگریس کے پاس چلی گئیں۔ جہاں تک مسلما
نوں کا تعلق تھا تو کُل ۴۸۲ نشستوں میں کانگریس نے ۵۸ کے لئے مقابلہ کیا۔ اُسے صرف
ہ تھیں۔ اور اُن میں بھی زیادہ تر صوبہ سرحد میں تھیں کیونکہ وہاں سُرخ پوشوں کے ساتھ کانگریس
د ہو چکا تھا۔ بنگال، پنجاب اور سندھ کے مسلم اکثریتی صوبوں میں نشستوں کی مجموعی تعداد
تھی۔ ان میں سے صرف ۸۶ کانگریس کو ملیں ان میں اکثر ہندو نشستیں تھیں۔
مسلمانوں کی بدقسمتی یہ تھی کہ اُن کی متعدد مختلف سیاسی جماعتیں تھیں یعنی مسلم لیگ ،

جمعیت العلمائے ہند، مجلس احرارِ اسلام، اتحادِ ملت، شیعہ کانفرنس، مومن کانفرنس، سرخ پوش، یونینیسٹ پارٹی اور کرشک پرجا پارٹی وغیرہ۔ مسلم لیگ کے سوا ان میں ایک جماعت بھی ایسی نہ تھی جس نے مسلمانوں کی قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہوں۔ خود مسلم لیگ میں بھی کافی افتراق رہ چکا تھا۔ کچھ عرصہ قبل محمد علی جناح نے انگلستان سے واپسی پر اس کی قیادت سنبھالی تھی اور اب تک اسے پوری طرح منظم نہ کر پائے تھے۔ جہاں تک صوبائی انتخابات کا سوال تھا تو اکثر لوگوں کی کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح تمام دوسری مسلمان جماعتیں مسلم لیگ کے ساتھ مل جائیں تاکہ انتخابات میں مسلمان نمایاں کامیابی حاصل کر سکیں۔ خود محمد علی جناح اس ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ اس بار انتخابات جداگانہ طریق پر ہونا تھے لہٰذا قدرتی طور پر مسلمانوں میں اتحاد کی شدید ضرورت تھی تاکہ وہ کامیابی کے بعد قدم ملا کر اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کر سکتے۔ اسی دوران اپریل ۱۹۳۶ء میں جمعیت العلماء کی طرف سے محمد علی جناح کو ایک جلسے میں تقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ جس میں ہندوستان کے علماء شریک تھے۔ اس موقع پر محمد علی جناح نے کہا کہ ہندوستان میں پہلی بار ایک نمائندہ حکومت کا قیام عمل میں آنے والا تھا لیکن حقیقتاً یہ اکثریت کی حکومت کا قیام تھا ان حالات میں اقلیتوں کا کیا بنے گا۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔ اقتدار اور اختیار کا نشہ اکثریت کو بدمست بھی کر سکتا ہے لہٰذا ضروری تھا کہ جمہوری آئین میں اقلیتوں کے تحفظ کی گنجائش رکھی جاتی۔ محمد علی جناح نے علماء سے اپیل کی کہ وہ معمولی مباحث میں اُلجھے بغیر متحد ہو جائیں اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ وفاقی سکیم کے بارے میں انہوں نے کہا

"جب تک ہمیں بہتر آئین نہ مل جائے ہمیں لڑنا ہو گا۔ ہم مسلمانوں کے مفادات کو کسی قیمت پر نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اگر اس وقت بھی جدوجہد نہ کی گئی تو ہمیں کوئی نہ پوچھے گا۔ ہماری عزت اور ہمارا وقار ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ اپنے لوگوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے کام کرنے میں آخر بڑی بات کیا ہے؟ ہندو اور مسلمان اس مقصد کے لئے الگ الگ بھی منظم ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں وہ ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طریق پر سمجھ سکیں گے اور پھر اُن دونوں کے درمیان مفاہمت کے لئے کئی سال تک انتظار نہ کرنا پڑے گا۔ میں اپیل کرتا ہوں کہ آپ لوگوں کے طنز کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ میں ۸ کروڑ مسلمانوں کی مدد کر رہا ہوں اور اگر وہ منظم ہو جائیں تو یہ تنظیم قومی جدوجہد کے لئے بیحد سودمند ثابت ہو سکے گی۔"

محمد علی جناح کی مساعی

محمد علی جناح نے مسلمانوں کے مستقبل کے لئے لائحہ عمل مرتب کرنے کی غرض سے ۱۹۳۶ء میں کل ہند مسلم لیگ کا اجلاس بمبئی میں طلب کیا۔ صدارت سید وزیر حسن نے کی کیونکہ مسلم لیگ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے وفاقی حصے کو قبول کرنے پر تیار نہ تھی لہذا اُس نے ہندوستان کے عوام پر ایک ایسا آئین ٹھونسنے کی مذمت کی جو عوام کی خواہشات کے برعکس تھا۔ گو مسلم لیگ کو آئین کے صوبائی حصّوں پر بھی مکمل اطمینان نہ تھا تاہم اُس نے حالات کے پیش نظر اُسے قبول کرلیا۔
مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ انتخابات میں ایک جماعت کی حیثیت سے شرکت کرے گی راجہ غضنفر علی خاں کی پیش کردہ ایک قرارداد بھی اس ضمن میں منظور کی گئی۔ اس قرارداد کے ذریعہ محمد علی جناح کو اپنی صدارت میں کم از کم ۳۵ افراد پر مشتمل ایک مرکزی انتخابی بورڈ قائم کرنے کا اختیار دیا گیا۔

محمد علی جناح نے اس مقصد کے لیے ہندوستان کا طوفانی دورہ کیا اور مختلف صوبوں میں مختلف گروہوں کے رہنماؤں سے بات چیت کی۔ وہ چاہتے تھے کہ یا تو سب گروپ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں یا مسلم لیگ کو اتنی فعّال جماعت بنا دیا جائے کہ وہ دُوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ مِل کر آزادی کے لئے جدوجہد کرسکے۔ اُنہوں نے ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ مقرر کردیا جس میں مسلمانوں کے مختلف گروہوں کے نمائندے شامل تھے۔ اس بورڈ کا پہلا اجلاس ۸ جون ۱۹۳۶ء کو لاہور میں منعقد ہوا۔ منعقد نشستوں میں مسلم لیگ کا انتخابی دستور منظور کرلیا گیا۔ جہاں تک صوبائی پارلیمانی بورڈوں کا تعلق تھا تو محمد علی جناح کی توجّہ صوبائی معاملات پر مرکوز تھی۔ پنجاب میں سر فضل حسین کے مشورے سے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ جماعت بنی جو یونینسٹ پارٹی کہلائی۔ بنگال میں فضل الحق نے کرشک پرجا پارٹی بنائی ہوئی تھی اور اُن کے مقابلے میں خواجہ ناظم الدین تھے۔ ناظم الدین مسلم لیگ کے ساتھ ہو گئے۔ سرحد میں خان عبدالغفار خان اور ڈاکٹر خان صاحب کانگریس کے حامی تھے۔

مسلم لیگ نے اپنے انتخابی منشور میں یہ واضح کردیا تھا کہ وہ تمام جابرانہ قوانین منسوخ کرائے گی اور ملک میں جو اقتصادی لوٹ کھسوٹ ہو رہی ہے، اُسے روکے گی۔ حکومت کے بے وجہ اخراجات میں تخفیف اور فوج کو قومی رنگ دیا جائے گا۔ صنعت کے لئے ترقی کے راستے کھولے

جائیں گے اور سکے وشرح مبادلہ کا خیال رکھا جائے گا۔ ابتدائی تعلیم مفت ہوگی اور زرعی قرضوں کے بوجھ کو کم کیا جائے گا۔ مسلمانوں کے مذہب، زبان اور ثقافت کی حفاظت کی جائے گی نیز رائے عامہ کو بیدار کیا جائے گا۔

محمد علی جناح تمام صوبوں میں مسلمانوں کے اتحاد کے لئے جو کوشش کر رہے تھے، انہیں اس میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مثلاً بنگال میں فضل الحق اس بنا پر ناراض رہتے کہ مسلم لیگ کے انتخابی منشور میں زمینداری کے خاتمے اور ٹیکس عائد کئے بغیر مفت ابتدائی لازمی تعلیم کو شامل کیوں نہ کیا گیا۔ مسلم لیگ نے دونوں مطالبے منظور کر لئے تھے مگر وہ ٹیکس کے معاملے پر متفق نہ تھی۔ چنانچہ فضل الحق نے بنگال میں کرشک پرجا پارٹی قائم کر لی۔

پنجاب میں محمد علی جناح نے مسلمانوں کے اتحاد کے لئے بھرپور کوشش کی لیکن یہاں پر زمینداریاں حائل تھیں۔ دوسرا طبقہ سرمایہ داروں کا تھا یہ دونوں مل کر یونینسٹ پارٹی بنا چکے تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ پنجاب کے لوگوں میں جب بھی بیداری کی لہر پیدا ہوتی تو یہی یونینسٹ صوبے کے گورنر کے ساتھ مل کر ایسی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتے اس لئے کہ ان کے اپنے مفادات اسی صورت میں محفوظ رہ سکتے تھے۔ یہ روایتی طور پر ایک خوشامد پرست پارٹی تھی اسی پارٹی نے شہری اور دیہی علاقوں میں مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کی بھی بار بار کوشش کی۔ انتخابات کے وقت اس کی قیادت سر فضل حسین کے ہاتھ میں تھی۔ سر فضل حسین وائسرائے کونسل کی رکنیت سے ریٹائر ہونے تک جداگانہ انتخابات کے لئے سرتوڑ کوشش کرتے رہے لیکن انتخابات کے وقت اُن کے مؤقف میں اچانک تبدیلی ہو گئی اور انہوں نے جداگانہ انتخابات کی مخالفت شروع کر دی۔ محمد علی جناح ان سے ملے اور اس بات پر زور دیا کہ اتحاد قائم کر کے مسلمان، پنجاب سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑیں اور پھر اُن عناصر کے ساتھ مل کر وزارت بنائیں جو مسلم لیگ کے پروگرام سے ہم آہنگ ہوں۔ مگر سر فضل حسین کا کہنا یہ تھا کہ مسلمانوں کے پاس صوبائی اسمبلی میں صرف ۵۱ فیصد نشستیں تھیں لہذا جب تک اُنہیں کسی دوسری غیر مسلم جماعت کا تعاون حاصل نہ ہو، وزارت کی تشکیل مشکل ہوگی۔ فضل حسین اس سے پہلے ہی سر چھوٹو رام کی مدد سے ایک مخلوط پارٹی بنا چکے تھے۔ گو محمد علی جناح بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے۔ مگر یہ چاہتے تھے کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعاون بیشک کیا جائے لیکن نام مسلم لیگ کا ہو اور انتخاب اسی نام سے لڑے جائیں تاکہ مسلم لیگ اسمبلی میں اپنی جداگانہ

یت کو قائم رکھ سکے۔ لیکن سرفضل حسین نے محمد علی جناح کی کسی بات کو تسلیم نہ کیا۔ یہی وجہ
کہ انتخابات کے بعد جب صوبہ میں یونینسٹ وزارت بنی تو مسلمانوں کے مفادات کو شدید
پہنچا۔ یونینسٹ پارٹی میں ہندو اور سکھ بھی موجود تھے اور ظاہر ہے کہ انہیں مسلمانوں کے
ادات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟

سرفضل حسین ۹ جولائی ۱۹۳۶ء کو وفات پا گئے۔ اُن کی جگہ سر سکندر حیات خاں نے
پنجاب سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صرف دو امیدوار راجہ غضنفر علی خاں اور ملک برکت علی
ب ہوئے مگر اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی بنا پر۔ کانگریس کے ٹکٹ پر صرف دو مسلمانوں کو
یابی حاصل ہوئی۔ تین چار مسلمان بطور آزاد امیدوار کامیاب ہو گئے۔ ۱۸ مسلمان اور ۲۲ ہندو
یندار اور اچھوت ممبر یونینسٹ پارٹی کے ساتھ ہو گئے۔ جب سر سکندر حیات خاں نے کابینہ
ملیں کی تو انہوں نے ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کو اپنے ساتھ ملا لیا۔

سندھ اور صوبہ سرحد میں جو مسلمان امیدوار کامیاب ہوئے وہ بھی اپنے ذاتی اثر و رسوخ
بنا پر۔ مسلم لیگ کا کوئی امیدوار ان دونوں صوبوں میں کامیابی حاصل نہ کر سکا۔ صوبہ سرحد
یں سر عبدالقیوم نے فرنٹیئر یونائیٹڈ پارٹی اور سندھ میں سر عبداللہ ہارون نے سندھ یونائیٹڈ
رٹی قائم کر لی۔ ان دونوں جماعتوں نے غیر مسلم اقلیتی ممبروں کو ساتھ ملا کر اپنی اپنی اسمبلیوں
یں اکثریت حاصل کر کے وزارتیں بنا لیں۔

جہاں تک ہندو اکثریت کے صوبوں میں انتخابات کے نتائج کا معاملہ تھا تو ان چھ صوبوں
کی اسمبلیوں میں کانگریس کو ٹھوس اکثریت حاصل ہو گئی۔ ساتویں صوبہ آسام میں بھی کانگریس سب
سے بڑی پارٹی تھی (آزاد امیدواروں کے الحاق سے) جب کانگریس نے یہ دیکھا کہ اُسے
واضح اکثریت حاصل ہو چکی ہے تو اس نے نیا راستہ اختیار کیا۔

کانگریس نے انتخابات کے فوراً بعد تمام کامیاب کانگریسی کارکنوں کا ایک کنونشن دہلی
میں طلب کیا اور تمام صوبوں کی اسمبلی پارٹیوں کو حکم دیا کہ وہ مرکز کی اجازت کے بغیر کسی پارٹی
سے کوئی معاہدہ نہ کریں۔

کانگریس کا نیا ہتھیار

کانگریس نے ایک طرف اپنی اسمبلی پارٹیوں کو پابند کر دیا اور دوسری طرف یہ کہہ دیا

کہ کانگریس چھ صوبوں میں، جہاں اس کی اکثریت تھی، خود وزارت بنائے گی نہ ہی وزارت بننے دے گی البتہ وزارت سازی نہ ہونے اس صورت میں ممکن ہو گی کہ گورنر اپنے خاص اختیارات استعمال نہ کرنے کا وعدہ کریں۔

کانگریس نے تیسرا اقدام یہ کیا کہ تمام کامیاب مسلمان اُمیدواروں کو مسلم لیگ پارٹی کی وساطت سے یا بحیثیت مجموعی، صوبائی کابینہ میں نمائندگی دینے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ اُس نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ وہ صرف ایک پارٹی کی وزارت پر یقین رکھتی ہے حالانکہ بعد ازاں کانگریس نے صوبہ سرحد میں کانگریس پارٹی کو مخلوط وزارت بنانے کی اجازت دے دی۔ اس اقدام سے کانگریس کا مقصد محض اتنا تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کو ختم کر دیا جائے۔ کانگریس نے ایک مہم چلانے کا فیصلہ کیا جس کا نام "مسلم ماس کنٹیکٹ" رکھا گیا مقصد یہ تھا کہ مسلم اقلیت کو کانگریس میں مدغم کر دیا جائے۔ کانگریس کا تیسرا بڑا فیصلہ یہ تھا کہ اُس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی، صرف کانگریس اور برطانوی سامراج کے درمیان ہے ان دونوں کے علاوہ کسی تیسری پارٹی کا وجود نہیں۔ اس موقع پر کانگریس کے ناپاک ارادے کھل کر لوگوں کے سامنے آ گئے۔ کانگریس کے ایسے ہی اقدامات اور گھٹیا رویہ سے تنگ آ کر محمد علی جناحؒ نے پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا۔

"میں کانگریس اور اپنے ہندو دوستوں کو انتباہ کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کو تنہا چھوڑ دیں ہم نے یہ بات واضح کر دی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی بھی گروپ یا گروپوں کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہیں۔ بشرطیکہ اِن گروپوں کا مزاج آزادانہ ہو اور وہ تنگ دلی سے کام نہ لیں نیز ہمارے اور ان کے پروگراموں میں خاص مشابہت پائی جاتی ہو ہم کسی جماعت کے حاشیہ بردار نہیں بننا چاہتے۔ پنڈت نہروؔ نے کلکتہ میں یہ کہا ہے کہ ہندوستان میں صرف دو ہی فریق ہیں۔ ایک کانگریس اور دوسرا برطانیہ، ان کے علاوہ کسی تیسرے فریق کا وجود نہیں۔ میں نہروؔ کی اس بات کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کرتا ہوں۔ ملک میں ایک تیسرا فریق بھی موجود ہے جس کا نام مسلمان ہے۔ کوئی جماعت یا کوئی اکثریت ہمیں حکم دینے یا اپنے حکم پر چلانے کی کوشش نہ کرے۔"

یونینسٹ وزارت کا قیام

اپریل ۱۹۳۷ء میں یونینسٹ وزارت نے پنجاب میں عہدہ کا حلف اٹھا لیا اور اسی ماہ پنجاب اسمبلی کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ راجہ غضنفر علی خاں یہ سوچ رہے تھے کہ کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے جس کے ذریعہ پنجاب اسمبلی میں یونینسٹ پارٹی کی پارلیمانی قوت قائم رہے۔ اور اس کے تمام مسلم اراکین ایک تنظیم میں بھی شامل رہیں۔ خود وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان اسی قسم کے انتظام کے حق میں تھے۔ لاہور کے [illegible] کے بعد پنجاب اسمبلی کا دوسرا اجلاس شملہ میں ہوا۔ اب یونینسٹ پارٹی کے بہت [illegible] اکھ [illegible] شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کی صو[illegible] پیدا ہو جائے۔ اسی دوران کانگرس اور مسلم لیگ میں اختلافات واضح صورت اختیار کر گئے۔ لہذا سر سکندر حیات نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ضروری ہے۔ جب مسلم لیگ نے اپنا اجلاس لکھنؤ میں منعقد کیا تو ان تمام یونینسٹ اراکین کو جو انتخاب سے پہلے مسلم لیگ کونسل کے رکن تھے اور آئینی طور پر اس وقت تک ان کی [illegible] موجود تھی، کو مرکزی مسلم لیگ کی طرف سے دعوت نامے [illegible] کئے گئے۔ چنانچہ یہ سب لوگ اور خود سر سکندر حیات خاں اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ لکھنؤ میں محمد علی جناح اور سر سکندر حیات خان میں بات چیت ہوئی اور مفاہمت کی صورت پیدا ہو گئی۔ اس طرح ۱۳ اکتوبر کو مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان سمجھوتہ طے پا گیا۔ آئندہ روز مسلم لیگ کونسل نے اس سمجھوتہ کی توثیق کر دی۔

جناح سکندر پیکٹ

یہ سمجھوتہ جسے جناح سکندر پیکٹ کہتے ہیں۔ یہ تھا۔

۱۔ پنجاب واپس جانے کے بعد سر سکندر حیات یونینسٹ پارٹی کا خاص اجلاس طلب کریں گے اور ان تمام مسلمان اراکین کو جو مسلم لیگ کے رکن نہیں، مسلم لیگ میں شامل ہونے کا مشورہ دیں گے۔ اس صورت میں وہ کل ہند مسلم لیگ کے مرکزی اور صوبائی پارلیمانی بورڈوں کے قواعد و ضوابط کے پابند ہوں گے۔ اس انتظام کے بعد عام یا ضمنی انتخابات میں یونینسٹ کولیشن میں شامل گروہ ایسے تمام امیدواروں کی حمایت کریں گے، جو اس گروپ کی طرف سے کھڑے کئے گئے ہوں۔

مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہونے یا اس ٹکٹ کو قبول کرنے والے مسلمان اراکین اسمبلی، اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کے رکن شمار ہوں گے اس طریق پر مسلم لیگ کی جو پارٹی پیدا ہو گی اسے مسلم لیگ کے بنیادی اصولوں اور اس کی پالیسی کی بنیاد پر کسی دوسری پارٹی کے ساتھ سمجھوتہ یا اس کی تائید کا حق حاصل ہو گا۔ ضروری نہیں کہ یہ اقدام انتخاب کے موقع ہی پر ہو بلکہ انتخاب سے پہلے بھی ممکن ہو گا۔ انتخاب کے بعد قائم شدہ اتحاد، اپنا نام، یونینسٹ پارٹی ہی رکھے گا نئے انتظام کے تحت صوبائی پارلیمانی بورڈ پھر سے مرتب کیا جائے گا۔"

اس سمجھوتہ کا لب لباب یہ تھا۔ کہ یونینسٹ پارٹی مسلم لیگ کے اراکین اور غیر مسلم اراکین کا ایک اتحاد تھا نہ کہ یونینسٹ پارٹی ایک علیحدہ جماعت تھی تاہم اندرونی اتحاد کی خاطر یونینسٹ پارٹی کو اپنا نام قائم رکھنے اور ایک علیحدہ جماعت کی حیثیت میں آئندہ عام یا ضمنی انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت تھی۔ محمد علی جناح نے صوبائی مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لئے ایک تنظیمی کمیٹی قائم کر دی۔ جس میں اکثریت سر سکندر کی پارٹی کی تھی، وہی اس کمیٹی کے صدر تھے۔

اس اتحاد کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان، مختلف گروہوں سے وابستگی کے باوجود متحد ہو گئے اور مسلم قومیت اور مسلم اتحاد کا نیا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ [illegible] مسلمانوں کی واحد مسلمہ اور غیر متنازعہ جماعت بن گئی۔ جب کانگریس نے [illegible] کا جائزہ لیا تو اسے اپنا تختہ الٹتا نظر آیا۔ فوری طور پر پنڈت [illegible] اور گاندھی نے محمد علی جناح سے خط و کتابت کا آغاز کر دیا جب بات چیت ناکام ہو گئی۔ تو خط و کتابت شائع کر دی گئی۔ ناکامی کی بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ کانگریس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ اور کانگریس کو ہندوؤں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ جبکہ محمد علی جناح کی بنیادی شرط ہی یہ تھی۔ کہ اس نمائندگی کو تسلیم کیا جائے۔ کانگریس کو تمام ہندوستانی باشندوں کی نمائندگی کا دعویٰ تھا۔

محمد علی جناح سے قائد اعظم

اپریل ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کا ایک خاص اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا۔ اسی سال دسمبر میں اس کا سالانہ اجلاس پٹنہ میں ہوا! ان دونوں کی صدارت محمد علی جناح نے کی۔ گو اس سے پہلے نئے آئین کے وفاقی حصہ کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے گورنر جنرل کے خصوصی اختیارات کی بنیاد پر مسترد کر دیا تھا لیکن پٹنہ کے اجلاس میں محمد علی جناح نے اس وفاقی نظام کو ایک نئی

بنیاد پر مسترد کیا۔ بنیاد یہ تھی ۔ کہ اس نئے نظام کے تحت ہندوؤں کے ہاتھ میں جو اقتدار آنے والا تھا، وہ ہندوستان میں ہندو حکومت کے مترادف تھا۔

اسی سال محمد علی جناح مرکزی اسمبلی میں اپنی "آزاد پارٹی" ختم کرکے مسلم لیگ پارٹی بنا چکے تھے۔ مسلم لیگ کی جو نئی پارٹی بنی تھی ۔ اس کی قیادت بھی انہی کے ہاتھ میں تھی ۔ پارٹی کے نائب قائد سید غلام بھیک نیرنگ تھے ۔ جہاں تک مرکزی اسمبلی میں سرگرمیوں کا تعلق تھا تو محمد علی جناح مسلسل اس بات پر اصرار کرتے رہتے ۔ کہ وفاقی سکیم کی جگہ مرکز کو نئی صورت دی جائے۔ مسلمانوں کے مطالبات کے پیشِ نظر ایسی کوئی نئی سکیم منظور نہ کی جائے جس سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہو اور کانگرس کے وزارتی صوبوں میں اور کچھ ہند وریاستوں میں مسلمانوں پر جو زیادتیاں ہو رہی ہیں انہیں ختم کر دیا جائے ۔

انہی دنوں کیمبرج یونیورسٹی کے ایک پنجابی طالب علم چوہدری رحمت علی کی تجویز "پاکستان" ایک بار پھر مسلمان عوام اور اخبارات کی توجہ کا مرکز بنی۔ اس تجویز کے تحت ہندوستان کے لئے کوئی وفاقی نظام یا الحاق نہ تھا۔ بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دو مختلف آزاد ریاستوں کا تصور پیش کیا گیا۔

پٹنہ کے سالانہ اجلاس مسلم لیگ ہی سے محمد علی جناح ۔ قائد اعظم کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ اس اجلاس میں "قائد اعظم" زندہ باد" کا نعرہ پہلی بار مسلم لیگ کے ایک گرم جوش کارکن فیروز الدین احمد نے لگایا۔ پھر اس لقب کو ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے اپنا لیا۔

تصویر کا دوسرا رُخ

۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد گو کانگرسی رہنماؤں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا ۔ کہ وہ کہیں بھی مخلوط وزارتیں نہیں بنائیں گے ۔ انہوں نے گورنروں کو بھی واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اگر وہ اپنے خاص اختیارات استعمال نہ کرنے کا وعدہ کریں ۔ تو کانگرس وزارت سازی پر غور کر سکے گی۔ لیکن اس کے باوجود کانگرس کی زبردست خواہش تھی کہ وہ وزارتیں بنائے ۔ اس خواہش کو وہ زیادہ دیر تک چھپا نہ سکی ۔ ۲۲ر جون ۱۹۳۷ء کو وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے ایک بیان جاری کیا جو خاصا مبہم تھا ۔ اس بیان میں محض اخلاقی اعتبار سے یہ کہا گیا تھا ۔ کہ گورنر بلا وجہ اپنے اختیارات استعمال نہ کریں گے ۔ تاہم اس کی کوئی آئینی بنیاد نہ تھی ۔ نمایاں کانگرسی رہنما اور یو۔ پی کانگرس

کمیٹی کے فاؤنڈر ڈاکٹر رفیع احمد قدوائی نے اس بیان کے بارے میں اپنے ردِّ عمل کا اظہار یوں کیا۔

"ہمیں نہایت فراخدلی کے ساتھ اپنی شکست کا اعتراف کر لینا چاہیئے۔ برطانیہ کی سیاسی چال ہم پر مکمل غلبہ حاصل کر چکی ہے۔ کیونکہ وہی کانگرس جو عوام میں انقلابی رجحانات پیدا کرنا چاہتی تھی، اب حکومت برطانیہ کی دوست بن چکی ہے۔"

کانگرس نے وائسرائے کے بیان کا سہارا لیتے ہوئے اپنا تمام پروگرام اور تمام دھمکیاں بالائے طاق رکھیں؛ اور یو۔ پی، بہار، اڑیسہ، سی۔ پی، بمبئی اور مدراس میں وزارتیں قائم کر لیں۔ لیکن ابھی کانگرس کے سامنے ایک اور نہایت کٹھن مرحلہ تھا۔ وہ یہ کہ کانگرس پورے ہندوستان کے تمام لوگوں کی نمائندگی کی دعوے دار اور مسلم لیگ کے اس مؤقف کو کسی قیمت پر تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ لہٰذا کانگرس کے لئے اپنے دعوے کے ثبوت میں چھ صوبوں میں جہاں اسے وزارت بنانا تھی، وزارتوں میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو شامل کرنا ضروری ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی مسئلہ یہ بھی تھا۔ کہ ان چھ صوبوں میں سے ۳ میں کانگرس کے ٹکٹ پر کوئی مسلمان کامیاب نہ ہوا تھا۔ اور باقی تین صوبوں میں معدودے چند مسلمان کامیاب ہوئے تھے۔ چنانچہ اب کانگرس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے مسلمانوں کو رشوت دے کر اپنی طرف کرتی۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی کہ اُسے مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے اب کانگرس کی پوری طاقت مسلمانوں کو ورغلانے پر مرکوز ہو گئی۔ سی۔ پی، بہار، بمبئی اور مدراس میں کانگرس نے مسلم لیگیوں یا آزاد مسلمان اراکین اسمبلی کو وزارتوں کی رشوت پیش کی اور اس کے عوض انہیں ایک معاہدہ پر دستخط کرنے کو کہا۔ بالخصوص یو۔ پی میں مسلم لیگ پارٹی کو کانگرس میں مدغم کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ کانگرس کا خیال یہ تھا۔ کہ اس طرح آل انڈیا مسلم لیگ کو کاری ضرب پہنچائی جا سکتی ہے۔ حالانکہ کانگرس یہ سیدھا سادا طریقہ بھی استعمال کر سکتی تھی، کہ براہِ راست مسلم لیگ کے ساتھ گفت و شنید کرتی اور مخلوط وزارت بنا لیتی۔ لیکن اُس نے مسلم لیگ کے اراکین اسمبلی کو انفرادی حیثیت میں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب میں بھی یہ تاثر دیا کہ یو۔ پی میں کسی پالیسی کے تحت یا کسی اصول کی بنا پر مسلمانوں کو کانگرسی وزارت میں شامل کرنا مقصود نہ تھا۔ بلکہ بات صرف اتنی تھی کہ ایک یا دو مسلمانوں کو وزارت میں ضرور شامل کر لیا جائے۔

کانگرس کے لئے مشکل یہ تھی کہ یو۔ پی سے کانگرس کے ٹکٹ پر کوئی مسلمان کامیاب نہ ہوا تھا

ایک مسلم لیگی اُمیدوار ٹھاکر اصغر علی خان ضلع بھڑائچ سے کامیاب ہوئے۔ اور وہ بھی وفات پا گئے
ظاہر ہے کہ مسلم لیگ یہاں سے دوبارہ اپنا امیدوار منتخب کرا سکتی تھی۔ مگر ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ
نے اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہ کیا لہذا کانگرسی رہنما رفیع احمد قدوائی اس حلقہ سے بلا مقابلہ منتخب ہو
قدوائی کو اس انتخاب میں چوہدری خلیق الزمان کی حمایت حاصل ہو گئی۔ مگر کانگرس کی مشکل اپنی
موجود تھی۔ ابوالکلام آزاد نے یو۔ پی مسلم لیگ پارٹی کے قائد چوہدری خلیق الزمان سے سلسلہ جنبا
کی۔ اس بات چیت کا مقصد صرف اتنا تھا۔ کہ مسلم لیگ کے اراکین کو رشوت کے ذریعہ کانگرس
دامن میں سمیٹ لیا جائے۔ آزاد کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور ایک مسلم لیگی حافظ محمد ابراہیم
مسلم لیگ کے ساتھ غداری کے انعام میں وزارت کی کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ کچھ دوسرے مسلم لیگیوں کو
ورغلا کر پارلیمانی سیکریٹریوں کے عہدے دے دیئے گئے۔ محمد علی جناح نے اس معاملہ کا سختی
ساتھ نوٹس لیا اور کانگرس کے ان اوچھے ہتھکنڈوں کی شدید مذمت کی۔ انہوں نے صاف طور پر
کہ کانگرس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مسلم لیگ کی صفوں میں انتشار پیدا کرے۔ لیکن مجھے یقین
ہے کہ یو۔ پی کے مسلمان، ہندوستان کے مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائیں گے۔ چند افراد
مسلم لیگ کا ساتھ چھوڑ کر کانگرس کی انگلی پکڑ سکتے ہیں لیکن انہیں یہ نہ بھولنا چاہئے۔ کہ ان کا
انفرادی اقدام اس امر کا آئینہ دار نہیں کہ تمام مسلمان بھی ان کے پیچھے پیچھے چل نکلیں گے۔

جہاں تک یو۔ پی کے ان مسلم لیگی رہنماؤں کی طرف سے وفاداریاں تبدیل کر کے کانگرس
کے ساتھ رشتہ جوڑنے کا تعلق تھا۔ تو محمد علی جناح نے اس سلسلہ میں مسلم لیگ پارٹی کے قائد چوہدری
خلیق الزماں سے اصل حالات معلوم کرنے کے لئے بار بار خط لکھے۔ لیکن چوہدری صاحب
وعدہ کے باوجود کوئی جواب نہ دیا۔

شرط وفاداری

یو۔ پی اسمبلی کے مسلمان اراکین کو کانگرس میں شامل کرنے کے لئے جو معاہدہ کیا گیا وہ ابو
آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو نے ترتیب دیا تھا۔ اس کی شرائط حسب ذیل تھیں۔

۱۔ یو۔ پی اسمبلی میں مسلم لیگی گروپ ایک علیحدہ گروپ کی حیثیت ختم کر دے گا۔
۲۔ یو۔ پی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے اراکین، کانگریس پارٹی کے اراکین سمجھے جائیں گے
کانگرس کے جزو تصور ہوں گے۔ وہ کانگرس کی تنظیم اور اس کے کنٹرول کے پابند ہوں

کانگرس اسمبلی میں اپنے اراکین کے کردار کے بارے میں جو بھی فیصلہ کرے گی، یہ ممبر بھی ان کی مکمل اطاعت کریں گے۔ تمام امور رسلسہ وہی کے ذریعہ طے پائیں گے۔ اور ہر رکن کا ایک ۔۔۔ ہوگا۔

۳۔ کانگرس کی مجلس عاملہ اسمبلی میں اپنے اراکین کے لئے جو پالیسی وضع کرے گی، تمام کانگریسی اور وہ رکن جو کانگرس میں شامل ہو چکے ہیں۔ اس پالیسی کی پوری پابندی کریں گے۔

۴۔ یو۔ پی میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ ختم کر دیا جائے گا اور کسی ضمنی انتخاب میں بورڈ کی طرف سے کسی امیدوار کا نام تجویز نہیں کیا جائے گا۔ پارٹی کے تمام اراکین ایسے ہر امیدوار کی بھرپور حمایت کریں گے۔ جسے کانگرس نامزد کرے۔

۵۔ کانگرس کے تمام اراکین کانگرس کے قواعد وضوابط کی مکمل پابندی اور کانگرس کے مفادات اور وقار میں اضافہ کرنے کے لئے ہر ممکن تعاون کریں گے۔

۶۔ اگر کانگرس، وزارت یا اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کرے تو سب لوگ اس فیصلہ کے پابند ہوں گے۔

اس کے بعد پنڈت جواہر لعل نہرو نے ایک نئی چال چلی جس کے بارے میں خود ابوالکلام آزاد نے لکھا، کہ جب وہ الٰہ آباد پہنچے تو معلوم ہوا کہ جواہر لعل نہرو نے چوہدری خلیق الزماں اور نواب محمد اسمٰعیل خان کو مطلع کیا کہ ان دونوں میں سے صرف ایک کو وزارت میں شامل کیا جا سکے گا۔ یہ فیصلہ کہ کون وزارت میں شامل ہو مسلم لیگ پارٹی کر سکتی ہے۔

لیکن مقامی حالات ایسے تھے۔ کہ ان دونوں میں سے صرف ایک کسی صورت بھی حکومت میں شامل نہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ ان دونوں نے جواہر لعل نہرو سے معذرت کر دی۔ پنڈت نہرو کا مقصد یہ تھا۔ کہ اس طرح فیصلہ میں ملوث کرنے کے بعد مسلم لیگ پارٹی کی من حیث الجماعت وزارت میں شمولیت کا پراپیگنڈا کیا جا سکے اور یہ تاثر دیا جا سکے کہ مسلم لیگ کانگرس میں ضم ہو چکی ہے۔ مگر جواہر لعل نہرو کا یہی اقدام یو۔ پی میں مسلم لیگ کی حیاتِ نو کا پیغام لے کر آیا۔ محمد علی جناح نے حالات پر غور کرنے کے بعد موقع سے فائدہ اٹھایا اور مسلسل ایسے اقدامات کئے جو پاکستان کی تشکیل کی طرف رہنمائی کر رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ پنڈت نہرو کا مقصد مسلمانوں کو اپنے ساتھ شامل کرنا نہ تھا۔ بلکہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو ختم کرنا تھا۔ اگر اس موقع پر قائداعظم فوری طور پر مداخلت نہ کرتے

تو مسلم لیگ کو کل ہند سطح پر بالعموم اور یو۔ پی میں بالخصوص انتہائی نقصان کا سامنا کرنا پڑتا۔

کچھ ایسی ہی حرکت کانگرس نے بمبئی میں کی۔ اس پست حرکت کا حال معروف ہندو دینا کانجی دوارکاداس کی زبانی یہ ہے "بمبئی کے نامزد وزیر اعلیٰ نے وزارت بنانے سے پہلے قائداعظم سے درخواست کی کہ وہ دو مسلم لیگی اراکین اسمبلی کو وزارت میں شمولیت کی اجازت دیں۔ قائداعظم نے اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ یہ یقین بھی دلایا کہ وہ کانگرسی وزارت کے ساتھ مکمل تعاون کریں گے لیکن ہوا یہ کہ سردار پٹیل، نامزد وزیر اعلیٰ کی اس حرکت پر سخت ناراض ہوئے کہ اس نے قائداعظم سے ملاقات کیوں کی۔ چنانچہ ساتھ ہی یہ مطالبہ کر دیا گیا۔ کہ جو مسلم لیگی وزارت میں لئے جائیں گے۔ انہیں پہلے مسلم لیگ سے استعفٰی دینا پڑے گا۔ اس کے بعد انہیں کانگرس کا رکن بننا پڑے گا۔ پھر انہیں وزارتوں میں شامل کیا جائے گا۔ محمد علی جناح نے اس شرط کو ٹھکرا دیا۔ اگر کانگرس سیاسی تدبر سے کام لیتی اور اس قسم کی بے بنیاد شرائط عائد نہ کرتی۔ تو ملک کبھی دو حصوں میں تقسیم نہ ہوتا۔"

اسی سلسلہ میں ایک اور ہندو مؤرخ ڈاکٹر مجمدار نے لکھا۔

"اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ کانگرسی رہنماؤں کا یہ فیصلہ انتہائی غیر دانشمندانہ اور سنگین نتائج کا حامل تھا۔ اسی فیصلہ کی بنا پر مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ ایک علیحدہ قوم کی حیثیت میں ان کا سیاسی مستقبل ہندوؤں کے ہاتھوں میں کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ کانگرس نے جو اقدام کیا، اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے الگ الگ راستوں کا تعین کر دیا اور اسی وجہ سے پاکستان کی بنیاد پڑی۔"

کانگرسی حکومت، مسلمانوں کے مصائب

۶ صوبوں میں کانگرسی وزارتیں قائم ہوتے ہی مسلمانوں کے لئے لاتعداد مصائب پیدا ہو گئے یہ تمام صوبے ہندو راج کی منہ بولتی تصویر بن گئے۔ کانگریسی ہندوؤں نے مسلمانوں کے بارے میں جو پالیسی اختیار کی وہ انتہائی غیر منصفانہ اور متعصبانہ تھی۔ وزارتیں قائم ہونے کے فوراً بعد ہندوؤں نے عین نماز کے وقت مساجد کے آگے سنکھ اور باجے بجانے شروع کر دیئے۔ محرم کے جلوس میں پٹاخے چھوڑ کر تمام الزام اہل سنت کے سر منڈھ کر شیعہ سنی فساد پیدا کرانے کی کوشش کی لیکن مسلمان ہندوؤں کی اس پالیسی کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ لہٰذا وہ آپس میں کبھی نبرد آزما نہ ہوتے۔ کانگرس نے تمام سرکاری عمارات پر ترنگا جھنڈا لہرا دیا۔ اور تمام سکولوں میں بندے ماترم کا ترانہ

لازمی قرار دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی گائے کے ذبیحہ پر پابندی عائد کر دی۔ مسلمان اداروں سکولوں اور کالجوں پر ترنگا جھنڈا لہرانا ضروری قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی ان اداروں میں گاندھی کی تصاویر آویزاں کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور اس تصویر کو ہندوانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرنے پر بھی مجبور کیا گیا

قدرتی طور پر ان تمام باتوں کا اثر یہ ہوا۔ کہ مسلمانوں میں ہندوؤں کے خلاف نفرت پلنے لگی۔ اس بارے میں سر کوپلینڈ نے اپنی کتاب میں لکھا۔

"جن صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں وہاں فرقہ وارانہ فسادات اور لوٹ مار عام ہو چکے تھے۔ جب ۱۹۳۹ء میں کانگریسی وزارتوں نے استعفے دے دیئے تو اس وقت تک ان صوبوں میں ۷۵ فرقہ وارانہ فسادات ہو چکے تھے اور ڈیڑھ سو سے زائد افراد ہلاک ہوتے تھے۔ یہ اعداد سرکاری ہیں۔ جبکہ غیر سرکاری تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اگر کانگریسی حکومت کچھ عرصہ مزید قائم رہتی تو شاید قانون کا احترام ہی ختم ہو جاتا۔"

ان صوبوں میں نہتے مسلمانوں پر ہندو مہا سبھا اور کانگریسی غنڈوں نے لاتعداد مظالم ڈھائے لیکن کانگریسی حکومتوں نے ایسے عناصر کے خلاف کارروائی کرنے کی بجائے مسلمانوں ہی پر گولیاں برسائیں اور انہی کو جیلوں میں ٹھونس دیا۔ دور دراز دیہی علاقوں میں مسلمانوں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ انہیں زبردستی ہندو بنا لیا جاتا۔ تمام صوبوں میں عید کے موقع پر بھی گائے کی قربانی کی اجازت نہ تھی۔ حتیٰ کہ بہت سی جگہوں پر اذان بھی ممنوع قرار دے دی گئی۔ بہت سی مساجد کو شہید کر دیا گیا۔ اور مسلمانوں کو مذہبی جلوس نکالنے کی ممانعت بھی کر دی گئی۔ جہاں تک انتظامیہ کا تعلق تھا۔ تو وہ چھوٹے چھوٹے کانگریسی رہنماؤں کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتی تھی۔ اور بڑے بڑے افسر معمولی سے کانگریسی رہنما کے دباؤ میں رہتے تھے۔ اگر وہ کسی مرحلہ پر کسی کانگریسی رہنما کی بات ماننے سے انکار کر دیتے تو ٹیلیفون پر ان کے تبادلہ کا حکم مل جاتا۔ بہت سے کانگریسی عدالت کے فیصلوں میں بھی مداخلت کرتے۔ اور وزارتیں عدالتوں کے فیصلوں کو نظر انداز کر دیتیں۔

ہندو وزیروں کے تعصب کا عالم یہ تھا۔ کہ ایک بار سی۔ پی کے ایک مرفنع چندر بسواس میں ایک بدنام شخص جگ دیو نے ایک جلوس نکالا۔ مسلمانوں کے خلاف نعرے لگاتے۔ اور مسجد کے سامنے باجے بجاتے۔ اس علاقہ کی تھوڑی سی مسلمان آبادی سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔ اور فساد ہو گیا اسی فساد میں جگ دیو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ چند گھنٹوں بعد سی۔ پی کے وزیر اعلیٰ شکلا موقع پر پہنچے۔

انہوں نے نہ صرف مسلمانوں پر ہندوؤں کے خلاف سازش کا الزام لگایا۔ بلکہ انہی کے حکم کے تحت اس موضع کے ۱۷۵ مسلمان (موضع کی مجموعی مسلمان آبادی) گرفتار کر لئے گئے ان سب کو بلا کی گرمی میں ایک چھوٹے سے کمرہ میں بند کر دیا گیا۔ اس کے بارے میں سیشن جج کلارک نے یہ کہا۔" برطانوی سلطنت میں نازی جرمنی کا یہ نظارہ دیکھنے میں آیا۔" بعد ازاں ۱۴۴ افراد کو رہا کر دیا گیا۔ اور ۳۴ پر مقدمہ چلایا گیا۔ مقدمہ کے دوران صفائی کا ایک بھی گواہ موجود نہ تھا۔ ان میں سے ۶ کو سزائے موت اور ۲۴ کو عمر قید دی گئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس فیصلہ سے انتہائی اشتعال پیدا ہو گیا۔ چنانچہ قائداعظم نے بمبئی کے ایک ممتاز قانون دان سوم جی کو ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرنے کے لئے مقرر کیا۔ اس سلسلہ میں۔ چیف جسٹس سرگل برڈسٹون اور مسٹر جسٹس وویان بوس نے استغاثہ کی کہانی کے بارے میں کہا۔

۱ - کتنی تکلیف دہ بات ہے۔ کہ ۳۴ افراد انتہائی بھیانک جرم کے الزام میں ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔ شہادتوں پر شہادتیں ہو رہی ہیں۔ جو جھوٹ پر مبنی ہیں۔ یا پولیس کے من گھڑت قصے ہیں۔

۲ - یہ عدالت سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھتی لیکن اس موقع پہ سیاست کو درمیان میں لائے بغیر گذارہ بھی نہیں۔

۳ - اسمبلی میں ایک تحریک التوا پر بحث کے دوران اراکین اسمبلی میں بار بار قتل کا لفظ استعمال کیا۔ حتیٰ کہ خود وزیر اعلیٰ شکلا نے بھی یہی لفظ انتخاب کیا۔ قتل کے لفظ کے استعمال کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ جرم کے ارتکاب کے بارے میں پُر یقین تھے۔ اور یہ ظاہر کر رہے تھے۔ کہ یہ سب کچھ ایک منصوبہ کے تحت کیا گیا۔

۴ - پولیس نے جو شہادتیں مہیا کیں وہ اس حد تک بے بنیاد ہیں۔ اور گواہوں کو اس حد تک پڑھایا گیا ہے۔ کہ اتنے گواہوں کی موجودگی کے باوجود ہر بیان مختلف ہے۔ اور جو بیان یہ ثابت کرنے کے لئے دلوائے گئے کہ ہر شخص مجرم ہے، اس حد تک مسخ ہو چکے ہیں کہ کوئی شخص بھی مجرم نظر نہیں آتا۔

۵ - اور یہ کتنے ظلم کی بات ہے۔ کہ ۱۷۵ افراد کو گرفتار کیا گیا۔ اور ۳۰ فٹ، ۲۰ فٹ طویل و عریض کمرے میں انہیں رات بھر محبوس رکھا گیا۔

جس وقت یہ لوگ جیلوں میں تھے۔ تو ان کی عورتوں اور بچوں کو شدید اذیت پہنچائی گئی۔

ہندوؤں نے ان کا اقتصادی بائیکاٹ کر دیا۔ اور پڑوس کے مواضعات کے مسلمانوں کو ان کی مدد کے لئے آنا پڑا۔

یو۔ پی میں ایک موضع ٹانڈا میں مسلمان پارچہ بافوں کی خاصی تعداد موجود تھی اور ان میں اکثر کانگریسی تھے۔ ۱۴ راگست ۱۹۳۸ء کو ان مسلمانوں پر اس لئے فائرنگ کی گئی کہ انہوں نے مسجد کے سامنے ہندوؤں کو باجا بجانے سے روکا تھا۔

بہار کے موضع ٹلکوری میں بھی یہی کچھ ہوا۔ کچھ مسلمانوں نے ایک لڑکی کی شادی کے موقع پہ گائے کا گوشت خریدا۔ ہندوؤں نے یہ الزام لگایا کہ اُس نے ایک ہندو کی گائے ذبح کی ہے ہندوؤں نے ان مسلمانوں اور باراتیوں پہ حملہ کر دیا مسلمانوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں گردنوں سے جکڑ دیا گیا۔ اور پھر ان کے منہ میں زبردستی سوٗر کا گوشت ٹھونسا گیا۔ اس کے بعد ہندو گھروں میں داخل ہو گئے۔ اور انہوں نے مسلمان عورتوں کے کپڑے نوچ ڈالے اور ان کی آبرو ریزی کی۔ جب یہ مقدمہ سماعت کے لئے پیش ہوا۔ تو عدالت نے بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کہ مسلمانوں کو سور کا گوشت کھلانے کی کوشش کی گئی تھی۔ عدالت نے یہ بھی فیصلہ دیا کہ ہندو مسلمانوں کو ۲۰۰ روپے ہرجانہ دیں۔ اس مقدمہ میں جو ۳۴ ہندو ملزم تھے۔ انہیں ایک کانگریسی پارلیمانی سیکریٹری کے گھر میں رکھا گیا۔ ان میں کچھ کو سزائیں دی گئیں۔ لیکن جب ان ہندوؤں نے سیشن کورٹ میں اپیل کی تو عدالت نے ان کی سزاؤں کو حیران کن حد تک کم قرار دیا۔

حاشیہ برداروں سے سلوک

سی۔ پی اسمبلی کے ایک رکن یوسف شریف مسلم لیگ کے ٹکٹ پہ کامیاب ہوئے اور پھر کانگرس میں چلے گئے۔ جہاں انہیں وزیر قانون مقرر کر دیا گیا۔ انہیں دنوں عدالت نے دو ہندوؤں اور دو مسلمانوں کو ایک لڑکی پر مجرمانہ حملہ کے الزام میں مختلف سزائیں دیں۔ ملزموں نے حکومت سے رحم کی اپیل کی۔ یوسف شریف نے لڑکی کے مشکوک چال چلن کے پیش نظر سزاؤں میں تخفیف کر دی مگر ہندوؤں نے اس فیصلہ کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ کیونکہ لڑکی ہندو تھی۔ کانگرس ہائی کمان نے ہائی کورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج سرمان متھا ناتھ مکرجی کو تحقیقات پر مامور کیا۔ انہوں نے فیصلہ دیا کہ یوسف شریف نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا۔ نہ ہی کسی بددیانتی یا فرقہ واریت سے کام لیا۔ لیکن ان سے فیصلہ کرنے میں جو تھوڑی بہت غلطی ہوئی۔ اس کے تحت اس بات کا کوئی جواز

نہیں، کہ انہیں وزارت سے ہٹادیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود کانگرس ہائی کمان کے حکم کے تحت یوسف شریف کو وزارت سے استعفٰا دینا پڑا۔

یوسف شریف کی جگہ ایک ہندو مہتا کو وزیر قانون بنایا گیا۔ انہی دنوں ایک ہندو کو سیشن کورٹ سے اس الزام میں سزائے موت کا حکم دیا گیا کہ اُس نے ایک مسلمان لڑکی کو زہر کھانے پر مجبور کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ ملزم کی اپیل ہائی کورٹ سے بھی مسترد ہو چکی تھی۔ رحم کی اپیل ہوئی۔ تو مہتا نے ملزم کو رہا کرنے کا حکم دیا۔ مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا۔ بار ایسوسی ایشن، جس میں ہر مذہب کے وکیل شامل تھے، نے بھی احتجاج کیا، مگر کانگرس ہائی کمان نے تحقیقات کرانے کا مطالبہ مسترد کر دیا۔

غرض کہ مسلمانوں پر ظلم وستم اور تشدد کے لاتعداد واقعات کانگرس کے "ہندو راج" کے دوران عظیم کارناموں کی صورت میں موجود ہیں۔ اس تمام عرصہ میں کانگرس نے مسلمانوں کو دباتے اور ان سے غیر منصفانہ سلوک کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔

واردھا سکیم

کانگرس نے اس دور میں تعلیمی میدان میں بھی کچھ ایسی چالوں سے کام لیا کہ جس کے ذریعہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کو اپنی ثقافت سے بے بہرہ کیا جا سکتا تھا۔ واردھا سکیم گاندھی کی رہنمائی میں جامعہ ملیہ دلی کے پرنسپل ڈاکٹر ذاکر حسین نے تیار کی تھی۔ ہندو یہ چاہتے تھے۔ کہ مسلمانوں کو ان کے مخصوص فکر اور عمل سے دُور کر دیا جائے۔ اس سکیم کی بنیاد دو چیزوں پر تھی۔ یعنی ایک تو اہنسا اور دُوسری علاقائی وطنیت۔ اور یہ دونوں مسلمانوں کے بنیادی عقائد کے خلاف تھیں۔ اس سکیم میں غذائی تجاویز بھی شامل تھیں۔ یعنی مشترکہ خوراک، جس کا واضح مطلب سبزی خوری تھا۔ اور اسے تمام بچوں کے لئے لازمی قرار دے دیا گیا۔ اس سکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے درسی کتابیں تیار کرائی گئیں۔ اور ان کتابوں کے ذریعہ یہ بتایا گیا کہ دنیا کے تمام مذاہب سچے ہیں۔ حضور اکرمؐ کے بارے میں یہ لکھا گیا۔ کہ وہ عرب میں اسی قسم کی سچائی کی تبلیغ کرنے والے ایک مبلّغ تھے۔ اس سکیم کے بارے میں سر کوپلینڈ نے لکھا۔

"کانگرس نے اپنے دورِ حکومت میں تعلیم کے لئے جو سکیم تیار کی، وہ خاصی طنز آمیز تھی۔ نصابی کتابوں میں اسلام کی قیمت پر ہندو ازم کا پرچار کیا گیا۔ اور مسلمان بچوں میں ہندوؤں کے عقائد کے جراثیم شامل کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ دراصل کانگرس چاہتی یہ تھی،

بلکہ جو کام ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت میں کھلے بندوں نہ کر سکی۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں کو ہندو قومیت میں ضم نہ کر سکی، وہ کام اس نے واردھا سکیم کے تحت کرنا چاہا۔ اس لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بیزاری پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی۔"

اقتصادی تعصّب

علاوہ ازیں کانگرسی صوبائی حکومتوں نے مسلمانوں کے مالی مفادات پر ضرب لگانے سے بھی گریز نہ کیا۔ ایسے کاروباروں پر بھاری ٹیکس عائد کر دیئے گئے۔ جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھے۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیئے گئے۔ کچھ تو انگریزوں کی پالیسی نے مسلمانوں کو پسماندہ کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر کانگریس نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں پوری کر دی۔ علاوہ ازیں تکنیکی اداروں میں مسلمانوں کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ اور بہت سے مسلمان اداروں وغیرہ کی سرکاری امداد منسوخ کر دی گئی۔ اس سلسلہ میں ایک پرانے آئی سی ایس انگریز افسر مسٹر پینڈرل نے کہا کہ "ہندو لاکھ کہیں کہ مسلمان اُن کے بھائی ہیں۔ مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ سوتیلے بھائیوں سے بھی بدتر سلوک کرتے ہیں۔ اور اُن سے وہی سلوک کرتے ہیں جو اچھوتوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔" جہاں تک کسانوں کا تعلق تھا تو کانگرس نے حکومتوں کے قیام سے قبل کسانوں کی کس مپرسی کے رونے روئے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نے حکومت بنگال کے ٹیننسی بل (TENANCY BILL) کی مخالفت اس لئے کی کہ وہاں کاشتکار مسلمان اور ہندو زمیندار تھے۔ مگر یو۔ پی میں اس کے برعکس TENANCY LAW پر اس لئے اصرار کیا کہ وہاں کچھ مسلمان زمیندار بھی تھے۔ پنجاب میں ایسے بلوں کی مخالفت کی گئی۔ اور رہن اراضی کے بل، سود خوروں کے بل اور سیلز ٹیکس بل کو "سیاہ بلوں" کا نام دیا۔ حالانکہ یہ بل عوام کے مفادات میں تھے۔ کیونکہ لاتعداد مسلمان۔ ہندو سود خوروں کے قرضوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ بہار میں ہندو زمیندار زیادہ تھے لہذا وہاں کانگرس نے ان سے کاشتکاروں کے مسئلہ پر فوری سمجھوتہ کر لیا۔ کانگرسی صوبوں میں جہاں جہاں بھی مزدوروں کی ہڑتال ہوئی، کانگرسی حکومت نے اسے اسی طریق سے کچل دیا۔ جس طریق سے انگریز کچلا کرتا تھا۔ اور ہندو اس کی تنقید کا ہدف بنا کرتے تھے۔ غرضیکہ کانگرس نے ہر اعتبار سے کوشش کی کہ اپنے صوبوں میں مسلمانوں کو ختم کر دے۔ اس مقصد کے لئے اُن کے قتل عام تبدیلیٔ مذہب، اقتصادی استحصال اور تعلیمی راستے مسدود کرنے کے انتہائی پست ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔

باب ۲۵

دوسری عالمگیر جنگ ۔ کانگریسی وزارتوں کا خاتمہ

جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کیا تو ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو برطانیہ نے بھی جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ اس طرح دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہو گیا۔ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے یہ اعلان کیا کہ ہندوستان بھی اس جنگ میں شریک ہے۔ وائسرائے نے ہندوستان کے لوگوں سے برطانیہ کی مدد کرنے کی اپیل کی۔ انہوں نے تمام ہندوستانی رہنماؤں سے بھی اسی سلسلہ میں تفصیلی بات چیت کی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وائسرائے نے گاندھی کے ساتھ قائد اعظم کو بھی بات چیت کے لئے یاد کیا۔ قائد اعظم یہ کہے بغیر نہ رہ سکے،

"مجھے حیرت ہے کہ جنگ شروع ہوتے ہی میرے بارے میں حکومت کے انداز کیوں بدل گئے؟ مجھے آج گاندھی کی سطح پر لایا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مجھے اتنی 'ترقی' کیسے مل گئی؟"

حقیقت یہ تھی کہ مسلم لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت بن چکی تھی اور حکومت کو اس بات کا مکمل احساس تھا کہ مسلمانوں کے تعاون کے بغیر کام نہ بنے گا۔

وائسرائے کے ساتھ پہلے گاندھی کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنا روایتی طرزِ عمل قائم رکھتے ہوئے اپنی طرف سے وائسرائے کو مکمل تعاون کا یقین دلایا لیکن کانگریس کی طرف سے کوئی وعدہ نہ کیا۔ انہوں نے کہا:

"میں کانگریسی رہنماؤں سے مشورہ کئے بغیر کوئی وعدہ کیسے کر سکتا ہوں۔ میں

تو اس کا عام ممبر بھی نہیں لہذا مجھے اس کا کوئی اختیار نہیں۔"

مگر ایسے کسی بھی موقعہ پر گاندھی نے یہ کبھی نہ کہا کہ ان کے ساتھ بات چیت ہی نہ کی جائے کیونکہ وہ کانگرس کے ممبر تو ہیں نہیں لہذا مناسب یہ ہو گا کہ کانگرسی رہنماؤں کو بلایا جائے۔ دلچسپ بات یہی ہے کہ بات چیت کے لئے وہ خود آتے یا یوں کہئے کہ خود کانگرس انہیں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجتی، لیکن عین موقع پر وہ کانگرس کے ممبر نہ ہونے کا بہانہ تراش لیتے۔

گاندھی کے بعد قائد اعظم کی ملاقات ہوئی اور انہوں نے وائسرائے سے صاف صاف کہہ دیا کہ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ سے مشورے کے بعد ہی وہ کوئی وعدہ کر سکیں گے ۔۔ یعنی انہوں نے متفقہ رائے کو ذاتی رائے پر ترجیح دی۔

۱۱ ستمبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے نے اسمبلی کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ہندوستان کا وفاق ملتوی کیا جاتا ہے "تاہم حکومتِ برطانیہ وفاق کے نصب العین سے منحرف نہیں۔ وفاق ختم کرنے میں عجلت سے اس لئے کام لیا گیا کہ ملک میں تعاون کی فضا قائم کی جا سکے۔

مسلم لیگ نے اس اعلان کی روشنی میں کچھ فیصلے کئے جن کے تحت وفاق کے التواء کو مفید قرار دیا گیا بلکہ یہ درخواست بھی کی گئی کہ وفاق ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ مسلم لیگ نے اس بات پر اصرار کیا کہ ہندوستان کے آئندہ آئین کے مسئلہ پر نظرِ ثانی کی جائے۔ اس نے حکومتِ برطانیہ کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرائی کہ مسلمان ۔۔۔ مذہبی، سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور اقتصادی آزادی چاہتے ہیں اور ہندوؤں کے تسلط کو ناپسند کرتے ہیں۔ جہاں تک وفاق کا تعلق ہے تو مسلمان اس کی منسوخی کے مطالبے سے کبھی اور کسی صورت بھی دست بردار نہیں ہو سکتے۔ اپنے اجلاس میں مسلم لیگ نے فرانس، انگلستان اور پولینڈ سے اظہارِ ہمدردی کیا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ کانگریسی وزارتوں کے صوبوں میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم و ستم کو بند کرائے اور وزارتوں کو ہدایات دے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ انسانوں جیسا سلوک کریں۔

اہم مطالبہ یہ تھا کہ حکومت، مسلم لیگ کی رضا مندی کے بغیر ایسا کوئی اقدام نہ کرے جو ہندوستان کی آئینی ترقی سے متعلق رکھتا ہو نہ ہی مسلم لیگ کی رضا مندی کے بغیر کوئی آئین وضع کیا جائے۔

کانگرس نے حسبِ معمول پھر سودا بازی سے کام نکالنا چاہا۔ اس کی مجلس عاملہ نے یہ فیصلہ کیا کہ کانگرس اسی صورت میں حکومت کے ساتھ تعاون کر سکتی ہے جب ہندوستان کے لئے

آزادی کا وعدہ کیا جائے اور جنگ ختم ہوتے ہی منتخب دستور ساز اسمبلی کو آئین آزادی بنانے کا حق دیا جائے۔ ایک اور قرارداد میں کہا گیا کہ نیا آئین تو جنگ کے اختتام پر ہی بنایا جا سکے گا مگر حکومت، وائسرائے کی کونسل کو فوراً ایک قومی حکومت کی صورت دے، یعنی کونسل میں ان اراکین کو شامل کر لیا جائے جنہیں مرکزی اسمبلی کے منتخب اراکین کی حمایت حاصل ہو۔

وائسرائے نے ایک بار پھر مسلم لیگ اور کانگرس کے رہنماؤں سے ملاقات ضروری سمجھی۔ انہوں نے پہلے گاندھی سے ملاقات کی پھر ان کے بتائے ہوئے دو رہنماؤں جواہر لعل نہرو اور راجندر پرشاد سے ملے۔ ان دونوں کی ملاقات ۳۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو ہوئی۔ دونوں نے اصرار کیا کہ وائسرائے کی طرف سے جنگ کے بعد مکمل آزادی کا غیر مبہم اعلان کیا جائے اور ہندوستان کو یہ آزادی ہو کہ وہ آئین ساز اسمبلی کے ذریعے اپنا آئین تیار کرے۔ انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ تمام اختیارات مرکزی حکومت کے پاس ہوں اور ان اختیارات میں ہندوستانیوں کو شریک کیا جائے۔ انہوں نے آل پارٹیز کانفرنس کی تجویز کی بھی مخالفت کی۔

اگلے دن لبرل پارٹی کی طرف سے سر چمن لعل، اچھوتوں کی طرف سے ڈاکٹر امبیدکر، ہندو مہاسبھا کی طرف سے ساورکر اور پارسیوں کی طرف سے کاؤس جی جہانگیر نے وائسرائے سے مشترکہ احتجاج میں کہا کہ گاندھی نے وائسرائے کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ پورے ہندوستان کی نمائندگی صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ کچھ اور قومیں بھی اس ملک میں بستی ہیں۔ کانگرس کا یہ دعوٰی کہ وہ ملک کی واحد سیاسی جماعت ہے، بالکل بے بنیاد ہے۔

وائسرائے نے دوسری سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں سے بھی ملاقاتیں شروع کر دیں۔ اس دوران مختلف سیاسی رہنماؤں نے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا۔ جب کانگرس کا یہ ڈھونگ ختم ہو گیا کہ وہ ملک کی واحد نمائندہ جماعت تھی تو اس نے نئی کروٹ بدلی اور ایک قرارداد کے ذریعے احتجاج کیا کہ ہندوستانیوں کی مرضی کے بغیر ہندوستان کو جنگ میں کیوں دھکیلا گیا؟ یہ بات کانگرس کو اس وقت یاد نہ آئی جب وہ وائسرائے سے آزادی کا وعدہ لے رہی تھی، ایگزیکٹو کونسل میں ہندوستانیوں کی شمولیت کا مطالبہ کر رہی تھی اور نئے آئین پر مُصر تھی۔

وائسرائے نے ۱۱ اور ۱۸۔ ستمبر کو جو اعلانات کئے، ان کے مطابق کچھ مطالبات کو جزوی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے وفاقی حصے کو معطل کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا

گیا کہ جنگ کے اختتام پر ہندوستانیوں کو نوآبادیاتی درجے کی آزادی دینے کے لئے نیا آئین مرتب کرنے کی غرض سے تمام سیاسی جماعتوں سے مشورہ کرنے کے بعد کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔

کانگرس وزارتوں کا خاتمہ

۲۲۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو کانگرس کی مجلس عاملہ نے وائسرائے کے اعلان پر احتجاج کرتے ہوئے اپنے ایک ہنگامی اجلاس میں وزارتوں سے استعفےٰ دینے کا فیصلہ کر لیا اور چھ صوبوں میں قائم کانگرسی وزارتوں کو ہدایات جاری کیں کہ وہ ۳۰۔ اکتوبر تک مستعفی ہو جائیں۔ اسی اجلاس میں کانگرس کی طرف سے برطانوی حکومت کو جنگی مساعی میں کوئی مدد نہ دینے کا فیصلہ بھی کیا گیا کیونکہ حکومت نے اپنی پالیسی کی وجہ سے کانگرس کو کچلنے کی کوشش کی تھی۔

۲۲۔ اکتوبر ہی کو مسلم لیگ کا اجلاس ہوا اور یہ موقف اختیار کیا گیا کہ ۱۸۔ ستمبر کو مسلم لیگ نے وائسرائے کے سامنے جو اہم نکات پیش کئے، اُن کا کوئی تسلی جواب نہیں دیا گیا۔ لہٰذا وائسرائے کی طرف سے ان کی صراحت ضروری ہے۔ اجلاس نے قائد اعظم کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ ان نکات پر اطمینان کے بعد حکومتِ برطانیہ کو جنگ میں تعاون کا یقین دلا سکتے ہیں۔

۲۶۔ اکتوبر کو مسلم لیگ، کانگرس اور ہندوستان کی دیگر سیاسی جماعتوں کے مطالبات برطانوی پارلیمان میں زیرِ بحث آئے۔ یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ وائسرائے ہند کی کونسل میں توسیع کر کے اُس میں ہندوستانیوں کو بھی شامل کیا جائے۔

کانگرس اس بات پر بھی رضامند نہ ہوئی۔ نومبر تک تمام کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ ان تمام صوبوں میں گورنروں نے انتظام سنبھال لیا۔ آسام میں گورنر راج کی جگہ سر محمد سعد اللہ نے وزارت بنائی جو مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرتی رہی۔ پنجاب، سندھ اور بنگال میں وزارتیں قائم رہیں۔

حکومت کی نئی پیشکش

یکم نومبر کو وائسرائے نے قائد اعظم، راجندر پرشاد اور گاندھی سے پھر ملاقات کی اور یہ تجویز پیش کی کہ وہ کوئی مشترکہ حل نکالیں تاکہ وائسرائے کی کونسل میں سیاسی جماعتوں کے نمائندگا

کو شامل کیا جا سکے۔ جنگ کے خاتمہ تک یہی صورت رہے۔ بعد ازاں وسیع تر آئینی اصلاحات پر غور کیا جائے گا۔

مگر کانگریس کے نزدیک یہ تجاویز "معقولیت کے دائرے" میں نہ تھیں کیونکہ وہ تو ہر حالت میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر اپنا تسلط چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے قائدِ اعظم کی طرف سے سمجھوتے کی کوشش کے باوجود دستِ تعاون دراز نہ کیا۔ گاندھی اور راجندر پرشاد نے بھی اس بات پر اصرار کیا کہ جب تک "جنگ کے مقصد" کا بنیادی مسئلہ طے نہ ہو جائے۔ اس وقت تک کانگریس کسی دوسرے مسئلے پر کیسے غور کر سکتی ہے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ کانگریس نے خود تو قائدِ اعظم کی طرف سے سمجھوتے کی کوشش کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا لیکن راجندر پرشاد نے وائسرائے کو جو خط لکھا اس میں کہا گیا کہ "حکومت نے ایک بار پھر فرقہ وارانہ مسئلے کو گھسیٹنے کی کوشش کی ہے جو کانگریسی رہنماؤں کے لئے بڑے دکھ کی بات ہے۔ کانگریس تو ہر قدم پر یہ چاہتی ہے کہ تمام فرقہ وارانہ مسائل آرام سے اور باہمی رضامندی کے تحت حل کئے جائیں اور کانگریس اس کے لئے تیار بھی ہے، لیکن یہ مسئلہ آزادیٔ ہند کے اعلان کے راستے میں حائل کیوں کیا جا رہا ہے؟"

کانگریس نے جو چار مطالبات پیش کئے اُن کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ ہندوستان پر اپنا تسلط جمائے۔ ان مطالبات میں پہلا تو یہ تھا کہ حکومتِ برطانیہ جنگ کا مقصد بتائے اور یہ واضح کرے کہ ہندوستان پر اس کا اطلاق کیسے ہوتا ہے؟ دوسرے یہ کہ ہندوستانیوں کو آئین ساز اسمبلی کے ذریعے اپنا آئین خود بنانے کا حق دیا جائے اور تیسرے کہ ہندوستان کی مکمل آزادی اور خود مختاری کا اعلان کیا جائے نیز یہ کہ ہندوستان کی آزادی وحدت پر ہو گی، یعنی اسے تقسیم نہ کیا جائے۔

یہ مطالبات کرتے وقت کانگریس نے صرف اپنے اقتدار کو سامنے رکھا اور دیگر تمام اقوام کے مطالبات اور حقوق و مفادات کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔

وائسرائے نے ایک بار پھر مختلف رہنماؤں سے ملاقات کی صورت پیدا کی۔ قائدِ اعظم نے ملاقات کے بعد ۵۔ نومبر کو وائسرائے کے نام جو خط بھیجا اس میں یہ چار باتیں شامل تھیں:

۱۔ جنگ کے بعد یا حالات سازگار ہوتے ہی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ سے قطع نظر، ہندوستان کے آئندہ دستور پر از سرِ نو غور کیا جائے۔

۲۔ حکومتِ برطانیہ یا برطانوی پارلیمان ہندوؤں اور مسلمانوں کی رضامندی حاصل کئے بغیر

آئین وضع کرے نہ ہی کوئی متعلقہ اعلان کرے۔

۳۔ حکومتِ برطانیہ فلسطین میں عربوں کے تمام قومی مطالبات پورے کرنے کی کوشش کرے۔

۴۔ ہندوستانی فوجوں کو کسی ملک کے خلاف ہندوستان سے باہر استعمال نہ کیا جائے۔

وائسرائے ہند نے ان چاروں باتوں کا اتنا مبہم جواب دیا کہ قائداعظم مطمئن نہ ہو سکتے تھے۔ گاندھی نے قائداعظم پر یہ الزام لگایا کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کانگریس پر تو بھروسہ نہیں کرتے لیکن انگریز پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ (قائداعظم) ہندوستان کی آزادی کے راستے میں حائل ہیں۔

قائداعظم نے جواباً کہا "گاندھی کی یہ بات توہین آمیز اور بے بنیاد ہے۔ گاندھی کی سطح کے شخص سے اتنے چھوٹے جرم کے ارتکاب کی توقع نہیں تھی۔ وہ جو چاہیں کہیں، لیکن مسلمان اپنے جائز حقوق کے حصول کا عزم کر چکے ہیں اور ان کی خاطر وہ آخری دم تک لڑیں گے خواہ اس مقصد کے لئے انہیں کانگریس سے لڑنا پڑے یا انگریز سے۔ مسلمان صرف اپنی طاقت پر بھروسہ رکھتا ہے۔"

دسمبر میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے مسلسل ایسے بیانات دیئے جو قائداعظم کے خلاف جھوٹے الزامات پر مبنی تھے۔ قائداعظم بہت دنوں تک خاموش رہے۔ آخر انہوں نے نہ صرف وہ خط و کتابت شائع کر دی جو ان کے اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے درمیان ہوئی تھی بلکہ ایک مختصر سا بیان بھی دیا۔

"نہرو اس الزام کو بار بار دُہرا رہے ہیں کہ میں ہندوستان پر برطانیہ کا تسلط قائم رکھنے پر تلا ہوا ہوں۔ یہ الزام سراسر بے بنیاد بلکہ گھٹیا اور بے ہودہ بھی ہے۔"

مسلم لیگ کا یومِ نجات

جب تمام صوبوں سے کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں تو مسلم لیگ نے ۲۲۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو یومِ نجات منانے کا فیصلہ کیا۔ یومِ نجات چھ صوبوں میں ہندو راج اور اس کے ظلم و ستم کے خلاف منایا جانا تھا۔ ہندوستان کے کونے کونے میں مسلمانوں نے شکرانہ ادا کیا اور ایک ہی قرارداد منظور کی جس میں مختلف صوبوں میں ہندو حکومتوں کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کا تذکرہ تھا۔ گورنر جنرل سے مسلمانوں کی شکایات کی تحقیقات کرانے کا مطالبہ کیا گیا۔ اس

"یومِ نجات" میں ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ دوسری اقوام نے بھی حصہ لیا۔ کانگریس کو منہ کی اس قدر کھانا پڑی کہ بہت سے کانگریسیوں نے بھی مسلمانوں کے اس اقدام کو برحق قرار دیا۔ یومِ نجات اتنے باوقار طریق پر منایا گیا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ممتاز انگریز صحافی سر آرتھر مور نے "یومِ نجات" کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا:

"یومِ نجات پر کانگریس اس طرح بوکھلا گئی جیسے کسی جنگلی سور کو زخمی کر دیا گیا ہو۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس موقع پر کوئی فساد، کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ صوبوں کے گورنروں اور بعض ایسے لوگوں نے، جن میں میں خود بھی شامل ہوں، کانگریسی حکومتوں کی بہت تعریف و توصیف کی تھی لیکن جلد ہی ہم پر یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ چھ صوبوں کی کانگریسی وزارتیں اپنے دورِ حکومت میں شکایات، غم و غصہ اور عدمِ اعتماد کے پلندے جمع کر رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم شروع ہی میں انہیں سمجھنے سے قاصر رہے۔"

بات چیت کا نیا دور

۱۰ر جنوری ۱۹۴۰ء کو وائسرائے نے بمبئی کے ایک کلب میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ حکومتِ برطانیہ، ہندوستان کے ملکی اتحاد اور اقلیتوں کے تحفظ کو بہت ضروری قرار دیتی ہے۔ انہوں نے ہندوستانی رہنماؤں سے ایک بار پھر اپیل کی کہ وہ اتحاد قائم کریں اور کسی مشترکہ فیصلے پر پہنچ جائیں۔ بمبئی سے واپسی سے قبل وائسرائے نے قائداعظم سے بھی ملاقات کی۔ قائداعظم نے جنگ کے خاتمے تک سمجھوتے کے لئے جو تجاویز پیش کیں اُن میں صوبوں کے اندر مخلوط وزارتوں کا قیام کسی ایسے قانون کے نفاذ سے اجتناب جو مسلمانوں کو متاثر کرتا ہو اور مسلمان اراکین اسمبلی کی مجموعی تعداد کا دو تہائی اس کا مخالف ہو، کانگریس کے جھنڈے سرکاری عمارتوں پر لگانے سے احتراز، بندے ماترم کے ترانے پر پابندی اور مسلم لیگ کے خلاف کانگریس کی تخریبی کارروائیوں سے گریز۔ شامل تھیں۔

وائسرائے نے بمبئی میں بھولا بھائی ڈیسائی سے بھی ملاقات کی۔ وہ اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے قائد تھے۔ لیکن انہوں نے وائسرائے سے ذاتی حیثیت میں بات چیت کی، جس کا لب لباب یہ تھا کہ صوبوں میں کسی نہ کسی طرح دوبارہ کانگریسی وزارتیں قائم ہو جائیں۔ حقیقت یہ تھی کہ کانگریس،

وزارتوں سے مستعفی ہونے کے بعد کفِ افسوس مل رہی تھی اور دوسری طرف گاندھی کو یہ غم
کھائے جا رہا تھا کہ وائسرائے نے کانگریس کو اہمیت دینا کیوں بند کر دی ؟ آخر انہوں نے خود
ہی وائسرائے کو ایک خط میں لکھا کہ "اقلیتوں کے مسئلہ پر آپ جس انداز میں عمل کرتے ہیں، یقیناً
اُس عمل کے لئے آپ کے پاس کوئی بنیاد بھی ہوگی ۔ لیکن اقلیتوں اور اچھوتوں کے بارے میں آپ
نے بمبئی میں جو کچھ کیا وہ میرے لئے ناقابل فہم ہے"۔ گاندھی نے یہ پیشکش بھی کی کہ اگر وائسرائے
اُن سے ملنا چاہیں تو خط یا تار کے ذریعے اطلاع دے دیں۔ اس خط کے دو دن بعد ہی گاندھی کی
ملاقات وائسرائے کے ساتھ ہو گئی۔ گاندھی نے وائسرائے کو یہ جتانے کی کوشش کی کہ وہ بالکل ذاتی
حیثیت میں اُن سے ملنے چلے آئے تھے کیونکہ کانگریس تو اِن سے سخت ناراض تھی نیز گاندھی نے
بڑی مشکل سے وائسرائے کے ساتھ ملاقات کی صورت پیدا کی ۔ کانگریس حالات سے بددل ہے
لہٰذا فوری طور پر کوئی تصفیہ ہونا ضروری ہے ۔ گاندھی نے یہ بھی کہا: حالات ایسے ہیں کہ قتل عام بھی
ہوسکتا ہے لیکن عدم تشدد پر یقین رکھنے کے باوجود میں اس قتل عام کو بلا ہچکچاہٹ دیکھوں گا۔
میرے ساتھی مجھے مجبور کر رہے کہ میں جنگ کا اعلان کردوں۔ مگر میں نے ہی ایسا کرنے سے انکار کردیا۔

گاندھی نے دوسرے الفاظ میں وائسرائے کو یہ جتانے کی کوشش کی کہ انہوں نے فسادات،
قتل وغارت، جنگ اور انگریز حکومت کے خلاف پورے ہندوستان کی نفرت اور بیزاری کو
اپنی قوت کے بل پر روکا ہوا تھا۔ اُن کا اشارہ پاتے ہی قیامت ٹوٹ پڑے گی اور انگریز کو اس
ملک سے بھاگتے ہی بن پڑے گی۔

مگر وائسرائے نے گاندھی سے کہا کہ جب وہ اختیار ہی نہیں رکھتے کہ کانگریس کی طرف سے
بات کر سکیں تو بات چیت کا فائدہ ہی کیا ؟ بہتر یہ ہوگا کہ گاندھی پہلے یہ اختیار نامہ حاصل کر لیں یا
بااختیار کانگرسی رہنماؤں کو ساتھ لے کر آئیں تاکہ جو بھی فیصلہ ہو اس کی پابندی ضروری
ہوجائے۔

مخلوط وزارتوں کے بارے میں مسلم لیگ کی پیش کش پر گاندھی نے وائسرائے کو یہ جواب
دیا کہ دراصل مسلم لیگ کا مزاج اتنا بگڑ چکا تھا کہ اُس سے سمجھوتے یا مل جل کر کام کرنے کی توقع
ہی نہیں رکھی جا سکتی ۔ لہٰذا یہ گفتگو بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوسکی۔

گاندھی کے بعد قائداعظم نے وائسرائے کی دعوت پر ملاقات کی اور اُن سے کھل کر پوچھا
کہ مسلم لیگ کے نکات کا واضح جواب کیا ہے ؟ دراصل قائداعظم یہ بات صاف کرنا چاہتے تھے کہ

اگر صوبوں میں کانگریسی وزارتیں پہلی صورت میں واپس آئیں تو ملک بھر میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ قائد اعظم نے دیگر مطالبات کو بھی دُہرایا ۔ اُن کی ملاقات بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی۔ بعد ازاں مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کا ایک وفد انگلستان جائے اور وہاں کے عوام اور حکومت کو مسلم لیگ کے مطالبات اور مسلمانوں کے مؤقف سے آگاہ کرے

باب ۲۶

قرارداد پاکستان

۵۔ فروری ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کونسل کے اجلاس دلی میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ جب ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہو تو اس میں ایک قرار دار پیش کی جائے۔ اس قرارداد کا مسودہ سر سکندر حیات خاں نے تیار کیا جو ملک کی تقسیم کے مطالبہ کی بنیاد پر تھا۔ جب یہ مسودہ نئی دلی میں قائد اعظمؒ کے پاس منظوری کے لئے بھیجا گیا تو انہوں نے اسے موضوعاتی کمیٹی (SUBJECTS COMMITTEE) کے سامنے رکھ دیا۔ کمیٹی نے اس مسودہ میں خاصی تبدیلیاں کیں جو بعد ازاں قرارداد لاہور کی صورت میں ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے آئیں۔

مسلم لیگ کا یہ تاریخی اجلاس لاہور کی شاہی مسجد کے زیر سایہ منعقد ہوا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قائد اعظم کی صدارت میں یہ قرارداد اے۔ کے فضل الحق نے پیش کی جس کی تائید مولانا ظفر علی خاں، چودھری خلیق الزماں، نواب محمد اسماعیل خاں، سر عبد اللہ ہارون، عبد الحمید خاں، قاضی محمد عیسیٰ، آئی آئی چندریگر، ڈاکٹر محمد عالم، سید ذاکر علی، بیگم مولانا محمد علی جوہر، سردار اورنگ زیب خاں اور سید عبد الرؤف شاہ نے کی۔

قرارداد یہ تھی:

۱۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس نہایت غور و فکر کے بعد اس ملک میں صرف اسی آئین کو قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول قرار دیتا ہے جو جغرافیائی اعتبار سے

باہم متصل یونٹوں کی صورت میں حد بندی کا حامل ہو اور بوقت ضرورت ان میں اس طرح رد و بدل ممکن ہو کہ جہاں جہاں مسلمانوں کی اکثریت بہ اعتبار تعداد ہو، انہیں آزاد ریاستوں کی صورت میں یکجا کر دیا جائے اور ان میں شامل ہونے والی وحدتیں خود مختار اور حاکمیت کامل کی حامل ہوں۔

۲۔ ان وحدتوں اور ہر علاقائی آئین میں اقلیتوں کے مذہبی، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی مفادات اور حقوق کے تحفظ کی خاطر ایسی اقلیتوں سے مشورے کے بعد موثر تحفظات شامل ہوں اور ہندوستان کے اُن تمام حصوں میں جہاں مسلمان آبادی کے اعتبار سے اکثریت میں نہیں تحفظ کا یقین دلایا جائے۔

۳۔ یہ اجلاس مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ ان اصولوں پر مبنی آئین کا لائحہ عمل مرتب کرے جس میں دونوں خطوں کے تمام اختیارات اور دیگر اہم امور کو سنبھالنے کا انتظام کیا جائے۔"

اس قرارداد کے بعد پہلی بار ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ایک آزاد اسلامی مملکت کا واضح اور غیر مبہم تصور آیا۔ یہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی۔ ایک بار پھر مسلمانوں کو احساس ہوا کہ ان کی جنت گم گشتہ انہیں واپس مل جائے گی اور وہ انگریز اور ہندو کی چالوں اور ان کے ظلم و ستم سے نجات حاصل کر لیں گے۔ ایک آزاد مملکت کی تائید کر کے یوپی، سی پی، بہار، مدراس اور بمبئی کے مسلمانوں نے جس عظمت اور اسلامی اخوت کا ثبوت دیا تھا اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اس قرارداد کی تائید کرنے والوں میں بہت سے لوگ ایسے تھے جن کا تعلق مذکورہ بالا علاقوں سے تھا۔ یہ لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ ہندوستان کی تقسیم اور ایک آزاد علیحدہ اسلامی مملکت کے قیام کے بعد انہیں ہندو حکومت کے زیرِ سایہ جانے کتنے مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور ان پر ہندو کی طرف سے کیا کیا ظلم توڑے جائیں گے، لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی ان مسلمانوں نے بہت بڑی قربانی دی۔

اس قرارداد کو "قرارداد تقسیم ہند" کا نام دیا گیا۔ صرف بیگم محمد علی جوہر نے اسے "قرارداد پاکستان" کہا کیونکہ پاکستان کا لفظ، اس لفظ کے موجد چودھری رحمت علی کی وجہ سے لوگوں میں مانوس ہو چکا تھا۔

قائد اعظم کا خطبۂ صدارت

اس موقع پر قائد اعظمؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا :

" حکومت برطانیہ ، ہندوستان کے مسئلہ کو بین الاقوامی مسئلہ تسلیم نہیں کرتی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے چند فرقوں کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے اور اس کا حل اسی بنیاد پر تلاش کرنا ضروری ہے۔ اگر اس بنیاد کے بغیر کوئی دستور وضع کرنے کی کوشش کی گئی تو تباہی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ اگر حکومتِ برطانیہ ہندوستان کے رہنے والوں کے لئے فی الواقعہ خلوص کے جذبات رکھتی ہے اور ان کو امن و امان سے ہمکنار دیکھنا چاہتی ہے تو اسے چاہیے کہ ہندوستان کو تقسیم کر دے اور دو بڑی اقوام یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے الگ الگ وطن قائم کر دے تاکہ وہ مکمل خودمختاری کے ساتھ اپنی اپنی قومی ریاستیں قائم کریں۔ ان ریاستوں کے درمیان عداوت کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی البتہ وہ ایک دوسرے پر چھا جانے کی کوشش ترک کر دیں گے۔ ان دو ریاستوں کے قیام سے اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ دونوں کے درمیان ایک دوسرے کی مرضی سے تمام امور طے پا جائیں گے نیز مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے حقوق و مفادات کی موثر حفاظت ہو جائے گی۔ یہ خواب دیکھنا کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم بن جائیں گے ، بے سود ہے۔ بنیادی طور پر دونوں دو الگ الگ اور مختلف اجتماعی نظام کے حامل ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہندو آج تک اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں کیونکہ مذاہب ، ثقافت ، رسم و رواج اور مذہبی فلسفہ ، غرضیکہ سب کچھ مختلف ہے۔ اس صورت میں بھلا وہ ایک قوم کے افراد کیونکر کہلا سکتے ہیں ؟ اگر حقائق سے نظریں چراتے ہوئے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر دونوں قوموں کو ایک قوم تصور کرنے کے بعد مشترکہ نظام قائم کر بھی لیا جائے تو ایک دن وہ بہرحال تباہ ہو کر رہ جائے گا۔ تاریخ ایسی غلط بنیادوں پر قائم کھوکھلے نظام کی تباہیوں سے

تحفظ کی بات کیوں کی گئی۔ مسلمانوں کو یہ دُکھ تھا کہ اس سے ہندوستان میں ، بسنے والی متعدد اقوام کی جگہ ایک قوم اور متحدہ ہندوستان کا تاثر ملتا تھا۔

جنگ کے اثرات

نازی فوجیں اتحادیوں پر کاری ضرب لگا رہی تھیں ۔ جون ۱۹۴۰ء تک نازی فوجوں نے قریباً نصف یورپ پر قبضہ کر لیا تھا۔ فرانس ، ہالینڈ ، بلجیم اور ڈنمارک نازیوں کے قبضہ میں جا چکے تھے ۔ ان حالات میں حکومت برطانیہ نے اپنی وزارت میں تبدیلی کی ۔ مئی میں چیمبرلین کی جگہ چرچل برطانیہ کے نئے وزیر اعظم مقرر ہوئے ۔ برطانیہ کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ اپنی تمام تر توجہ جنگ پر مرکوز کر دے اور ہندوستان سے مکمل جنگی تعاون کو خاص اہمیت دے ۔ وائسرائے ہند نے برصغیر کی تمام سیاسی جماعتوں کو اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کی کہ فی الحال وہ آئینی امور پر بحث بند کر دیں اور وائسرائے کی کونسل میں اپنے نمائندوں کو شامل کر کے عملاً حکومت میں شامل ہو جائیں۔

اس دوران آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے وائسرائے کو ایک خط کے ذریعہ اپنے فیصلوں سے آگاہ کیا۔ ان میں بنیادی بات یہ تھی کہ مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر آئینی مسائل اور ایسے دیگر اہم معاملات پر کوئی اعلان نہیں کیا جائے گا۔ نیز ملک کو درپیش خطرہ کے مقابلہ کے لئے صرف صوبائی اور ضلعی کمیٹیوں میں ہندوستانیوں کی شرکت بے سود ہوگی — مجلس عاملہ نے ایک اور قرارداد کے ذریعہ تمام صوبائی اور ضلعی مسلم لیگوں کو آئندہ ہدایات تک جنگی کمیٹیوں میں شرکت سے روک دیا۔

۱۷۔ جون کو کانگرس کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا۔ کانگرس کی نئی پالیسی یہ تھی کہ گاندھی کے اس نظریہ پر کہ اتحادی عدم تشدد کے ذریعہ نازیوں کا مقابلہ کریں ، کانگرس موجودہ حالات میں یقین نہیں رکھتی اور اس پالیسی میں گاندھی کا ساتھ نہیں دے سکتی ۔ گاندھی جس طرح چاہیں عمل کریں اور ان پر کانگرس کے لائحہ عمل اور سرگرمیوں کی کوئی ذمہ داری عائد نہ ہوگی — کانگرس نے یہ کہہ کر وہی رویہ اختیار کیا جو دکھاوے کے لئے کوئی باپ اپنی اولاد کو عاق کر کے روا رکھتا ہے ۔ فرق صرف اتنا تھا کہ باپ نے اولاد کو عاق کرنے کی جگہ اولاد نے باپ کو عاق کر دیا تھا۔ کانگرس نے اس قرارداد میں یہ بھی کہا کہ وہ تمام ملک میں ایک متوازی

نظام کی حیثیت سے کام کرے گی تاہم وہ حکومت کی قائم کردہ جنگ کمیٹیوں سے تعاون پر آمادہ نہیں ہوگی ۔ کوئی کانگرسی جنگ کے لئے چندہ نہ دے گا نہ ہی سول گارڈز میں بھرتی ہوگا ۔

جون ۱۹۴۰ء میں قائداعظم اور وائسرائے کو چند تجاویز بھیجیں ، جن میں کہا گیا تھا کہ برطانوی حکومت کی طرف سے قرارداد لاہور اور ہندوستان کی تقسیم کے برعکس کوئی اعلان یا بیان جاری نہیں کیا جانا چاہئے کیونکہ ہندوستان کے مسلمان بطور عقیدہ قرارداد پاکستان کو اپنا چکے ہیں۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین دلائے کہ ان کی رضامندی کے بغیر کوئی مستقل یا عارضی آئینی لائحہ عمل اختیار نہیں کیا جائے گا ۔ تیسری تجویز یہ تھی کہ مسلمانوں کو ہندوستان کی سلامتی کا مکمل احساس ہے اور وہ اس سلسلہ میں ممکنہ اقدامات پر یقین رکھتے ہیں لیکن جب تک مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں مسلمانوں کو مناسب حیثیت نہیں دی جاتی ، مسلمان کسی تعاون سے قاصر ہوں گے ۔ دراصل قائداعظم یہ چاہتے تھے کہ ملک میں جو آئین موجود تھا ، اس کے تحت وائسرائے کی کونسل کو وسعت دی جائے ، کانگرس کی شرکت کی صورت میں مسلم لیگی نمائندوں کی تعداد مساوی ہو اور گورنری راج کے صوبوں میں غیر سرکاری مشیر مقرر کئے جائیں جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہو نیز ۱۵ اراکین پر مشتمل ایک جنگ کونسل قائم کی جائے جس کے صدر وائسرائے ہوں ۔ یہ کونسل تمام دفاعی امور کے بارے میں مشورے دے ۔ اس کونسل میں اگر کانگرس بھی شریک ہو تو مسلمانوں کو ہندوؤں کے مساوی نمائندگی دی جائے ۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایسی جنگ کونسل یا ایگزیکٹو کونسل میں شریک ہونے والے مسلمان نمائندوں اور غیر سرکاری مشیروں کا انتخاب مسلم لیگ کی صوابدید پر ہو۔

جولائی میں وائسرائے نے کونسل میں توسیع کی تجویز تو منظور کرلی۔ مگر ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی نمائندگی کو قبول نہ کیا۔ جہاں تک اراکین کی نامزدگی کا تعلق تھا تو یہ کام صرف گورنر جنرل پر چھوڑ دیا گیا۔

فوراً بعد کانگرس کی مجلس عاملہ کا اجلاس دلی میں ہوا۔ جس نے فیصلہ کیا کہ ایک عارضی قومی حکومت قائم کی جائے اور اس میں مجلس مقننہ کے منتخب اراکین کو شامل کیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو کانگرس جنگ کی مساعی میں ہر ممکن تعاون کرے گی۔

بھری پڑی ہے۔ البتہ ایسے ملک جہاں مختلف اقوام آباد تھیں اور انہیں قومی بنیادوں پر ہی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا برقرار رہیں۔ اس کے برعکس ان کا مشترکہ نظام کبھی پائدار نہ ہو سکا۔ مسلمانوں پر اگر ایسا دستور ٹھونسا گیا جس کا نتیجہ مسلمانوں پر ہندو راج کی صورت میں برآمد ہو تو ہندوستان کے مسلمان اسے کسی قیمت پر بھی تسلیم نہ کریں گے۔ ہم پر دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ ہم نے اپنی منزل کا تعین کر لیا ہے اور جس راہ پر چل نکلے ہیں ، کسی صورت بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم سے اس راہ میں قربانیاں طلب کی گئیں تو اُن کے لئے بھی تیار ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج قطعی فیصلہ ہو جائے اور اس کے بعد ہندوستان بھر کے مسلمان متحد ہو جائیں تاکہ وہ اسلام کے خادم بن کر پیش قدمی شروع کریں اور ایک ناقابل تسخیر قوت بن جائیں۔"

ہندو کی بوکھلاہٹ

اس قرارداد کی منظوری کے بعد پورے ہندوستان کے ہندو بُری طرح بوکھلا گئے ان کے ذرائع ابلاغ کے وسیع اور موثر جال نے پاکستان کا مضحکہ اڑایا اور اتنی پست سطح پر لکھنا شروع کر دیا کہ صحافت کے آداب بھی نظر انداز کر دیئے۔ شاید ہی کوئی ہندو رہنما ہو جس نے اس قرارداد کے خلاف جذباتی تقریر نہ کی ہو۔ ہندوؤں کی منطق یہ تھی کہ ہندوستان ناقابل تقسیم ہے کیونکہ اس کی جغرافیائی وحدت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ نیز ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کی اکثریت بنیادی طور پر ہندو ہے۔ انہوں نے اپنا مذہب تبدیل کیا اور اُن کے آباؤ اجداد ہندو تھے۔ لہٰذا وہ مسلمان قومیت کا چولہ پہن کر اپنی قومیت کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ تیسری بات یہ کہی جاتی تھی کہ پاکستان دو ماہ کے اندر اندر ختم ہو کر رہ جائے گا کیونکہ وہاں اتنے معاشی وسائل ہی نہیں جو پاکستان کو قائم رکھ سکیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے ہندو رہنماؤں اور اخبارات کی اس یاوہ گوئی کی مطلق پروا نہ کی اور قائد اعظم کی قیادت میں حصولِ منزل کے عزم کو سینے سے لگا کر آگے بڑھتے رہے۔

باب ۲۷

نئی کش مکش کا آغاز

۱۰ اپریل ۱۹۴۰ء کو برطانوی حکومت نے دوسری عالمگیر جنگ اور ہندوستان کے حالات کے بارے میں ایک قرطاس ابیض (WHITE PAPER) شائع کیا جو کانگریسی وزارتوں کے استعفوں کی وجوہات، مسلم لیگ، کانگریس کے رہنماؤں کے ساتھ وائسرائے کی بات چیت اور ان دونوں سیاسی جماعتوں کی قراردادوں پر مشتمل تھا۔ حکومتِ برطانیہ نے اپنی پارلیمان سے اس امر کی منظوری ۱۸ اپریل ۱۹۴۰ء کو حاصل کر لی کہ کانگریسی صوبوں میں دفعہ ۹۳ جاری رہے — برطانوی وزیر ہند نے دارالامراء میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ حکومت ہندوستانیوں کی مرضی کے برعکس کوئی دستور وضع نہ کرے گی۔ حکومت وعدہ کر چکی ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں سے مشورہ کے بعد آئینی معاملات پر غور کیا جائے گا۔ لہٰذا ہندوستان کے تمام فرقوں میں اس لئے بھی اتحاد ضروری ہے کہ ہندوستانیوں کی آزادی کا خواب حقیقت میں تبدیل ہونے والا ہے۔ برطانیہ کی کوئی بھی برسراقتدار سیاسی جماعت یا پارلیمان یہ کبھی پسند نہ کرے گی کہ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں پر کوئی ایسا آئین مسلط کر دیا جائے جو ان کا امن و سکون عنقا کر دے۔ کانگریس کو اس بیان پر شدید اعتراض تھا مسلمان بھی اس بیان سے ناخوش تھے۔ کانگریس کو تو یہ غم کھانے لگا کہ اس بیان میں ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کے

آنا دباؤ ڈالا جائے کہ حکومت کانگرس کے تمام مطالبات من وعن قبول کرلے اور مسلمان منہ دیکھتے رہ جائیں۔

ان حالات میں جب کانگرس اور مسلم لیگ دونوں ۸۔ اگست کی پیشکش قبول کرنے سے انکار کر چکی تھیں، وائسرائے نے اعلان کیا کہ فی الحال وائسرائے کی کونسل اور جنگ کی مشاورتی کونسل کے قیام کے لئے کوئی کوشش نہ کی جائے گی۔

مسلم لیگ کا ردِ عمل

۲۲۔ فروری ۱۹۴۱ء کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس دلی میں ہُوا، جس میں فیصلہ کیا گیا کہ ہر ۲۳۔ مارچ کو مسلم لیگ "یوم استقلال" منایا کرے گی۔ اس موقع پر ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کی بنیاد اور اصولوں کی تشریح کی جایا کرے گی اور سال میں چار مرتبہ تمام صوبوں اور اضلاع کی مسلم لیگیں "ہفتہ مسلم لیگ" منایا کریں گی۔ اس ہفتہ میں مسلم لیگ کے لئے رکنیت سازی کی جائے گی اور اس کے مقاصد کی وضاحت پر توجہ مرکوز کی جائے گی۔

گاندھی کی سول نافرمانی کے بارے میں ایک قرارداد میں کہا گیا کہ یہ سول نافرمانی دراصل مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو تباہ کرنے اور حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے شروع کی گئی ہے، تاکہ حکومت کانگرس کے مطالبات تسلیم کرلے۔

کچھ دنوں بعد قائد اعظم نے ایک تقریر کے دوران واضح الفاظ میں کہا کہ کانگرس نے سول نافرمانی کا ڈھونگ صرف حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے رچایا ہے، تاکہ حکومت، کانگرس کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرلے۔ مسلم لیگ زیادہ دیر تک خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتی۔ اگر حالات خطرناک حد تک پہنچ گئے تو اس کی ذمہ داری کانگرس پر عائد ہوگی۔ نیز اگر مسلمانوں کے مفادات کو خطرے میں ڈالنے کی کوشش کی گئی تو وہ مداخلت سے بھی گریز نہ کریں گے۔ ہندوؤں کو چاہئے کہ وہ ہندو راج کے خواب دیکھنا چھوڑ دیں اور ہندوستان کی تقسیم تسلیم کریں، پاکستان مسلمانوں کا نصب العین ہے، کوئی سودا بازی نہیں۔

ادھر تقریباً ایک سال تک سول نافرمانی کی انفرادی مہم جاری رہی مگر پہلے کی طرح اپنی موت آپ مرگئی۔ اس کے بعد کانگرس نے ایک بار پھر وہی مطالبہ دہرایا کہ اگر اس کے تمام مطالبات تسلیم کر لئے جائیں تو حکومت کے ساتھ مکمل تعاون کیا جائے گا ——

ا۔ مسٹر گاندھی نے ایک سال تک سول نافرمانی کرنے کے بعد پھر ارشاد فرمایا کہ کانگرس ملک کا دفاع تشدد کے ہتھیاروں کے ذریعہ کرنا چاہتی ہے، جو ان کے اصولوں کے برعکس ہے۔ لہذا وہ کانگرس کی قیادت سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ اس طرح دوسری بار گاندھی نے کانگرس کو عاق کر دیا۔

۸۔ اگست کی پیشکش

۸۔ اگست کو وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے ایک بیان میں ایسے اشارے کئے کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں بلکہ متعدد اقوام آباد ہیں اور ان اقوام کی قوت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جن اقوام کا ذکر کیا گیا تھا ان میں مسلمان لازمًا شامل تھے۔ اس اعلان کے چند دن بعد برطانوی وزیر امور ہند نے جو تقریر کی اس نے مسلم لیگ کو یقین دلا دیا کہ برطانوی حکومت مسلمانوں کی علیحدہ حیثیت کو تسلیم کر چکی ہے۔

وائسرائے نے اپنے اعلان میں یہ بھی کہا کہ جنگ کے فوراً بعد آئین کے بنیادی مسائل کو قطعی طور پر طے کر دیا جائے گا۔ دوران جنگ ناسازگار حالات کے باعث عجلت میں یہ کام سرانجام دینا مناسب نہیں تاہم نمائندہ حیثیت رکھنے والے اس وقت تک کے لئے مخلصانہ تعاون کریں اور اس بات پر بھی غور کرتے رہیں کہ جنگ کے بعد جب بنیادی آئینی مسائل کو طے کرنے کا وقت آئے تو دستور کے بنیادی اصول اور اس کا ڈھانچہ کیا ہو۔

مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ان بیانات پر غور کرنے کے لئے اجلاس طلب کیا۔ پھر وائسرائے سے ان باتوں کی وضاحت طلب کی کہ کونسل میں کتنے اضافی اراکین ہوں گے۔ کونسل کی دوبارہ تشکیل کسی طریق سے کی جائے گی، مسلم لیگ کو کون سی دوسری پارٹیوں کے ساتھ کام کرنا ہو گا۔ اضافی اراکین کونسل کو کون سے شعبے دیئے جائیں گے اور جنگ کی مشاورتی کونسل کی ہیئت کیا ہو گی، نیز اس کے فرائض کیا ہوں گے؟

مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے مسلمانوں کو جنگ کمیٹیوں میں شرکت کی اجازت بھی دے دی۔

کانگرس کا ردعمل

کانگرس نے عارضی قومی حکومت کا جو مطالبہ کیا تھا، نامنظوری کی بنا پر ۸۔ اگست کی پیشکش کو مسترد کر دیا گیا اور حکومت پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ طاقت کے بل پر ہندوستان میں اپنی حکومت قائم رکھنا چاہتی ہے۔ جہاں تک ہندو مہاسبھا کا تعلق تھا تو وہ کونسلوں میں بیجا نمائندگی چاہتی تھی لیکن کانگرس کے انکار پر دونوں میں اَن بن ہو گئی۔ مہاسبھا نے وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ وہ ملک کی تقسیم سے متعلق کسی بھی تجویز یا سکیم کو مسترد کر دیں۔ کونسل میں

مسلم لیگ کی ۵۰ فیصد نمائندگی لغو اور غیر جمہوری ہے اور ہندو مہا سبھا کو یقین دلایا جائے کہ مسلمانوں کو اتنی نمائندگی نہیں دی جائے گی۔

دراصل کانگرس اور ہندو مہا سبھا کو بنیادی عارضہ یہ تھا کہ اگر ہر جگہ مسلمانوں کو ۵۰ فیصد نمائندگی مل گئی تو وہ ہندوؤں کے برابر آ جائیں گے اور کانگرس نے اپنے مختصر دورِ حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم و ستم، بربریت اور ناانصافیاں روا رکھی تھیں آئندہ کے لئے ان کی کوئی گنجائش نہ رہے گی اور مسلمان زندگی کے ہر شعبہ میں ہندوؤں کی سطح پر آ جائیں گے۔ ہندو مہا سبھا کا مطالبہ یہ تھا کہ اسے کونسل میں مسلم لیگ کے مقابلہ میں تین گنا نشستیں دی جائیں۔

جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق تھا تو اس نے ناکافی نمائندگی اور گورنری صوبوں کے انتظام میں مسلمانوں کو شامل کرنے سے انکار پر ۸۔ اگست کی پیشکش کو مسترد کر دیا۔

کانگرس اور سول نافرمانی

گو کانگرس گاندھی کو عاق کر چکی تھی لیکن جب سول نافرمانی کے فیصلہ کو عملی صورت دینے کا وقت آیا تو یہ 'عاق نامہ' واپس لے لیا گیا۔ سول نافرمانی کی تمام ذمہ داری گاندھی کے سپرد کر دی گئی۔ اس طرح گاندھی دوبارہ تخت نشین ہو گئے۔ گاندھی یہ چاہتے تھے کہ جنگ میں شرکت کے خلاف ہندوؤں کو تبلیغ کا حق دیا جائے لیکن جب وائسرائے نے انکار کر دیا تو گاندھی نے اسے آزادیٔ تقریر پر پابندی کا نام دیتے ہوئے سول نافرمانی کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۳؍ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو کانگرس کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں گاندھی نے اپنی سول نافرمانی کا پروگرام واضح کیا۔

اس سول نافرمانی کا مقصد کیا تھا؟ صرف یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بتایا جائے کہ برطانوی فوج میں نازیوں کے ساتھ نبرد آزما لوگوں میں ۶۰ فیصد مسلمان تھے، لہٰذا اس کے باوجود مسلم لیگ نے مسلمانوں کو جنگ کمیٹیوں میں شرکت کی اجازت دے کر نہ صرف مسلمانوں کو جنگ کے جہنم میں دھکیلنے کی کوشش کی بلکہ انگریز سامراج کے ہاتھ بھی مضبوط کئے۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں مسلم لیگ کے خلاف نفرت پیدا کی جا سکے۔ دوسری طرف گاندھی نے آزادیٔ تقریر پر پابندی کا بہانہ تراش کر یہ کوشش کی کہ سول نافرمانی کے ذریعہ حکومت پر

کرسکے۔ اگر وہ محسوس کرے کہ اس کا پہلا فیصلہ غلط تھا تو اس فیصلہ کو تبدیل کیا جا سکے گا۔ اور الحاق سے علیحدگی اختیار کی جا سکے گی۔

کرپس نے دفاعی امور پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگر برطانیہ بحری، بری اور فضائی افواج کی ذمہ داری قبول کرے گا تو اس کے لئے ہندوستان کی دفاعی ضروریات کی خاطر یہ بھی ضروری ہو گا کہ تمام دفاعی اختیارات جنگ کابینہ۔ کے زیر اہتمام کمانڈر انچیف کے پاس رہیں۔ کیونکہ حکومت ہندوستان کے لئے دفاعی کونسلوں میں مؤثر شرکت ضروری ہے۔ لہٰذا کمانڈر انچیف بطور ایگزیکٹو کونسل ممبر اپنی حیثیت کو برقرار رکھے گا۔

کرپس نے تمام ہندوستانی رہنماؤں سے اس سکیم کو قبول کر لینے کی اپیل کرتے ہوئے کہا کہ یہ تجاویز یقینی اور قابل قدر ہیں۔ اگر اس وقت ہندوستان کی رائے عامہ نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا تو پھر یہ موقع جنگ سے پہلے حاصل نہ ہو سکے گا۔ اس طرح دنیا بھر میں ہندوستان کے دوستوں اور بہی خواہوں کو شدید صدمہ پہنچے گا۔

قابلِ غور باتیں

کرپس کی ان تجاویز میں کچھ باتیں قابلِ غور تھیں مثلاً:

- اس میں تین مختلف لیکن باہم مربوط معاملات شامل تھے۔ ہندوستان کا آزاد مستقبل — نئے آئین کی تشکیل کا طریق کار اور مجوزہ آئین کی تشکیل تک عبوری آئین کے لئے اختیار کئے جانے والا طریق کار۔
- پالیسی میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ تھی۔ اس کی شرائط تقریباً وہی تھیں جو ۸ اگست ۱۹۴۰ء کی پیش کش میں رکھی گئی تھیں۔ البتہ نئی پالیسی اس کے مقابلے میں زیادہ تعمیری حیثیت کی حامل تھی۔ کیونکہ اس میں ڈومینین کی حیثیت کی وضاحت کر دی گئی تھی۔ اور یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا۔ کہ نئے آئین کی تمام تر ذمہ داری ہندوستانیوں پر عائد ہو گی، جس کے تحت مجلسِ آئین ساز میں ہندوستانیوں کو یکجا کرنے اور کسی سمجھوتے کے عملی طریق کار تک پہنچنے کے لئے گنجائش موجود تھی، یہ وعدہ بھی تھا کہ جو آئین تجویز کیا جائے گا وہی حکومت برطانیہ کے لئے قابلِ قبول ہو گا۔
- یہ تجاویز برطانوی جنگ کونسل کی متفقہ تجاویز تھیں لہٰذا کابینہ میں ان پر اختلاف کا سوال نہ تھا۔
- تجاویز کے ذریعہ جنگ کے دوران کسی اہم آئینی تبدیلی کو ناقابلِ عمل قرار دے دیا گیا تھا۔

ردِ عمل

مسلم لیگ، کانگریس، ہندو مہاسبھا اور دیگر اقلیتوں نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔ اعلان کے بعد

بھی کرپس مختلف رہنماؤں سے بات چیت میں مصروف رہے۔ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق تھا تو وہ اس تجویز سے قطعاً متفق نہ تھی۔ کہ جو صوبے نہ چاہئیں، مجوزہ ہندوستانی یونین میں شریک نہ ہوں۔ مسلم لیگ کے خیال میں یوں نظریۂ پاکستان کی نفی ہوتی تھی۔ مسلم لیگ کا مقصد یہ تھا کہ پاکستان کے مطالبہ کو مبہم الفاظ میں تسلیم کرنے کی جگہ کھل کر تسلیم کیا جائے۔

جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا تو انہیں اس تجویز کی بناء پر اکھنڈ بھارت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اس طرح ہندوستان تقسیم ہو جائے گا۔ لہٰذا کانگریس نے اسے ہندوستان کے اتحاد پر زد سمجھتے ہوئے قطعی طور پر ناقابلِ قبول قرار دے دیا۔ کانگریس چاہتی تھی کہ ریاستوں کے نمائندے نامزد کئے جانے کی جگہ انتخاب کے ذریعہ آئیں۔ کیونکہ اس طرح کانگریس اپنے حامیوں کو منتخب کرانے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ مسلم لیگ ریاستوں کے معاملہ میں خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کر رہی تھی۔ ممکن ہے کہ مسلم لیگ کی طرف سے ریاستی نمائندوں کے بارے میں عدم دلچسپی کی یہی وجہ ہو کہ وہ انتخابی طریقِ کار کے ذریعہ کانگریس کی قوت میں اضافہ نہ کرنا چاہتی تھی۔

جہاں تک دفاعی امور کا تعلق تھا، کانگریس کا مطالبہ یہ تھا کہ مرکز میں فوری طور پر ایک ذمہ دار حکومت قائم کی جائے اور دفاع کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے کسی ہندوستانی رکن کے براہِ راست کنٹرول میں دیا جائے۔

اس مرحلے پر مسلم لیگ کے لئے انتہائی کشمکش اور تذبذب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ کیونکہ اگر وہ مرکزی حکومت کے قیام کے بارے میں کانگریس کے مطالبہ کی حمایت نہ کرتی تو اس پر غیر جمہوری ہونے کا الزام عائد کر دیا جاتا اور اگر وہ اس مطالبہ کا ساتھ دیتی تو مرکز میں ایک کانگریس، یا دوسرے الفاظ میں ہندو حکومت قائم ہو جاتی، اور مسلمانوں کے مفادات خطرے میں پڑ جاتے۔ گاندھی نے کرپس کی تجاویز کو ایک ایسے چیک کا نام دیا۔ جس پر آئندہ کی تاریخ درج تھی۔ گاندھی نے یہ بھی کہا کہ یہ ایک دیوالیہ بنک کا چیک تھا۔

مختلف جماعتوں کے رہنماؤں سے بات چیت میں ناکامی کے بعد ۱۱ اپریل کو کانگریس نے ان تجاویز کے استرداد کے فیصلے کا اعلان کر دیا۔ کانگریس کا مؤقف خاصا دلچسپ تھا۔ یعنی یہ کہ وہ ہندوستان کے کسی علاقے کے لوگوں کی آزادی سلب نہیں کرنا چاہتی اور ان کی خواہشات کے برعکس ان کو انڈین یونین میں شامل کرنا پسند نہیں کرتی۔ لیکن وہ ہندوستان کی علاقائی سالمیت کے لئے بھی کوئی خطرہ برداشت نہیں کر سکتی۔ فیصلے میں ہندوستان کے دفاع کو کسی ہندوستانی کے ہاتھ میں دینے اور فوری طور پر ذمہ دار قومی

باب ۲۸

دسمبر ۱۹۴۱ء میں جاپانی طیاروں نے پرل ہاربر میں امریکی بحریہ پر شدید بمباری کی اور چند گھنٹوں کے بعد شنگھائی کی بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ جاپانی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے دیکھتے دیکھتے برطانوی، ملایا اور سیام پر بھی قبضہ کر لیا۔ فروری ۱۹۴۲ء میں سنگاپور کا سقوط ہو گیا اور جاپانی افواج رنگون میں داخل ہو گئیں۔ اور جزائر انڈیمان پر بھی قبضہ کر لیا۔ جب جاپانی افواج ہندوستان کے دروازوں پر پہنچ گئیں۔ تو حکومت برطانیہ کو سخت پریشانی ہوئی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزوں کو ہندوستان کے عوام کا تعاون حاصل نہ تھا۔ اس سلسلہ میں وائسرائے اور حکومت برطانیہ کو پہلے ہی ناکامی ہو چکی تھی۔ بظاہر ایسی کوئی صورت نہ تھی کہ ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں اور حکومت کے درمیان مفاہمت ممکن ہوتی اور حکومت پر یقین ہوتی کہ ہندوستان کے عوام اس کی پشت پر ہیں۔

برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل نے انڈیا کمیٹی کے نام سے ایک خاص کمیٹی قائم کی جس کے چیئرمین اٹیلی تھے۔ اس میں تین دیگر اراکین شامل تھے۔ اٹیلی کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ ہندوؤں سے ان کی گاڑھی چھنتی ہے۔ کمیٹی کے ایک اور رکن سر سٹیفورڈ کرپس تھے۔ حکومت نے کرپس کو ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ مختلف تجاویز کے ذریعہ مسلم لیگ اور کانگریسی رہنماؤں سے بات چیت کریں اور ان میں اتحاد کے لئے کوشش کریں۔ ۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو کرپس ہندوستان پہنچ گئے۔

سر سٹیفورڈ کرپس نے ہندوستان پہنچتے ہی وائسرائے ہند، وائسرائے کی کونسل اور مشاورتی کونسلوں کے اراکین سے ملاقات کے بعد قائداعظم، سر سکندر حیات خان، فضل الحق، ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو

ڈاکٹر امبیدکر، ایم۔ ایس راجہ، سرتیج بہادر سپرو، جیکر، ساورکر اور دیگر اقلیتوں اور ریاستوں کے نمائندوں سے تبادلہ خیال کیا۔

۲۹ مارچ ۱۹۴۲ء کو کرپس نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ کرپس نے اپنی تجاویز پیش کیں۔ جن کا لب لباب یہ تھا کہ ہندوستان کی ایک نئی ڈومینین قائم کی جائے۔ جس کی وابستگی برطانوی دولت مشترکہ اور دوسری ڈومینینوں کے ساتھ ہو گی۔ یہ سب مشترکہ طور پر تاج برطانیہ کی اطاعت گذار ہوں گی۔ تاہم انہیں ہر اعتبار سے مساوی حیثیت حاصل ہو گی اور امور داخلہ و خارجہ کے معاملات میں کسی دوسرے کی پابند نہ ہوں گی۔ جونہی جنگ ختم ہو جائے گی ہندوستان میں ایک آئین کی تشکیل کے لئے آئین ساز مجلس بنائی جائے گی۔ اس مجلس کا انتخاب تمام صوبائی مجالس مقننہ کے ایوان ہائے زیریں جنگ کے بعد منعقد ہونے والے عام انتخابات میں متناسب نمائندگی کے ذریعے کریں گے۔ اس مجلس آئین ساز میں ریاستوں کو بھی نمائندگی دی جائے گی۔ یہ مجلس جو بھی آئین بنائے گی وہ حکومت برطانیہ کے لئے قابل قبول ہو گا تاہم اس کے لئے تین شرائط تھیں۔

(۱) ہر اس صوبہ کو مجوزہ یونین سے الگ رہنے کا حق حاصل ہو گا۔ اور وہ اپنی موجودہ آئینی حیثیت برقرار رکھ سکے گا۔ اگر مجوزہ یونین میں شامل نہ ہونے والے ایسے صوبے پسند کریں تو ان کی ایک علیحدہ یونین مجوزہ ہندوستانی یونین کے برابر قائم کر دی جائے گی۔

(۲) حکومت برطانیہ اور مجلس آئین ساز کے درمیان برطانیہ کی طرف سے ہندوستانیوں کو اختیارات منتقل کئے جانے کی صورت میں جو امور پیدا ہوں کے وہ اس معاہدے میں شامل کئے جائیں گے۔ اس معاہدے کے تحت ہندوستان کی مذہبی اور نسلی اقلیتوں کے تحفظ کے معاملات بھی شامل ہوں گے۔

(۳) ریاستیں اس آئین کے ساتھ وابستگی اختیار کریں یا نہ کریں ان کے ساتھ معاہدہ کے معاملات میں نظر ثانی پر بات چیت ضروری ہے۔

کرپس نے یہ وضاحت بھی کی کہ جنگ کے خاتمے اور مجوزہ آئین کی تیاری تک تاج برطانیہ بہرحال ہندوستان کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھے گا۔ اور اس کے دفاع کی ذمہ داری بھی اس پر رہے گی۔ تاہم فوجی، اخلاقی اور مادی وسائل کی تنظیم کی ذمہ داری بہرحال حکومت ہندوستان پر عائد ہو گی۔

کرپس نے یہ بھی بتایا کہ اگر ہندوستان کے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے رہنما چاہیں تو جنگ کے خاتمے سے قبل مجوزہ مجلس آئین ساز کی نوعیت اور اس کے عمل میں تبدیلی کی گنجائش ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ جو صوبہ ایک بار الحاق میں شامل ہو جائے گا اس پر ایسی کوئی پابندی نہ ہو گی کہ وہ الحاق سے نجات ہی نہ حاصل

کانگریس کے اِس نعرے کی تردید کی کہ عالمی جنگ برطانوی سامراج تک محدود تھی۔ لہٰذا ہندوستان اُس میں ملوث کیوں ہوا؟ ان کے نزدیک کانگریس کی یہ پالیسی بھی قابلِ اعتراض تھی کہ ہندوستان میں صرف قومی حکومت قائم ہونا ضروری ہے۔ راج گوپال اچاریہ کے مطابق جب مسلم لیگ قومی حکومت کو تسلیم ہی نہیں کرتی اور ہندوستان کے ایک حصہ میں مسلمانوں کی علیحدہ ریاست کے قیام کا عزم رکھتی ہے تو اس مطالبے کو تسلیم کر لینے میں کیا مضائقہ ہے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ اسی بنیاد پر سمجھوتہ کرنے میں کیا نقصان ہے؟

راج گوپال اچاریہ نے اِس سلسلہ میں انفرادی مساعی کے ساتھ ساتھ یہ بھی کیا کہ اپنے صوبہ کی معطل اسمبلی کے تمام کانگریسی اراکین اور دیگر کانگریسی رہنماؤں کا اجلاس بلایا۔ اس اجلاس نے دو قراردادیں منظور کیں۔

(۱) یہ اجلاس کانگریس کی مجلس عاملہ سے سفارش کرتا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ جو مسلم لیگ کی طرف سے کیا گیا ہے تسلیم کرے۔ نیز اس بنیاد پر مسلم لیگ کے ساتھ بات چیت کا آغاز کرے۔ تاکہ موجودہ ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لئے ایک قومی حکومت کے قیام کی سفارش کی جا سکے۔

(۲) مدراس میں وزارت اور اسمبلی کو بحال کر کے مسلم لیگ کو وزارت میں شمولیت کی دعوت دی جائے۔

جب یہ قراردادیں منظرِ عام پر آئیں تو کانگریسی حلقوں میں افراتفری پیدا ہو گئی۔ ہندوؤں کے لئے یہ بات قابلِ فہم تھی۔ کہ آخر پاکستان کو تسلیم کرنے کی سفارش کرنے والے کانگریسی اور وہ بھی ہندو کانگریسی کیسے ہو سکتے ہیں؟ بہرحال ۲۹ر اپریل ۱۹۴۲ء کو یہ قراردادیں کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش ہوئیں جنہیں مسترد کر دیا گیا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ کانگریس ایسی کسی تجویز کو کسی قیمت پر قبول کرنے پر تیار نہیں جس کے ذریعے ملک ٹکڑوں میں تقسیم ہوتا ہو۔

اس کے بعد راج گوپال اچاریہ نے ایک اور اقدام کیا۔ انہوں نے مدراس اسمبلی کی نشست اور کانگریس کمیٹی سے استعفا دے دیا۔ اس کے بعد معطل اسمبلی کی کانگریس پارٹی کا ایک اور اجلاس ہوا، ان کی ہمنوائی میں سات اور اراکین اسمبلی بھی مستعفی ہو گئے۔

کانگریسی رہنما تین باتوں کی وجہ سے بُری طرح بوکھلا گئے تھے۔

(۱) کہ حکومتِ برطانیہ نے بالواسطہ پاکستان کا مطالبہ کیوں تسلیم کر لیا تھا۔ کانگریس اسے اپنی شکست اور مسلم لیگ کی فتح سمجھ رہی تھی۔

(۲) راج گوپال اچاریہ کی قیادت میں کانگریسیوں کا ایک گروہ یہ مطالبہ کر رہا تھا کہ پاکستان کے مطالبے کو تسلیم کیا جائے۔

(۳) اور کرپس نے اپنے مشن کی ناکامی کی ذمہ داری کانگریس پر کیوں عائد کی ؟

۲۷ جولائی ۱۹۴۲ء کو سر سٹیفورڈ کرپس نے امریکہ کے عوام کے نام ایک نشری تقریر میں کانگریس کی سیاست پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ دنیا کی کوئی بھی ذمہ دار حکومت کانگریس کے مطالبہ کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان کے مسلمان اور چھوٹے فرقوں اور پست اقوام کے لاکھوں لوگ کانگریس کے غلبہ سے خائف ہیں۔ اگر گاندھی کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا جائے تو ہندوستانیوں میں بحران اور بدامنی ناگزیر ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ برطانیہ ان حالات میں خاموش تماشائی نہیں بن سکتا۔ یہ مسئلہ انتہائی نازک اور پوری دنیا کے لئے سنگین ہے۔

پنڈت جواہر لعل نہرو، کرپس کے اس بیان سے اتنے بوکھلائے کہ انہوں نے کرپس کو "شیطان کا چرخہ" قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ حکومت برطانیہ عرصہ سے ہندوستان میں جو شیطانی کردار ادا کر رہی تھی۔ وہی آج بھی ادا کیا جا رہا ہے۔ نہرو کا سب سے زیادہ دلچسپ جملہ یہ تھا۔

"میں اپنے ملک کے مسلمانوں کو کرپس سے زیادہ جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کرپس ان مسلمانوں پر سراسر بہتان تراشی کر رہے ہیں۔"

وہی اوچھے ہتھیار

کرپس کے بیانات اور پاکستان کے مسئلہ پر کانگریس کے درمیان پھوٹ نے ایک بار پھر کانگریس کو اپنا پرانا ہتھیار آزمانے پر مجبور کر دیا۔ کانگریس کی بوکھلاہٹ میں یوں بھی اضافہ ہوا کہ ہر طرف سے اس کی مذمت کا سلسلہ چل نکلا تھا۔

۸ راگست ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا، جس میں کانگریس کی مجلس عاملہ کی ۱۴ جولائی کی قرارداد کی توثیق کر دی گئی۔ اس کے بعد کانگریس نے یہ اعلان کیا کہ انگریز ہندوستان سے فوراً نکل جائیں اور ہندوستان اور ہندوستانیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ کانگریس نے کہا کہ ہندوستان سے برطانوی حکومت کا فوری خاتمہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اب انگریزوں کا کوئی وعدہ یا کوئی یقین دہانی موجودہ حالات کو معمول پر نہیں لا سکتے۔ ہندوستان کو فوری طور پر ایک آزاد ملک قرار دیا جائے۔ جس کے بعد کانگریس ملک کی تمام بڑی سیاسی جماعتوں اور دیگر گروہوں

حکومت تشکیل کرنے پر بھی اصرار کیا گیا تھا۔

مسلم لیگ نے اپنے فیصلے میں اس بات پر ناخوشی کا اظہار کیا کہ کرپس تجاویز میں حکومت برطانیہ نے صرف تجاویز کی حد تک بات کی اور فیصلہ کن انداز اختیار کرنے سے گریز کیا۔ نیز یہ بات واضح کر دی کہ انگلستان کے لوگ جو بھی فیصلہ کریں گے وہی حکومت برطانیہ کے لئے قابل قبول ہوگا۔ علاوہ ازیں اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مرضی کے بغیر کوئی آئینی پیش قدمی نہ کی جائے۔ یوں پاکستان کے امکان کو تسلیم کیا گیا تھا۔ لیکن مسلم لیگ نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ ان تجاویز میں کسی ترمیم و اضافہ کی اجازت نہ تھی، نہ ہی متبادل تجاویز طلب کی گئیں۔

مسلم لیگ نے ان تجاویز کو اس بناء پر مسترد کیا کہ مسلم لیگ کیونکہ مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت پر یقین رکھتی تھی۔ لہٰذا ایک کی جگہ دو مجالس آئین ساز کی تشکیل ضروری تھی۔ جہاں تک آئین ساز مجلس کے انتخاب کا تعلق تھا تو اس کے لئے جو طریق کار تجویز کیا گیا وہ پُرسقم اور مسلمانوں کے مفادات کے برعکس تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کے ذریعہ اپنے نمائندوں کے انتخاب کا موقعہ نہیں دیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں مخلوط انتخابات کے تحت منتخبہ مجلس آئین ساز میں سادہ اکثریت کے ذریعہ فیصلوں کے باعث مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ ممکن نہ ہوگا۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ سراسر ناانصافی ہوگی۔ کیونکہ وہ مجلس آئین ساز میں ایک چوتھائی اقلیت کے برابر ہوں گے۔ نیز تجاویز میں الحاق یا عدم الحاق کے بارے میں صوبوں کی رائے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ حق صرف ریاستوں کو تھا کہ وہ یونین سے الحاق کریں یا نہ کریں۔ مسلم لیگ کا ایک اہم اعتراض یہ بھی تھا کہ تجاویز میں اس بات کی کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ اگر تاج برطانیہ اور انڈین یونین یا یونینوں کے درمیان معاہدے کی شرائط کے بارے میں اختلاف ہوگیا تو آئندہ اقدام کیا ہوگا؟ مسلم لیگ کے فیصلے کے آخر میں یہ بھی کہا گیا کہ جب تک ہر بات کھل کر سامنے نہ آئے اس وقت تک مسلم لیگ عارضی انتظامات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کرسکتی۔ اور جب تک مسلم لیگ کی قرارداد پاکستان مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو تسلیم اور مسلمانوں کو حق خود اختیاری نہیں دیا جاتا۔ مسلم لیگ کے لئے مستقبل کی کوئی سکیم یا تجویز قبول کرنا ممکن نہ ہوگی۔

قائداعظم نے قومی حکومت کے قیام کے مسئلہ پر بات کرتے ہوئے کہا کہ کرپس کے ساتھ عارضی انتظامات کے بارے میں ان کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی اور اگر کانگریس کی متبادل تجاویز کو قبول کرلیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک ایسی حکومت تشکیل ہوگی جسے علیحدہ نہ کیا جاسکے گا اور جو صرف اکثریت کے سامنے جوابدہ ہوگی اور جس کی کابینہ پر صرف کانگریس کی گرفت ہوگی۔ قائداعظم نے ایسی حکومت کو ایک فاشسٹ

کرانڈ کونسل " قرار دیا اور کہا کہ مسلمان اور دیگر اقلیتی فرقے کانگریس کے رحم وکرم پر ہوں گے۔ لہٰذا جنگ کے بعد مستقبل کی بات کرنا کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس لئے کہ اس وقت تک سوائے تفصیلات کے مستقبل کے بارے میں اقدام کے لئے اور کوئی بات ہی نہیں رہے گی۔

کرپس کا بیان

کرپس ناکام ہوکر لندن واپس چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ۲۸ اپریل ۱۹۴۲ کو دارالعوام میں ایک بیان دیتے ہوئے اپنے مشن کی ناکامی کی وضاحت کی۔ انہوں نے کہا کہ کانگریس، ملک کو بہرحال متحد رکھنا چاہتی ہے۔ جبکہ حکومت برطانیہ کا فرض ہے کہ وہ دو بڑے فریقوں کے درمیان ایسا سمجھوتہ کرائے، جو دونوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ملنا چاہیئے۔ نہ کہ سب کچھ ایک ہی کے دامن میں ڈال دیا جائے۔ کانگریس کا سب سے بڑا اعتراض عبوری دفاعی انتظامات کے بارے میں ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ حکومتِ ہندوستان کو دفاعی امور پر مکمل اختیارات حاصل ہوں۔ لیکن یہ بات نہ صرف حکومتِ برطانیہ بلکہ ہندوستان کی مؤثر اقلیتوں کے لئے بھی ناقابلِ قبول ہے۔ بات چیت ایک عبوری حکومت کے قیام کے مرحلہ پر آکر ٹوٹی۔ حالانکہ یہ بات واضح کردی گئی تھی کہ جنگ کے خاتمہ تک آئین میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے گی۔ کانگریس عبوری حکومت کے قیام پر برابر اصرار کرتی رہی مگر مکمل اختیارات کی بات ماسوا کانگریس کے کسی اور جماعت نے نہ کی۔ چنانچہ کانگریس کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ سمجھوتے کے ہر امکان کو خارج از بحث قرار دینا پڑا۔ اگر ایک بار ایگزیکٹو کونسل کے قیام کا راستہ انتخاب کرلیا جاتا تو یہ کونسل صرف اپنوں کے آگے جواب دہ ہوتی اور اقلیتوں کے تحفظ کا سوال ختم ہو جاتا۔ یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کوئی بھی اقلیت، خاص طور پر مسلمان اس مطالبہ کو کسی قیمت پر قبول نہ کرتے اور شائد کبھی تیار نہ ہوں۔

" میں نہ مانوں "

کانگریس کے اندر بھی سوجھ بوجھ سے کام لینے والا ایک عنصر موجود تھا۔ جو اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ایک نہ ایک دن حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی۔ لہٰذا بلا وجہ تاخیر سے کام لینے کی جگہ کیوں نہ اس حقیقت کو آج ہی تسلیم کرلیا جائے۔ لیکن کانگریس کے متعصب رہنماؤں کی اکثریت میں اس تھوڑے سے عنصر کی آواز دب کر رہ گئی۔ کانگریسی نقار خانے میں یہ آواز راج گوپال اچاریہ کی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے تو

سے ساتھ مل کر عارضی حکومت قائم کرے گی۔ اس حکومت کا پہلا فرض ہندوستان کا دفاع اور جارحیت کے مقابلہ میں ہر قسم ... کے اندر رہتے ہوئے تحفظ ہوگا۔ یہ عارضی حکومت ایک آئین ساز اسمبلی کی تشکیل کے لئے ڈھانچہ بھی تیار کرے گی۔ جو بعد ازاں تمام وحدتوں پر مشتمل ایک وفاق قائم کرے گی۔ جس میں ہر وحدت کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے گی۔ قرارداد میں کہا گیا کہ اگر حکومت نے فوراً ہندوستان سے دست برداری اختیار نہ کی تو ہندوستان کے عوام عدم تشدد کی پوری طاقت کے ساتھ انگریزوں کو باہر نکال دیں گے۔ کانگریس کمیٹی نے وسیع پیمانے پر سول نافرمانی کی مہم چلانے کا فیصلہ بھی کیا۔

گاندھی نے خود کو "کھلا باغی" قرار دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۹ اگست ۱۹۴۲ء کو حکومت نے کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دے کر گاندھی اور اہم کانگریس رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ حکومت کے اس اقدام کے نتیجہ میں ہندوستان بھر میں ہندوؤں نے ہنگامے شروع کر دیئے۔ ریلوں کی پٹڑیاں اکھاڑیں اور ریلوے سٹیشنوں، تار گھروں اور ڈاکخانوں کو نذرِ آتش کرنا شروع کر دیا۔ بہت سے ہوائی اڈوں کو بھی نقصان پہنچایا گیا۔ جا بجا تشدد کیا گیا۔ اور سینکڑوں افراد قتل کر دیئے گئے۔

کانگریس کی اس تحریک کو مختلف طبقۂ خیال کے لوگوں کا کوئی تعاون حاصل نہ ہوا۔ پست اقوام کے رہنما ڈاکٹر امبیدکر نے کانگریس کے اس اقدام کی مذمت کی۔ انڈین نیشنلسٹ لیگ نے اسے "گاندھی کا احمقانہ اقدام" قرار دیا۔ حتیٰ کہ ہندو مہاسبھا کے رہنماؤں نے بھی اپنے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ ہندوستان سے نکل جاؤ تحریک کے ساتھ نہ دیں۔ کانگریس کی دوست مجلسِ احرار اسلام نے بھی اسے بے وقت اقدام قرار دیا۔

قائداعظم نے اس تحریک پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایسے موقع پر جب حکومت نہایت نازک حالات سے دوچار ہے اس قسم کا اقدام خانہ جنگی اور بدترین غداری کے مترادف ہے۔ انہوں نے کانگریسی رہنماؤں کی گرفتاریوں کو بنظرِ استحسان دیکھا۔

بعض یورپی اور امریکی اخبارات نے اسے ۱۹۴۲ء کی بغاوت کا نام دیتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ موجودہ تحریک ہندوستان کی آزادی کی راہ میں جدوجہد نہیں بلکہ اس تحریک کی صورت میں گاندھی کی میٹھی میٹھی باتوں کے پس پردہ مشتعل اور قانون سے بے بہرہ ہجوم کی غراہٹ سنائی دیتی ہے۔

کانگریس نے یہ اقدام کیوں کیا ؟

کانگریس کے وفادار ساتھی ابوالکلام آزاد کی زبانی...... اصل بات یہ تھی کہ :

وہ کانگریس کو یقین ہو چکا تھا کہ جاپانیوں کے ہاتھوں اتحادیوں کو شکست ہوگی۔ ہندوستان کے

ارادے سے پرو دشمنوں کی دستک نے کانگریسی رہنماؤں کو اس معاملہ میں اور زیادہ پُر یقین کر دیا تھا۔ لہٰذا گاندھی جی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ جونہی جاپانی بنگال میں داخل ہوں گے اور برطانوی فوجیں بہار کی طرف پیچھے ہٹیں گی۔ کانگریس فوری طور پر ملک پر قبضہ جما لے گی۔ یہ منصوبہ ۱۹۴۲ء کے وسط میں مکمل کر لیا گیا تھا۔ گاندھی یہ سمجھتے تھے کہ اگر جاپان ہندوستان میں داخل ہوا تو برطانیہ کے دشمن کی حیثیت سے اور جونہی ہندوستان سے برطانوی اقتدار ختم ہوگا جاپان ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دے گا۔ لیکن گاندھی کو یہ علم نہ تھا۔ کہ جاپانیوں کے بنگال میں داخل ہونے سے قبل ہی خود جیل میں داخل ہو جائیں گے۔"

باب ۲۹

گاندھی جناح بات چیت اور راجہ فارمولا

کانگریس کو ۱۹۴۲ء میں انگریزوں کو ہندوستان سے نکل جانے کا حکم دینے اور اسے باقاعدہ تحریک کی صورت دینے کے اقدامات کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ گاندھی سمیت قریبا تمام رہنما جیلوں میں پہنچ گئے جہاں انہیں طویل عرصہ گزارنا پڑا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم لیگ کو اپنی تنظیم مضبوط کرنے کا بہترین موقع ہاتھ آیا اور جب کانگریسی رہنما جیلوں سے نکل کر دوبارہ میدانِ سیاست میں آئے تو انہیں دنیا ہی بدلی ہوئی نظر آئی۔

راج گوپال اچاریہ نے ۱۹۴۲ء کی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک میں قطعاً حصہ نہ لیا کیونکہ وہ اسے کانگریس کے لئے مہلک سمجھتے تھے۔ دوسری ہندو جماعتیں حتیٰ کہ ہندو مہاسبھا بھی اس تحریک سے الگ تھلگ رہی۔ راج گوپال اچاریہ نے مسلم لیگ کی قرارداد لاہور (۱۹۴۰ء) کی بنیاد پر کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی بہت کوشش کی لیکن کانگریس کو بزعم تھا کہ وہ ملک کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور انگریز کو آخر کار اس کے سامنے ہتھیار ڈالنا ہی پڑیں گے۔ راج گوپال اچاریہ نے بار بار ناکامی کے باوجود سمجھوتہ کے لئے اپنی کوشش جاری رکھی۔ انہوں نے ۱۹۴۲ء میں اسی سمجھوتہ کے لئے قائداعظم سے کئی ملاقاتیں کیں اور ان کے خیالات کو پوری طرح سمجھنے کے بعد اس سمجھوتہ کے لئے ایک فارمولا تیار کیا۔ راج گوپال اچاریہ اسی سلسلہ میں گاندھی سے بھی ملنا چاہتے تھے لیکن انہیں [illegible] کی اجازت نہ ملی۔ جب ۱۰ فروری ۱۹۴۳ء کو گاندھی نے جیل سے [illegible] کے لئے

اا دن کا برت شروع کر دیا تو اُن کے کچھ دوستوں وغیرہ کو ملاقات کی اجازت مل گئی۔ مگر گاندھی، جیل سے نجات حاصل نہ کر سکے۔ اسی دوران راج گوپال اچاریہ نے بھی ملاقات کی اور انہوں نے قائداعظم سے گفتگو کے بعد جو فارمولا تیار کیا تھا، گاندھی کو دکھایا۔ ان کی رضامندی حاصل کی اور ۱۷ اپریل کو قائداعظم سے ملاقات کے دوران یہ فارمولا ان کے سپرد کر دیا۔ انہوں نے فارمولا پر گاندھی کی رضامندی سے بھی مطلع کر دیا۔ قائداعظم نے اس کا کوئی حتمی جواب قریباً ڈیڑھ ماہ تک نہ دیا۔ البتہ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اشارتاً یہ کہا کہ اگر گاندھی، مسلم لیگ کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کرنے کے خواہشمند ہیں تو وہ براہِ راست ان سے بات کیوں نہیں کرتے؟ جب گاندھی تک یہ اطلاع پہنچی تو انہوں نے ملاقات کی خواہش کا اظہار بذریعہ خط کیا۔ لیکن سمجھوتہ کے بارے میں اس خط میں کچھ نہ لکھا۔ چنانچہ قائداعظم نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔

اکتوبر ۱۹۴۳ء میں لارڈ لنلتھگو کی جگہ لارڈ ویول ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے اس دوران جنگ کے حالات بھی کافی بدل چکے تھے۔ اتحادیوں کی فتح کی پیشگوئی کرنا ممکن ہو گیا تھا۔ جہاں تک لارڈ ویول کا تعلق تھا، وہ ملک کی تقسیم کے حق میں نہ تھے، ان کے خیال میں جغرافیہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مئی ۱۹۴۴ء میں گاندھی کی علالت کی بنا پر جیل سے رہا کر دیا گیا۔ گاندھی نے رہائی کے قریباً اڑھائی ماہ بعد قائداعظم کو ایک خط میں لکھا کہ انہیں مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھا جائے اور ان کی ملاقات کی خواہش کو پورا کر دیا جائے ورنہ انہیں سخت مایوسی ہو گی۔ محمد علی جناح نے ملاقات پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔

۹ ستمبر ۱۹۴۴ء کو ان دونوں رہنماؤں کی ملاقات قائداعظم کے مکان پر ہوئی۔ راج گوپال اچاریہ کا فارمولا زیر بحث آیا۔ فارمولا کا اقتباس یہ تھا:

- درج ذیل شرائط کے تحت مسلم لیگ ہندوستان کے لئے آزادی کے مطالبہ کی حمایت کرتے ہوئے کانگرس کے تعاون سے ہندوستان میں ایک عبوری عارضی حکومت کی تشکیل پر تیار ہے۔

- ہندوستان کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ان اضلاع میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ جنگ ختم ہوتے ہی ایک کمیشن مقرر کر دیا جائے گا، جو ان اضلاع کی حد بندی کرے گا۔ ان تمام اضلاع میں استصواب رائے عامہ کے ذریعہ علیحدگی کے مسئلہ پر فیصلہ کیا جائیگا۔

اگر ان اضلاع کی اکثریت ایک آزاد ریاست کے حق میں رائے دے تو اس فیصلہ پر فوراً عمل کیا جائے۔ سرحدی اضلاع کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ ہندوستان یا نئی ریاست میں سے جس میں چاہیں، شامل ہو جائیں۔

- تمام سیاسی جماعتوں کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ استصواب رائے عامہ سے پہلے اپنے موقف اور نقطۂ نظر کی عام وضاحت کر سکیں۔
- علیحدگی کی صورت میں دفاع، تجارت، مواصلات اور دیگر ضروری امور سے متعلق معاہدے کئے جائیں۔
- ایک ریاست سے دوسری ریاست میں آبادی کا تبادلہ ممکن حد تک رضاکارانہ بنیادوں پر ہوگا۔
- ان شرائط کی پابندی اسی صورت میں کی جائے گی کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کی حکومت کی تمام ذمہ داریاں اور مکمل اختیارات منتقل کر دے۔

قائد اعظم کو تو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے گاندھی سے بات چیت کرنے کا مکمل اختیار دے دیا تھا لیکن کیا گاندھی ذاتی حیثیت میں اس معاہدے کو تسلیم کر رہے تھے یا انہیں بھی کانگرس کی طرف سے یہ اختیار حاصل تھا؟ ماضی میں بارہا ایسا ہوا کہ گاندھی نے ایک فیصلہ کرنے کے بعد کانگرس کے انکار پر خود بھی انکار کر دیا۔ یا یہ کہہ کر بات کو الجھانا چاہا کہ وہ تو کانگرس کے عام رکن بھی نہیں البتہ وہ کانگرسی رہنماؤں کو رضا مند کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ گاندھی کو کانگرس کی طرف سے اس معاہدہ پر دستخط کرنے کا کوئی اختیار نہ دیا گیا تھا۔ لہٰذا اس بات چیت کو طول دینے کا مطلب محض وقت کا ضیاع تھا۔ اس لئے کہ بات چیت ایک جماعت اور ایک فرد کے درمیان ہو رہی تھی اور اس امر کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ کامیابی کی صورت میں یہ فرد اپنی جماعت کو بھی رضا مند کر سکے گا۔ قائد اعظم کو بھی یہی اعتراض تھا۔ تاہم انہوں نے اتمام حجت کے لئے مذاکرات میں مکمل دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

قائد اعظم کو دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مسلم لیگ کی طرف سے مطالبہ آزادی کی حمایت کا مطلب یہ تو نہیں کہ مسلم لیگ دراصل کانگرس کی قرارداد اگست ۱۹۴۲ء کی حمایت کر رہی ہے یا یہ کہ مسلم لیگ بجائے خود حصول آزادی کی خواہشمند نہیں۔ تیسرا اعتراض یہ تھا کہ پہلے متحدہ

ہندوستان کی حکومت ذمہ داریاں اور اختیارات حاصل کرے اور پھر اسے صواب رائے عامہ کے پروگرام پر عمل ہو یا یہ دونوں کام بیک وقت ہوں یعنی حکومت برطانیہ دو خود مختار ریاستوں کو بیک وقت ذمہ داریاں اور اختیارات منتقل کرے؟ کیونکہ مسلم لیگ سب سے پہلے ہندوستان کی تقسیم کے اصول کو بنیاد بناتی تھی اور حد بندی کا سوال اس کے بعد پیدا ہوتا تھا۔

قائداعظم یہ چاہتے تھے کہ سب سے پہلے ان اعتراضات اور معاہدہ کے ان ابہام کو دور کیا جائے تاکہ اس کے بعد ٹھوس بنیادوں پر کوئی بات چیت ہو سکے ۔ ۹ ستمبر سے ۲۷ ستمبر ۱۹۴۴ء تک دونوں رہنماؤں کی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور خط وکتابت بھی جاری رہی۔ آخر تان وہیں ٹوٹی اور گاندھی نے ایک خط میں قائداعظم کو مطلع کیا کہ :

- "میں تو کانگرس کو صرف مشورہ دے سکتا ہوں یہ کام کانگرس کا ہے کہ وہ میرے مشورہ کو قبول کرے یا نہ کرے
- ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرار دادِ لاہور میں تو اس بات کا کہیں ذکر نہیں کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں اور ان کی دو الگ ریاستیں قائم ہونا ضروری ہیں ۔
- میں جہاں تک مسلم لیگ کی مذکورہ بالا قرار داد کا مطلب سمجھ سکا ہوں ، وہ یہ ہے کہ ایک خاندان کے ارکان ایک ہی مکان کے اندر الگ الگ حصوں میں رہائش رکھنا چاہتے ہیں ۔ لہٰذا اس مکان کی حدود مقرر کر دی جائیں۔
- ان حدود کے تقرر کے بعد بھی خاندان کے دونوں حصوں سے بعض معاملات کی ذمہ داریاں مشترک ہوں گی ۔
- سب سے پہلا کام حصول آزادی ہے ۔ اس کے بعد ہی اس مکان کے کمروں کی تقسیم ممکن ہو گی تاہم مکان مشترک ہی ہوگا۔

ظاہر ہے کہ گاندھی مناظر کے الٹ پھیر سے چکر دینے کی کوشش کر رہے تھے اور مکان کے کمروں اور اہل خانہ کی بات کر کے تقسیم کے اصول کو تسلیم کرنے سے واضح انکار کر رہے تھے ۔ قائداعظم نے اسی دن گاندھی کو لکھا کہ ہر بات کھل کر کریں اور واضح مؤقف اختیار کریں۔ اگر معاملات کو الجھانے کی کوشش کی گئی تو نتیجہ کچھ بھی نہ نکل سکے گا ۔ اگر گاندھی مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم تسلیم کرنے کے حق میں نہیں تو کسی سمجھوتہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

باب ۳۰

ویول منصوبہ اور شملہ کانفرنس

گاندھی، جناح بات چیت کی ناکامی کے بعد سر تیج بہادر سپرو جنہوں نے ۱۹۴۱ء میں ایک غیر جماعتی کانفرنس بھی بلائی تھی، نے مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان مصالحت کے لئے از سرِ نو کوشش شروع کر دی۔ ان کی ایک تجویز یہ تھی کہ غیر جماعتی کانفرنس کی مجلسِ قائمہ ہندوستان کے مستقبل کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کرے۔ اس کمیٹی پر کوئی فیصلہ دینے کی ذمہ داری عائد نہ تھی۔ مقصد یہ تھا کہ یہ کمیٹی جس نتیجہ پر بھی پہنچے اسے احاطۂ تحریر میں لائے، دستخط کرے اور اسے سربمہر کر کے پارٹیوں کے حوالے کر دے۔ بعد ازاں سیاسی جماعتوں کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ کمیٹی کی تجاویز قبول کریں یا نہ کریں گاندھی نے اس تجویز سے اس شرط پر اتفاق کیا کہ اس کمیٹی میں مسلم لیگ اور کانگرس سمیت کوئی مسلّمہ سیاسی جماعت شریک نہ ہو، نہ ہی اس کمیٹی میں ایسے لوگ شامل کئے جائیں، جنہوں نے گاندھی ۔ جناح بات چیت کی ناکامی کے بعد کسی واضح رائے کا اظہار کیا ہو۔

غیر جماعتی کانفرنس کی مجلس قائمہ کا اجلاس ۱۹۔ نومبر ۱۹۴۴ء کو اس غرض سے دلی میں منعقد ہوا۔ اسی دن تیج بہادر سپرو نے یہ بھی بتایا کہ کمیٹی میں کسی مسلّمہ سیاسی جماعت کا کوئی شخص شریک نہیں ہوگا۔ بہتر یہ ہوگا کہ اس میں ہائی کورٹ کے دو سابق جج اور ایک یا دو انگریزوں کو شامل کر دیا جائے۔ ۳۔ دسمبر ۱۹۴۴ء کو کمیٹی کا دوسرا اجلاس الہ آباد میں ہوا۔ نئی کمیٹی کے اراکین کے ناموں کا اعلان کیا گیا، جس میں سر تیج بہادر سپرو بطور چیئرمین، جیکر، بشپ، فاس ویسٹ کوٹ،

راد ھاکرشنن ، سرہومی مودی، سرمہاراج سنگھ ، محمد یونس ، این آر سرکار ، فرینک انیتھونی اور سنت سنگھ شامل تھے۔ ۱۰ دسمبر کو سپرو نے کمیٹی کے چند ارکین کے ساتھ قائد اعظم سے ملاقات کی اجازت چاہی لیکن قائد اعظم نے کمیٹی کے مقاصد سے عدم اتفاق کی بنا پر ملاقات سے معذرت کردی۔

کمیٹی کے متعدد اجلاس ہوئے۔ ۸ اپریل ۱۹۴۵ کو اس نے جو قرار دادیں منظور کیں اور جو تجاویز پیش کیں، ان کے مطابق ہندوستان کی تقسیم کی مخالفت کی گئی تھی۔ ملک کا آئندہ آئین مرتب کرنے کے لئے ۱۶۰ اراکین پر مشتمل آئین ساز جماعت کی تشکیل اور ہندوستان کے مجوزہ وفاق میں ہندوستان کی ریاستوں کی بطور وحدت، شمولیت کی سفارش کی گئی ہندوستان کے آئندہ آئین میں بنیادی حقوق کی وضاحت اور ایک آزاد اقلیتی کمیٹی کے قیام کی تجویز بھی پیش کی گئی نیز جداگانہ انتخابات ختم کرنے اور مجلس آئین ساز، مرکزی اسمبلی اور مرکزی انتظامیہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی نمائندگی کے لئے کہا گیا۔

کمیٹی نے رپورٹ میں یہ سفارش بھی کی کہ اگر یہ تجاویز مختلف سیاسی جماعتوں اور فرقوں کے لئے قابل قبول نہ ہوں تو حکومت برطانیہ ہندوستان میں ایک عبوری حکومت قائم کردے اور آئندہ نئے آئین کی تشکیل کے لئے ان تجاویز کے تحت ایک جماعت بھی قائم کردے۔ آئین پارلیمان میں پیش کرنے کے بعد جلد از جلد نافذ ہو۔ ہندو مہا سبھا ، سکھوں اور دیگر چھوٹی چھوٹی جماعتوں نے اس تجویز کو اس بنا پر مسترد کر دیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی کا حق دیا گیا تھا۔ نیز سکھوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے کوئی تجویز نہ تھی۔ قائد اعظم نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ کمیٹی گاندھی کی دھن پر رقص کر رہی ہے۔

لیاقت ڈیسائی معاہدہ

اپریل ۱۹۴۵ء میں یہ افواہ عام ہو گئی کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان کوئی معاہدہ طے پا گیا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ لیاقت علی خاں اپنے طور پر مرکزی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے قائد بھولا بھائی ڈیسائی کے ساتھ مل کر عبوری حکومت سے متعلق کسی سمجھوتہ پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ طے یہ پایا تھا کہ عبوری حکومت میں کانگرس اور مسلم لیگ کی مساوی نمائندگی ہو۔ ڈیسائی کا کہنا تھا کہ اس تجویز کو گاندھی کی حمایت حاصل تھی اور قائد اعظم کو بھی اس کا

مرکزی اور صوبائی آئینوں کے منتخب اراکین سے لیا جائے۔

۲۔ تمام کونسل ہندوستانی اراکین پر مشتمل ہو۔ البتہ وائسرائے اور کمانڈر انچیف حکومت برطانیہ کے، یعنی انگریز ہوں۔

۳۔ وزارتِ جنگ کمانڈر انچیف کے پاس ہو اور باقی محکمے کونسل کے اراکین کے پاس ہوں۔

۴۔ نئی کونسل اسی دستور کے تحت کام کرے جو اس وقت ملک میں موجود تھا۔

۵۔ گورنر جنرل کو اپنی کونسل کا کوئی فیصلہ مسترد کرنے اور اس فیصلہ کے برعکس اپنے فیصلہ کے مطابق عمل کرنے کا اختیار ہو۔ تاہم وہ اس اختیار کا استعمال بلاوجہ نہ کرے۔

۶۔ تاج برطانیہ اور ہندوستان کی ریاستوں کے تعلقات بدستور وائسرائے کی وساطت سے قائم رہیں۔

۷۔ برطانیہ کے تجارتی و دیگر مفادات کی نگرانی کے لئے ہندوستان میں نوآبادیاتی سطح کا ایک انگریز ہائی کمشنر موجود رہے۔

ایگزیکٹو کونسل کے اہم فرائض یہ تھے:

ا۔ جاپان کے خلاف جنگی کوششیں۔

ب۔ نئے اور مستقل آئین پر تمام پارٹیوں کے اتفاق رائے تک امورِ حکومت ہند چلانا۔

ج۔ آئین پر اتفاق رائے کے لئے غور و خوض۔

لارڈ ویول نے اپنی نشری تقریر میں یہ بات بھی بتائی کہ اگر یہ تجاویز منظور کر لی گئیں اور ان پر عمل شروع ہو گیا تو ایسے تمام صوبوں میں از سرِ نو وزارتوں کا قیام عمل میں آئے گا، جہاں وزارتوں کے مستعفی ہونے کے باعث گورنر راج قائم تھا۔

ان دنوں دونوں کی پوزیشن یہ تھی کہ کانگریس تو چھ صوبوں میں اپنی وزارتیں ختم کر چکی تھی اور اپنی اس احمقانہ سیاسی حرکت پر اب تک ہاتھ مل رہی تھی۔ اُدھر صوبۂ سرحد اور بنگال میں علی الترتیب سردار اورنگ زیب اور خواجہ ناظم الدین کی وزارتوں کو شکست ہو چکی تھی۔ صوبۂ سرحد میں کانگریس ہائی کمان نے ڈاکٹر خان صاحب کو وزارت سازی کی اجازت دے دی تھی۔ بنگال گورنر راج کے تحت رہا۔ چنانچہ ویول نے اس اعلان کے وقت صرف سندھ اور آسام میں وزارتیں قائم تھیں۔

موجود تھا۔ تجویز میں یہ بات شامل تھی کہ کانگرس اور مسلم لیگ عبوری حکومت میں برابر لوگوں کو شامل کرنا چاہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ مرکزی اسمبلی کے رکن بھی ہوں۔ نیز سکھوں اور اچھوتوں کا ایک ایک نمائندہ بھی شامل ہو۔ یہ تجاویز وائسرائے کے پاس پیش کر دی گئیں اور اس توقع کا اظہار کیا گیا کہ گاندھی اور جناح بھی ان پر صاد کریں گے۔ وائسرائے نے یہ تجاویز وزیر امور ہند کو روانہ کر دیں لیکن اس کا اعتراض یہ تھا کہ ان میں جنگ کے معاملہ پر حکومت کی حمایت کا کوئی ذکر نہیں۔ نیز گورنر جنرل کو کونسل کے اراکین کی نامزدگی کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے نہ ہی غیر کانگرسی ہندوؤں، غیر مسلم لیگی مسلمانوں اور اقلیتوں کے بارے میں کوئی تفصیل موجود ہے۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ قائد اعظم نے اس معاہدہ سے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ اصل معاملہ کیا تھا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ لیاقت علی خاں نے بالا بالا ایسی کوئی کوشش کی ہو اور یہ بات بھی قابل قبول نہیں کہ پہلے قائد اعظم نے لیاقت علی خاں کو ایسا کرنے کی اجازت دے دی ہو اور بعد میں گاندھی کی طرح اپنی بات سے پلٹ گئے ہوں۔ بہرحال نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور ڈیسائی ہمیشہ کے لئے سیاست سے خارج ہو گئے۔

یہ سب کچھ جان لینے کے بعد بھی لارڈ ویول مئی ۱۹۴۵ء میں لندن چلے گئے تاکہ اس منصوبہ پر کوئی بات چیت کی جا سکے۔

ویول منصوبہ

لارڈ ویول لندن پہنچے۔ اسی دوران جرمنی نے ہتھیار ڈال دیئے اور یورپ میں جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔ اب حالات کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے فوری طور پر اقدامات کئے جائیں۔ لارڈ ویول اپنے ساتھ جو منصوبہ لے کر گئے تھے اس پر انہوں نے انگلستان میں مختلف اراکین حکومت کے ساتھ تبادلہ خیال کیا۔ وہ ۴ جون ۱۹۴۵ء کو بعض تجاویز کے ساتھ ہندوستان لوٹ آئے۔ انہی تجاویز کو ویول منصوبہ کا نام دیا گیا۔ ۱۴ جون کو انہوں نے ریڈیو سے تجاویز کا اعلان کیا، لب لباب یہ تھا:

۱۔ موجودہ ایگزیکٹو کونسل ختم کر کے اس کی جگہ ایک نئی ایگزیکٹو کونسل قائم کر دی جائے۔ نئی کونسل میں مسلمانوں اور اونچی جاتی کے ہندوؤں کی نمائندگی مساوی ہو اور نمائندوں کو

وزارتوں کی بحالی سے متعلق ویول کا اعلان کانگرس کے لئے گزشتہ چھ سال میں سب سے بڑی خوشخبری کے مترادف تھا لیکن اپنے دل میں وہ اس خار کی کھٹک بھی شدت سے محسوس کر رہی تھی کہ وزارتیں مخلوط ہوں گی۔ کانگرس کو یہ بھی رنج تھا کہ ویول منصوبہ کے تحت اونچی جاتی کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مساوات قائم کرکے انہیں (ہندوؤں کو) مسلمانوں کی سطح پر کیوں لایا گیا اور ان صوبوں میں جہاں ہندو اکثریت میں تھے، مخلوط وزارتیں قائم کرنے کی تجویز کیوں رکھی گئی؟ بہرحال کانگرس نے نہایت چالاکی سے یہ موقف اختیار کیا کہ وائسرائے نے اونچی اور نیچ ذات کے ہندوؤں میں تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر کانگریسی ہندوؤں نے اس بات پر احتجاج کرتے ہوئے ہندوستان اور اپنے مذہب کی تاریخ کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا جبکہ اس احتجاج کے لمحہ تک اچھوتوں کے ساتھ حسن سلوک اور ذات پات کے امتیاز کو ختم کرنے کے لئے گاندھی کے لیکچر جاری تھے اور وہ مثال قائم کرنے کے لئے خود اچھوتوں کی بستی میں قیام فرماتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگرس کا احتجاج اس دکھ پر مبنی نہ تھا کہ ذات پات کی تمیز کیوں پیدا کی گئی بلکہ مقصد یہ تھا کہ نیچ ذات کے ہندوؤں کو عام ہندوؤں میں شامل کرکے اچھوت اقلیت کو نظر انداز کیا جانا چاہئے تھا اور اس طرح زائد تعداد کی بناء پر مسلمانوں کے مقابلہ میں مساوی نمائندگی کو ختم کرا کے کانگرس کے لئے زائد نمائندگی حاصل کرنا تھا۔ یعنی ایک پنتھ دو کاج۔ اچھوت اپنے حقوق سے محروم، کانگرس کی نفری میں اضافہ! ۱۷ر جون کو کانگرس کی مجلس عاملہ نے ایک ہدایت نامہ جاری کیا جو شملہ کانفرنس میں مدعو کانگریسی نمائندوں کے نام تھا جس میں کہا گیا تھا کہ مدعو کانگرسی، کانفرنس میں اس بات کی مخالفت کریں کہ مسلمان نمائندوں کے نام صرف مسلم لیگ ہی پیش کرے بلکہ کانفرنس میں شریک ہونے والے تمام گروہ، کونسل کی رکنیت کے لئے مسلمانوں، پست اقوام اور ہندوؤں کے نام مشترکہ طور پر پیش کریں۔

شملہ کانفرنس

لارڈ ویول نے ۱۵ر جون ۱۹۴۵ء کو شملہ کانفرنس میں شرکت کے لئے دعوت نامے جاری کئے۔ مدعوئین میں صوبائی حکومتوں کے وزرائے اعلیٰ، مستعفی کانگریسی وزارتوں کے سابق وزرائے اعلیٰ، مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر، مرکزی اسمبلی کانگرس پارٹی کا لیڈر، نیشنلسٹ اور یورپین گروپ کے لیڈر، گاندھی اور قائد اعظم محمد علی جناح شامل تھے۔ موخرالذکر

دونوں رہنماؤں کو مسلم رہنماؤں کی حیثیت میں دعوت دی گئی تھی - علاوہ ازیں پست اقوام اور سکھوں کا ایک ایک نمائندہ بھی مدعو کیا گیا۔ جہاں تک گاندھی کا تعلق تھا تو انہوں نے یہ کہہ کر کہ وہ کانگرس کے ابتدائی رکن بھی نہیں، لہذا کانگرس کی نمائندگی کیسے کرسکتے ہیں، وائسرائے سے معذرت کر لی۔ قائداعظم نے وائسرائے سے درخواست کی کہ ان کی نشری تقریر میں شامل بعض باتوں کی وضاحت قبل از وقت ضروری تھی تاکہ وہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ سے مشورہ کرسکیں۔ انہوں نے کانفرنس ۱۵ دن کے لئے ملتوی کرنے کو بھی کہا۔ وائسرائے نے کانفرنس کے التوا پر معذرت کرتے ہوئے قائداعظم کو جواب دیا کہ یہ وضاحت کانفرنس کے اجلاس ہی میں کی جائے گی۔ وائسرائے نے یہ مشورہ بھی دیا کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس اگر شملہ میں طلب کر لیا جائے تو باہم بات چیت میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ ۲۴ جون کو لارڈ ویول نے شملہ میں قائداعظم، گاندھی اور ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی۔ گاندھی نے ابوالکلام آزاد کا نام اپنی جگہ تجویز کیا تھا۔ گاندھی کے اس اقدام کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ کانگرس ہندوؤں ہی کی نہیں بلکہ مسلمانوں کی نمائندہ بھی ہے۔ پنجاب کے خضر حیات ٹوانہ نے وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ وائسرائے کی کونسل میں یونینسٹ پارٹی کو بھی نمائندگی ملنی چاہئے۔ کانگرس اور خود وائسرائے کو یہ مطالبہ "پسند" تھا کیونکہ اس طرح پاکستان کے مقصد کو نقصان پہنچایا جاسکتا تھا۔ لیکن قائداعظم نے اس مطالبہ کی شدید مخالفت کی اور صاف طور پر بتا دیا کہ یونینسٹ پارٹی ہو یا کانگرس، دونوں میں کسی کو مسلمانوں کی نمائندگی کا کوئی حق حاصل نہیں اور وائسرائے کی کونسل میں مسلمانوں کی طرف سے صرف مسلم لیگ کے نمائندے شامل ہوں گے۔ قائداعظم نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ چھوٹی اقلیتیں کیونکہ ہندوؤں کی ہمنوائی کریں گی لہذا قدرتی طور پر مسلمان اقلیت میں رہ جائیں گے۔ چنانچہ جب مسلمان اکثریت کسی مسئلہ پر مخالفت کرے تو یہ مسئلہ ووٹوں کے ذریعہ طے نہ ہو۔

۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو شملہ کانفرنس کا پہلا اجلاس وائسرائے کی افتتاحی تقریر پر ختم ہو گیا۔ دوسرا اجلاس کھانے کے بعد شروع ہوا۔ سب سے پہلے کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد نے دوران تقریر کہا کہ کانگرس کسی ایسی تجویز کو خواہ وہ عبوری تصفیہ کی خاطر سامنے آئی ہو، قبول نہیں کرے گی، جس کے باعث اس کے قومی مزاج کو ضعف پہنچتا ہو اور ایک قومیت کی نشوونما میں حائل ہوتا ہو۔

قائداعظم کے اعتراض پر وائسرائے نے ابوالکلام آزاد کو بتایا کہ ان کی تجاویز میں ایسی

کوئی بات نہیں جس سے کانگرس کو فرقہ وارانہ انجمن بنانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ اسی کانفرنس میں قائداعظم اور ڈاکٹر خان صاحب کے درمیان بھی نوک جھونک ہوئی۔ ڈاکٹر خان صاحب بھی اس بات پر معترض تھے کہ کانگرس کو صرف ہندوؤں کی نمائندگی تک کیوں محدود رکھا جا رہا تھا۔ مگر وائسرائے نے واضح طور پر کہہ دیا کہ کانگرس صرف اپنے اراکین کی نمائندہ ہے۔ ۱۷ر جون کو کانفرنس کا اجلاس صرف ایک گھنٹہ جاری رہا تاکہ قائداعظم اور پنڈت گووند ولبھ پنت کو مسلم لیگ اور کانگرس میں سمجھوتہ کرانے کا موقع دیا جائے۔ ۱۹ر جون کو چوتھا اجلاس ہوا جس میں بتایا گیا کہ قائداعظم اور پنڈت پنت کی مساعی ناکام ہو چکی ہیں۔ لہٰذا وائسرائے نے تمام پارٹیوں سے کونسل کے اراکین کے نام طلب کر لئے۔

کانگرس نے ۵ر جولائی کو کونسل کے لئے اراکین کے نام وائسرائے کو بھیج دیئے۔

۶۔ جولائی کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے یہ فیصلہ کیا کہ وائسرائے اور قائداعظم کے درمیان خفیہ بات چیت میں مسلم لیگی نمائندوں کے بارے میں فیصلہ کیا جائے نیز کونسل کے لئے تمام مسلمان اراکین مسلم لیگ ہی سے لئے جائیں۔ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا ایک اور فیصلہ یہ تھا کہ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کوئی ٹھوس اقدام کیا جائے تاکہ عبوری انتظام و انصرام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔

۹۔ جولائی کو وائسرائے نے قائداعظم کو اطلاع دی کہ انہیں یہ بات منظور نہیں کہ کونسل کے لئے مسلمان اراکین کا انتخاب صرف مسلم لیگ کی فہرست سے کیا جائے۔ چنانچہ قائداعظم نے اسی دن ویول کو اطلاع دی کہ اس طرح مسلم لیگ کے بنیادی اصولوں کی نفی ہوتی ہے لہٰذا وہ نام بھیجنے سے قاصر ہیں۔

اس دوران وائسرائے کو دیگر تمام پارٹیوں کی طرف سے ناموں کی فہرستیں وصول ہو چکی تھیں۔ وائسرائے نے اپنے طور پر مسلم لیگ کی طرف سے فہرست بھی مرتب کر لی جو ان کے خیال میں مسلم لیگ کے لئے قابل قبول ہو سکتی تھی۔ ۱۱ر جولائی کو ویول نے قائداعظم کو بتایا کہ کونسل میں مسلم لیگ کے ۴ نمائندے لئے جائیں گے۔ پانچواں مسلمان ہوگا، جو پنجابی اور غیر مسلم لیگی ہوگا۔ ویول نے اتنی لچک رکھی کہ اگر مسلم لیگ کو وائسرائے کے ناموں پر اعتراض ہو تو مسلم لیگ اور نام دے دے، جن پر غور کیا جا سکے گا۔ ویول کی خواہش یہ تھی کہ قائداعظم بہرحال کونسل میں شامل ہوں۔

مسلم لیگ کا مؤقف

قائد اعظم کا اصرار تھا کہ کونسل میں پانچوں مسلمان ہر قیمت پر مسلم لیگ سے ہی لئے جائیں۔ اگر کونسل میں مسلمانوں کو کسی فیصلہ پر اعتراض ہو تو اس فیصلہ کے لئے لازما دو تہائی اکثریت کی رائے دریافت کی جائے۔

لیکن وائسرائے نے یہ دونوں شرائط تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ قائد اعظم نے بھی صاف بتا دیا کہ مسلم لیگ اپنے بنیادی اصولوں کے برعکس تعاون پر آمادہ نہیں۔

۱۴۔ جولائی کو کانفرنس کے آخری اجلاس میں لارڈ ویول نے اپنی مساعی اور کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کر دیا۔ اس اجلاس سے قائد اعظم نے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"میں اس بات کی تردید کرتا ہوں کہ کانفرنس کی ناکامی کی ذمہ دار مسلم لیگ ہے۔ کانفرنس میں شریک دو نمائندوں نے یہ ذمہ داری مسلم لیگ پر عائد کی ہے لیکن انہوں نے حقیقت کو قطعاً نظر انداز کر دیا۔ مشکل یہ ہے کہ مسلم لیگ اور کانگرس کے انداز فکر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر آج بنیادی تنازعہ ہے کل وہ ایک مسئلہ بن کر مجوزہ کونسل میں اختلاف کی صورت اختیار کرے گی۔ مثلاً آج متحدہ ہندوستان اور پاکستان کے بنیادی پر اتفاق نہیں تو کل کونسل کے اجلاس میں بھی یہی بات زیر بحث آ سکتی ہے۔ اس وقت کون سا نیا حل آئے گا؟ مسلم لیگ اس عزم کا اعادہ کرتی ہے کہ وہ پاکستان حاصل کر کے رہے گی۔ جہاں تک عبوری دور کی عارضی حکومت کے قیام کا تعلق ہے تو مسلم لیگ ایسی ہر تجویز پر مشروط غور و خوض کے لئے تیار ہے۔ شرائط یہ ہیں کہ حکومت برطانیہ کی طرف سے مسلمانوں کو حق خود ارادیت دینے کا اعلان کیا جائے اور عبوری انتظام میں مسلمانوں کو دیگر تمام قوموں کے مقابلہ میں مساوی نمائندگی دی جائے۔ لیکن ہماری پہلی شرط کے لئے اس عبوری انتظام میں کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ دوسری شرط نامکمل رہی کیونکہ مسلمانوں کو مساوی نمائندگی دینے کی جگہ صرف ایک تہائی نمائندگی دی گئی۔"

اسی دن قائد اعظم نے پریس کو بتایا کہ ویول منصوبہ صرف ایک جال تھا، جو گاندھی، کانگرس

لارڈ ویول اور خضر حیات خاں نے مسلمانوں کو پھنسانے کے لئے بچھایا تھا۔ یہ سب مل کر مسلمانوں کے خلاف صف آرا تھے اور اگر مسلمان ویول کی تجاویز سے اتفاق کر لیتے تو یقیناً اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیتے۔ مسلمان یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ انہیں ایک قوم کی جگہ اقلیت کہا جائے اسی لئے وہ ۲۳ ؍ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان سے ایک قدم پیچھے ہٹنے پر تیار نہیں۔

افشائے راز

۱۰ ؍ اگست ۱۹۴۵ء کو جب قائد اعظم نے شملہ کانفرنس کے اندرونی حالات بیان کئے تو وہ باتیں کھل کر سامنے آگئیں جو کانگرس اور انگریز کے درمیان خفیہ ملاقاتوں میں طے پائی تھیں۔ سرکاری ریکارڈ کے حوالہ سے قائد اعظم نے بتایا کہ لارڈ ویول نے کانگرس سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ اگر مسلم لیگ اپنے موقف سے نہ ہٹی تو اسے نظر انداز کرتے ہوئے وہ اپنی پسند کے پانچ مسلمانوں کو اپنی کونسل میں شامل کر لیں گے۔ کانگرس اور دیگر جماعتوں کے نمائندے بھی لارڈ ویول کو اس بات پر اکسا رہے تھے کہ ایک ضدی شخص (قائد اعظم) کو ہندوستان کی ترقی کے راستہ کی چٹان نہ بننے دیا جائے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب لارڈ ویول نے حکومت برطانیہ سے اس امر کی اجازت طلب کی کہ مسلم لیگ کو نظر انداز کرتے ہوئے ویول منصوبہ کو عملی جامہ پہنا دیا جائے تو برطانوی کابینہ نے منظوری دینے سے انکار کر دیا اور یہ بھی واضح کر دیا کہ عبوری حکومت کا قیام مسلم لیگ اور کانگرس کے تعاون ہی سے عمل میں آئے گا۔

برطانوی کابینہ میں تبدیلی

برطانوی وزیر اعظم چرچل نے ویول کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ ویول کی تجاویز انہیں ۱۶ ؍ جولائی کو وصول ہوئی تھیں، لیکن ۲۰ ؍ جولائی ۱۹۴۵ء کو برطانوی حکومت تبدیل ہو گئی اور لیبر پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد کانگرس کے ناپاک عزائم دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ لیکن برطانیہ میں لیبر پارٹی کے برسر اقتدار آتے ہی کانگرس نے محسوس کیا کہ شملہ کانفرنس کا زخم جلد مندمل ہو جائے گا۔ کیونکہ کانگرس۔ لیبر پارٹی کی چہیتی محبوبہ تھی۔ کانگرس نے فوراً نئے وزیر اعظم ایٹلی کو مبارکباد کا تار دے کر اپنی پرانی وفاداریوں کا یقین دلانے میں پہل کر دی۔

باب ۲۱

عام انتخابات سنہ ۱۹۴۵ء اور کابینہ مشن منصوبہ

شملہ کانفرنس ناکام ہوئی، کانگریس نے ایٹلی کو وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے پر مبارک باد دی اور مسلم لیگ نے دسمبر ۱۹۴۳ کی قراردادِ کراچی کا اعادہ کرتے ہوئے اس مطالبے کو دہرایا کہ ملک میں جلد از جلد عام انتخابات کرائے جائیں۔ مسلم لیگ کا مقصد یہ تھا کہ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد انگریز اور ہندو پر یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ مسلم لیگ بلا شبہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور اُسے ہندوستان کے مسلمانوں کی مکمل تائید حاصل ہے تاکہ اس طرح کانگریس کے اس دعوے کو غلط ثابت کیا جائے کہ وہ تمام ہندوستانیوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اتفاق یہ ہوا کہ اگست ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما پر ایٹم بم پھینکا گیا، ساتھ ہی جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے۔ لہٰذا جرمنی اور جاپان کی شکست کے بعد عام انتخابات کو التوا میں رکھنے کا کوئی جواز نہ رہا۔ علاوہ ازیں اس مطالبے پر برطانیہ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ خود اس نے جنگ ختم ہونے سے پہلے انتخابات کرائے تھے۔

وائسرائے ہند لارڈ ویول نے ۲۱ اگست ۱۹۴۵ء کو یہ اعلان کیا کہ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے آئندہ انتخابات موسم سرما میں کرائے جائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ جلد ہی حکومتِ برطانیہ سے صلاح مشورہ کی غرض سے لندن جائیں گے۔ مسلم لیگی حلقوں نے وائسرائے کے ان اعلانات کا خیر مقدم کیا۔ لارڈ ویول ۲۴ اگست کو عازمِ لندن ہوئے اور ۱۶ ستمبر کو ہندوستان لوٹ آئے۔ واپسی کے چوتھے دن انہوں نے ایک اعلان کیا:

"ملک معظم برطانیہ کی حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ ہندوستان کے مختلف الخیال رہنماؤں کی

مشترکہ کرائے سے ہندوستان کو جلد حکومتِ خود اختیاری دینے کی کوشش کریں گے۔ اس سلسلہ میں ملک معظم کے ساتھ میری تفصیلی بات چیت ہوئی اور مجوزہ اقدامات بھی زیرِ بحث آئے۔ انتخابات آئندہ موسم سرما میں ہوں گے۔ اور حکومتِ برطانیہ یہ توقع رکھتی ہے کہ تمام صوبوں میں سیاسی رہنما وزارتی ذمہ داریاں قبول کرنے میں مسرت محسوس کریں گے۔ اس اقدام کے فوراً بعد حکومتِ برطانیہ جلد از جلد مجلسِ آئین ساز کے انعقاد کا ارادہ رکھتی ہے۔ بعد ازاں ۱۹۳۵ء کے اعلان کے بارے میں اسمبلی کے اراکین سے بات چیت کی جائے گی۔ حکومتِ برطانیہ نے مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ میں صوبائی انتخابات ختم ہوتے ہی ایک ایسی کونسل قائم کروں، جسے تمام اہم سیاسی جماعتوں کی تائید حاصل ہو۔"

مسلم لیگ نے وائسرائے کے پہلے بیان کا خیر مقدم کیا تھا۔ لیکن لندن سے واپسی پر انہوں نے جو بیان دیا اس پر مسلم لیگ اور کانگریس، دونوں کو اعتراض تھا۔ مسلم لیگ کا اعتراض تو یہ تھا کہ بیان میں پاکستان کی بنیاد کو تسلیم کرنے کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ مسلم لیگ پاکستان کے اصول سے ایک قدم ادھر اُدھر نہ ہوگی۔ کانگریس کا خیال یہ تھا۔ کہ اس اعلان میں آزادی کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ بہرحال دونوں جماعتوں نے انتخابات کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کیونکہ انہی پر ہندوستان کے مستقبل کا دارو مدار تھا۔ مسلم لیگ کے لئے خود کو مسلمانوں کی نمائندہ ثابت کرنے کا اس سے بہتر موقع نہ تھا۔

انتخابی سرگرمیاں

عام انتخابات کے لئے مسلم لیگ نے اپنا پارلیمانی بورڈ مقرر کیا جس کے صدر لیاقت علی خاں تھے۔ ایک الیکشن کمیٹی تشکیل کی، جسے مجلسِ عاملہ کے بعض اختیارات منتقل کئے گئے۔ الیکشن کمیٹی کے صدر نواب محمد اسماعیل خان تھے۔ قائداعظم نے ہندوستان بھر کا دورہ کیا۔ اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اس نازک موقع پر مسلم لیگ کے پرچم تلے اکٹھے ہو جائیں۔

کانگریس نے حسبِ عادت تفریق پیدا کرنے کے لئے مختلف نعرے لگائے اور کہا کہ دھرتی ماتا کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کسی قیمت پر بھی پاکستان نہ بننے دیا جائے۔ کانگریس نے مسلم لیگ پر یہ الزام بھی عائد کیا کہ وہ خان بہادروں، سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کا ٹولہ ہے یا حکومت سے پنشن حاصل کرنے والے پٹھوؤں کی جماعت ہے۔ کانگریس نے ایسے مسلمانوں کو ساتھ ملانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ جو پیسے کے بل پر بآسانی خریدے جا سکتے تھے اور قبل ازیں کسی نہ کسی طرح کانگریس کا ساتھ دے چکے تھے۔ مسلمانوں کے ان گروہوں میں مومن کانفرنس، شیعہ کانفرنس، جمعیت العلمائے ہند اور مجلسِ احرار

اسلام شامل تھے۔ پنجاب میں کانگریس کو یونینسٹ پارٹی کی حمایت حاصل تھی۔ جہاں تک جمیعتہ العلماء ہند کا تعلق تھا تو اس میں بیشتر ممتاز علماء شامل نہ تھے۔ علاوہ میں مسلم لیگ کا ساتھ دینے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ مثلاً مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ؛ بڑے علماء میں مولانا حسین احمد مدنی غالباً واحد عالم تھے۔ جو کانگریس کا ساتھ دے رہے تھے۔ انتخابات کے دوران کانگریس کے ہاتھ آزاد قومی فوج کا سٹنٹ بھی آیا۔ سبھاش چندر بوس ہندوستان سے بھاگ کر جاپان جا چکے تھے۔ وہاں انہوں نے ہندوستانی جنگی قیدیوں کو ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے لئے آئی۔ این۔ اے (انڈین نیشنل آرمی) کے نام سے فوجی تنظیم قائم کر لی تھی۔ مگر جاپان کی شکست کے بعد اس فوج کے بیس ہزار سپاہی انگریزوں کی قید میں آ گئے۔ ان پر مقدمہ چلانے کے لئے ایک فوجی عدالت قائم کی گئی۔ کیونکہ ان سپاہیوں میں ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ لہٰذا ہندوستان میں ان سے سبھی کو ہمدردی تھی۔ کانگریس کے لئے یہ ایک اچھا موقع تھا۔ لہٰذا اس نے ان قیدیوں کے مسئلہ کو سیاسی ضرورت کے لئے پوری طرح استعمال کیا۔

انتخابات دو مراحل میں مکمل ہوئے۔ دسمبر ۱۹۴۵ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات کی تکمیل ہوئی۔ بمبئی میں کانگریس نے قائداعظم کے مقابلہ میں ایک مسلمان تاجر سیٹھ حسین بھائی لال جی کو کھڑا کیا۔ لیکن ان کی ضمانت نہ صرف اس حلقے میں ضبط ہوئی۔ بلکہ وہ جس دوسرے حلقہ سے امیدوار تھے، وہاں بھی ضمانت ضبط کرا بیٹھے۔ اکثر نیشنلسٹ مسلمانوں کا بھی یہی انجام ہوا۔ مسلم لیگ نے انتخابات میں اتنی شاندار کامیابی حاصل کی۔ کہ کوئی بھی مسلمان نشست اس کے ہاتھ سے نہ گئی۔ مسلم لیگ نے ۸۶٫۶ فیصد (مسلمان ووٹوں کا) اور کانگریس نے ۹۱٫۳ فیصد (مجموعی عام ووٹوں کا) ووٹ حاصل کئے۔

مرکزی اسمبلی کی نشستوں کے اعداد و شمار یہ تھے۔

کانگریس	۵۷ نشستیں
مسلم لیگ	۳۰ "
آزاد امیدوار	۵ "
سکھ	۲ "
یورپین	۸ "
کل :	۱۰۲

دلچسپ بات یہ ہے کہ اعداد و شمار کی موجودگی کے باوجود کانگریس نے ایک خاص بلیٹن شائع کیا

جس میں کل ۱۰۲ نشستوں میں سے ۵۷ کے حصول کو کانگریس کی سب سے بڑی کامیابی قرار دیتے ہوئے یہ کہا گیا کہ کانگریس نے اس ملک کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت ہونے کا ثبوت دے دیا۔

صوبائی انتخابات

مرکزی اسمبلی کے بعد صوبائی اسمبلی کے انتخابات کا آغاز ہوا۔ اوائل ۱۹۴۶ء کے ان عام صوبائی انتخابات میں کانگریس نے ۹۲۰ نشستیں جیت کر ۸ صوبوں میں مطلق اکثریت حاصل کر لی، مسلم لیگ نے ۴۲۸ نشستیں حاصل کیں۔

انتخابات کے نتائج یہ تھے۔

پنجاب	مسلمان حلقے	۸۶	کامیاب	۷۵
بنگال	〃 〃	۱۱۹	〃	۱۱۳
آسام	〃 〃	۳۴	〃	۳۳
سندھ	〃 〃	۳۴	〃	۲۷
یوپی	〃 〃	۶۶	〃	۵۴
بمبئی	〃 〃	۳۰	〃	۳۰
مدراس	〃 〃	۲۹	〃	۲۹
سی پی	〃 〃	۱۴	〃	۱۳
اوڑیسہ	〃 〃	۴	〃	۴
صوبہ سرحد	〃 〃	۳۸	〃	۱۷
بہار	〃 〃	۴۰	〃	۳۴

بعد ازاں پنجاب میں ۴ مزید کامیاب امیدوار مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ سندھ کا مسئلہ یہ تھا کہ انتخابات کے بعد مسلم لیگ کو اسمبلی میں نصف ووٹ حاصل ہوئے۔ لہٰذا دسمبر ۱۹۴۶ء میں دوبارہ انتخابات کرائے گئے۔ اور مسلم لیگ نے تمام دوسری سیاسی جماعتوں پر برتری حاصل کر لی۔

وزارت سازی کا مرحلہ

سندھ میں آزاد مسلمان اراکین اسمبلی کا ایک گروہ جس کی قیادت جی، ایم سید کے ہاتھ میں تھی

کانگریس کے ساتھ گٹھ جوڑ میں مصروف تھا۔ اور دعویٰ کر رہا تھا کہ اس نے اس گٹھ جوڑ کے ذریعہ اپنی تعداد مسلم لیگ کی تعداد سے زیادہ کر لی تھی۔ لہٰذا اُسے وزارت سازی کا موقع ملنا چاہیئے۔ لیکن سندھ اور بنگال کے گورنر یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ مخلوط وزارت قائم کرنے کا موقع سب سے پہلے اس جماعت کو دیں گے جسے ایوان میں سب سے بڑی پارٹی کا درجہ حاصل ہو۔ چنانچہ مسلم لیگ پارٹی کے قائد غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی۔

آسام میں کانگریس نے واضح اکثریت کی بنیاد پر وزارت بنائی۔ اور ایک نیشنلسٹ مسلمان کو بھی کابینہ میں شامل کر لیا۔ وزارت میں دو مسلم لیگی شامل کرنے کی پیش کش بھی کی گئی۔ لیکن شرط یہ تھی کہ یہ مسلم لیگی کانگریس کے پارلیمانی پروگرام کی پیروی کریں گے۔ لیکن مسلم لیگ نے وزارت میں نیشنلسٹ مسلمان کی موجودگی کے باعث اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ بمبئی، بہار، مدراس، یوپی، سی پی اور اڑیسہ میں کانگریس وزارتیں قائم ہو گئیں۔ گو کانگریس نے ہر وزارت میں مسلم لیگ کو شامل کرنے کی مشروط پیش کش کی لیکن مسلم لیگ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

صوبہ سرحد میں کانگریس کو واضح اکثریت حاصل ہوئی تھی۔ لہٰذا وہاں ڈاکٹر خان صاحب نے وزارت بنائی۔

بنگال میں سید حسین شہید سہروردی کو وزارت سازی کی دعوت دی گئی، انھوں نے کانگریس کو شرکت کی دعوت دی۔ مگر کانگریس کے انکار پر انہوں نے آزاد امیدواروں کو ساتھ ملانے کے بعد مسلم لیگی وزارت قائم کر لی۔

پنجاب میں یونینسٹ پارٹی برسرِ اقتدار آئی۔ اُسے کانگریس اور سکھوں کی بھرپور امداد کے باوجود ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جب چار یونینسٹ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو مسلم لیگ کے اراکین کی مجموعی تعداد ۹، ہو گئی۔ کچھ اور یونینسٹ اراکین بھی تقسیم ہو گئے۔ اس طرح یونینسٹ پارٹی کے پاس صرف ۸ نشستیں رہ گئیں۔ جب پنجاب میں وزارت سازی کا مرحلہ آیا تو کانگریس اور سکھوں نے مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تین شرائط پیش کر دیں۔ شرائط یہ تھیں۔

۱۔ کانگریس کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھنے والوں کو وزارت میں شامل کرے۔
۲۔ کانگریس اور اکالی سکھوں کو وزارت میں نصف حصہ ملے گا۔
۳۔ صوبائی اسمبلی میں پاکستان یا اس قسم کا کوئی سوال جس کا تعلق صوبہ سے نہ ہو، نہیں اٹھایا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کے لیے یہ شرائط قابلِ قبول نہ ہو سکتی تھیں۔ لہٰذا مسلم لیگ نے سکھوں کے ساتھ مل کر وزارت سازی کی کوشش کی۔ لیکن انہوں نے یہ شرط پیش کر دی کہ پاکستان کے قیام کی صورت میں پنجاب میں سکھ ریاست قائم کی جائے گی۔ مسلم لیگ فوری طور پر ایسا کوئی وعدہ نہ کر سکتی تھی جو بعد ازاں پورا کرنے میں دشواری پیش آتی۔ لہٰذا یہ کوشش بھی ترک کر دی گئی۔ اس کے بعد کانگریس نے سکھوں اور یونینسٹوں سے مخلوط وزارت قائم کرنے کے سلسلے میں اتحاد قائم کیا۔

پنجاب کا گورنر گلانسی یہ نہیں چاہتا تھا کہ پنجاب میں مسلم لیگ وزارت قائم ہو۔ اُس نے سندھ اور بنگال کے گورنروں کے اقدام کے برعکس مسلم لیگ پارٹی کے قائد کو وزارت سازی کی دعوت نہ دی اور یہ عذر لنگ پیش کیا کہ شاید غیر مسلم جماعتیں مسلم لیگ کے ساتھ تعاون نہ کریں۔ چند دن بعد گورنر نے مخلوط وزارت قائم کر دی۔ جس میں کانگریس، سکھ اور یونینسٹ شامل تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وزیر اعلیٰ سر خضر حیات خاں ٹوانہ تھے۔ جن کی جماعت میں صرف دس اراکین شامل تھے اور جو صوبے کی سب سے چھوٹی جماعت تھی۔ اس اتحاد میں ۱۵ یونینسٹ، ۲۲ سکھ اور ۵۱ کانگریسی شامل تھے۔ اس طرح پنجاب کی اکثریتی جماعت یعنی مسلمان حزبِ اختلاف بن گئی۔ مگر مخلوط وزارت دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ وزیر اعلیٰ خضر حیات خان ٹوانہ خود ہی مستعفی ہو گئے۔ اس وقت سے اب تک یونینسٹ پارٹی کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

حصولِ پاکستان کا عزم

انتخابات کے بعد قائداعظم نے اپریل ۱۹۴۶ء میں انتخابات میں کامیاب ہونے والے تمام مسلم لیگی امیدواروں کا ایک کنونشن طلب کیا۔ اس موقع پر قائداعظم نے اپنی افتتاحی تقریر میں حصولِ پاکستان کی جدوجہد کو تیز تر کرنے پر زور دیا اور انگریزوں کے چلے جانے کے بعد مسلمانوں پر ہندوؤں کے غلبہ کے سنگین نتائج سے آگاہ کیا۔ قائداعظم نے واضح الفاظ میں بتایا کہ انگریز ہو یا ہندو ـــــ دونوں مسلمانوں کے راستے میں دیواریں کھڑی کر سکتے ہیں۔ مگر وہ کسی قیمت پر بھی مسلمانوں کی منزل اُن سے نہیں چھین سکتے۔ تاخیر تو ہو سکتی ہے لیکن حوصلہ اور یقین محکم کبھی اور کسی صورت میں ختم نہیں ہو سکتے۔ فتح آخر کار ہندوستان کے مسلمانوں کی ہوگی۔

اسی کنونشن میں حسین شہید سہروردی نے پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان، بنگال اور آسام میں مسلمانوں کے لیے خود مختار ریاست کے قیام کی قرارداد پیش کی۔ اس قرارداد میں

صاف صاف کہا گیا تھا کہ مسلمان، متحدہ ہندوستان کے لئے کوئی آئین قبول نہ کریں گے، نہ ہی ایسی کسی کوشش میں حصہ لیں گے۔ جس کا مقصد متحدہ ہند کے لئے متحدہ آئین کے تحت متحدہ مشینری قائم کرنا ہو۔ قرارداد میں مزید کہا گیا کہ برطانوی حکومت کے لئے مسلم لیگ کا تعاون حاصل کرنے کی اولین شرط مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی فوری منظوری ہے۔ مسلم لیگ اسی صورت میں مرکز میں عبوری حکومت کے ساتھ تعاون کر سکے گی۔

کنونشن کے اختتام سے قبل ہر رکن نے حلف اٹھایا۔ جس میں مسلم لیگ کے ساتھ وفاداری، مسلم لیگ کے مقاصد اور اس کی طرف سے حصول پاکستان کے مطالبہ کی راہ میں چلائی جانے والی ہر تحریک اور مہم کے ساتھ وفاداری کا وعدہ کیا گیا تھا۔ حلف میں ہر قسم کی قربانی دینے اور خطرات کا مقابلہ کرنے کا وعدہ بھی کیا گیا۔

کابینہ مشن

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد حکومت برطانیہ، ہندوستان کے سیاسی حالات کا بنظر غائر جائزہ لے رہی تھی۔ حکومت برطانیہ کو انتخابات کے دوران ہی یہ احساس ہو چکا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو نظر انداز کر دینا ممکن نہیں رہا۔ اور اگر حالات پر قابو پانے کی کوشش نہ کی گئی تو سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان کے مستقبل کا مسئلہ طے کرنے کے لئے ایک وزارتی وفد ہندوستان بھیجا جائے۔ وفد کے لئے وزیر امور ہند سر پیتھک لارنس، سر سٹیفورڈ کرپس اور اے، وی الیگزنڈر کو منتخب کیا گیا۔ ۹ار فروری کو لارڈ پیتھک لارنس اور وزیر اعظم برطانیہ ایٹلی نے علی الترتیب دار الامراء اور دار العوام میں بیک وقت اس وزارتی وفد کا اعلان کیا۔ ۱۵ر مارچ کو وزیر اعظم ایٹلی نے دار العوام میں بحث کے دوران بتایا کہ برطانیہ کو اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا مکمل احساس ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اقلیتوں کو اکثریت کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ رہے۔ لیکن یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی اقلیت کو اکثریت کی نشوونما اور ترقی کے خلاف دیوار بننے کی اجازت دے دی جائے۔

کانگریس کو اس اعلان کا آخری جملہ بہت پسند آیا۔ لیکن تیسرے ہی دن قائد اعظم نے اس کا مسکت جواب دیتے ہوئے کہا کہ اگر ایک مکڑی، ایک مکھی کو اپنے "محل" میں آنے کی دعوت دے اور مکھی انکار کر دے تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مکھی ضد کر رہی ہے اور مکڑی کی ترقی کے راستے میں حائل ہو رہی ہے ؟

قائداعظمؒ نے وزیراعظم برطانیہ کو یہ بھی بتایا کہ مسلمان اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم ہے اور حق خود ارادیت اس کا پیدائشی حق ہے۔ مسلمان ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کی تشکیل کا فیصلہ کر چکے ہیں یہ ان کا آخری فیصلہ ہے کیونکہ ہندوستان کے آئینی مسئلہ کا حل صرف اور صرف پاکستان میں ہے۔

۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزارتی وفد ہندوستان پہنچ گیا۔ لارڈ پیتھک لارنس نے آتے ہی پریس سے بات چیت کرتے ہوئے کہا، بلاشبہ کانگریس زیادہ لوگوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ لیکن مسلم لیگ کو صرف ایک اقلیت کی سیاسی نمائندہ جماعت سمجھ لینا غلط ہوگا۔ مسلم لیگ ایک عظیم مسلمان جمعیت کی نمائندگی کرتی ہے اور صاحب اکثریت ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وفد کی آمد کا مقصد ایسے نظام کا قیام ہے۔ جس کے ذریعہ ہندوستانی خود ایسی صورت کا تعین کریں کہ ہندوستان کو آزادی کا مکمل درجہ حاصل ہو جائے۔ اس پریس کانفرنس میں سر سٹیفورڈ کرپس نے یہ وضاحت بھی کی کہ مشن کسی فیصلے کا تعین کرکے نہیں آیا نہ ہی کوئی سکیم ہمراہ لے کر آیا تھا۔

مشن کے اراکین نے وائسرائے کے بعد تمام صوبائی گورنروں اور وائسرائے کی کونسل کے اراکین سے بات چیت شروع کی۔ یہ سلسلہ تقریباً آٹھ دن جاری رہا۔ بعد ازاں مشن نے مختلف سیاسی رہنماؤں صوبائی وزراء، صوبائی اسمبلیوں کے اراکین اور والیان ریاست سے تبادلہ خیال کیا۔

کانگریسی رہنماؤں سے مشن کی پہلی ملاقات ۳ اپریل ۱۹۴۶ء کو ہوئی۔ کانگریس کے صدر ابوالکلام آزاد نے مشن کو بتایا کہ ہندوستان کے لئے مکمل آزادی تا آئین، آئین ساز اسمبلی وضع کرے دریں اثناء مرکز میں عبوری حکومت قائم کر دی جائے۔ اور آئندہ تمام مراحل کی ذمہ داری مجلس آئین ساز پر ہو، عبوری حکومت ۱۵ افراد پر مشتمل ہو، جس میں صوبوں کے ۱۱ نمائندے لئے جائیں اور چار نشستیں اقلیتوں کو دی جائیں۔ ابوالکلام آزاد نے مشن کو بتایا کہ کانگریس ہر قیمت پر متحدہ ہندوستان چاہتی ہے۔ تاہم مسلم لیگ کو اختیاری شعبوں میں خود اختیاری کا حق دیا جا سکتا ہے۔ نمائندگی کے بارے میں ابوالکلام آزاد نے بتایا کہ کانگریس کی ۹ نشستوں کے مقابلے میں بلاشبہ مسلم لیگ کے پاس صرف دو یا تین نشستیں ہوں گی۔ لیکن ایگزیکٹو کونسل میں کانگریس اور مسلم لیگ کے لیے تقریباً مساوی نشستوں کا اہتمام کیا جا سکے گا۔ مگر وہ وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ کانگریس اس پر رضامند ہوگی یا نہیں۔ ابوالکلام آزاد نے یہ بات بالکل گاندھی کے انداز میں کہی کہ انتظام ممکن تو ہے لیکن ان کی ذاتی رائے میں فیصلہ کانگریس پر ہے۔

اسی شام گاندھی نے وفد سے ملاقات کی اور اپنی روایات اور الفاظ کے الٹ پھیر کو قائم

رکھتے ہوئے کہا کہ وہ تو بالکل ذاتی حیثیت میں مل رہے تھے۔ کیونکہ وہ کانگریس کے ابتدائی رکن بھی نہیں۔ کانگریس کا مؤقف تو کانگریسی رہنما ہی بتا سکیں گے۔ گاندھی دلچسپ باتیں کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ انہوں نے اصل مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے اور موقع محل سے قطع نظر مشن سے کہا کہ نمک کا محصول ختم کر کے غریبوں کے لئے نمک مفت فراہم کیا جائے۔ انہوں نے مشن کو یہ تاثر بھی دیا کہ وہ مسلمانوں کے نہایت مخلص دوست تھے۔ (مگر لندن کانفرنس کے موقع پر انہوں نے مسلمانوں کے لئے پدرانہ شفقت کا مظاہرہ کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا تھا۔) لیکن قائداعظم جس قسم کا پاکستان چاہتے تھے۔ وہ ان کی فہم سے بالاتر تھا۔ کیونکہ پاکستان کا مطالبہ جب تک "ٹھوس دلائل" کے تحت نہ سمجھا جائے۔ اسے کیسے قبول کیا جا سکتا ہے؟ گاندھی نے دو نظریے کے بارے میں کہا، کہ وہ نہایت خطرناک قسم کا نظریہ تھا۔ دراصل مسلمان تو ہندوؤں ہی کی نسل سے تھے۔ اس لئے دو قوموں کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے۔ گاندھی نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ عبوری دور کے لئے قائداعظم سے حکومت بنانے کو کہا جائے۔ جس میں اسمبلیوں کے اراکین شامل ہوں۔ اگر قائداعظم انکار کر دیں تو کانگریس کو یہی پیشکش کی جائے۔

۴ر اپریل کو مشن کی ملاقات قائداعظم سے ہوئی۔ جب مطالبۂ پاکستان کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ تاریخ شاہد ہے کہ چندر گپت کے زمانہ میں ہندوستان میں کبھی ایک حکومت قائم نہیں رہی۔ حتیٰ کہ انگریزوں کی آمد اور ہندوستان کے بڑے حصّہ پر حکومت کے باوجود ریاستیں قائم رہیں۔ لہٰذا پاکستان کا مطالبہ کسی صورت بھی نامناسب نہ تھا۔ اگر اتحاد ممکن ہوتا تو ۱۹۰۶ء میں معمولی سے اختیارات منتقل ہوتے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کا آغاز کیوں ہوا؟ مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کے بعد سمجھوتہ نہ ہونے کی صورت میں حکومت برطانیہ نے حتمی فیصلہ کیوں دیا؟ مسلمانوں کے مطالبہ پر سندھ کو بمبئی سے الگ کیوں کیا۔ اور صوبہ سرحد کو گورنری صوبہ کیوں بنایا گیا؟ اگر خود برطانوی حکومت نے یہ اقدامات کئے تو آج پاکستان کے مطالبہ پر اعتراض کیوں؟ مسلمانوں کی ثقافت، زبان، معاشرت، رسم و رواج، فلسفہ، اور مذہب سبھی ہندوؤں سے مختلف ہیں سوال یہ ہے کہ اتنے اختلاف کے باوجود حکومت برطانیہ ان دو قوموں کو کس قدر مشترک کے ذریعہ ملا کر ایک کر سکے گی۔ ان تمام باتوں کا حل صرف قیام پاکستان ہی میں نظر آتا ہے۔

۱۶ر اپریل کو مشن نے قائداعظم سے دوبارہ ملاقات کی تو مشن کے بارے میں بتایا گیا کہ "برطانوی مشن کی آمد کا مقصد ہندوستان سے برطانوی اقتدار کے خاتمہ پر غور و خوض ہے۔

اب اس کے سامنے یہ فیصلہ ہے کہ اختیار اور اقتدار کس کے حوالہ کیا جائے۔ مشن یہ سمجھا ہے کہ اس معاملہ پر ہندوستان میں اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔ کانگریس متحدہ ہندوستان چاہتی ہے اور ریاستوں کے حکمران ہندوستان کے وفاق میں شمولیت پر آمادہ ہیں۔ مگر آپ پاکستان چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر حکومت برطانیہ کو ہندوستان سے اپنا اقتدار اور فوج دونوں ختم کرنا ہیں تو دو جماعتوں کے درمیان تصادم کے امکان پر بھی غور کرنا ضروری ہے۔ اگر اس بات کا کوئی جواب نہیں تو پھر یہ سوچنا ہوگا کہ حکومت برطانیہ اور یہ مشن کیا کرے؟ مشن کو یہ سوال کرنے کا حق حاصل ہے کہ کیا ہندوستانی اپنی حفاظت کو قائم رکھ سکیں گے؟ اسی لئے حکومت برطانیہ یہ چاہتی ہے کہ ہندوستان کے دفاع کے لئے برطانیہ سے مدد طلب کی جائے۔ اس صورت میں برطانیہ کو اس مدد کی شرائط پر غور کرنا ہوگا۔ یعنی یہ کہ اس کے عوض ہندوستان ہمسایہ ممالک کے دفاع میں برطانیہ کی مدد کرے۔ لیکن ہندوستان پر بیرونی حملہ کی صورت میں خود ہندوستان کا دفاع مؤثر طریق پر ہونا ضروری ہے، لہٰذا ہندوستان کے معاملات کا حل تلاش کرنا ناگزیر ہے۔ اور برطانوی حکومت یہ پوچھنے کا حق رکھتی ہے کہ کیا ہندوستان کا نظام ایسا ہوگا جو عملاً برطانیہ کے ساتھ تعاون کر سکے؟"

۱۷ اپریل کو مشن نے قائداعظم سے ملاقات کے بارے میں ابوالکلام آزاد کو مطلع کیا۔ دوسرے دن مشن آرام کی غرض سے کشمیر چلا گیا۔ کشمیر سے واپسی پر کرپس نے ۲۶ اپریل کو ابوالکلام آزاد سے دوبارہ ملاقات کی اور ایک بار پھر سے بنیادی آئین پر تبادلۂ خیال کیا۔ قبل ازیں اس آئین کی تجویز کو گاندھی اور پنڈت نہرو مسترد کر چکے تھے۔ ابوالکلام آزاد نے آمادگی ظاہر کی کہ وہ کانگریس کو ان بنیادوں پر مسلم لیگ کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ کرپس نے قائداعظم سے پھر ملاقات کی اور حالات سے آگاہ کیا۔ قائداعظم مسلم لیگ اور کانگریس کے مشترکہ اجلاس پر رضامند ہو گئے۔ ۲۷ اپریل کو وزیر امور ہند پیتھک لارنس نے قائداعظم اور ابوالکلام آزاد کو ایک خط کے ذریعہ مطلع کیا کہ مسلم لیگی اور کانگریسی رہنماؤں سے ملاقات کے بعد ان کی خواہش ہے کہ دونوں جماعتیں ایک بار پھر مفاہمت کی کوشش کریں۔ پیتھک لارنس نے بات چیت کے بنیادی اصولوں کے طور پر ان دونوں کو ایک سکیم بھی روانہ کی اور کہا کہ وہ چار برطانوی نمائندوں سے اس مسئلہ پر بات چیت کے لئے اپنے چار چار نمائندے بھیجیں۔ برطانوی نمائندوں میں وائسرائے ہند لارڈ ویول اور کابینہ مشن کے ۳ اراکین شامل ہو گئے۔ خط میں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی کہ آئندہ آئین کا ڈھانچہ یہ ہو کہ امور خارجہ، مواصلات اور دفاع کا انتظام ایک یونین گورنمنٹ کرے۔ صوبوں کی صورت یہ ہو کہ ہندو اکثریت کے صوبوں کا ایک اور مسلم اکثریت کے صوبوں

کا وہ سرا گروپ ہو۔ یہ گروپ دوسرے تمام شعبوں کے انتظامات سنبھالیں۔ لیکن یہ شعبے وہ ہوں گے جو دونوں گروپوں کے خیال میں مشترکہ انتظام کے متقاضی ہوں۔ اس کے بعد جو شعبے بچیں وہ صوبائی حکومتیں اپنے زیر انتظام رکھیں۔ ہندوستان کی ریاستیں پہلے سے طے شدہ شرائط کے تحت اس منصوبہ میں گنجائش حاصل کر سکیں گی۔ بنیادی اصولوں کی وضاحت کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ بات چیت کے دوران کی جا سکتی ہے۔

قائداعظم نے اس اعتراض کے ساتھ کہ متعدد معاملات کی وضاحت پہلے سے ضروری ہے کانفرنس میں شرکت کے لئے نام بھیج دیئے۔ ان میں نواب محمد اسماعیل خان، سردار عبدالرب نشتر لیاقت علی خان اور وہ خود شامل تھے۔

کانگریس کا اعتراض یہ تھا کہ پیتھک لارنس کے خط میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی بنیادی بات موجود نہ تھی۔ نہ ہی یہ بتایا گیا کہ ہندوستان سے برطانوی فوجیں کب تک واپس بلائی جائیں گی۔ تاہم کانگریس نے کانفرنس میں شرکت کے لئے جواہر لعل نہرو، ولبھ بھائی پٹیل، خان عبدالغفار خان (سرحدی گاندھی)، اور ابوالکلام آزاد کے نام بھیج دیئے۔

دوسری شملہ کانفرنس

شملہ کانفرنس کا آغاز ۵ رمئی ۱۹۴۶ء کو ہوا۔ اس کے اجلاس ایک ہفتہ تک جاری رہے۔ ۸ رمئی کو مشن نے مفاہمت کے لئے مجوزہ نکات، کانگریس اور مسلم لیگ کے سامنے رکھ دیئے؛ جو نکات مختصراً یہ تھے:

○ ایک کل ہند یونین گورنمنٹ اور مقننہ ہو گی۔ جس کے تحت امور خارجہ، دفاع، مواصلات، اور بنیادی حقوق شامل ہوں گے۔ یونین کو ان محکموں کے اخراجات کے لئے رقم کی فراہمی کا اختیار ہو گا۔

○ باقی تمام اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں گے۔

○ مسلم اور ہندو اکثریت کے صوبوں کے الگ الگ گروپ ہوں گے جو اپنے مشترکہ امور کا تعین کریں گے۔

○ یہ صوبائی گروپ اپنی اپنی انتظامیہ اور اسمبلیاں قائم کر سکیں گے۔ یونین کی اسمبلی مسلمان اور ہندو اکثریت کے صوبوں کی مساوی نمائندگی کی حامل ہو گی۔ خواہ انہوں نے یا ان میں سے کسی ایک نے

خود کو گروپوں میں تقسیم کیا ہو یا نہ کیا ہو، اسمبلی میں ریاستوں کے نمائندے بھی شامل ہوں گے۔
یونین کی حکومت اسمبلی کے تناسب سے تشکیل کی جائے گی۔

اگر گروپ ہوں تو ان گروپوں اور یونین کے دساتیر میں یہ بات شامل ہوگی کہ کوئی صوبہ اپنی اسمبلی کی کثرت رائے سے آئین کے نکات پر دوبارہ غور و خوض کا مطالبہ کر سکے گا۔ تاہم یہ مطالبہ دس سال کے بعد کیا جاسکے گا۔ اور اس کے بعد ایسا ہی ہر مطالبہ ہر دس سال کے بعد ممکن ہوگا۔

آئین ساز ادارہ درج بالا بنیادوں پر آئین کی تشکیل کے لئے جس صورت کا حامل ہوگا وہ یوں ہوگی۔ کہ ہر صوبائی اسمبلی سے نمائندگان چنے جائیں گے۔ نمائندگان کا تناسب اسمبلی میں مختلف جماعتوں کی قوت کے تناسب اور مذکورہ اسمبلی کے اراکین کی مجموعی تعداد کے دسویں حصّہ کی بنیاد پر ہوگا ــــ ریاستوں کے نمائندے ان کی آبادی کی بنیاد پر اور برطانوی ہند کی نمائندگی کے اعتبار سے شامل کئے جائیں گے۔ اس طرح جو آئین ساز اسمبلی معرض وجود میں آئے گی۔ اس کا اجلاس کم از کم وقت میں نئی دلی میں منعقد ہوگا۔ ابتدائی اجلاس کے بعد جس میں بنیادی امور پر بات چیت شامل ہوگی اُسے تین شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ پہلا شعبہ مسلمان اکثریت کے صوبوں، دوسرا ہندو اکثریت کے صوبوں اور تیسرا ریاستوں کی نمائندگی کرے گا۔ ہندو اور مسلم اکثریت والے صوبوں پر مشتمل دونوں شعبے علیحدہ اجلاس منعقد کریں گے۔ تاکہ وہ اپنے گروپ کے لئے صوبائی دساتیر کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو ایک دستور کے بارے میں متفق ہو جائیں۔ جب یہ معاملہ طے پا جائے تو ہر صوبہ کے لئے یہ اختیار محفوظ ہوگا کہ وہ اپنے بنیادی گروپ سے الگ ہو کر دوسرے گروپ میں شامل ہو جائے۔ یا دونوں گروپوں سے باہر رہے۔ اس کے بعد پھر تینوں شعبے مشترکہ اجلاس منعقد کریں۔ تاکہ وہ یونین کے لئے آئین وضع کر سکیں۔ یونین کے آئین میں ایسا کوئی بنیادی نکتہ شامل نہ کیا جائے۔ جس کا تعلق فرقہ وارانہ مسائل سے ہو تاوقتیکہ اسمبلی میں شامل ہندوؤں اور مسلمانوں کی اکثریت اس کے حق میں اپنی رائے کا اظہار نہ کر دے۔

اِن نکات پر بحث کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ سے ان کے نقطہ ہائے نظر طلب کر لئے گئے۔

کانگریس کی شرائطِ مفاہمت

۱۔ ہر صوبہ کی اسمبلی متناسب نمائندگی اور آرائے منتقلہ (سنگل ٹرانسفریبل ووٹ) کے ذریعہ نمائندے منتخب کرے اور اس طرح جو تعداد منتخب ہو وہ اراکین اسمبلی کی مجموعی تعداد کا پانچواں حصّہ ہو ان اراکین پر اسمبلی کے رکن ہونے کی کوئی پابندی عائد نہ ہو۔ ریاستوں کے نمائندے اپنی آبادی کے

اعتبار سے اس تناسب سے لئے جائیں۔ جس تناسب سے برطانوی ہندوستان کے نمائندے موجود ہوں۔ ان نمائندوں کے طریق انتخاب پر بعد ازاں غور ہو۔

۲۔ آئین ساز اسمبلی یونین کے لئے آئین وضع کرے۔ جو کل ہند یونین گورنمنٹ اور مجلس مقننہ پر مشتمل ہو۔ اور دفاع امور خارجہ، مواصلات، بنیادی حقوق، کرنسی، محصول بندی اور کسٹم وغیرہ کا بندوبست کرے۔ ایسے ہی دیگر اہم شعبوں کا انتظام بھی اس کے سپرد کر دیا جائے۔ یونین کو اختیار ہو، کہ ہنگامی حالات یا آئینی انتشار کی صورت میں مطلوبہ اقدامات کر سکے۔

۳۔ باقی ماندہ اختیارات صوبوں یا وحدتوں (یونٹ) کو حاصل ہوں۔

۴۔ صوبوں کے گروپ قائم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ گروپ ایسے شعبوں کا تعین کریں، جنہیں وہ مشترکہ انتظام میں لینا چاہتے ہوں۔

۵۔ جب آئین ساز اسمبلی کل ہند یونین کے لئے آئین کا فیصلہ کر چکے تو صوبوں کے نمائندے اپنے اپنے گروپ کے لئے صوبائی دساتیر کا فیصلہ کریں۔ بشرطیکہ وہ گروپ کے لئے آئین پر متفق ہوں۔

۶۔ کل ہند وفاقی یونین کے آئین میں ایسا کوئی معاملہ جس کا تعلق فرقہ وارانہ مسئلہ سے ہو، آئین ساز اسمبلی میں طے کیا جائے گا۔ بشرطیکہ متعلقہ فرقے یا کوئی ایک فرقہ اسمبلی میں موجود ہو اور اس مسئلہ پر جداگانہ حیثیت میں اس کے حق میں رائے موجود ہو۔ اگر ایسے کسی مسئلہ پر اتفاق رائے نہ ہو سکے تو اُسے ثالثی کے لئے بھیج دیا جائے۔ اس بات کا فیصلہ کہ کیا بات فرقہ واریت پر مبنی ہے؟ اسمبلی کا سپیکر کرے۔ وہ اگر چاہے تو یہ مسئلہ وفاقی عدالت کو بھیج دے۔

۷۔ اگر آئین سازی کے دوران کسی معاملہ پر نزاع پیدا ہو جائے تو ایسے مسئلہ کو فیصلہ کے لئے عدالت کے سپرد کیا جائے۔

۸۔ آئین پر کسی وقت بھی نظر ثانی کا انتظام موجود ہو۔ نظر ثانی کے مطالبہ پر آئین میں یہ واضح کر دیا جائے۔ کہ دس سال کے بعد اس پر نظر ثانی کی گنجائش موجود ہو۔

مسلم لیگ کی شرائط مفاہمت

۱۔ پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ، بنگال اور آسام کے چھ مسلمان صوبوں کا ایک گروپ قائم کیا جائے۔ یہ گروپ امور خارجہ، دفاع اور دفاع کے لئے لازمی مواصلات کے سوا باقی تمام اختیارات کا حامل ہو گا۔

۲۔ ان چھ مسلمان صوبوں کے لئے ایک علیحدہ آئین ساز ادارہ ہو۔ جو اس پورے گروپ اور گروپ میں شامل صوبوں کے لئے آئین وضع کرے۔

۳۔ آئین ساز اسمبلی کے لئے نمائندوں کے انتخاب کا طریق کار یہ ہو۔ کہ اس میں مختلف فرقوں کی نمائندگی اس کی آبادی کے اعتبار سے موجود ہو۔

۴۔ مسلمان صوبوں کا یہ گروپ "پاکستان گروپ" کہلائے گا۔ اور اس کے ہر صوبہ کو پاکستان کی وفاقی حکومت اور اس کے صوبوں کے دساتیر مرتب کرنے کے بعد اس بات کا حق حاصل ہو کہ وہ گروپ میں رہنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ استصواب رائے عامہ کے ذریعہ ہو۔

۵۔ مشترکہ آئین ساز ادارہ میں اس معاملہ پر بحث کے لئے ہر وقت اجازت ہو۔ کہ یونین کی مجلس قانون ساز ہو یا نہ ہو۔ نیز دونوں گروپوں کی مجالس آئین ساز کو اس فیصلہ کا حق حاصل ہو، کہ مشترکہ یونین کے لئے اخراجات کیونکر فراہم کئے جائیں۔ تاہم یہ اخراجات کسی صورت میں بھی ٹیکس کے ذریعہ پورے کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

۶۔ یونین کی انتظامیہ میں (اگر اس کی مجلس مقننہ ہو تو) دونوں گروپوں کو مساوی نمائندگی حاصل ہو۔

۷۔ یونین کے آئین میں اگر فرقہ وارانہ مسئلہ آجائے۔ تو اس کا فیصلہ مشترکہ آئین ساز ادارہ کرے۔ بشرطیکہ ہندو اور پاکستانی صوبوں کے گروپ کی مجالس آئین ساز کے موجود اور ووٹ دینے والے اراکین کی اکثریت علیحدہ علیحدہ اس کی تائید کرتی ہو۔

۸۔ قانون سازی یا انتظامی معاملات میں کوئی نزاعی مسئلہ پیدا ہو۔ تو یونین تین چوتھائی آراء کی اکثریت کی صورت ہی میں کوئی فیصلہ کرے۔

۹۔ گروپوں اور صوبوں کے دساتیر میں بنیادی حقوق، مذہب، ثقافت اور ایسے دیگر معاملات کے تحفظ کے لئے جو کسی بھی فرقہ پر اثر انداز ہوتے ہوں، کوئی انتظام کیا جائے۔

۱۰۔ یونین کے آئین میں یہ بات شامل ہو کہ کوئی صوبہ اپنی مجلس قانون ساز کی اکثریت کے فیصلہ کے تحت آئین کی شرائط پر نظر ثانی کا مطالبہ کر سکے۔ یا دس سال کی ابتدائی مدت کی تکمیل کے بعد جب بھی چاہے یونین سے علیحدگی اختیار کرے۔

مسلم لیگ نے مفاہمت کی ان شرائط کے آخر میں یہ بات بھی واضح کر دی کہ تمام شرائط کا انحصار ایک دوسرے پر ہے۔ اور ان شرائط مفاہمت پر فرداً فرداً نہیں بلکہ ان کی مجموعی حیثیت میں

غور کرنا ضروری ہے۔

کابینہ مشن رپورٹ

۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو کابینہ مشن نے اپنی رپورٹ کا آغاز یوں کیا۔

"۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو وزیراعظم برطانیہ مسٹر اٹیلی نے کابینہ مشن کو ہندوستان روانہ کرنے سے پہلے یہ الفاظ کہے تھے کہ میرے ساتھی ہندوستان کو کم از کم عرصہ میں آزادی کے حصول میں مدد دینے کے لئے ہندوستان جا رہے ہیں۔ موجودہ حکومت کے بعد ہندوستان میں کون سا طرز حکومت قائم ہوگا اس کا فیصلہ خود ہندوستان کو کرنا ہوگا۔ لیکن ہماری خواہش یہ ہے کہ یہ فیصلہ کرنے کے لئے ہندوستان کو ایک لائحہ عمل فراہم کر دیا جائے۔ مجھے توقع ہے کہ ہندوستان کے لوگ برطانوی دولت مشترکہ کے ساتھ رہنا پسند کریں گے۔ اور یہ یقین بھی کہ ہندوستان کو اس صورت میں بہت سے فائدے حاصل ہوں گے۔ تاہم یہ ہندوستان کی اپنی مرضی پر منحصر ہے۔ برطانوی دولت مشترکہ اور سلطنت کسی صورت بھی بیرونی دباؤ کے پابند نہیں یہ آزاد لوگوں کی رضا کارانہ وابستگی کا معاملہ ہے۔ اگر ہندوستان مکمل آزادی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے، پھر یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم انتقالِ اختیارات کے کام کو کس طرح آسان تر بنائیں اور اس کے لئے راستہ کیوں کر ہموار کریں۔"

اس تمہید کے ساتھ کابینہ مشن نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ :

"ان تاریخی الفاظ کے احترام میں کابینہ کے وزراء اور وائسرائے ہند نے مل کر اس امر کی حتی الوسع کوشش کی کہ وہ ہندوستان کی دونوں اہم سیاسی جماعتوں کے درمیان ہندوستان کے اتحاد یا اس کی تقسیم کے بنیادی مسئلہ پر کوئی سمجھوتہ کرانے میں اس کی پوری مدد کریں۔ دلی میں طویل بات چیت کے بعد ہم کانگریس اور مسلم لیگ کو شملہ کانفرنس میں یکجا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ شملہ میں بالوضاحت تبادلۂ خیال ہوا۔ دونوں سیاسی جماعتیں کسی سمجھوتہ پر پہنچنے کے لئے کچھ نہ کچھ گنجائش پیدا کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ لیکن ان کے درمیان کچھ اختلافات بدستور رہیں۔ نتیجہ بات چیت کی ناکامی کی صورت میں برآمد ہوا۔ کیونکہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ لہٰذا ہمارا یہ فرض ہے کہ وہ تجاویز پیش کریں جو ہمارے نزدیک بہترین ہوں اور جن کے تحت نئے آئین کی تیاری میں آسانیاں پیدا ہو جائیں۔ یہ بیان تاجِ برطانیہ کے منشاء اور اس کی منظوری کے بعد دیا جا رہا ہے۔

ہم نے ایسے اہتمام کا فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستان کے لوگ، ہندوستان کے لئے آئندہ آئین

کے بارے میں کسی فیصلہ پر پہنچ سکیں۔ اور فوری طور پر ایک عبوری حکومت قائم کردی جائے جو نئے آئین کی تیاری تک برطانوی ہندوستان کا انتظام و انصرام سنبھال سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ عوام کے تمام چھوٹے اور بڑے طبقوں کے ساتھ انصاف روا رکھا جائے اور ایک ایسا حل پیش کیا جائے جس کے تحت مستقبل کے ہندوستان پر حکومت ممکن ہو۔ نیز اس انتظام کے تحت دفاع، سماجی، سیاسی اور اقتصادی میدان میں ترقی کے لئے ٹھوس بنیادوں پر مواقع فراہم کئے جا سکیں۔

اس بیان میں مشن کے سامنے رکھی جانے والی مختلف تجاویز پر تبصرہ ضروری نہیں سمجھا گیا تاہم اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کے سوا باقی سب نے ہندوستان کے اتحاد کے حق میں بات کی ہے۔

اس کے باوجود ہم ہندوستان کی تقسیم کے غیر جانبدارانہ اور بنظر غائر مطالعہ کے امکان کو نظرانداز نہیں کرسکے۔ ہمیں مسلمانوں کی جائز خواہشات کا مکمل احساس ہے۔ مسلمانوں کا یہ اندیشہ بجا ہے کہ وہ ہندو راج کے ماتحت نہ آجائیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ احساس اتنا شدید اور عام ہے کہ اسے صرف کاغذی تحفظات و مواعید تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہندوستان میں داخلی امن و امان کا قیام ضروری ہے۔ تو اس کے لئے ایسے اقدامات بھی نہایت ضروری ہوں گے۔ جن کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنے مذہبی، ثقافتی اور اقتصادی مفادات کی ضمانت دی جا سکے۔

لہٰذا ہم نے پہلے تو مسلم لیگ کے دعوے کی روشنی میں ایک علیحدہ اور مکمل آزاد و خود مختار ریاست "پاکستان" کے سوال کا جائزہ لیا۔ اس قسم کے پاکستان میں دو علاقے ہوں گے۔ ایک شمال مغرب میں، جس میں پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحد اور برطانوی بلوچستان شامل ہوں گے۔ اور دوسرا شمال مشرق میں جو بنگال اور آسام کے صوبوں پر مشتمل ہوگا۔ مسلم لیگ حدود کے تعین کے بارے میں اس بات پر آمادہ تھی کہ یہ کام بعد ازاں کر لیا جائے گا۔ لیکن اسے اصرار اس بات پر تھا کہ سب سے پہلے پاکستان کے اصول کو تسلیم کر لیا جائے۔ جہاں تک پاکستان کی علیحدہ ریاست کے قیام کے سلسلہ میں مسلم لیگ کے دلائل کا تعلق ہے، وہ ایک تو مسلمان اکثریت کی اس خواہش پر مبنی ہیں کہ مسلمان اپنے طرز حکومت کا فیصلہ خود کریں۔ اور دوسرے بعض ایسے علاقوں کو پاکستان میں شامل کیا جائے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں تاکہ پاکستان کو اقتصادی اور انتظامی اعتبار سے فعال بنایا جا سکے۔

پاکستان میں چھ صوبے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، غیر مسلم اقلیتوں کا جائزہ حسب ذیل ہے۔

شمال مغربی علاقہ

	مسلمان	غیر مسلم
پنجاب	۱۶,۲۱۷,۲۴۲	۱۲,۲۰۱,۵۷۷
صوبہ سرحد	۲,۷۸۸,۷۹۷	۲۴۹,۲۷۰
سندھ	۳,۲۰۸,۳۲۵	۱,۳۲۶,۶۸۳
برطانوی بلوچستان	۴۳۸,۹۳۰	۶۲,۷۰۱
	۲۲,۶۵۳,۲۹۴	۱۳,۸۴۰,۲۳۱
	۳۷٫۹۳ فیصد	۶۲٫۰۷ فیصد

شمال مشرقی علاقہ

	مسلمان	غیر مسلم
بنگال	۳۳,۰۰۵,۴۳۴	۲۷,۳۰۱,۰۹۱
آسام	۳,۴۴۲,۴۷۹	۶,۷۶۲,۲۵۴
	۳۶,۴۴۷,۹۱۳	۳۴,۰۶۳,۳۴۵
	۵۱٫۶۹ فیصد	۴۸٫۳۱ فیصد

باقی برطانوی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے مسلمانوں کی تعداد دو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔

ان اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے خطوط پر جس الگ اور خود مختار ریاست پاکستان کا مطالبہ کیا گیا۔ وہ فرقہ وارانہ اقلیت کا مسئلہ حل نہیں کر سکتا۔ نہ ہی ہمیں خود مختار پاکستان میں پنجاب، بنگال، اور آسام کے علاقوں کو شامل کرنے میں کوئی معقولیت محسوس ہوتی ہے اور اگر پاکستان کے حق میں زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کر کے کوئی دلیل فراہم کی جا سکتی ہے۔ تو ہمارے

خیال ہیں صرف یہی کہ پاکستان سے غیر مسلم علاقوں کو خارج کر دیا جائے۔ اس مرحلہ پر سکھوں کی حیثیت یقیناً متاثر ہوگی۔

لہٰذا ہم نے اس بات پر غور کیا آیا ایک چھوٹا خود مختار پاکستان جو صرف مسلمان اکثریت سے علاقوں پر مشتمل ہو، سمجھوتے کی بنیاد بن سکتا ہے؟ لیکن اس قسم کا پاکستان مسلم لیگ کے نزدیک نامناسب ہوگا۔ کیوں اُس میں سے

(۱) پنجاب میں انبالہ اور جالندھر کے ڈویژن خارج ہو جائیں گے،

(ب) ماسوا سلہٹ، پورا آسام نکل جائے گا اور

(ج) کلکتہ سمیت جس کی مسلمان آبادی ۲۳٫۶ فی صد ہے، مغربی بنگال کا خاصا حصہ بھی نکل جائے گا۔

ہم بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بعد جو حل سامنے آئے گا وہ ان صوبوں کے رہنے والوں کی اکثریت مناسب کی خواہشات اور مفادات کے برعکس ہوگا۔ بنگال اور پنجاب میں ہر ایک کی اپنی زبان اور طویل تاریخ و روایات ہیں۔ مزید یہ کہ پنجاب کی تقسیم سکھوں کو بھی لازماً تقسیم کر دے گی۔ اور وہ سرحد کے دونوں طرف منقسم ہو جائیں گے۔ لہٰذا ہم اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ پاکستان بڑا ہو خواہ چھوٹا۔ فرقہ وارانہ مسائل کے لئے کوئی قابلِ قبول حل پیش نہ کر سکے گا۔

مندرجہ بالا وزنی دلائل کے بعد انتظامی، اقتصادی اور فوجی اہمیت کے امور کو بھی زیرِ غور لانا ہوگا جہاں تک ہندوستان کے ڈاک تار اور مواصلاتی نظام کا تعلق ہے۔ تو اس کی بنیاد متحدہ ہندوستان کے پیشِ نظر رکھی گئی تھی۔ جب اس مواصلاتی نظام کو درہم برہم کیا جائے گا تو ہندوستان کے دونوں حصے بری طرح متاثر ہوں گے۔ مشترکہ دفاع کا معاملہ مقابلتاً زیادہ قابلِ غور ہے۔ جہاں تک ہندوستان کی مسلح افواج کا تعلق ہے تو اس کی مجموعی تشکیل ہندوستان کے مجموعی دفاع کے لئے کی گئی تھی۔ تقسیم کی صورت میں جب اس کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے جائیں گے، تو ہندوستانی فوج کی قدیم روایات اور انتہائی عمدہ کارکردگی بری طرح متاثر ہوگی۔ بلکہ بہت سے شدید خطرات بھی پیدا ہو جائیں گے ہندوستان کی بحریہ اور فضائیہ بھی آج کی طرح مؤثر نہ رہیں گی۔ رہا سوال پاکستان کے دو حصوں کے باہمی تعلق کا تو اس کے ساتھ دو انتہائی نازک اور اہم سرحدیں ملتی ہیں۔ لہٰذا پاکستان کا کامیاب دفاع تسلی بخش طریق پر نہ کیا جا سکے گا۔

مزید اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان کی ریاستیں ٹکڑوں کے ساتھ وابستگی میں خاصی مشکلات

محسوس کریں گی۔

اس کے بعد جغرافیائی حقائق ہیں۔ یعنی پاکستان کے دو حصے ایک دوسرے سے کوئی سات سو میل کے فاصلے پر واقع ہوں گے۔ دونوں کے درمیان امن یا جنگ کے زمانے میں مواصلاتی نظام کے لئے پاکستان کو ہندوستان کے رحم وکرم پر رہنا ہوگا۔

لہٰذا ہم حکومت برطانیہ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ اس وقت جو اختیار و اقتدار حکومت برطانیہ کے ہاتھوں میں ہے۔ دو الگ خود مختار ریاستوں کو منتقل کیا جائے۔

اس فیصلے کے باوجود ہم مسلمانوں کے اس اندیشہ کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے کہ مسلمانوں کی ثقافتی، سیاسی اور سماجی زندگی مکمل طور پر متحدہ ہندوستان میں جذب ہو کر رہ جائے ہندو ان کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں اور ان پر چھا سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں کانگریس نے ایک سکیم پیش کی، جس کے تحت مرکز کو کم از کم اختیارات کے استثناء کے ساتھ صوبوں کو مکمل خود مختاری حاصل ہوگی۔ مرکز کے پاس امور خارجہ، دفاع اور مواصلات وغیرہ کے شعبے ہوں گے۔

اس سکیم کے تحت اگر صوبے اقتصادی اور انتظامی منصوبہ بندی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی خواہش رکھتے ہوں، تو وہ مرکز کے لازمی اختیارات کے علاوہ اختیاری امور بھی مرکز کے سپرد کر سکتے ہیں۔

لیکن ہمارے خیال میں اس قسم کی ... ہم فی الوقت زیر غور آئینی معاملات میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا کر سکتی ہے۔ اس صورت میں ایک ایسی مرکزی انتظامیہ اور مرکزی اسمبلی کا فعال ہونا مشکل ہوگا۔ جس میں کچھ وزیر لازمی مرکزی امور سر انجام دے رہے ہوں اور پورے ہندوستان کے سامنے جواب دہ اور ذمہ دار ہوں، جبکہ کچھ وزیر جو اختیاری امور سر انجام دے رہے ہوں صرف ان صوبوں کے سامنے جواب دہ اور ذمہ دار ہوں، جنہوں نے ان وزراء کو یہ اختیاری امور سونپے تھے یہ مشکل مرکزی اسمبلی میں بھی پیش آئے گی۔ یہاں کچھ اراکین کو بات کرنے اور ووٹ دینے سے اس وقت محروم کرنا پڑے گا، جب ان کے صوبوں کے امور پر بحث نہ ہو رہی ہو۔ علاوہ ازیں ایسے صوبوں کے ساتھ بھی انصاف روا نہ رکھا جا سکے گا جنہوں نے اختیاری امور مرکز کو نہ سونپنے کی خواہش کا اظہار کیا ہوا اور انہیں اس مقصد کے لئے اپنا ایک علیحدہ گروپ بنانے کی اجازت دی گئی ہو۔ درحقیقت اس طرح انہیں ایک خاص طریق پر اپنے خود مختار[illegible] اختیارات کے استعمال سے زیادہ کچھ نہ ملے گا۔

اپنی سفارشات پیش کرنے سے پہلے ہم برطانوی ہند کے ساتھ ہندوستانی ریاستوں کے تعلقات کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد، تاج برطانیہ اور ہندوستانی ریاستوں کے درمیان جو تعلق موجود ہے، برطانوی دولت مشترکہ کے اندر یا باہر اسے قائم رکھنا ناممکن ہوگا۔ اس صورت میں نہ تو تاجِ برطانیہ اپنی بالادستی قائم رکھ سکے گا نہ ہی یہ بالادستی نئی حکومت کو منتقل کی جاسکے گی۔ اس حقیقت کو ان ریاستی نمائندوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ جن کے ساتھ ہماری بات چیت ہوئی ہے اس کے باوجود انہوں نے ہمیں یہ یقین بھی دلایا ہے کہ ریاستیں، ہندوستان میں آئندہ تبدیلیوں اور ترقی میں پوری طرح اور رضاکارانہ طریق پر تعاون کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان کے تعاون کی صورت کیا ہو گی۔ اس کا فیصلہ نئے آئینی ڈھانچے کی تیاری کے دوران باہمی گفت و شنید سے ہوگا۔ لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ریاستوں کے لئے جو طریق کار وضع کیا جائے گا۔ وہ تمام ریاستوں کے لئے یکساں مفید ہوگا۔ اس لئے ہم نے آئندہ پیرے میں ریاستوں کے معاملے پر اس انداز میں بات نہیں کی جو ہم نے برطانوی ہند کے صوبوں کے لئے اختیار کیا ہے۔"

کابینہ مشن منصوبہ

"اب ہم اُس حل کی نوعیت کے بارے میں بات کرتے ہیں جو ہمارے خیال میں تمام جماعتوں کے لازمی مطالبات کے لئے منصفانہ ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ہی پورے ہندوستان کے لئے ایک مستحکم اور ممکن العمل آئین بھی فراہم کرے گا۔

ہم سفارش کرتے ہیں کہ آئین کی حسب ذیل بنیادی صورت ہونی چاہیئے۔

۱۔ ہندوستان کی ایک یونین ہو، جس میں برطانوی ہند اور ریاستیں شامل ہوں اور جو امورِ دفاع امور خارجہ اور مواصلات کے شعبے اپنے پاس رکھے۔ اسے مندرجہ بالا امور پر اخراجات کے لئے ضروری رقم فراہم کرنے کا اختیار حاصل ہو۔

۲۔ یونین کی ایک انتظامیہ اور ایک اسمبلی ہو جو برطانوی ہندوستان اور ریاست کے نمائندوں پر مشتمل ہو، اگر اسمبلی میں کوئی بڑا فرقہ وارانہ مسئلہ پیش آ جائے تو حاضر نمائندوں کی اکثریت اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی رائے اور حاضر اور ووٹ دینے والے تمام اراکین کی اکثریت کے ذریعہ اس کا فیصلہ کیا جائے۔

۳۔ مرکز کے امور کے علاوہ باقی تمام امور اور اختیارات ماتحت صوبوں کے پاس رہیں۔

۴۔ صرف ان امور اور اختیارات کے سوا جو ریاستوں نے یونین کے سپرد کر دیئے ہوں باقی تمام امور و اختیارات ریاستوں کے پاس رہیں گے۔

۵۔ صوبوں کو انتظامیہ اور اسمبلیوں کے ساتھ گروپ بنانے کی آزادی ہوگی اور ہر گروپ مشترکہ صوبائی امور کا تعیّن کر سکے گا۔

(۶) یونین اور گروپوں کے دساتیر میں ایک دفعہ شامل ہوگی۔ جس کے تحت کوئی صوبہ اپنی اسمبلی کی اکثریت کے ووٹ کے ذریعہ آئین پر نظر ثانی کا مطالبہ کر سکے گا۔ یہ مطالبہ دس سال کی ابتدائی مدت کے بعد اور پھر ہر دس سال کے وقفہ کے بعد کیا جا سکے گا۔

ہمارا یہ مقصد نہیں کہ مندرجہ بالا پروگرام کے مطابق آئین کی تفصیلات طے کریں بلکہ مقصد ایک ایسی متحرک مشینری قائم کرنا ہے۔ جو ہندوستانیوں کے لئے ہندوستانیوں کی طرف سے آئین تشکیل کر سکے۔

ہمارے لئے آئندہ آئین کے بارے میں یہ سفارش اس لئے ضروری ہو گئی تھی کہ ہم پر مذاکرات کے دوران یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ جب تک ایسا کوئی اقدام نہ کیا جائے گا اس وقت تک ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس آئین ساز مشترکہ ادارے میں شامل کرنا مشکل ہو جائے گا۔

ہم امید رکھتے ہیں کہ نیا آزاد ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ میں شرکت قبول کرے گا۔ ہم یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ ہندوستانی ہر حال میں ہمارے عوام کے ساتھ دوستانہ اور قریبی وابستگی قائم رکھیں گے۔ بہر حال یہ ہندوستانیوں کی اپنی مرضی پر منحصر ہوگا۔ وہ جو راستہ بھی اختیار کریں، ہم دعاگو ہیں کہ انہیں دنیا کی تمام بڑی اقوام میں زیادہ سے زیادہ خوشحال نصیب ہو اور ان کا مستقبل ماضی سے زیادہ تابناک ہو۔"

کابینہ مشن نے آئین ساز اسمبلی کی تشکیل کے لئے جس منصوبے کی سفارش کی وہ یہ تھا۔

(۱)۔ ہر صوبہ کو اس کی آبادی کے تناسب سے مجموعی نشستیں الاٹ کی جائیں۔ ہر دس لاکھ افراد کے لئے اندازاً ایک نشست ہو۔

(ب)، ہر صوبہ میں ان نشستوں کو اس کے اہم فرقوں میں آبادی کے تناسب سے تقسیم کیا جائے

(ج)، اور ہر فرقے کے لئے جتنی نمائندگی کا تناسب قائم کیا جائے، وہ اسی فرقہ کے اراکین اپنی اسمبلی کے لئے منتخب کریں۔

مشن نے ہندوستانی صوبوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا۔ آئین ساز اسمبلی کے ان صوبوں پر

مشتمل تینوں گروپوں کو صوبائی دساتیر کا فیصلہ کرنا تھا یا یہ کہ ان صوبوں کے لئے کوئی مشترکہ آئین تیار ہوگا یا نہیں، اگر مشترکہ آئین کے حق میں فیصلہ ہو تو یہ گروپ کون کون سے صوبائی امور پر حاوی ہوگا۔

صوبوں کی تین حصوں میں تخصیص حسب ذیل طریق سے کی گئی اور ہر صوبے کے لئے آئین ساز اسمبلی میں نمائندگی کا تعین کیا گیا۔

(حصہ ا)

	عام نشستیں	مسلمان نشستیں	مجموعی نشستیں
مدراس	۴۵	۴	۴۹
بمبئی	۱۹	۲	۲۱
یوپی	۴۷	۸	۵۵
بہار	۳۱	۵	۳۶
سی پی	۱۶	۱	۱۷
اڑیسہ	۹	—	۹
	۱۶۷	۲۰	۱۸۷

(حصہ ب)

	عام نشستیں	مسلمان نشستیں	سکھ نشستیں	مجموعی نشستیں
صوبہ سرحد	—	۳	—	۳
پنجاب	۸	۱۶	۴	۲۸
سندھ	۱	۳	—	۴
	۹	۲۲	۴	۳۵

(حصہ ج)

	عام نشستیں	مسلمان نشستیں	مجموعی نشستیں
بنگال	۲۷	۳۳	۶۰
آسام	۷	۳	۱۰
	۳۴	۳۶	۷۰

حصہ ا میں دلی، اجمیر، مارواڑ اور کرگ کا ایک ایک نمائندہ شامل کیا جاتا تھا۔ ریاستوں کی نشستوں کو ۹۳ سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے تھا۔

ردّ عمل

کابینہ مشن کی سفارشات اور منصوبے پر سب سے پہلے گاندھی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ جہاں تک وزارتی مشن کے بیان کا تعلق ہے، وہ کوئی فیصلہ نہیں۔ دراصل مشن نے مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان اتحاد کے لئے جو کوششیں کیں وہ ناکام ہوگئیں۔ پھر اس نے ایسی سفارش کی جو اس کے خیال میں ہندوستانیوں کے لئے قابل قبول ہو سکتی تھی۔ آئین ساز اسمبلی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ان تجاویز میں ترمیم کرلے، انہیں بہتر بنالے، یا انہیں مسترد کردے۔ اگر اسمبلی کو یہ اختیار حاصل نہ ہو تو اسے با اختیار ادارہ نہیں کہا جا سکتا۔ مشن نے بعض شعبوں کو مرکز کے لئے بھی تجویز کیا۔ یہ فیصلہ آئین ساز اسمبلی پر ہے۔ کہ وہ ان میں اضافہ کردے یا کمی! اسمبلی کو مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز بھی ختم کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ جہاں تک وحدتوں کا تعلق ہے تو کسی صوبے کو اس کی مرضی کے برعکس کسی گروپ میں شرکت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال مشن نے ایک قابل فخر کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ گاندھی اس بات پر خوش تھے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے تمام مطالبات ٹھکرانے اور ان پر ہندو اکثریت کا تسلط قائم کرنے میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

پنڈت جواہر لعل نہرو کے انگریزی روزنامہ نے لکھا "کابینہ مشن نے جو دستاویز پیش کی ہے اس نے جناح کے تصوّرِ پاکستان کو دفن کرکے رکھ دیا۔ اور اگر اب بھی یہ شبہ ہو کہ اس تصوّرِ پاکستان میں

زندگی کی رمق باقی ہے۔ تو اسے ختم ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ کابینہ مشن نے جناح کے پاکستان کو جو سزائے موت دی ہے اس کی توثیق حکومتِ برطانیہ پہلے ہی کر چکی ہے۔"

۲۴ مئی کو قائداعظم نے مشن کے بیان پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ مشن نے دو آئین ساز مجالس کی جگہ ایک مجلس تجویز کی اور دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے لئے اخراجات فراہم کرنے کے بارے میں مشن نے یہ نہیں بتایا کہ یہ اخراجات کہاں سے پورے کئے جائیں گے؛ مسلم لیگ اس سلسلے میں کہہ چکی ہے کہ کوئی ٹیکس عائد نہ کیا جائے۔ نیز مواصلات کے بارے میں مسلم لیگ کا موقف یہ تھا کہ اسے یونین کے انتظام میں صرف اس حد تک دیا جائے جس حد تک دفاع کے لئے ضروری سمجھا جائے۔ لیکن مشن نے مواصلات کا پورا انتظام یونین کے ماتحت کر دیا مسلم لیگ کی طرف سے ان تین شرائط کو بھی نظر انداز کر دیا گیا کہ یونین کے لئے کوئی مجلس مقننہ نہ ہو؛ یونین کی ایگزیکٹو میں ہندوستان اور پاکستان کے صوبوں کو مساوی نمائندگی حاصل ہو۔ اور یونین میں جن معاملات پر نزاع پیدا ہو، ان کا فیصلہ تین چوتھائی اکثریت سے کیا جائے۔ فرقہ وارانہ مسائل طے کرنے کے لئے مشن جو تجویز رکھی ہے اس کے تحت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا۔ کہ بڑا کون سا اور چھوٹا مسئلہ کون سا ہے اور کون سا مسئلہ غیر فرقہ وارانہ؛ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخر کار فیصلہ اسمبلی کا چیئرمین کرے گا۔ جو ہندو اکثریت کے ہاتھوں منتخب ہوا ہوگا۔ علاوہ ازیں اسمبلی میں کل ۲۹۷ نمائندے ہوں گے۔ لیکن مسلمانوں کی تعداد صرف ۷۹؛ اور جب ریاستوں کے ۹۳ نمائندے شریک ہوں گے تو ان کی اکثریت ہونے کے باعث مسلمان مزید اقلیت میں چلے جائیں گے۔

کانگریس کی قرارداد

کانگریس کی مجلسِ عاملہ نے ۲۴ مئی کو ایک قرارداد منظور کی جس کے ذریعہ ابتدائی گروپ بندی کو صوبوں کی موجودہ آزادی کے لئے غیر تسلی بخش قرار دیا گیا کہ اس طرح صوبائی خودمختاری کے بنیادی اصول پر ضرب لگتی تھی۔ لہٰذا کانگریس نے قرارداد میں کہا کہ جب تک اس امر سے متعلقہ نکات کی وضاحت نہ ہو جائے کسی فیصلہ پر پہنچنا ممکن نہ ہوگا۔ ۲۵ مئی کو کابینہ مشن نے مطلوبہ وضاحت کر دی۔

مسلم لیگ کا فیصلہ

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۶ جون ۱۹۴۶ء کو کابینہ مشن کے منصوبہ پر غور کرنے کے لئے منعقد

ہوا۔ کونسل نے جو قرارداد منظور کی اس میں کابینہ مشن کے پاکستان سے متعلق خیالات پر احتجاج کیا گیا تھا قرارداد میں کہا گیا کہ مشن کی طرف سے اس نوعیت کے خیالات کا اظہار ایک ایسی اہم دستاویز میں نہیں کیا جانا چاہیئے تھا جو حکومت برطانیہ کی طرف سے اور اس کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت جاری کی گئی تھی۔ قرارداد میں مزید کہا گیا کہ اس شبہ کو بہرحال رفع کرنا ضروری ہے کہ مسلم لیگ اپنے مطالبہ سے ذرہ برابر بھی پیچھے ہٹ سکتی ہے۔ ایک خود مختار پاکستان کا مطالبہ ہندوستان کے مسلمانوں کا وہ مقصد ہے۔ جس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں جس کے حصول کی خاطر ہندوستانی مسلمان اپنے دائرہ اختیار میں تمام وسائل کو بروئے کار لائیں گے اور بڑی سے بڑی قربانی کے لئے بھی تیار رہیں گے۔

تاہم مسلم لیگ نے اس منصوبہ کو دو بنیادوں پر قبول کیا۔

۱۔ کیونکہ ہندوستان کو گمبھیر مسائل کا سامنا تھا۔ لہٰذا مسلم لیگ کی یہ مخلصانہ اور دیانتدارانہ خواہش تھی کہ وہ ان مسائل کا کوئی پُرامن حل تلاش کرے۔

۲۔ پاکستان کی بنیاد کابینہ مشن کے منصوبہ میں موجود تھی۔ کیونکہ اس میں ۶ مسلمان صوبوں کی گروپ بندی کو تسلیم کیا گیا تھا۔

کونسل نے اس توقع کا اظہار کیا کہ قدرتی طور پر ان چھ مسلمان صوبوں کی لازمی گروہ بندی ایک مکمل خود مختار پاکستان کے وجود پر منتج ہوگی۔ جہاں تک عبوری حکومت کی تشکیل کے قلیل المیعاد منصوبہ کا تعلق تھا، تو مسلم لیگ کونسل نے قائداعظم کو اس مسئلہ پر وائسرائے کے ساتھ بات چیت کا اختیار دے دیا اور ساتھ ہی مناسب اقدامات اور فیصلوں کا بھی!

مسلم لیگ کی طرف سے اس منصوبہ کو قبول کرنے کے بعد مسلم لیگ کے فیصلہ کا وسیع پیمانے پر خیر مقدم کیا گیا۔ لیکن جہاں تک ہندو اخبارات کا تعلق تھا۔ انہوں نے اسے مسلم لیگ کی زبردست شکست قرار دیتے ہوئے کانگریس سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی فتح کی خوشی میں مشن پر دباؤ ڈالے۔ کہ مشن باقی نکات بھی منظور کرے۔ مسلمانوں کا عام ردعمل یہ تھا کہ قائداعظم نے منصوبہ کو قبول کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔

۸ رجون کو قائداعظم نے وائسرائے کو خط لکھا کہ مسلم لیگ کی طرف سے منصوبہ کی منظوری میں وائسرائے کے اس وعدہ کو بہت زیادہ وزن دیا گیا ہے۔ کہ مجوزہ عبوری حکومت میں کل بارہ ۱۲ محکمے ہوں گے جن میں سے ۵ مسلم لیگ، ۵ کانگریس، ایک سکھوں اور ایک ہندوستانی عیسائیوں کو دیا جائے گا۔ نیز اہم محکمے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان برابر برابر تقسیم ہوں گے۔ قائداعظم نے وائسرائے کو مطلع کیا کہ اگر اس یقین دہانی سے انحراف کیا گیا۔ تو اس صورت میں مسلم لیگ کی طرف سے کسی تعاون کی امید

نہ رکھی جائے۔ جواباً وائسرائے نے قائد اعظم کو مطلع کیا کہ اس نے اس قسم کی کوئی یقین دہانی نہیں کرائی تھی۔ البتہ اس نے مسلم لیگ اور کانگریس، دونوں سے اتنا ضرور کہا تھا۔ کہ اہم محکموں کی مساوی تقسیم اس کے ذہن میں ہے۔

۱۲ جون کو نہرو، ویول ملاقات ہوئی۔ نہرو نے تجویز پیش کی کہ مجموعی طور پر ۱۵ اراکین ہوں، ان میں ۵ کانگریسی ہندو اور ۴ مسلم لیگی، ایک غیر مسلم لیگی مسلمان، ایک غیر کانگریسی ہندو، ایک اچھوت، ایک ہندوستانی عیسائی، ایک سکھ اور ایک کانگریسی خاتون ہو، لیکن وائسرائے نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد ابوالکلام آزاد نے وائسرائے کو لکھا کہ کانگریس اس پیشکش کی شدید مخالف ہے۔ کہ مسلم لیگ اور کانگرس میں مساوات قائم کی جائے۔ چنانچہ لارڈ ویول نے متبادل تجویز پیش کی۔ جو چھ کانگرسیوں، پانچ مسلم لیگیوں اور دو اقلیتی نمائندوں یعنی کل ۱۳ نمائندوں کی کونسل سے متعلق تھی۔ کانگرس نے اسے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

نئی تجاویز

عبوری حکومت میں نمائندگی کے تناسب کے مسئلہ پر تعطل کو ختم کرنے کے لئے کابینہ مشن اور وائسرائے نے ۱۶ جون کو اپنی طرف سے نئی تجاویز پیش کیں۔ ان کے تحت ایگزیکٹو کونسل ۱۴ افراد پر مشتمل تھی۔ ان میں سردار بلدیو سنگھ، سر اتھی، پی انجینئر، جگ جیون رام، جواہر لعل نہرو، محمد علی جناح، لیاقت علی خان، ایچ کے مہتاب، ڈاکٹر جان متھائی، نواب محمد اسماعیل خان، خواجہ ناظم الدین، سردار عبدالرب نشتر، سی راج گوپال اچاری، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور سردار ولبھ بھائی پٹیل شامل تھے۔ ان چودہ نمائندوں میں ۶ کانگریسی، ۵ مسلم لیگی، ایک سکھ، ایک ہندوستانی عیسائی اور ایک پارسی شامل تھے۔ تجویز کے ساتھ یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ اگر مسلم لیگ اور کانگرس نے اس تجویز سے اتفاق نہ کرتے ہوئے، مخلوط حکومت میں مذکورہ خطوط پر شرکت سے انکار کر دیا۔ تو وائسرائے ایک عبوری حکومت کی تشکیل کرے گا جو زیادہ سے زیادہ نمائندگی کی حامل ہوگی۔

کانگریس نے عبوری حکومت کی تجاویز کو ٹھکرا دیا۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ مجوزہ آئین ساز اسمبلی میں کانگریس شرکت کرے گی۔ لیکن اس نقطۂ نظر سے کہ اسمبلی ایک متحد، جمہوری اور آزاد ہندوستان کے لئے آئین وضع کرے گی۔

اسی دن مسلم لیگ نے ۱۶ جون کی مشن وائسرائے تجاویز کی بنیاد پر عبوری حکومت میں شمولیت

کا فیصلہ کر لیا۔ قائداعظم نے کابینہ مشن اور لارڈ ویول کے ۱۶ جون کے بیان کی توضیح یوں کی کہ اب مشن کے اراکین اور وائسرائے دونوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ فوری طور پر ان لوگوں کے ساتھ مل کر جو ۱۶ جون کے بیان سے اتفاق رکھتے ہوں، عبوری حکومت قائم کریں۔ اس توضیح کا مطلب یہ تھا کہ اگر اب بھی کانگرس عبوری حکومت میں شمولیت سے انکار کر دے تو وائسرائے پر مسلم لیگ کے نامزدگان اور دوسری پارٹیوں کے نمائندوں کے ساتھ عبوری حکومت کے قیام کا فرض عائد ہو جاتا ہے۔

قائداعظم کی طرف سے اس توضیح کی وصولی کے بعد لارڈ ویول نے قائداعظم کو لکھا کہ وہ اس توضیح سے متفق نہ تھے۔ اور کانگرس کی شرکت کے بغیر عبوری حکومت کی تشکیل کے سلسلہ میں وائسرائے پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ قائداعظم نے واضح الفاظ میں وائسرائے پر اپنے وعدہ سے منحرف ہو جانے کا الزام عائد کیا۔ وائسرائے نے کانگرس کے بغیر حکومت بنانے پر حکومت نہ بنانے کو ترجیح دی وائسرائے کے اس اقدام پر کڑی تنقید کی گئی۔ برطانوی اور ہندوستانی اخبارات نے تقریباً ایک ہی بات لکھی یہ کہ جب کانگرس اڑ جائے تو مسلمان روتے رہتے ہیں۔ مگر جب مسلمان تعاون کی کوشش کریں تو کانگرس ان پر غلبہ پانے کے لئے بیقرار ہو جاتی ہے۔ ایک اخبار نے تو یہاں تک لکھا، کہ سیاست دان تو نوک جھونک کرتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن وائسرائے کے درجہ کے مدبّر سے یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

باب ۳۲

عبوری حکومت

۲۹ جون کو کابینہ مشن برطانیہ واپس چلا گیا۔ اس وقت ہندوستان میں خانہ جنگی کے مکمل امکانات موجود تھے۔ لیکن کابینہ مشن حالات کی پرواہ کئے بغیر تمام ذمہ داریاں وائسرائے پر عائد کرنے کے بعد ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔ ۶ جولائی ۱۹۴۶ کو بمبئی میں کانگریس کمیٹی نے اپنی ۲۵ جون کی قرارداد جس کے ذریعہ کابینہ مشن کے منصوبہ کی منظوری دی گئی تھی، کی توثیق کے لئے اجلاس طلب کیا۔ کانگریس کے نئے صدر پنڈت جواہر لعل نہرو نے کابینہ مشن کا منصوبہ ۱۶ مئی توثیق کے لئے پیش کیا۔ اس بار کانگریس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندوستان کا بچہ بچہ اس کے اشارے پر چل رہا تھا۔ اور ہندوستان میں عملاً کانگریس کی حکومت تھی۔ نیز اس نے کابینہ مشن کے منصوبہ کے منظوری دے کر ہندوستان اور حکومت برطانیہ کو تباہی سے بچا لیا تھا۔ اس موقع پر نہرو نے تقریر کرتے ہوئے کہا

"سوال یہ نہیں کہ کانگریس کسی طویل المیعاد یا قلیل المیعاد منصوبہ کو قبول کرتی۔ سوال صرف اتنا تھا کہ آئین ساز اسمبلی میں شمولیت پر رضامند ہو جانا چاہیئے۔ جہاں تک اسمبلی میں کانگریس کی موجودگی کا تعلق ہے تو وہ اسمبلی میں اس وقت تک رہے گی جب تک اسمبلی میں اپنی شرکت کو ہندوستان کی فلاح کے لئے ضروری خیال کرے گی۔ فی الوقت ہم پر صرف اتنی پابندی عائد ہوتی ہے کہ ہم نے آئین ساز اسمبلی میں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے چوتھے دن پنڈت نہرو نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ گوہر افشانی کی۔

"ہم صرف آئین ساز اسمبلی میں جانے پر رضامند ہوئے ہیں۔ اب ہمیں اس بات کی مکمل آزادی ہے کہ اپنا لائحہ عمل طے کریں۔ کیونکہ ہم نے کسی معاملہ میں کسی کے ساتھ کوئی وعدہ نہیں کیا جب ہم نے یہ کہا تھا کہ آئین ساز اسمبلی مکمل اور مطلق خود مختار ہو گی۔ تو کابینہ مشن نے نفرت کیا۔" ہاں "کردی تھی۔ بس اتنی شرط تھی۔ کہ اقلیتوں کا مناسب تحفظ ہو اور ہندوستان اور حکومت برطانیہ کے درمیان معاہدہ ہو، لیکن ہم اب بھی یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم پر کوئی معاہدہ ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو ہم کوئی معاہدہ نہ کریں گے۔ جہاں تک اقلیتوں کا سوال ہے تو وہ ہمارا مسئلہ ہے اور ہم اُسے حل کر ہی لیں گے۔ ہم اس مسئلہ میں کسی کی مداخلت بالخصوص برطانیہ کی طرف سے ہرگز قبول نہ کریں گے۔ ہم نے ایسی کوئی بات قبول نہیں کی جو آئین ساز اسمبلی کے اختیارات پر تعزیر کی صورت پیدا کرتی ہو۔ جہاں تک صوبوں کی گروہ بندی کا سوال ہے تو ہر پہلو سے غور کرنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ شائد ہی کوئی گروہ بندی ہو سکے۔ صوبہ سرحد گروہ بندی کے حق میں فیصلہ نہ دے گا اور آسام بھی بنگال کے ساتھ شرکت پسند نہ کرے گا۔ رہا مرکز کے لئے امور خارجہ، دفاع، مواصلات اور ان پر اخراجات کے لئے رقم کی فراہمی کے اختیار کا تعلق، تو یہ سب کچھ یونین گورنمنٹ کے ماتحت ہوگا۔ جب امور خارجہ مرکز کے پاس ہوں گے تو قدرتی طور پر غیر ملکی تجارتی پالیسی بھی مرکز کے پاس ہو گی۔ اگر ایسا نہ ہو تو غیر ملکی پالیسی کا تعین کیوں کر ہو سکتا ہے؟ ان تمام امور کے لئے بہر حال ٹیکس لگانا پڑیں گے۔ صوبوں کی طرف سے ان اخراجات کے لئے عطیات کی بات بالکل بیہودہ ہے۔ چندوں کے ذریعہ حکومتیں نہیں چلا کرتیں لہٰذا ٹیکس ناگزیر ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ ٹیکس کتنی قسم کے ہوں گے؟ فی الحال صرف کسٹم اور ٹیرف کا نام لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ٹیرف درآمدات و برآمدات سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا ٹیکسوں کی حد وہاں تک پہنچ سکتی ہے۔ علاوہ ازیں انکم ٹیکس بھی ہو سکتا ہے۔ بہر کیف اس کا تعین بعد ہی میں ہوگا۔ یونین گورنمنٹ کو قرضوں، غیر ملکی منڈیوں، کرنسی اور کریڈٹ پر بھی کنٹرول کرنا لازم ہوگا۔ تمام صوبے اپنے طور پر تو یہ سب کام کرنے سے رہے۔ اگر ملک میں قحط پڑ جاتا ہے۔ تو قدرتی طور پر اقتصادی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں یا صوبوں اور ریاستوں کے درمیان تنازعہ پیدا ہو جاتا ہے تو یقیناً مرکز کو درمیان میں آنا پڑتا ہے لہٰذا اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مرکز کے اختیارات وسیع تر ہوں یہ فیصلہ آئین ساز اسمبلی ہی کرے گی۔"

پنڈت جواہر لعل نہرو نے جو کچھ کہا اس کے ایک ایک لفظ سے ہندو راج اور ہندوستان کے مسلمانوں پر ہندو تسلط کے ناپاک عزائم عیاں ہوتے تھے۔ نہرو کا مقصد صرف اتنا تھا کہ ایک بار کانگرس

آئین ساز اسمبلی میں قدم رکھے اور اس کے بعد ہندو ریاستوں اور ممکن ہو تو سکھوں اور اچھوتوں کی حمایت حاصل کر کے ووٹوں کی اکثریت کے ذریعہ مسلمانوں کو بے بس کر دے۔ گروہ بندی کے منصوبہ کو ختم کرے اور تمام اہم شعبے مرکز کے زیر اختیار کر کے صوبوں کو بے بس کر دیا جائے۔ جہاں تک نہرو کے اس دعوے کا تعلق تھا کہ کانگریس آئین ساز اسمبلی میں غیر مشروط طور پر داخل ہو سکتی تھی۔ تو اس کی تردید خود ابوالکلام آزاد نے کر دی۔ کیونکہ آزاد ہی نے کانگرس کے صدر کی حیثیت سے کابینہ مشن کے اراکین سے ملاقاتیں اور گفت و شنید کی تھی۔ ابوالکلام آزاد نے واضح طور پر یہ کہہ دیا کہ کانگرس کو کابینہ مشن کے منصوبہ میں ترمیم و تنسیخ کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ کانگرس صرف اس بات پر رضا مند ہوئی تھی کہ مرکزی حکومت وفاقی طرز کی حامل ہو گی۔ صرف تین شعبے یعنی دفاع، امور خارجہ اور مواصلات مرکز کے پاس رہیں گے۔ اور باقی تمام شعبے صوبوں کے دائرہ اختیار میں شامل ہوں گے۔ نیز اس بات پر بھی اتفاق ہوا تھا کہ فریق دو نہیں بلکہ تین ہوں گے اور کوئی فریق یک طرفہ طور پر ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گا۔

۱۸ر جولائی ۱۹۴۶ء کو وزیر امور ہند اور کابینہ مشن کے ایک رکن لارڈ پیتھک لارنس نے پنڈت جواہر لعل نہرو کے ان خیالات کی تردید کی۔ انہوں نے بتایا کہ جن شرائط پر سمجھوتہ ہوا تھا۔ کوئی جماعت ان سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس طرح دوسری جماعتوں کی حق تلفی ہو گی۔ آئین ساز اسمبلی مجوزہ منصوبہ اور شرائط کے تحت جو فیصلہ کرے گی بلا شبہ تاج برطانیہ اپنے وعدہ کے مطابق اس فیصلہ کا احترام کرے گا

سر سٹیفورڈ کرپس نے برطانوی دارالعوام میں کہا کہ نہرو نے صوبوں کی گروہ بندی کے بارے میں جو کچھ کہا ——— خود انہیں بات سمجھ نہیں آتی کہ یہ کیسے ممکن ہو گا لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ سکیم کے برعکس کوئی اقدام نہ کیا جائے۔

تاہم لارڈ پیتھک لارنس یا سر سٹیفورڈ کرپس یہ نہ کہہ سکے کہ کانگرس کو اس قسم کا کوئی اقدام کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔

راست اقدام کا فیصلہ

ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگرس کی ان دھمکیوں اور برطانیہ کی طرف سے مسلمانوں کے تحفظ کی ضمانت کے مسئلہ پر خاموشی سے غافل نہ رہ سکتے تھے۔ ۲۷ر جولائی ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا۔ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے کہا۔

"مسلم لیگ نے حصول انصاف کے لئے ہر قدم پر جو مساعی کیں، سب رائیگاں گئیں۔ کابینہ مشن

خود کانگرس کا کھلونا بنا رہا اور اس نے اپنا کھیل بھی جاری رکھا۔ اگر کانگرس یہ سمجھتی ہے کہ وہ مسلم لیگ کو شانہ دے کر خود عبوری حکومت میں چلی جائے گی۔ تو یہ اس کی سب سے بڑی غلطی ہو گی۔ ہمیں اس کا علاج معلوم ہے اور ہم کسی سے خوف زدہ بھی نہیں۔ ہم نے بات چیت کے دوران ہمیشہ اعلیٰ اقدار اور ارفع اصولوں کو پیش نظر رکھا، جو بات کی ایک صاحب وقار انجمن کی طرح کی، اپنے مطالبات میں لچک پیدا کی۔ لیکن اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم کسی سے مرعوب ہیں یا کمزور ہیں، تو یہ اس کی بھول ہو گی۔ ہمارا مقصد صرف اتنا تھا کہ مسلمانوں، ہندوؤں اور دیگر تمام فرقوں کو آزادی کی نعمت مل جائے لیکن کانگرس نے ایک اڑیل ٹٹو ایسا مظاہرہ کیا۔ غالباً حصول آزادی سے زیادہ کانگرس کا نصب العین یہ ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کس طرح دبائے۔ کانگرس نے تو بدعہدی کی۔ مگر کابینہ مشن نے بھی عبوری حکومت کے مسئلہ پر اسی بدعہدی کا مظاہرہ کیا۔ کانگرس کے انداز اتنے گھٹیا ہیں کہ معمولی سے معمولی شخص بھی شرما جاتا ہے کیا کانگرس میں جرأت، معقولیت اور عزت نفس کا اتنا احساس بھی نہیں کہ وہ صاف الفاظ میں یہ کہہ کر کہ تجاویز اس کے اصولوں سے متصادم ہیں۔ مسترد کر دے۔ میں وائسرائے سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ ۲۴ جون کو کانگرس نے طویل المیعاد منصوبے مسترد نہیں کئے تھے؟ کیا ۲۵ جون کو علی الصبح، بھنگی کالونی میں گاندھی کے پاس وائسرائے نے قدم رنجہ نہیں فرمایا تھا؟ کیا وائسرائے نے پیتھک لارنس کو پٹیل کی منانے پر مامور نہیں کیا تھا؟ کیا انہوں نے پٹیل کو اچانک اپنے گھر لے جانے کے بعد اس بات پر رضامند نہیں کیا تھا کہ کانگرس اپنی توضیح کے تحت طویل المیعاد تجویز قبول کرے تو کابینہ مشن عبوری حکومت کی ۱۶ جون کی سکیم ترک کر دے گا؟

مسلم لیگ کونسل نے ۳ دن تک غور و فکر کے بعد ۲۸ جولائی ۱۹۴۶ء کو دو قراردادیں منظور کیں۔ پہلی قرارداد میں کہا گیا تھا کہ وائسرائے ہند اور کابینہ مشن نے بار بار یہ کہا تھا کہ آئین ساز اسمبلی میں بڑی پارٹیوں کی شرکت کے لئے بنیادی اصولوں کا تعین کر دیا گیا ہے اور باہمی تعاون کے بعد کامیابی ممکن نہیں لیکن اب کانگرس کے طرز عمل نے یہ بات واضح کر دی کہ حالات میں خاصی تبدیلی آچکی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ تاج برطانیہ نے بھی مسلمانوں، چھوٹی اقلیتوں اور اچھوتوں کے مفادات کو کانگرس پر قربان کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیونکہ وائسرائے اور خود کابینہ مشن کے اراکین اپنے تمام وعدوں سے منحرف ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ایسے حالات میں مسلمان، آئین ساز اسمبلی میں شمولیت کو اپنے لئے خطرناک تصور کرتے ہیں۔ مسلم لیگ مجبور ہے کہ اس قرارداد کے ذریعہ کابینہ مشن کے منصوبے کی منظوری واپس لے لے۔

دوسری قرارداد میں کہا گیا کہ ہندوستان کے مسلمان ایک خود مختار اور قطعی با اختیار مملکت پاکستان

قائم کئے بغیر چین سے نہ بیٹھیں گے۔ اور اگر مسلم لیگ کی رضامندی کے بغیر آئین بنانے کے لئے کوئی نامناسب اقدام کیا گیا تو مسلمان اس کی بھرپور مخالفت کریں گے۔ قرارداد میں مزید کہا گیا کہ مسلمان اپنے منصفانہ حقوق، حصول پاکستان، قیام عزّ و وقار کی خاطر اور انگریز اور ہندو کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے راست اقدام پر مجبور ہیں۔ اسی قرارداد میں مسلمانوں سے ہندو اور انگریز کے استبداد اور ناپاک ارادوں کے خلاف صف آراء ہونے کی اپیل کی گئی۔ نیز اوّلین احتجاج کے طور پر برطانوی اعزازات و خطابات رکھنے والے مسلمانوں سے ان کی واپسی کی اپیل کی گئی۔ متعدد مسلمانوں نے جو اس کونسل کے اجلاس میں شریک تھے۔ اسی وقت اپنے خطابات واپس کرنے کا اعلان کر دیا۔ کونسل نے ۱۶ اگست سے راست اقدام کا فیصلہ کیا۔

آئین ساز اسمبلی کے نتائج

جولائی کے اواخر تک ہندوستان میں آئین ساز اسمبلی کے انتخابات ختم ہو چکے تھے۔ کل ۲۹۶ اراکین اسمبلی کے انتخاب میں کانگرس نے نو کے سوا باقی تمام عام نشستیں حاصل کر لیں۔ مسلم لیگ نے ۷۸ نشستوں میں سے ۷۳ حاصل کیں۔ آسام اور بنگال کے یورپین اراکین نے انتخابات میں حصہ ہی نہ لیا۔ سکھوں کی نشستیں بھی خالی رہیں اور ریاستوں کے نمائندوں کا اسمبلی میں شرکت کا مسئلہ بھی زیر غور رہا۔

۲۲ جولائی کو لارڈ ویول نے پنڈت نہرو اور قائد اعظم کو مضمون واحد کے خطوط روانہ کئے۔ وائسرائے نے دونوں سے اپیل کی تھی کہ جب تک کانگرس، مسلم لیگ اور وائسرائے کے درمیان کسی مسئلہ پر اتفاق رائے نہ ہو جائے خط و کتابت کو صیغہ راز میں رکھا جائے۔ خط میں مزید کہا گیا کہ عبوری حکومت ۱۴ اراکین پر مشتمل ہوگی۔ کانگرس کی طرف سے پست اقوام کے ایک نمائندے سمیت ۶ نمائندے نامزد کئے جائیں گے۔ ۵ نمائندے مسلم لیگ نامزد کرے گی اور اقلیتوں کے ۳ نمائندے، جن میں ایک سکھ ہوگا وائسرائے کی طرف سے نامزد کئے جائیں گے۔ کوئی جماعت دوسری جماعت کے نامزدگان پر اعتراض نہ کرے گی۔ (وائسرائے کی طرف سے منظوری کی صورت میں) ——— نامزدگیوں اور حکومت میں شمولیت پر رضامندی کے بعد شعبوں کی تقسیم کا فیصلہ کیا جائے گا۔ عبوری حکومت کی حیثیت سے متعلق وائسرائے کی طرف سے ابوالکلام آزاد کو ۳۰ مئی جو یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ وہ بدستور موجود تھی۔ ان شرائط کے بعد وائسرائے نے لکھا کہ وہ خالصتاً ایسی مخلوط حکومت کے حق میں ہیں۔ جس میں زیادہ سے زیادہ باہمی رضامندی موجود ہو۔ لہٰذا کانگرس کی طرف سے کوئی ایسا لائحہ عمل پیش کیا جائے جس کے تحت مسلم لیگ

اور کانگرس کی رضامندی سے فرقہ وارانہ مسائل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہو، موخرالذکر بات شرائط میں شامل نہیں تھی۔

۲۲ر جولائی کو پنڈت نہرو نے لارڈ ویول کو اس خط کے جواب میں لکھا کہ کانگرس ایک آزاد اور خودمختار حکومت کو انتہائی اہمیت دیتی ہے۔ حکومت کسی صورت بھی گورنر جنرل کی بالادستی میں کام نہ کرے اور وہ صرف آئینی سربراہ حکومت ہو، علاوہ ازیں اس کی طرف اقلیتی نمائندوں کی ... کی بھی نامناسب ہوگی۔

پنڈت نہرو نے وائسرائے کے خط میں موجود شرائط کے ساتھ حکومت بننے سے انکار کردیا انہوں نے مطالبہ کیا کہ پہلے سیاسی خودمختاری کا مسئلہ حل کیا جائے۔

۳۱ر جولائی کو قائداعظم نے وائسرائے کے نام ایک خط میں تجاویز کو رد کرنے سے اظہار معذرت کردیا۔ چنانچہ کانگرس اور مسلم لیگ دونوں کی طرف سے وائسرائے کی شرائط کے استرداد کے بعد عبوری حکومت کی تشکیل التوا میں پڑ گئی۔ لیکن منسٹرسے ونفرکے بعد حکومت برطانیہ کی پالیسی میں ایک عجیب انقلاب آیا کہ اس نے پنڈت نہرو کو حکومت بنانے کی دعوت دے دی۔ اس سلسلہ میں وزیر امور ہند نے وائسرائے کو لکھا کہ وہ نہرو کو یہ پیش کش کرتے ہوئے بتا دیں کہ حکومت کی تشکیل میں تعاون حاصل کرنے کے لئے قائداعظم سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ نے راست اقدام کا فیصلہ کیا تھا۔ اور حکومت برطانیہ کو یہ بات بہت بری محسوس ہوئی تھی۔

باقاعدہ پیش کش

۶ر اگست کو وائسرائے نے باضابطہ طور پر پنڈت نہرو کے نام عبوری حکومت کی تشکیل کی پیش کش طشتری میں سجا کر روانہ کردی۔ کانگرس کے لئے اس سے بہتر اور کیا بات ہوسکتی تھی کہ اسے پنے سلنے والا کوئی نہ ہو اور وہ مسلمانوں کو ہندو تسلط قائم کرنے کے لئے من مانی کاروائی کرسکے ۸ر اگست کو کانگرس کی مجلس عاملہ نے لارڈ ویول کی یہ پیش کش قبول کرتے ہوئے پنڈت نہرو کو اختیار دیا۔ کہ وہ اس مسئلہ پر وائسرائے کے ساتھ مذاکرات کریں۔ ۱۰ر اگست کو نہرو ویول ملاقات ہوئی۔ نہرو نے وائسرائے کو بتایا کہ وہ ایک مضبوط حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ ایسے غیر مسلم لیگی مسلمانوں کو بھی حکومت میں شامل کریں گے۔ پنڈت نہرو اپنی طرف سے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کر

رہے تھے۔ حالانکہ یہ بات ظاہر تھی کہ وہ جن مسلمانوں کو حکومت میں شامل کرتے وہ یقینی طور پر کانگرس کے پٹھو ہوتے۔ یا اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ کانگرس مسلمانوں کی نمائندہ بھی ہے۔ لیکن ویول کو اس بات سے اتفاق نہ تھا، ان کی تجویز یہ تھی کہ مسلمانوں کی پانچوں نشستیں کچھ مدت کے لئے خالی چھوڑ دی جائیں۔ نہرو کے لئے یہ بڑی دل آزاری کی بات تھی۔

کانگرس کی عبوری حکومت کے قیام سے چند دن پہلے تک لارڈ ویول اس بات پر مصر رہے، کہ مسلم لیگ کے لئے نشستیں خالی رکھے بغیر حکومت تشکیل نہ ہو گی۔ انہوں نے اس سلسلہ میں وزیر اعظم برطانیہ سے بھی اجازت چاہی، لیکن لارڈ ایٹلی نے ان کی بات نہ مانی، جواز یہ تھا، کہ اس طرح کانگریسی رہنما بددل ہو جائیں گے اور حکومت برطانیہ اور کانگریسی رہنماؤں کے درمیان جو رہا سہا ربط قائم تھا، وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔

۲۴ر اگست ۱۹۴۶ء کو دلی سے ایک اعلان جاری کیا گیا، جس میں نئی ایگزیکٹو کونسل کے قیام کا ذکر تھا۔ اعلان میں بتایا گیا کہ ۲ر ستمبر سے نئی کونسل کام شروع کر دے گی۔

۱۶ر اگست

مسلم لیگ نے راست اقدام کا فیصلہ تو اپنے اجلاس میں کر ہی لیا تھا۔ چنانچہ وہ دن بھی آ گیا۔ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو حکومت برطانیہ کی جانب دارانہ اور غیر منصفانہ پالیسی کے خلاف راست اقدام کا آغاز ہو گیا۔ اس موقع پر مسلمانوں نے ملک گیر ہڑتال کی، جلسے منعقد کئے اور جلوس نکالے، کلکتہ میں مسلمانوں کے جلسوں اور جلوسوں پر ہندوؤں نے اقتدار ہاتھ آنے سے پہلے ہی نشہ میں چور ہو کر حملے شروع کر دیئے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق ان ہنگاموں میں پندرہ ہزار افراد زخمی اور پونے پانچ ہزار ہلاک ہوئے۔ لارڈ ویول نازک حالات کا جائزہ لینے کے لئے بنگال کے دورے پر گئے تو انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہوا۔ کہ اگر فوری طور پر مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان اتحاد قائم نہ ہوا۔ تو پورا ملک خانہ جنگی کے شعلوں کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ ویول نے واپس آتے ہی کانگرسی رہنماؤں پر دباؤ ڈالا اور یہ تجویز پیش کی کہ بنگال اور مرکز میں مخلوط حکومتیں قائم کی جائیں۔ مگر ۲۰ر اگست کو نہرو نے لارڈ ویول کو مطلع کیا کہ کانگرس کی مجلس عاملہ کوئی نیا فارمولہ اختیار کرنے پر آمادہ نہیں۔ گاندھی نے وزیر اعظم برطانیہ کو ایک خط میں لکھا کہ وہ وائسرائے ہند لارڈ ویول کی ذہنی حالت پر سخت پریشان ہیں۔ لہٰذا وزیر اعظم اس سلسلہ میں کوئی فوری اقدام کریں۔ گاندھی نے لکھا: ”محسوس ہوتا ہے کہ بنگال میں قتل و غارت کے باعث

لارڈ ویول کے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔ لہٰذا ان کی جگہ فوری طور پر ہندوستان میں کوئی زیادہ قابل اور قانونی مزاج رکھنے والا وائسرائے بھیجا جاتے۔" گاندھی نے ایک اور خط وائسرائے کو بھی بھیجا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ اگر وہ اس بات سے خائف ہیں کہ قتل و غارت کا سلسلہ پورے ہندوستان میں پھیل جائے گا، تو انگریزوں کو چاہیئے کہ وہ فوری طور پر ہندوستان سے چلے جائیں۔ اور امن و امان قائم کرنے کا معاملہ کانگرس پر چھوڑ دیں۔

پنڈت نہرو نے بھی انگلستان میں بہت سے لوگوں کو یہ لکھا کہ ویول بہت کمزور آدمی واقع ہوئے ہیں۔ اور وہ محمد علی جناح کو خوش کرنے کے لئے پورے ہندوستان کو مصائب و مشکلات کے جہنم میں دھکیل رہے ہیں۔ انہوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ ویول یہ سب کچھ "انگریز موروں" یعنی سر فرانسس موڈی اور جارج ایبل کے ایماء پر کر رہے ہیں۔ لہٰذا ویول کو ہر حالت میں ہندوستان سے چلے جانا چاہیئے۔

۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عبوری حکومت کا قیام عمل میں آگیا۔ کانگریسی اور ہندو خوشی سے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ اور اسے اپنی زبردست کامیابی قرار دے رہے تھے۔ بعض ہندو رہنماؤں نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

"بس اور چند دن کی بات ہے۔ ملک میں ایک قومی حکومت قائم ہو جائے گی۔ مسلم لیگ کے شامل ہونے یا نہ ہونے سے فرق کیا پڑے گا۔ آزادی کا قافلہ تو مسلم لیگ کے بغیر بھی رواں دواں رہے گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم (ہندو) اپنے آپ کو اس ملک کا حاکم کہہ سکتے ہیں۔

کانگرس کی عبوری حکومت

ہندوستان میں عارضی مخلوط حکومت کی جگہ صرف ہندو عبوری حکومت کے قیام کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان اور برطانیہ کے غیر جانبدار سیاسی حلقوں میں زبردست اضطراب پیدا ہو گیا۔ ۲ ستمبر کو جب کانگریسی حکومت نے نئی حکومت قائم کر لی تو ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے اپنی عمارتوں پر سیاہ جھنڈے لہرائے۔ برطانیہ میں مسٹر چرچل نے ایک پارٹی کی حکومت کے قیام کو انتہائی ناانصافی اور جانبدارانہ اقدام قرار دیا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ اگر ہندوستان میں کانگرس حکومت کی سرپرستی کی گئی تو اتنا زبردست قتل عام ہو گا کہ شاید ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ انہوں نے برطانوی حکومت کو انتباہ کیا کہ اگر انگریزوں نے ہندو راج کو ہندوستان پر تھوپنے کی کوشش کی تو سوائے خانہ جنگی اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ سر سٹیفورڈ کرپس

نے ہندوؤں کی جانبداری میں نامناسب اور ناجائز حد تک تجاوز کیا ہے۔ چرچل نے "اونچی ذات کے ہندو۔ نہرو" کو حکومت سونپنے کے اقدام کو حکومت برطانیہ کی زبردست غلطی قرار دیا۔ چرچل کی طرح اور بہت سے نمایاں انگریز سیاست دانوں نے بھی ایک پارٹی کو حکومت دینے کے اقدام کی زبردست مذمت کی۔ ان سیاست دانوں نے صاف طور پر کہا کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ صریحاً وعدہ خلافی کی ہے اور اس اقدام سے حکومت برطانیہ نے مسلمانوں کے اعتماد کو زبردست صدمہ پہنچایا ہے۔

کانگرسی حکومت کے قیام کے چند دن کے اندر مسلم لیگ نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے مفادات کو بری طرح کچلا جا رہا ہے۔ یہ سب محض اس لئے ہوا کہ مسلم لیگ، حکومت میں شامل نہ تھی لیکن جہاں تک ان اصولوں کا تعلق تھا اور جن کو سربلند رکھنے کے لئے مسلم لیگ نے حکومت میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی، وہ اصول اب تک اپنی جگہ قائم تھے۔ لیکن بنیادی مسئلہ پر بھی فقط کرنا صرف سیاسی حالات کا تقاضا تھا۔ بلکہ وزارت داخلہ نے مسلمانوں کے خلاف جو رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ اس کے تحت بھی مسلم لیگ کو اپنی پالیسی میں خاصی تبدیلی کرنا پڑی۔ بنیادی بات یہی تھی کہ حکومت میں مسلم لیگ کی عدم موجودگی کے باعث کانگرس کو من مانی کرنے اور مسلمانوں کے مفادات کو ختم کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملتا۔ کانگرس کی پالیسی کی وجہ سے مختلف صوبوں میں مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچ رہا تھا۔ ان حالات میں مسلم لیگ کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ حکومت میں شرکت اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے کام کرے۔ قائداعظم کا خیال یہ تھا کہ علیحدہ رہ کر نہیں بلکہ حکومت میں شامل ہو کر ہی پاکستان کی جنگ لڑی جا سکتی تھی۔ ادھر وائسرائے ہند لارڈ ویول کی زبردست خواہش تھی کہ مسلم لیگ حکومت میں شامل ہو جائے۔ انہوں نے کلکتہ کا ہنگامہ آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دیگر صوبوں میں بھی اس قسم کے ہنگاموں کو شدید خطرہ تھا۔ اس دوران وائسرائے، قائداعظم اور جواہر لعل نہرو کے درمیان علیحدہ علیحدہ مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا۔

حکومت میں مسلم لیگ کی شرکت

۲۵ اکتوبر کو ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل نو کی گئی اور درج ذیل محکمے ان لوگوں کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

مسلم لیگ

لیاقت علی خان (محکمہ خزانہ)، آئی آئی چندریگر (تجارت)، سردار عبدالرب نشتر (مواصلات

راجہ غضنفر علی خاں (صحت)، اور جے این منڈل (قانون)

کانگرس

جواہر لعل نہرو (امور خارجہ اور دولت مشترکہ)، سردار ولبھ بھائی پٹیل (امور داخلہ، اطلاعات اور نشریات)، ڈاکٹر راجندر پرشاد (خوراک اور زراعت)، سی راج گوپال اچاری (تعلیم اور فنون)، آصف علی (ذرائع رسل و رسائل اور ریلوے)، جگ جیون رام (محنت)

اقلیتیں

جان میتھائی (صنعت اور سپلائی)، سی ایچ بھابھا (تعمیرات)، کان کنی اور برقیات، بلدیو سنگھ (دفاع)۔

ہندوؤں کو حکومت میں مسلمانوں کی شمولیت بہت ناگوار گزری، کیونکہ ان کی اجارہ داری ختم ہو گئی تھی اور ہندو راج کے تمام خواب بکھر کر رہ گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہندو کو یہ صدمہ بھی تھا کہ نئی کونسل اب ان کے زیر اختیار اور دباؤ میں نہیں رہے گی۔ اِدھر جب مسلم لیگ نے ایک اچھوت نمائندہ جے این منڈل کو بھی مسلم لیگ کے نمائندوں کی فہرست میں شامل کر لیا تو کانگرس کو ایک اور شدید دھچکا لگا، کیونکہ اب تک کانگرس یہی سمجھتی آئی تھی کہ اقلیتوں اور خاص طور پر اچھوتوں کی محافظ وہی ہے اور مسلم لیگ صرف ایک فرقہ وارانہ جماعت کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ ان تمام حالات میں کانگرس کو لیگ کی شمولیت سخت ناگوار گزری۔ اس کی پالیسی میں لچک آنے کی جگہ زیادہ سختی پیدا ہو گئی۔ پنڈت نہرو کو تو اتنی زیادہ بے قراری محسوس ہوئی کہ انہوں نے وائسرائے کو ایک خط میں یہاں تک لکھا کہ انہیں مسلم لیگ کے ناموں پر شدید اعتراض ہے اور مسلم لیگ کانگرس کے ساتھ تعاون کرنے کی جگہ تصادم پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

حکومت میں شمولیت کی وجہ سے مسلم لیگ کو نہ صرف مسلمانوں کے تحفظ کا موقع ملا بلکہ اس نے ایک اچھوت نمائندے کو اپنی فہرست میں شامل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اگر کانگرس کو قوم پرست مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ تھا تو مسلم لیگ کو بھی اچھوتوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہے۔ مسلم لیگ کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسے کانگرس کی طرف سے پاکستان کی مخالفت کا تدارک کرنے کا موقع ملا۔

کانگرس نے پھر اُجر اُمسلم لیگ کی حکومت میں شمولیت کو برداشت تو کیا۔ لیکن وائسرائے کے اصرار کے باوجود مسلم لیگ کو اہم شعبوں میں سے کوئی ایک دینے پر رضامند نہ ہوئے۔ وائسرائے کا اصرار یہ تھا کہ مسلم لیگ کے امورِ خارجہ، امورِ داخلہ اور امورِ دفاع میں سے کوئی ایک لازماً دیا جائے، مگر نہرو اس کی مخالفت کرتے رہے۔ البتہ کانگرس نے محکمہ خزانہ خوشی کے ساتھ مسلم لیگ کے سپرد کر دیا کیونکہ کانگرس کا خیال یہ تھا کہ مسلمان حساب کتاب پر دسترس نہ رکھنے کی وجہ سے بُری طرح ناکام ہو جائے گا اور کانگرس کو نہ صرف اس کا تمسخر اُڑانے کا موقع ملے گا، بلکہ وہ یہ بھی دعوے سے کہہ سکے گی کہ مسلمان حکومت کرنے کے قابل نہیں۔ لیکن بعد میں کانگرس کو اپنی اِس نامعقولیت پر بُری طرح پچھتانا پڑا۔ کیونکہ مسلم لیگ نے اِسی ایک محکمے کے ذریعے کانگرس کو ایسا سبق دیا جسے وہ آج تک نہ بھلا سکی۔

لندن میں بات چیت

منتخب آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ۹، دسمبر ۱۹۴۶ء کو منعقد ہونا تھا۔ لیکن مسلم لیگ کے کامیاب امیدواروں نے اس میں شمولیت سے انکار کر دیا حتیٰ کہ اسمبلی کو ایک نمائندہ جماعت تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ مسلم لیگ کا مطالبہ یہ تھا کہ جب تک کانگرس صوبوں کی گروہ بندی کی دفعہ کی مکمل وضاحت کر کے اُسے تسلیم نہیں کر لیتی، مسلم لیگ اسمبلی کی کارروائی میں حصّہ نہیں لے گی حالات اتنے نازک ہو چکے تھے کہ وائسرائے ہند لارڈ ویول نے ایک بار پھر برطانوی وزیر امورِ ہند کو مطلع کیا کہ اگر اسمبلی کا اجلاس بلایا گیا تو ہندوستان میں خانہ جنگی پھیل سکتی ہے۔ مگر ۲۰ نومبر کو لارڈ ویول نے کابینہ مشن منصوبہ کے تحت دعوت نامے جاری کر دیئے۔ اور آئین ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا۔ وائسرائے کے اس اقدام کو قائداعظم نے ایک اور بہت بڑی غلطی قرار دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ایک بار پھر حقائق اور حالات کی سنگینی کو قطعی طور پر نظر انداز کرتے ہوئے کانگرس کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی آخر حکومت برطانیہ تے کسی فیصلے پر پہنچنے کی غرض سے کانگرس اور مسلم لیگ کے دو دو نمائندوں کو لندن بلایا تاکہ کوئی فیصلہ کن بات ہو سکے۔

اس دوران کانگرس کا سالانہ اجلاس میرٹھ میں منعقد ہوا، جس میں کانگرس نے یہ مطالبہ کیا کہ مسلم لیگ یا تو آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرے یا حکومت سے استعفیٰ دے۔ کانگرس نے یہ بات کچھ اس انداز میں کی، جیسے مسلم لیگ کو اس نے حکومت میں جگہ دی ہو، ایک بار پھر ہندو ذہنیت کھل کر سامنے آئی اور کانگرس کے "مردِ آہن" سردار پٹیل نے اجلاس میں یہاں تک کہہ دیا

کہ "ہم تلوار کا مقابلہ تلوار سے کریں گے۔ اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ تمام ہندوستان میں اکثریت، اقلیت کو موت کے گھاٹ اتار دے۔"

۲ دسمبر ۱۹۴۶ء کو برطانوی حکومت نے بات چیت کے لئے قائد اعظم، لیاقت علی خاں پنڈت نہرو اور سردار بلدیو سنگھ لندن پہنچ گئے۔ لیکن بات چیت ناکام ہوگئی۔ اس کا باضابطہ اعلان حکومت برطانیہ کی طرف سے ۶ دسمبر کو کر دیا گیا۔ اختلاف صوبوں کی گروہ بندی والی شرط کی تشریح پر تھا۔ حکومت برطانیہ نے خود اس کی تشریح یوں کی تھی۔

"شروع سے اب تک کابینہ مشن کی یہی رائے ہے کہ اگر کسی مسئلہ پر اتفاق نہ ہوسکے تو فریقوں کے اندر ان نمائندوں کی عام کثرت رائے سے فیصلہ کیا جائے گا جو ان فریقوں میں ہوں۔"

مسلم لیگ نے اس تشریح کو قبول کر لیا لیکن کانگرس نے اس کی تشریح یہ کی کہ صوبوں کو گروہ بندی اور اپنے آئین سے متعلق خود فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔

۹ دسمبر کو آئین ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا۔ پنڈت نہرو نے نئی دولت کی قرار داد مقاصد پیش کی۔ لیکن اس کے التواء کے لئے ایک ترمیم پیش کی گئی جو منظور ہوگئی اور آئین ساز اسمبلی کا اجلاس ۲۰ جنوری تک ملتوی کر دیا گیا۔ ۵ جنوری ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس نے یہ قرارداد منظور کی۔

"کانگرس کمیٹی کی دلی خواہش ہے کہ آئین ساز اسمبلی آزاد ہندوستان کے لئے آئین سازی کا کام کرے اور بعض نکات کی تشریح کے باعث جو دشواریاں پیدا ہوگئی ہوں، انہیں دور کرنے کی غرض سے برطانوی تشریح کے مطابق فریقین میں ضابطہ کار ... ئی اختیار کیا جائے مگر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ایسا کرتے وقت کسی صوبے پر جبر نہ ہو اور نہ ہی سکھوں کے حقوق پامال ہوں، اگر ایسا ہوا تو پورے صوبے یا اس کے ایک حصہ کو یہ حق ہوگا کہ متعلقہ فرقہ کے لوگوں کی مرضی سے مناسب کارروائی کرے چنانچہ کانگرس کمیٹی اپنی مجلس عاملہ کو یہ ہدایت کرتی ہے کہ جب بھی ضرورت محسوس ہو، صوبائی خود مختاری کے اصولوں کے پیش نظر ایسے معاملات میں مشورہ دے۔

دراصل کانگرس کی طرف سے یہ ایک نیا فتنہ کھڑا کرنے کی کوشش تھی اور اس قرارداد کے ذریعہ معاملات کو مزید الجھانے کی کوشش کی گئی تھی۔

مسلم لیگ کی قرارداد

آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس کراچی میں منعقد ہوا جس نے کانگرس کی قرارداد کی روشنی میں حالات کا جائزہ لیا۔ مسلم لیگ نے یہ قرارداد منظور کی۔

"کانگرس کی مجلس عاملہ نے کانگرس کمیٹی کو قراردادوں کے ذریعے جو حق استرداد دیا ہے اور پنجاب میں سکھوں کو جو امتناعی اختیار تفویض کیا ہے، وہ بے بنیاد اور مہمل ہے۔ مسلم لیگ سمجھتی ہے کہ یہ قرارداد مسلمانوں اور حکومت برطانیہ دونوں کو فریب دینے کے لئے منظور کی گئی ہے۔ کانگرس نے ضابطہ کی کاروائی کے بارے میں حکومت برطانیہ کی ۶ر دسمبر ۱۹۴۶ء کی تشریح کو مسترد کر کے اور پھر آئین ساز اسمبلی کے اجلاس میں اپنی مرضی سے قرارداد منظور کر کے اس بات کا کوئی امکان باقی نہیں رہنے دیا کہ کابینہ مشن کے آئینی منصوبہ پر کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔ نیز حکومت برطانیہ پر ان حالات میں یہ فیصلہ صادر کرنا مناسب ہوگا کہ ۱۶ر مئی کو کابینہ مشن نے جس منصوبہ کا اعلان کیا تھا وہ کانگرس، سکھوں اور پست اقوام کی نامنظوری کی وجہ سے ناکام ہوگیا۔ کیونکہ ۱۶ر مئی کے بیان کا نفاذ صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ کانگرس اور مسلم لیگ اسے قبول کرتیں۔ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے، اس نے ۶ر جون ۱۹۴۶ء ہی کو منظوری دے دی تھی۔ لیکن کانگرس کی طرف سے استرداد کی بنا پر ۲۹ر جولائی ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ نے مجبوراً اپنی منظوری واپس لے لی۔ ان حالات میں مسلم لیگ کے کھلے احتجاج اور اعتراض کے باوجود آئین ساز اسمبلی کے انتخابات اور اجلاس کا انعقاد بنیادی طور پر غیر قانونی، ناقص اور بے ضابطہ تھا۔ اسی طرح آئین ساز اسمبلی کی تمام دیگر کاروائیاں خلاف قانون ہیں۔ مسلم لیگ مطالبہ کرتی ہے کہ آئین ساز اسمبلی کو فوراً توڑ دیا جائے۔"

۵ر فروری ۱۹۴۷ء کو کانگرس اور اقلیتی نمائندوں نے (جو حکومت میں شامل تھے) وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ وہ عبوری حکومت میں شامل مسلم لیگی نمائندوں سے استعفے طلب کر لیں۔ کیونکہ مسلم لیگ نے نہ صرف آئین ساز اسمبلی میں شرکت نہیں کی بلکہ کابینہ مشن کا منصوبہ بھی رد کر دیا۔ علاوہ ازیں اس کے راست اقدام کا پروگرام بھی جاری ہے۔ ۱۳ر فروری کو کانگرس نے یہی مطالبہ دہرایا۔ جب وائسرائے نے کوئی اقدام نہ کیا تو کانگرس نے یہ دھمکی دی کہ وہ عبوری حکومت سے الگ ہو جائے گی۔

مسلم لیگ اور کانگریس دونوں ہی اپنے مؤقف پر قائم تھیں اور حکومت برطانیہ کے لئے دونوں، بالخصوص مسلمانوں کو ناراض کرنا بہت مشکل تھا۔ کیونکہ نہ صرف ہندوستان میں ہنگامہ ہوسکتا تھا۔ بلکہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی اس کے اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔

باب ۳۲

انتقالِ اقتدار کا اچانک اعلان

کانگرس کی ضد نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ خانہ جنگی کا زبردست خطرہ پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی نے اچانک ایک بیان دیا جو ہندوستانیوں کو اختیارات کی منتقلی سے متعلق تھا۔ حکومتِ برطانیہ نے یہ اعلان انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں اور کسی پیشگی منصوبہ بندی کے بغیر کیا۔ ایٹلی نے اعلان میں کہا کہ حکومت برطانیہ کی رائے میں وہ وقت آچکا ہے کہ ہندوستان کی حکومت کی تمام ذمہ داریاں اور اختیارات ہندوستانیوں کے سپرد کر دیئے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ وزارتی وفد ہندوستان گیا اور اس نے دو بڑی سیاسی جماعتوں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان سمجھوتہ کرانے اور فارمولہ وضع کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن افسوس کہ کامیابی نہ ہو سکی۔ انہوں نے اس امر پر مزید اظہارِ افسوس کیا کہ ان کے اعلان تک ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے درمیان کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا تھا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجوزہ منصوبہ کے تحت آئین ساز اسمبلی کو کام کرنے کا موقع نہیں مل سکا، حالانکہ منصوبہ کی بنیاد یہی تھی کہ اسمبلی ہر اعتبار سے نمائندہ حیثیت کی حامل ہو۔ چنانچہ حکومت برطانیہ کی خواہش ہے کہ تمام ذمہ داریاں ان نمائندہ جماعتوں یا افراد کے سپرد کر دی جائیں، جنہیں تمام جماعتیں کابینہ مشن کے منصوبے کی مطابقت میں قبول کریں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس وقت حالات بہت غیر یقینی بلکہ خطرناک بھی ہیں۔ کیونکہ ہندوستان میں ایسا آئین اور ایسے با اختیار لوگ نظر نہیں آتے، جنہیں اختیارات منتقل کئے جائیں تاہم اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے میں مزید تاخیر بھی

روا نہیں رکھی جا سکتی۔ لہٰذا حکومتِ برطانیہ اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتی ہے کہ جون ۱۹۴۸ء تک ضروری تدابیر کے تحت ہندوستانیوں کو اختیارات منتقل کر دیئے جائیں۔ حکومت برطانیہ نے یہ بات پہلے ہی واضح کر دی تھی کہ ایک مکمل نمائندہ آئین ساز اسمبلی جو آئین مرتب کرے اسے پارلیمان میں پیش کر دیا جائے گا لیکن اگر اس وقت تک آئین ساز اسمبلی نے آئین مرتب نہ کیا تو حکومتِ برطانیہ اس بات پر غور کرے گی کہ ہندوستان کی حکومت کے اختیارات کس کے سپرد کئے جائیں۔ یعنی کسی مرکزی حکومت کے یا کچھ علاقوں میں صوبائی حکومتوں کے، یا ایسے طریق اختیار کرے جو ہندوستان کے نمائندوں کے نزدیک قابل قبول ہوں۔

وزیر اعظم ایٹلی نے یہ اعلان بھی کیا کہ ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ویول نے جنگ کے زمانے میں جو خدمات سرانجام دیں، وہ قابلِ قدر ہیں تاہم اب انتقالِ اقتدار کا مرحلہ ہے جس کے لئے لارڈ مونٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے اور گورنر جنرل مقرر کر کے بھیجا جا رہا ہے۔ وہ مارچ ۱۹۴۷ء تک اپنے عہدے کا چارج لیں گے۔

اعلان کے دوسرے دن لارڈ ویول نے پنڈت نہرو اور لیاقت علی خاں سے ملاقاتیں کیں۔ وائسرائے نے پنڈت نہرو پر اس ضرورت کی وضاحت کی کہ آئین ساز اسمبلی میں مسلم لیگ کی شمولیت نہایت ضروری تھی۔ انہوں نے نہرو کی توجہ کانگرس کمیٹی کی قرارداد ۶۔ دسمبر ۱۹۴۶ء کی طرف مبذول کرائی جس کی تشریح اس لئے ضروری تھی کہ مسلم لیگ کو آئین ساز اسمبلی میں شامل کیا جا سکے۔ ویول نے نہرو پر یہ بات بھی واضح کر دی کہ حکومتِ برطانیہ ایسا کوئی آئین مسلط کرنے پر ہرگز تیار نہیں جس سے ملک کا ایک یا کچھ حصے اختلاف رکھتے ہوں۔ لہٰذا بنگال کے ہندوؤں اور پنجاب کے سکھوں کو یہ آئین قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

لارڈ ویول نے نوابزادہ لیاقت علی خاں سے ملاقات کی تو انہوں نے دریافت کیا کہ کیا آئین ساز اسمبلی بدستور کام کرتی رہے گی؟ لیاقت علی خاں نے وائسرائے کو صاف صاف کہا کہ مشیر خزانہ کی حیثیت سے انہیں یہ پوچھنے کا مکمل اختیار تھا کہ اگر آئین ساز اسمبلی مکمل نمائندہ نہیں کرتی تو اس پر عوامی خزانے سے بلاوجہ رقم کیوں خرچ کی جائے؟ ویول نے لیاقت علی خاں کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ عملی طور پر حکومتِ برطانیہ، گورنر جنرل یا مشیر خزانہ، کوئی بھی آئین ساز اسمبلی کو کارروائی جاری رکھنے سے روکنے کے مجاز نہیں۔ ویول نے اس بات پر اصرار کیا کہ مسلم لیگ آئین ساز اسمبلی میں ضرور شرکت کرے۔ مگر لیاقت علی خاں نے واضح کر دیا کہ

حالات کے پیشِ نظر بظاہر اس امر کا کوئی امکان نہ تھا۔

کانگرس کا اقدام

کانگرس نے حکومت کی طرف سے مایوس ہو کر اپنی روایات کے مطابق وہی اوچھے ہتھیار استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ اس نے مسلم اکثریت کے تمام صوبوں میں ہندوؤں اور سکھوں کو اکسایا کہ وہ صوبائی گروپوں کی آئین ساز اسمبلی میں شرکت نہ کریں نیز مسلم اکثریت کے دو صوبوں پنجاب اور بنگال اور آسام کی تقسیم کا مطالبہ کریں۔ آسام کی کانگرس پارٹی نے بھی یہ ہدایات جاری کر دیں کہ کابینہ مشن کی سکیم کے تحت کوئی رکن اسمبلی بنگال کے گروپ میں شرکت نہ کرے۔ صوبہ سرحد گو مسلمان اکثریت کا صوبہ تھا لیکن وزارت کانگرس کی تھی۔ وہاں ہندوؤں اور سکھوں کے تعاون سے کانگرسی مسلمانوں کی تعداد مسلم لیگی اراکین سے زیادہ تھی۔ پنجاب میں مسلمانوں کے پاس ۸۷ نشستیں تھیں اور سب مسلم لیگ کے قبضہ میں تھیں۔ انتخابات کے بعد تین آزاد امیدوار مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو یہ تعداد ۹۰ ہو گئی۔ لہذا اب مسلم لیگ کے لئے مجموعی طور پر بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جن صوبوں میں وہ پاکستان قائم کرنا چاہتی تھی، وہی صوبے مسلم لیگ کے مخالفین کے قبضہ میں تھے۔ خضر حیات خاں ٹوانہ کی سازش کے باعث مسلم لیگ وزارت نہ قائم کر سکی تھی۔ خضر حیات نے سکھوں اور ہندوؤں سے مل کر وزارت قائم کر لی تھی۔ علاوہ ازیں اس حکومت نے مسلم لیگ کے خلاف معاندانہ پالیسی جاری رکھی۔ نواب ممدوٹ، میاں ممتاز دولتانہ، سردار شوکت حیات خاں، ملک فیروز خاں نون، سید امیر حسین شاہ اور بیگم شاہنواز کو گرفتار کیا گیا — اور جب مسلم لیگ نے سول نافرمانی شروع کی تو پنجاب اسمبلی کے ۱۴ مسلم لیگی اراکین کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

لارڈ اٹیلی کے اس بیان کے بعد کہ حکومت برطانیہ تمام اختیارات ہندوستانیوں کے سپرد کرنا چاہتی ہے۔ مسلم لیگ کے لئے سب سے بڑا اور نازک مرحلہ یہ تھا کہ صوبہ سرحد اور پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارت قائم کی جاتی، بصورتِ دیگر یہ دونوں صوبے مسلم لیگ کے ہاتھ سے نکل جاتے۔

اسی دوران ہندوؤں کے اکسانے پر سکھ رہنما ماسٹر تارا سنگھ نے یہ اعلان کر دیا کہ اگر مجلسِ مقننہ اور سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں اور سکھوں کو ایک تہائی نمائندگی نہ دی گئی تو

سکھ تقسیم پنجاب پر اصرار کریں گے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے یہ بھی کہا کہ سکھ کسی صورت بھی مسلمانوں کے ساتھ ایسا سمجھوتہ نہیں کر سکتے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو۔ اگر ایسی حکومت سکھوں پر ٹھونسی گئی تو وہ تلوار کے زور سے مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے باہر نکال دیں گے۔

مسلم لیگ کی کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح پنجاب میں یونینسٹ مخلوط وزارت کو ختم کر دیا جائے لیکن عملی کوشش سے قبل ہی ۲۔ مارچ ۴۷ء کو خضر حیات خاں ٹوانہ نے استعفا دے دیا۔ اس طرح یہ مخلوط اور غدار وزارت خود بخود ختم ہو گئی۔ ۳۔ مارچ کو نواب ممدوٹ نے سکھوں، ہندوؤں اور یونینسٹ پارٹی کے مسلمانوں کو یکجا کر کے یہ یقین دلایا کہ اگر وہ پنجاب میں وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئے تو سکھوں اور ہندوؤں کے مفادات کی مکمل حفاظت کی جائے گی۔ مگر اس کے جواب میں تارا سنگھ نے اسی دن یہ بیان داغ دیا کہ سکھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں یا زندہ رہیں، لیکن وہ مسلمانوں کی حکومت کبھی برداشت نہ کریں گے۔ انہوں نے سکھوں سے ان الفاظ میں اپیل کی "خالصہ تیار ہو جائے اور کمر باندھے۔ آخری فیصلے کا وقت آ چکا ہے۔ خدا تیری رہنمائی اور حفاظت کرے گا" دوسرے دن اس جذباتی لیکن ذہنی طور پر نابالغ بوڑھے سکھ رہنما نے تلوار گھما کر پاکستان مردہ باد اور ست سری اکال کے نعرے لگائے۔ یہ بھی کہا کہ اب فیصلہ تلوار کرے گی اور سکھ مسلمانوں کے جوش ٹھکانے لائیں گے۔ اسی دن تارا سنگھ نے ایک جلسہ عام میں سکھوں کو ان الفاظ میں اشتعال دلایا:

"ہندو اور سکھو! آؤ کہ تمہارے امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ دھرتی خون مانگ رہی ہے۔ اب اس کی پیاس خون ہی سے بجھائی جائے گی۔ بگل بج گیا ہے مسلم لیگ کو تم ختم کر دو۔"

ماسٹر تارا سنگھ اور دوسرے سکھ اور ہندو رہنماؤں کی ان اشتعال انگیز تقریروں کا اثر یہ ہوا کہ ۵۔ مارچ کو ہندوؤں اور سکھوں کا ایک مشترکہ جلوس انارکلی لاہور سے گزرا۔ اس جلوس میں شامل لوگوں نے دکانوں سے مسلم لیگ کے جھنڈے اتار دیئے، پاکستان مردہ باد کے نعرے لگائے اور مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے۔ دیکھتے دیکھتے فساد پنجاب کے دیگر اضلاع میں بھی پھیل گیا۔ دو دن بعد حکومت کو ۲۴ گھنٹے کا کرفیو لگانا پڑا کیونکہ پنجاب میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

مسلم لیگ نے فیروز خاں نون کی تجویز پر ایک بار پھر سکھوں اور ہندوؤں سے

مصالحت کے لئے دستِ تعاون دراز کیا مگر کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ آخرکار پنجاب کے انگریز گورنر نے حکومت کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

نئی تجاویز

کانگرس نے ۵۔ مارچ کو مسلم لیگ کو دعوت دی کہ وہ کانگرس سے مذاکرات کے لئے اپنے نمائندے نامزد کرے تاکہ انتقالِ اختیارات کا عمل خوشگوار اور پُر امن طور پر ہو سکے۔ کانگرس نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ پنجاب کو مسلم اور غیر مسلم اکثریت کے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ کانگرس نے یہ تجاویز وائسرائے کو بھی روانہ کیں۔ ان میں بنگال کی تقسیم کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔

مسلم لیگ ان حالات میں، کہ کانگرس نے آئین ساز اسمبلی کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ کیا تھا، تعاون کیسے کر سکتی تھی۔ انہی دنوں لیاقت علی خاں نے نئے سال کا بجٹ پیش کیا۔ اس بجٹ میں ناجائز طریقوں سے بے پناہ دولت کمانے والوں پر کچھ ٹیکس عائد کئے گئے تھے۔ کانگرس جو اس وقت تک یہ سمجھ رہی تھی کہ مسلمان حساب کتاب میں کمزور ہوتا ہے۔ لہذا خزانہ اگر ایک مسلمان کے پاس چلا گیا تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا، اب نئے ٹیکس پر بُری طرح بوکھلا گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی بڑی بڑی صنعتوں اور تجارتوں پر ہندوؤں کا قبضہ تھا اور اس ٹیکس سے وہی متاثر ہونے تھے۔ کانگرس ان کروڑپتی ہندوؤں سے چندے حاصل کرتی تھی لہذا اسے یہ اقدام سخت ناگوار گزرا۔ پنڈت نہرو —— جو کسی وقت مسلم لیگ کو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کی جماعت کہتے تھے، اب خود ہی اس ٹیکس کی مخالفت کرنے میں پیش پیش تھے۔ اس کاری ضرب نے کانگرس کی کمر توڑ کر رکھ دی اور بہت سے ہندو سیٹھ کانگرس کے خلاف ہو گئے۔

نئے وائسرائے کی آمد

نئے وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۲۲۔ مارچ، ۱۹۴۷ء کو دلی پہنچ گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے عہدے کا حلف اٹھانے سے پہلے ہی قائداعظم اور گاندھی کو خط لکھ دیئے کہ وہ ان سے ملاقات کے لئے دلی پہنچ جائیں۔ اسی دن خط لکھنے کے بعد انہوں نے اپنے عہدے کا حلف اٹھا لیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پنڈت جواہر لعل نہرو سے ساتھ مراسم عالم سب کو تھا۔ لہٰذا ان کی بطور وائسرائے آمد بہرحال کانگریس کے لئے ایک نیک فال تھی۔ گو حکومت برطانیہ کو بعض انگریز مدبرین اور سیاست دانوں نے قبل از وقت متنبہ کیا تھا کہ انہیں وائسرائے بنا کر ہندوستان بھیجنے کا واحد مطلب یہ لیا جائے گا کہ کانگریس کے ساتھ رعایت برتی جا رہی ہے۔ لیکن حکومت برطانیہ نے اس کی مطلق پروا نہ کی۔ اپنی افتتاحی تقریر کے دوران انہوں نے یہ ظاہر کیا کہ انتقال اقتدار ایک فوری ضرورت ہے۔ لہٰذا تمام پیچیدہ مسائل کو بھی جلد از جلد طے کرنے کی ضرورت ہے۔ نہ صرف یہ کہ ماؤنٹ بیٹن، کانگریس کے چہیتے تھے بلکہ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ وائسرائے کے عملہ میں ایک ہندو۔ کرشنا مینن بھی تھے جو خود کانگریسی تھے۔ وہ ہر وقت وائسرائے کو جانبدارانہ رویئے پر اکسا سکتے تھے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انتقال اختیارات کا تمام منصوبہ بھی کرشنا مینن نے تیار کیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کا عالم یہ تھا کہ وہ ناشتہ اکثر نہرو کے ساتھ موخر الذکر کے گھر کرتے۔ اندرا گاندھی سے ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ ادھر لیڈی ماؤنٹ بیٹن کے نہرو کے ساتھ گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ ابوالکلام آزاد نے تو اس حد تک اعتراف کیا کہ نہرو پر لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا اثر سردار پٹیل اور ماؤنٹ بیٹن سے بھی زیادہ تھا۔

ماؤنٹ بیٹن نے مختلف اوقات میں پنڈت نہرو، گاندھی، قائداعظم، لیاقت علی خاں اور کچھ والیان ریاست سے ملاقاتیں کیں۔ کانگریسی رہنما اپنی خوشامد سے اور کرشنا مینن کی قربت کے بل پر ماؤنٹ بیٹن پر دباؤ ڈالتے رہے۔ اسی دوران گاندھی نے ماؤنٹ بیٹن کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی کہ کانگریس وزارت سے الگ ہو جاتی ہے، مسلم لیگ سے کہا جائے کہ وہ خالصتاً اپنی وزارت قائم کر لے۔ شاید کانگریس نواز وائسرائے یہ بھی کر گزرتے مگر مشکل یہ تھی کہ کابینہ مشن منصوبے کے تحت وہ ایسا نہ کر سکتے تھے اور "تمام سیاسی جماعتوں کی رضامندی" کے پابند تھے۔

منصوبہ تقسیم ہندوستان

ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان پہنچتے ہی محسوس کیا کہ کابینہ مشن منصوبہ کے تحت متحدہ ہند کی بنیاد پر کسی حل پر پہنچنا ناممکن ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک نیا منصوبہ تیار کرنے کی کوشش شروع کر دی جس کی بنیاد وہ بیان تھا جو ۲۰ فروری کو وزیر اعظم برطانیہ نے دیا تھا۔

ماؤنٹ بیٹن نے اپنے مشیروں کی مدد سے ایک منصوبہ تیار کیا جو منظوری کے لئے لندن روانہ کردیا گیا۔ انتقالِ اختیار کے اس منصوبہ میں صوبوں کو اور صوبوں کے گروہوں کو انتقالِ اختیار سے پہلے عبوری دور میں اختیارات دینے کی تجویز شامل تھی۔ ۱۱ اپریل کو یہ منصوبہ ترمیم و اضافہ کیلئے کرشنا مینن کو لندن سے ملا۔ کرشنا مینن نے اس حکم کی تعمیل تو کر لی لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ منصوبہ قطعی طور پر ناقابل عمل تھا۔ ۱۵ اور ۱۶ اپریل کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے صوبائی گورنروں کا اجلاس منعقد کیا اور یہ متبادل منصوبہ پیش کیا۔ منصوبہ جو صوبوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی تقسیم پر بھی مشتمل تھا، منظور کر لیا گیا۔ کانگرس یہ چاہتی تھی کہ اگر کابینہ مشن کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا جائے اور ہندوستان میں اس نوعیت کی وفاقی حکومت قائم ہو، جس میں ہندوستان کی یونین اور مسلمان اکثریتی صوبے دو گروہوں کی صورت میں شریک ہوں، اس صورت میں بھی بنگال، پنجاب اور آسام کو تقسیم کر دیا جائے۔ کانگرس کا موقف یہ تھا کہ اگر مسلم لیگ، مسلمان اکثریت کے علاقے الگ کرنا چاہتی ہے تو صوبوں کے اندر جو ہندو اکثریت کے علاقے موجود ہیں انہیں بھی بہرحال تقسیم ہونا چاہیئے۔ قائداعظم نے کانگرس کے اس مطالبہ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان پاکستان کا مطالبہ اس اصول کی بنیاد پر کر رہے ہیں کہ مسلمانوں کو ایک قومی وطن ملے جو پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان، بنگال اور آسام کے صوبوں پر مشتمل ہو۔ اگر پنجاب اور بنگال کی تقسیم کو تسلیم کر لیا جائے تو دوسرے صوبوں کی تقسیم بھی ضروری ہو جائے گی۔ قائداعظم نے فوجوں کی تقسیم اور ہندوستان اور پاکستان کی مکمل خودمختاریت کا مطالبہ بھی کیا۔

کانگرس نے صوبوں کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو سکھوں نے بھی خالصتان کا مطالبہ کر دیا اور ہندو اکثریتی صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں نے ان ہندو صوبوں کی تقسیم پر زور دینا شروع کر دیا۔

گورنروں کی کانفرنس میں منظوری کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے توثیق کے لئے ترمیم شدہ منصوبہ دوبارہ لندن بھیجا اور یہ درخواست کی کہ ۱۰ مئی تک اسے لازماً واپس بھیج دیا جائے تاکہ سیاسی جماعتوں کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ پھر ہفتہ بھر آرام کے لئے وائسرائے شملہ پہنچ گئے۔

راز و نیاز

منصوبہ توثیق کے لئے لندن پہنچا۔ وائسرائے شملہ آ گئے اور پھر شملہ کی خوشگوار فضا میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن، کرشنا مینن اور پنڈت جواہر لعل نہرو کے درمیان راز و نیاز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کرشنا مینن نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے اس منصوبہ کے بارے میں بات کی جو لندن بھیجا گیا تھا۔ اسی اثناء نہرو بھی ماؤنٹ بیٹن کے مہمان خصوصی کے طور پر شملہ پہنچ گئے۔ پھر ان سب کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ کرشنا مینن، نہرو سے تبادلۂ خیال کے بعد ایک اور منصوبہ فوری طور پر لندن روانہ کریں۔

۹۔ مئی کو مینن نے نہرو کے ساتھ جس نئے منصوبہ کی بات کی اس کے تحت "دو ہندوستانوں" یا صوبوں کے گروہوں کو انتقال اختیار کا کوئی ذکر نہ تھا۔ ۱۰۔ مئی کو ان تینوں میں پھر مشورے ہوئے اور منصوبہ پر غور کیا گیا لیکن اسے اجلاس کہہ کر اس کی کارروائی سرکاری ریکارڈ میں شامل کر لی گئی۔ حالانکہ تمام کارروائی ویسے بھی یکطرفہ ہو رہی تھی۔

اسی دن وائسرائے کو لندن سے وہ منصوبہ موصول ہو گیا، جو وہاں توثیق کے لئے بھیجا گیا تھا۔ حکومت برطانیہ نے اس میں بھی بعض ترامیم کی تھیں۔ رات کے کھانے کے بعد وائسرائے نے برطانیہ سے توثیق شدہ منصوبہ نہرو کو دکھایا۔ نہرو اسے پڑھتے ہی چلا کر بولے "کانگرس اسے کسی قیمت پر بھی قبول نہیں کرے گی"۔

نہرو کے بہترین دوست اور ان کی صاحبزادی اندرا گاندھی کے نازبردار لارڈ ماؤنٹ بیٹن، نہرو کے اس انداز سے بے حد گھبرائے۔ انہوں نے علی الصبح کرشنا مینن کو نہرو کے ردعمل سے مطلع کیا۔ کرشنا مینن نے یہ تجویز پیش کی کہ انہوں نے جو نیا منصوبہ تیار کیا تھا اسے اپنایا جائے کیونکہ اس کے تحت ہندوستان ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ سکتا تھا۔ فوری طور پر وائسرائے کے عملہ کا اجلاس طلب کر کے نہرو کو خاص طور پر مدعو کیا گیا۔ چند لمحوں میں لندن سے موصولہ منصوبہ پر اعتراضات کو سرکاری ریکارڈ میں شامل کیا گیا اور اس طرح انتقال اختیارات کے اتنے بڑے اور اہم منصوبہ پر صرف نہرو کے اعتراضات شامل کر کے آخری صورت دے دی گئی۔ فوراً بعد کرشنا مینن سے کہا گیا کہ وہ اپنا منصوبہ مرتب کر کے پنڈت نہرو کو رات سے پہلے دکھا دیں کیونکہ اسی رات نہرو دلی واپس جا رہے تھے۔ مینن نے فوری طور پر منصوبہ تیار کیا،

نہرو نے اس کی منظوری دے دی۔
۱۸ ۔ مئی کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نئے منصوبہ کی توثیق کے لئے بنفس نفیس لندن پہنچ گئے۔
لندن میں لارڈ ازمے اور لارڈ ایبل نے نئے منصوبہ کی شدید مخالفت کی لیکن ماؤنٹ بیٹن نے
دھمکی دی کہ اگر منصوبہ منظور نہ کیا گیا تو وہ اپنے عہدے سے استعفا دے دیں گے ۔ ماؤنٹ بیٹن حکومت
برطانیہ کے چہیتے تھے ، ان کی یہ دھمکی کارگر ہوئی اور برطانوی کابینہ کی ہندبرما کمیٹی نے اس کی
توثیق کر دی ۔ وزیر اعظم برطانیہ اور ان کی کابینہ نے بھی اس منصوبہ کی منظوری صرف ۵ منٹ
میں دی ۔ غالباً اتنے اہم کام اور ۴۰ کروڑ عوام کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے صرف ۵ منٹ
دنیا کے تختہ پر پہلی اور آخری لیکن بدترین مثال تھی۔

۴ ۔ جون کا منصوبہ

۱ ۔ ۲۰ ۔ فروری ۱۹۴۷ء کو تاج برطانیہ کی طرف سے جو اعلان کیا گیا تھا اس کے مطابق ہندوستانیوں
کو جون ۱۹۴۸ء تک اختیارات منتقل کئے جانے تھے ۔ تاج برطانیہ کو توقع تھی کہ ہندوستان
کی بڑی سیاسی جماعتیں کابینہ مشن منصوبہ ۱۶ ۔ مئی ۱۹۴۶ء کے تحت باہم تعاون کریں گی
اور ان کے لئے ایک ایسا آئین وضع کرنا ممکن ہو جائے گا جو تمام جماعتوں کے لئے قابل قبول
ہو ۔ لیکن تاج برطانیہ کی یہ توقع پوری نہ ہو سکی۔
۲ ۔ مدراس ، بمبئی ، یو پی ، بہار ، سی پی ، برار ، آسام ، اُڑیسہ ، صوبہ سرحد ،
دلی ، اجمیر ۔ مارواڑ اور کرگ کے نمائندوں کی اکثریت نئے آئین کے سلسلہ میں پہلے ہی
کام کر چکی ہے ۔ دوسری طرف مسلم لیگ جس میں بنگال ، پنجاب ، سندھ اور
بلوچستان کے نمائندوں کی اکثریت ہے ، نے فیصلہ کیا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کی کارروائی
میں حصہ نہ لے گی۔
۳ ۔ شاہ برطانیہ کی حکومت کی یہ خواہش رہی ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کو ان کی امنگوں
اور خواہشات کے مطابق اقتدار منتقل کیا جائے ۔ اگر تمام سیاسی جماعتوں میں مکمل
تعاون ہوتا تو یہ کام بہت آسان ہو جاتا ۔ لیکن اس تعاون اور باہمی افہام وتفہیم کی عدم
موجودگی میں کوئی طریق کار اختیار کرنے کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہو گئی ہے تاکہ
ہندوستان کے عوام کو ان کی خواہشات کے مطابق اقتدار منتقل کیا جائے ۔ ہندوستان

کے سیاسی رہنماؤں سے مکمل مشورے کے بعد حکومت برطانیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مندرجہ ذیل منصوبہ کو اپنایا جائے اور یہ بات بھی واضح کر دی جائے کہ وہ خود کوئی متبادل آئین وضع کرنے کے حق میں نہیں بلکہ یہ ہندوستانیوں کا اپنا کام ہے اور نہ ہی اس منصوبہ میں کوئی ایسی بات ہے جو مختلف فریقوں میں متحدہ ہندوستان پر گفت وشنید کی راہ میں مانع ہو۔

۴۔ حکومت برطانیہ موجودہ آئین ساز اسمبلی کے کام میں کوئی خلل ڈالنے پر آمادہ نہیں۔ وہ توقع رکھتی ہے کہ اب ان صوبوں کے مسلم لیگی نمائندے مطمئن ہو جائیں گے، جن صوبوں کے نمائندوں کی اکثریت پہلے ہی آئین ساز اسمبلی میں موجود ہے۔ اسکے ساتھ ہی یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ موجودہ آئین ساز اسمبلی جو آئین مرتب کر چکی ہے ضروری نہیں کہ اسکا اطلاق ملک کے ان حصوں پر بھی ہو جو حصوں کیلئے یہ آئین ناقابل قبول ہے۔ لہذا حکومت برطانیہ مطمئن ہے کہ جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے تمام لوگوں کی خواہشات کی تکمیل کے لئے ایک بہترین عملی طریق کار ہے۔ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ ایسے علاقوں کے لوگوں کا یہ منشا معلوم کیا جائے کہ وہ موجودہ آئین ساز اسمبلی کے ذریعہ اپنا آئین وضع کریں گے یا کسی نئی آئین ساز اسمبلی کے ذریعہ، جہاں اُن کے نمائندے ہوں، اور جنہوں نے یہ فیصلہ کیا ہو کہ وہ آئین ساز اسمبلی میں شرکت نہیں کریں گے! اس کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا جا سکے گا کہ انتقال اختیار کسی ایک یا ایک سے زائد با اختیار لوگوں کو منتقل کیا جائے۔

۵۔ اس مقصد کے لئے بنگال اور پنجاب کی مجالس قانون ساز دو گروہوں میں تقسیم ہوں گی۔ یورپین اراکین ان میں شامل نہیں ہوں گے۔ ان دو گروہوں میں ایک وُہ ہو گا، جو مسلمانوں کی اکثریت کے اضلاع پر اور دُوسرا وہ جو دونوں صوبوں کے باقی ماندہ علاقوں کے اضلاع پر مشتمل ہو۔ اضلاع کی آبادی کے تعین کی غرض سے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری مستند سمجھی جائے گی۔ پنجاب اور بنگال کے صوبوں میں مسلمان اکثریت کے اضلاع اس بیان کے ضمیمہ میں درج ہیں۔

۶۔ ہر مجلس قانون ساز کے دونوں گروہوں کے اجلاس الگ الگ منعقد ہوں گے اور انہیں اس سلسلہ میں اظہار رائے کا اختیار ہو گا کہ صوبہ کو تقسیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اگر کوئی بھی گروپ سادہ اکثریت سے تقسیم کے حق میں رائے دے تو

تقسیم کا عمل قبول کر لیا جائے گا اور متعلقہ انتظامات کئے جائیں گے۔

۷۔ تقسیم کے فیصلہ سے قبل بہتر یہ ہو گا کہ ہر گروہ کے نمائندوں کو پہلے سے علم ہو کہ اگر اسمبلی کے دونوں گروہوں نے صوبہ کے اتحاد کے حق میں فیصلہ کیا تو متعلقہ صوبہ متحدہ صورت میں آئین ساز اسمبلی میں شریک ہو گا ————

———— اور اگر دونوں گروہوں میں کسی ایک کا کوئی رکن یہی مطالبہ کرے تو مجلس قانون ساز کے تمام اراکین کے اجلاس میں اس مسئلہ کا فیصلہ ہو گا لیکن کوئی یورپی رکن ایسا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

۸۔ اگر تقسیم کا فیصلہ ہو جائے تو مجلس قانون ساز کا ہر گروہ اپنے علاقوں کی طرف سے یہ فیصلہ کرے گا کہ اس کا آئین موجودہ آئین ساز اسمبلی وضع کرے ——— یا نئی اور علیحدہ آئین ساز اسمبلی۔

۹۔ بنگال اور پنجاب کے مسلم اور غیر مسلم اضلاع کی تقسیم عارضی ہو گی۔ دونوں صوبوں یا کسی ایک صوبہ کی تقسیم کا فیصلہ ہونے کے بعد گورنر جنرل ایک حد بندی کمیشن مقرر کرے گا۔ حد بندی کمیشن حدود کے تعین کے سلسلہ میں مسلسل اور غیر مسلم اکثریتی علاقوں اور دیگر ضروری باتوں کو مدِ نظر رکھے گا۔ حد بندی کمیشن کا فیصلہ موصول ہونے تک عارضی حدود قائم رہیں گی۔

سندھ

۱۰۔ سندھ کی مجلس قانون ساز کے تمام ہندوستانی اراکین ایک خاص اجلاس میں اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ سندھ کا آئین موجودہ آئین ساز اسمبلی وضع کرے یا ایک نئی اور علیحدہ آئین ساز اسمبلی!

صوبہ سرحد

۱۱۔ صوبہ سرحد کی حیثیت استثنائی ہے لہٰذا اسے یہ موقع فراہم کرنا ضروری ہے کہ جب پنجاب یا پنجاب کا ایک حصہ موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شریک نہ ہونے کا فیصلہ کر لے تو صوبہ سرحد اپنی حیثیت پر از سر نو غور کرے۔ جن لوگوں نے موجودہ مجلس

قانون ساز کے اراکین کو ووٹ دیئے تھے، وہی اس معاملہ پر حق استصواب رائے استعمال کریں گے کہ وہ موجودہ آئین ساز اسمبلی یا نئی اور علیحدہ اسمبلی میں سے کس میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔

برطانوی بلوچستان

۱۲۔ برطانوی بلوچستان نے ایک رکن منتخب کیا ہے۔ لیکن اس رکن نے موجودہ آئین ساز اسمبلی میں نشست نہیں سنبھالی۔ بلوچستان کی جغرافیائی حیثیت کی بنا پر اس صوبہ کو بھی اپنی حیثیت کا از سر نو جائزہ لینے کا حق دیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے گورنر جنرل اس امر کا جائزہ لے رہے ہیں کہ یہ کام خوش اسلوبی کے ساتھ کیونکر انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس صوبہ کو موجودہ آئین ساز اسمبلی یا نئی اور الگ آئین ساز اسمبلی میں شرکت کا اختیار رہے گا۔

آسام

۱۳۔ گو آسام میں غیر مسلم اکثریت ہے۔ لیکن سلہٹ کا ضلع مسلمانوں کی اکثریت کا حامل ہے۔ یہ مطالبہ عام رہا ہے کہ بنگال کی تقسیم کی صورت میں سلہٹ کو بنگال کے مسلمان حصہ میں شامل کیا جائے۔ چنانچہ اگر بنگال کی تقسیم کا فیصلہ ہو جاتا ہے تو سلہٹ کے ضلع میں آسام کی صوبائی حکومت سے مشورہ کے بعد گورنر جنرل کی منظوری کے تحت یہ فیصلہ کرنے کے لئے آیا، سلہٹ بدستور صوبہ آسام کا ایک حصہ رہے یا اسے مشرقی بنگال کے نئے صوبے کا حصہ بنا دیا جائے، استصواب رائے عامہ کرایا جائے گا۔ اگر استصواب رائے کا نتیجہ مشرقی بنگال کے ساتھ وابستگی کے حق میں ہو تو ایک حد بندی کمیشن ضلع سلہٹ کے مسلم اکثریتی علاقوں اور متصل مسلمان اکثریتی علاقوں کی حد بندی کے لئے قائم کیا جائے گا جو پنجاب اور بنگال کے حد بندی کمیشن کی بنیادوں پر کام کریگا۔ اس کے بعد سلہٹ کا ضلع مشرقی بنگال کو منتقل کر دیا جائے گا۔ جہاں تک صوبہ آسام کے باقی ماندہ حصہ کا تعلق ہے تو وہ بدستور موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شریک رہے گا۔

آئین ساز اسمبلیوں میں نمائندگی

۱۴۔ اگر پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے حق میں فیصلہ ہو جائے تو ان علاقوں کے نمائندگان کے انتخاب کے لئے نئے انتخابات کا انعقاد ضروری ہوگا۔ نمائندگی ہر دس لاکھ افراد پر ایک کے تناسب سے ہوگی، اسی طرح اگر سلہٹ مشرقی بنگال کا حصہ بننے پر اظہار رضامندی کر دے تو وہاں بھی مندرجہ بالا طریق پر نئے انتخابات ہوں گے۔ ہر علاقہ کی نمائندگی یوں ہوگی:

صوبہ	عام نشستیں	مسلمان نشستیں	سکھ	مجموعی نشستیں
ضلع سلہٹ	۱	۲	×	۳
مغربی بنگال	۱۵	۴	×	۱۹
مشرقی بنگال	۱۲	۲۹	×	۴۱
مغربی پنجاب	۳	۱۲	۲	۱۷
مشرقی پنجاب	۶	۴	۲	۱۲

۱۵۔ مختلف علاقوں کے نمائندے موجودہ آئین ساز اسمبلی میں یا نئی آئین ساز اسمبلی میں شرکت کریں گے۔

انتظامی معاملات

۱۶۔ کسی بھی صوبہ کی تقسیم کے نتیجہ میں پیدا شدہ انتظامی تبدیلی کے بارے میں بات چیت درج ذیل بنیادوں پر جلد از جلد کی جائے گی:

(ا) ایسے تمام معاملات جو اس وقت مرکزی حکومت کے تحت ہیں اور جن میں دفاع، خزانہ اور مواصلات شامل ہیں، نئے مختاران مجاز کے نمائندوں کی وساطت سے!

(ب) انتقال اختیار سے پیدا شدہ امور پر نئے مختاران مجاز اور حکومت برطانیہ کے درمیان!

(ج) تقسیم ہونے والے صوبوں کے صوبائی امور سے متعلق مثلاً پولیس اور دیگر

ملازمتیں، اعلیٰ عدالتیں، صوبائی ادارے اور دیگر ذمہ داریاں وغیرہ!

ریاستیں

۱۷۔ حکومت برطانیہ یہ بات واضح کر دینا چاہتی ہے کہ جو فیصلے کئے گئے ہیں، برطانوی ہند سے تعلق رکھتے ہیں اور ہندوستانی ریاستوں سے متعلق ان کی پالیسی (کابینہ مشن رپورٹ ۱۲ ۔ مئی ۱۹۴۶ء کے مطابق) میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

شمال مغربی سرحدی قبائل

۱۸۔ شمال مغربی سرحدی قبائل کے امور کا فیصلہ ان کے مختارانِ مجاز کے ساتھ بات چیت کے بعد ہوگا۔

عجلت کی ضرورت

۱۹۔ اختیارات سنبھالنے کے لئے مختارانِ مجاز کو کچھ وقت درکار ہے، تاہم یہ بہت ضروری ہے کہ اس طریق کار کو جلد از جلد مکمل کیا جائے۔ تاخیر سے بچنے کے لئے مختلف صوبے یا ان صوبوں کے حصے، جہاں تک ممکن ہو آزادانہ طور پر اس منصوبہ کی شرائط کے تحت موجودہ آئین ساز اسمبلی یا نئی آئین ساز اسمبلی (اگر تشکیل ہو گئی ہو) اپنے اپنے علاقوں کیلئے آئین مرتب کریں گی اور انہیں اپنے ضابطے وضع کرنے کا مکمل اختیار رہوگا۔

فوری انتقال اختیارات

۲۰۔ تمام بڑی سیاسی جماعتوں نے اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ اختیارات جلد از جلد منتقل کر دیئے جائیں۔ حکومت برطانیہ ان کی اس خواہش کا مکمل احترام کرتی ہے اور اس مقصد کے لئے ایک آزاد حکومت ہندوستان یا کئی حکومتوں کو اختیار منتقل کرنے کی زیادہ سے زیادہ مدت جون ۱۹۴۸ء مقرر کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے حکومتِ برطانیہ ایک یا دو مختار مجاز وارثان کو نوآبادی کے درجہ کی بنیاد پر اختیار منتقل کرنے کے لئے قانون وضع کرے گی۔ اس قانون کے تحت ہندوستان کی آئین ساز

اسمبلی کے اس فیصلہ پر کوئی اثر نہ پڑے گا کہ ہندوستان کے وہ حصے جن کی وہ نمائندہ ہے، برطانیہ کی دولت مشترکہ میں بدستور شریک رہیں یا نہ رہیں۔

مزید اعلانات

۲۱۔ گورنر جنرل وقتاً فوقتاً نئے انتظامات کے سلسلہ میں ضروری اعلانات کرتے رہیں گے۔

ضمیمہ

۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق بنگال اور پنجاب کے مسلم اکثریتی اضلاع یہ ہیں:

۱۔ **بنگال:**

چٹاگانگ ڈویژن: چٹاگانگ، نواکھالی، تپرہ۔

ڈھاکہ ڈویژن: باقرگنج، ڈھاکہ، فرید پور، میمن سنگھ۔

پریذیڈنسی ڈویژن: جیسور، مرشد آباد، نادیا۔

راجشاہی ڈویژن: بوگرہ، دیناج پور، مالدہ، پبنہ، راجشاہی، رنگ پور۔

۲۔ **پنجاب:**

لاہور ڈویژن: گوجرانوالہ، گورداسپور، لاہور، شیخوپورہ، سیالکوٹ۔

راولپنڈی ڈویژن: اٹک، گجرات، جہلم، میانوالی، راولپنڈی، شاہ پور۔

ملتان ڈویژن: ڈیرہ غازی خاں، جھنگ، لائل پور، منٹگمری، ملتان، مظفر گڑھ۔

رہنماؤں کی کانفرنس

۲۔جون کو وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سات سیاسی رہنماؤں پر مشتمل ایک کانفرنس طلب کی۔ اس میں قائداعظم محمد علی جناح، نوابزادہ لیاقت علی خاں، سردار عبدالرب نشتر، پنڈت جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل، اچاریہ کرپلانی اور سردار بلدیو سنگھ

شامل تھے۔ ۲ جون کا منصوبہ ان رہنماؤں کے سامنے رکھا گیا۔ گاندھی اس کانفرنس میں وقت کے باوجود شریک نہیں ہوئے کیونکہ وہ ہندوستان کی تقسیم کے مخالف تھے۔ اسی سلسلہ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن ناز برداری کے لئے ان کے پاس خود بھی گئے تاکہ انہیں کانگرس کے حق میں منصوبہ کی افادیت واضح کر سکیں۔

پنڈت جواہر لعل نہرو نے کانفرنس میں یہ الفاظ کہے کہ گو کانگرس کے لئے پورا منصوبہ ناقابل قبول نہیں، تاہم کانگرس اسے قبول کرنے گی، حالانکہ اس منصوبہ کا انکشاف پنڈت نہرو پر تیاری کے وقت میں ہو چکا تھا اور ان کی پیشگی منظوری کے بعد ہی یہ منصوبہ لندن گیا تھا، تاہم انہوں نے یہ ظاہر کیا گویا منصوبہ منظور کرتے وقت وہ حکومت برطانیہ اور مسلم لیگ پر احسانِ عظیم کر رہے تھے۔

قائد اعظم نے صاف کہہ دیا کہ جب تک وہ مسلم لیگ کونسل سے منظوری حاصل نہ کر لیں، منصوبہ کے بارے میں کوئی یک طرفہ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ وائسرائے نے قائد اعظم کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تصدیق کر دیں اور بعد ازاں کونسل سے توثیق کرا لیں۔ لیکن قائد اعظم نے انہیں دو ٹوک بتایا کہ وہ مسلم لیگ کونسل اور مسلمان قوم کو اس منصوبہ کی منظوری پر آمادہ کرنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں لیکن تنہا کوئی وعدہ نہیں کر سکتے۔

۴۔ جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ کہا کہ منصوبہ کے بارے میں ہر قدم پر تمام سیاسی رہنماؤں کو باخبر رکھا گیا تھا، لہذا کسی رہنما کو اس منصوبہ پر تعجب یا صدمہ نہیں ہوا۔ وائسرائے نے اسی پریس کانفرنس میں انتقال اختیارات کے لئے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء مقرر کی۔

قائد اعظم نے رہنماؤں کی کانفرنس ہی میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کو ایک دوسرے سے ملانے کے لئے ساڑھے سات سو میل لمبی راہداری کا مطالبہ کیا تھا۔ لیکن ہندوؤں کی مخالفت کے باعث یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا۔

کانگرس اور سکھ منصوبہ کی منظوری دے چکے تھے۔ کچھ اعتراضات بھی کئے گئے۔

۱۰ جون کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں قائد اعظم کو منصوبہ کے بنیادی اصولوں کو قبول کرنے یا نہ کرنے کا مکمل اختیار دیا گیا۔ کانگرس کمیٹی نے اپنے اجلاس میں منصوبہ کی منظوری دی تو تقاریر کے دوران نئی مملکت پاکستان کے بارے میں ان خیالات کا

اظہار کیا۔

نہرو : ہمالہ کی چوٹیاں، سمندر، دریا — یہ سب جغرافیائی سرزمین ہیں — کوئی انسان انہیں تبدیل نہیں کر سکتا، نہ ہی ان کی نشوونما میں حائل ہو سکتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ جب موجودہ معاندانہ جذبات سرد پڑ جائیں گے تو دو قومی نظریہ کا جھوٹا عقیدہ مکمل طور پر ترک کر دیا جائے گا۔

ابوالکلام آزاد : میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تقسیم صرف اور صرف چند دن زندہ رہے گی۔

ہندو مہا سبھا : بھارت ایک ہے اور ناقابلِ تقسیم رہے گا۔ اس وقت تک چین سے بیٹھنا مشکل ہوگا، جب تک تقسیم شدہ علاقے دوبارہ ہندوستان میں شامل کر کے ہندوستان کا اٹوٹ انگ نہ بنا دیئے جائیں اور بھارت اکھنڈ نہ ہو جائے۔

گاندھی : (۱۵ اگست کو) وہ دن دُور نہیں جب یہ تقسیم ختم ہو کر رہے گی۔

کرشنا مینن نے : ملک کی تقسیم سے ڈیڑھ سو سال پرانے وہ بندھن نہیں ٹوٹ سکتے جنہوں نے ہندوستان کو یکجا رکھا۔

عبدالغفار خان (سرحدی گاندھی) : اگر ملک کی تقسیم کے موقعہ پر کانگرس نے خدائی خدمت گاروں کو "مسلم لیگی بھیڑیوں" کے سامنے ڈال دیا تو وہ اسے کانگرس کی غداری سمجھیں گے۔

۳۔ جون کی شام کو وائسرائے، قائداعظم، پنڈت نہرو اور بلدیو سنگھ نے منصوبہ سے متعلق آل انڈیا ریڈیو سے تقاریر نشر کیں۔ قائداعظم نے اس موقع پر اپنی نشری تقریر میں کہا:

"ہم پر انتہائی مشکل کام سرانجام دینے کا وقت ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہئے کہ پُرامن انتقالِ اختیارات کے لئے اپنی تمام تر مساعی وقف کر دیں۔ میں خلوص کے ساتھ ہر فرقہ کے لوگوں اور خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ امن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ یہ بات واضح ہے کہ بعض پہلوؤں سے یہ منصوبہ ہمارے نقطۂ نظر کی مطابقت میں نہیں۔ ہم یہ بھی نہیں

[illegible] ہم اس منصوبہ سے مطمئن اور متفق ہیں۔ فیصلہ یہ کرنا ہے کہ منصوبہ کو
[illegible] طرف سے ایک سمجھوتے یا فیصلہ کے طور پر قبول کیا جائے۔ مسلم لیگ
[illegible] کا اجلاس ۹ جون کو طلب کیا گیا ہے۔ اجلاس کے انعقاد سے پہلے
[illegible] اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ آخری فیصلہ کونسل کے ہاتھ میں ہے
— اور عام تاثر حوصلہ افزا ہے۔

—— میں صوبہ سرحد کی مسلم لیگ سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ پر امن سول
نافرمانی ختم کر کے صوبہ سرحد کے استصواب رائے عامہ میں مسلم لیگ کی کامیابی
کے لئے منظم ہو جائے تاکہ صوبہ سرحد کے عوام سے پاکستان کی آئین ساز
اسمبلی کے حق میں فیصلہ لیا جا سکے"۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلم لیگ، پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے منصوبہ کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئی تھی کیونکہ ہندو نواز وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اگر مسلم لیگ نے ان کا منصوبہ قبول نہ کیا تو ہندوستان کا اقتدار آئین ساز اسمبلی کے سپرد کر دیا جائے۔ اس صورت میں یا تو ہنگامہ آرائی ہوتی اور وہ بھی بے نتیجہ —— یا ملک ہندو راج میں چلا جاتا اور مسلمان ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو کر رہ جاتے۔

باب ۱۴

پاکستان کا قیام

آزادی کے آخری مرحلہ پر دشواریاں

پست ذہنیت کا مظاہرہ

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی ہندو نواز پالیسی، ہندوؤں سے گہرے تعلقات اور اندرا گاندھی کے ساتھ دوستی کا پورا پورا نباہ کرتے ہوئے تقسیم کے منصوبہ کے ذریعہ مسلمانوں کی خواہشات کو دل بھر کر پامال کیا تھا لیکن اس کے باوجود ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اُس نے مشترکہ دفاع کونسل کو توڑ کر فیلڈ مارشل آکنلک کو اس لئے الگ کر دیا کہ وہ اپنے فرائض دیانتداری کے ساتھ سرانجام دینا چاہتے تھے۔ اُس نے تقسیم کمیٹی کو بھی توڑا حالانکہ اس وقت تک پاکستان کو اپنی چیزوں کا حصّہ بھی نہ ملا تھا۔ بعدازاں اُس نے مہاراجہ کشمیر کی درخواست قبول کرتے ہوئے ہندوستان کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ اپنے فوجی دستے ریاست میں داخل کر دے۔ سردار پٹیل کے کہنے پر حیدرآباد دکن کے ساتھ معاہدہ کے مسودے کو بھی تبدیل کیا گیا۔ حتیٰ کہ حد بندی کمیشن کی تمام کارروائی بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی خواہشات کے مطابق ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ جب تقسیم سے پہلے ماؤنٹ بیٹن مسلمانوں کو ہر قسم کا نقصان پہنچا ہی چکا تھا تو تقسیم کے بعد اس کی یہ معاندانہ حرکات کس بنا پر تھیں — کہ وہ مسلسل پست ذہنیت کا مظاہرہ

کرتا رہا ؟

حقیقت یہ تھی کہ ماؤنٹ بیٹن بیک وقت ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ کانگرس نے اُسے خود ہی یہ پیش کش کی تھی لیکن اس کی ذاتی خواہش یہ تھی کہ دونوں ممالک کے مشترکہ سربراہ کی حیثیت سے پاکستان کی ترقی کے راستے میں ایسے کانٹے بچھائے جو اس کی ترقی و خوشحالی کی جدوجہد میں قدم قدم پر مشکلات پیدا کرکے حوصلہ شکنی کا باعث ہوں اور ایک دن یہ مملکت ختم ہو کر رہ جائے۔

ماؤنٹ بیٹن، دونوں ممالک کا سربراہ بننے کے لئے اپنے وقار اور خودداری کو بھی داؤ پر لگانے سے باز نہ رہا۔ قائداعظم کو ماؤنٹ بیٹن کے اس مطالبہ سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا۔ قائداعظم یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان اور پاکستان کے گورنر جنرل الگ الگ ہوں اور اُن دونوں سے اعلیٰ حیثیت کا ایک اور عہدے دار تاج برطانیہ کی نمائندگی کرے اور اس حیثیت میں تقسیم کی باریکیوں اور پیچیدگیوں کے بارے میں دونوں حکومتوں کو مخلصانہ مشورے دے سکے۔ قائداعظم نے ماؤنٹ بیٹن کو اسی اعلیٰ منصب کے لئے حکومت برطانیہ کو رضامند کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم سے یہ وعدہ لینا چاہا کہ اگر حکومت برطانیہ نے یہ تجویز قبول نہ کی تو کیا اُس صورت میں اسے پاکستان کا گورنر جنرل بنا دیا جائے گا؟ قائداعظم نے ماؤنٹ بیٹن کو ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ یہ کہہ کر لندن چلا گیا کہ اس کے سیکرٹری سر ایرک میول دلی میں رہیں گے لہٰذا انہیں فیصلے سے مطلع کر دیا جائے۔ ماؤنٹ بیٹن لندن پہنچنے کے بعد بھی مسلسل بے قرار رہا، اِدھر سر ایرک کو یہ کہہ کر ٹالتے رہے کہ فی الحال کوئی قائداعظم نہیں کیا جا سکا۔ ماؤنٹ بیٹن نے حکومتِ برطانیہ کو اپنے طور پر یہ تاثر دیا کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں اُسے مشترکہ گورنر جنرل بنانے پر رضامند ہو جائیں گے۔ ماؤنٹ بیٹن کی اسی توقع پر برطانوی پارلیمان کی طرف سے انتقالِ اقتدار کا وہ بل عمل میں تاخیر پر منتج ہوا۔ جو بل کی منظوری کی صورت میں ہونا تھا اور جس میں ہندوستان اور پاکستان کی رسمی منظوری کے بعد گورنر جنرلوں کے ناموں کا اندراج ہونا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کے کہنے پر ناموں کی جگہ خالی رکھی گئی۔ وہ لندن سے واپس آیا اور ایک بار پھر اس مقصد کے لئے کوشش شروع کر دی۔ اس نے حیدر آباد دکن کے آئینی مشیر سر والٹر، لارڈ ازمے، سر ایرک میول اور نواب بھوپال کو درمیان میں ڈالا تا کہ وہ قائداعظم کو اس بات پر رضامند کر سکیں لارڈ ازمے اور سر ایرک نے قائداعظم سے ملاقات کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

البتہ لیاقت علی خاں نے ان دونوں سے یہ وعدہ کیا کہ چند دن کے اندر وہ قائدِ اعظم سے جواب لے کر روانہ کر دیں گے۔ ماؤنٹ بیٹن کے اضطراب کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۳ رجون کو اس نے اپنی طرف سے قائدِ اعظم کو ملاقات کی دعوت دی اور اشارۃً بتایا کہ اگر دونوں مملکتوں کا مشترکہ گورنر جنرل ہوا تو تقسیم سے پیدا شدہ مشکلات میں کافی حد تک کمی کی جا سکے گی۔ قائدِ اعظم نے اس ملاقات کے نو دن بعد ۲ جولائی کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام یہ پیغام بھیجا کہ انہوں نے بوجوہ یہ عہدہ خود سنبھالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کو شدید مایوسی ہوئی۔ اس کے باوجود اس نے نواب بھوپال سے سفارش کے لئے کہا لیکن قائدِ اعظم نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر ۵ رجولائی کو لیاقت علی خاں کی طرف سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام ایک خط پہنچا جس میں تاجِ برطانیہ سے درخواست کی گئی تھی کہ محمد علی جناح کو پاکستان کا گورنر جنرل نامزد کیا جائے۔ اس طرح لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو نہ صرف شدید مایوسی ہوئی بلکہ اس کی یہ حسرت بھی پوری نہ ہو سکی کہ ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ سربراہ بن کر اپنی ہندو نواز پالیسی کے تحت پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کر سکے۔

صوبوں کی تقسیم

۲۰ رجون کو بنگال کی مجلسِ قانون ساز کا اجلاس ہوا۔ ۱۲۶ کے مقابلے میں ۹۰ ووٹوں سے فیصلہ کیا گیا کہ بنگال کو نئی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہونا چاہئے۔ بعد ازاں غیر مسلم گروپ کا اجلاس ہوا جس نے ۲۱ کے مقابلہ میں ۵۸ ووٹوں سے بنگال کی تقسیم اور مغربی بنگال کو ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ تیسرا اجلاس مسلمان اکثریت کے علاقوں کے نمائندوں کا ہوا جس میں ۳۵ کے مقابلہ میں ۱۰۶ ووٹوں سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ صوبہ تقسیم نہ کیا جائے اور مشرقی بنگال اور سلہٹ کو ایک کر کے انہیں نئی آئین ساز اسمبلی میں شامل کر دیا جائے۔

پنجاب کی مجلسِ قانون ساز نے ۷۷ کے مقابلہ میں ۹۱ ووٹوں سے پنجاب کو نئی آئین ساز اسمبلی میں شریک کئے جانے کا فیصلہ کیا۔ بعد ازاں مسلم اکثریت کے علاقوں کے نمائندوں کے اجلاس میں ۲۷ کے مقابلہ میں ۶۹ ووٹوں سے صوبہ کی تقسیم کے خلاف فیصلہ دیا گیا۔ غیر مسلم اکثریتی علاقوں کے نمائندوں نے ۲۲ کے مقابلہ میں ۵۰ ووٹوں سے صوبہ کی تقسیم کے حق میں اور موجود آئین ساز اسمبلی میں شامل کرنے کا فیصلہ دیا۔

سندھ کی مجلس قانون ساز نے ۲۶ جون کو ۲۰ کے مقابلے میں ۳۰ ووٹوں سے نئی آئین ساز اسمبلی میں شرکت کا فیصلہ کیا۔

بلوچستان میں شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر سرکاری اراکین نے متفقہ فیصلہ دیا کہ بلوچستان نئی آئین ساز اسمبلی میں شامل ہو۔

جولائی میں سلہٹ کے معاملہ پر استصواب رائے عامہ ہوا اور اکثریت نے سلہٹ کو آسام سے الگ کر کے مشرقی بنگال میں شامل کرنے کے حق میں ووٹ دیا۔

صوبہ سرحد میں استصواب رائے عامہ ۶ جولائی سے ۱۷ جولائی تک جاری رہا اس موقع پر سرحدی گاندھی خان عبد الغفار خان نے یہ مطالبہ کیا کہ سرحد کے عوام کو نہ صرف یہ فیصلہ کرنے کا، کہ صوبہ سرحد موجودہ آئین ساز اسمبلی میں شامل ہو یا نئی آئین ساز اسمبلی میں، بلکہ اس فیصلے کا حق بھی دیا جائے کہ وہ آزاد پختونستان قائم کرنا چاہتے ہیں یا نہیں؟ گاندھی اور نہرو نے غفار خان کی بھرپور حمایت کی لیکن یہ مطالبہ اس لئے تسلیم نہ کیا جا سکا کہ ۳ جون کا منصوبہ دونوں پارٹیوں کی رضامندی کے بغیر تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا اور قائد اعظم بھی اس قسم کی کسی تبدیلی کے حق میں نہ تھے۔ چنانچہ سرحدی گاندھی نے اپنے کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ استصواب رائے میں حصہ نہ لیں اس کے باوجود استصواب رائے عامہ ہوا اور ۲۸۷۴ کے مقابلے میں ۲۸۹۲۴۴ ووٹوں کی اکثریت سے صوبہ سرحد کو نئی آئین ساز اسمبلی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے افغانستان نے یہ نعرہ لگا دیا کہ دریائے سندھ کے مغرب میں افغان آباد ہیں لہذا انہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن برطانوی وزیر امور ہند لارڈ لسٹاول نے واضح الفاظ میں کہا کہ افغانستان کو صوبہ سرحد کے معاملات کا کوئی حق حاصل نہیں افغان ایک عرصے سے صوبۂ سرحد کے اندر رہے تھے لہذا اس صوبہ کو توڑنے کا کوئی نعرہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

بل کی منظوری

دریں اثنا ہندوستان کی آزادی کا بل تیار ہوا اور سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو دکھانے کے بعد وزیر اعظم ایٹلی نے اسے ۴ جولائی کو برطانوی دارالعوام میں پیش کر دیا۔ ۱۵ جولائی کو برطانوی دارالعوام نے اور ۱۶ جولائی کو دارالامراء نے اس کی منظوری دے دی۔ بل میں کوئی

ترمیم نہیں کی گئی۔ ۱۸ جولائی کو بل کی شاہی توثیق ہو گئی۔ ۲۰ جولائی کو ہندوستان اور پاکستان کی دو الگ الگ مملکتوں کا قیام عمل میں آ گیا۔ قائداعظم نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت میں اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کے گورنر جنرل کے طور پر اپنے عہدے سنبھال لئے۔

تقسیم کے مسائل

۳ جون کے منصوبہ کے تحت جب مختلف صوبوں اور علاقوں نے اپنی اپنی قسمت کا فیصلہ کر لیا تو دیگر تفصیلات طے کرنا شروع کی گئیں۔ دو الگ الگ ریاستوں کے مفروضہ پر دونوں حکومتوں نے مختلف کمیٹیاں قائم کیں اور دونوں حکومتوں نے اپنے اپنے نمائندے مساوی تعداد میں ان کمیٹیوں کے لئے نامزد کر دیئے۔ کمیٹیوں کے باہم متنازعہ امور کے فیصلے کے لئے ایک ٹریبونل مقرر کر دیا گیا۔ اس ٹریبونل کے اوپر ایک تقسیم کونسل PARTITION COUNCIL تھی جس کا کام پالیسیوں کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا۔ کونسل میں دونوں حکومتوں کے دو دو وزراء شامل تھے۔

فوج اور فوجی سازوسامان کی تقسیم کی ذمہ داری ہندوستان کے کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل سر آکنلک کے سپرد تھی۔ ۱۵ اگست کے بعد دونوں حکومتوں کے الگ الگ فوجی سربراہوں کی تقرریوں لیکن تقسیم کی تکمیل تک آکنلک کو سپریم کمانڈر مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ انہیں ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ دفاع کونسل کے مشورے سے تقسیم کا باقی کام مکمل کرنا تھا۔ آکنلک نے ۱۵ اگست تک فوج کی نفری تقسیم کر دی۔ اس کے بعد سوال اس فوجی سازوسامان کی تقسیم کا تھا جو ذخیروں میں موجود تھا۔ دراصل ہندو رہنما اور لارڈ بیٹن چاہتے یہ تھے اس کام میں جتنی تاخیر ہو، بہتر ہے۔ سردار پٹیل نے دلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اس کام کے لئے دو سال درکار ہوں گے لہذا دو سال تک پاکستان کے پاس کوئی فوج نہ ہوگی۔ لیکن جب آکنلک نے نہایت غیر جانبداری اور دیانتداری کے ساتھ تیز رفتاری سے یہ کام مکمل کر لیا تو کانگرسی راہنماؤں اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے خواب بکھر کر رہ گئے۔ انہوں نے آکنلک پہ بددیانتی کا گھناؤنا الزام عائد کرتے ہوئے کہا کہ وہ بھارت کے ساتھ عداوت کر رہے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوؤں کی وفاداری میں آکنلک کے علم میں لائے بغیر برطانوی حکومت کی طرف سے ان

و ہندوستان سے پالیسی کے احکامات جاری کرا دیئے۔ لومڑی کی طرح مکار ماؤنٹ بیٹن نے آکنلک کو ایک خط کے ذریعے یہ تاثر دیا کہ دراصل اس نے آکنلک کو ایسے الزامات سے بچانے کے لئے یہ عہدہ ختم کیا تھا۔ آکنلک خوددار اور دیانتدار شخص تھے، انہوں نے احتجاج کے طور پر اپنے عہدے سے استعفاء دے دیا اس طرح فوجی سامان کی تقسیم التواء میں پڑ گئی۔

حد بندی کمیشن

جن صوبوں کو تقسیم کیا گیا تھا ان کی نئی سرحدوں کے تعین کے لئے دو حد بندی کمیشن قائم کئے گئے۔ پنجاب کمیشن کے لئے جسٹس دین محمد اور جسٹس محمد منیر پاکستان کی طرف سے اور جسٹس مہر چند مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ بھارت کی طرف سے اس کمیشن کے رکن تھے۔ بنگال حد بندی کمیشن جسٹس ابو صالح محمد اکرم اور جسٹس ایس۔ اے رحمان (پاکستان) جسٹس سی سی بسواس اور جسٹس بی کے مکرجی (بھارت) پر مشتمل تھا۔ ہندوستان اور پاکستان نے ریڈ کلف کو ان دونوں کمیشنوں کا چیئرمین بنانے پر اتفاق کیا۔

ریڈ کلف ۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو دلی پہنچے اور پھر کلکتہ جانے کے بعد ۱۸ جولائی کو لاہور آئے۔ ریڈ کلف نے لاہور پہنچتے ہی کمیشن کے پاکستانی رکن جسٹس دین محمد سے کہا کہ وہ ایک خاص علاقے پر (مادھو پور اور تحصیل گورداسپور) پرواز کرنا چاہتے ہیں۔ دین محمد نے دل کے عارضہ کی بنا پر اظہار معذوری کیا۔ ان کی جگہ جسٹس منیر احمد تیار ہو گئے لیکن بعد ازاں ریڈ کلف نے اچانک یہ پروگرام ملتوی کر دیا۔ حد بندی کمیشن کے پاکستانی اراکین کو ریڈ کلف کی یہ بات بری طرح کھٹکی کہ فریقین کے دعاوی کی وصولی کے بغیر وہ کس بنا پر خاص علاقوں کا دورہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ شبہ درست تھا کہ ریڈ کلف کسی سے متاثر ہوئے تھے اور جانبداری کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ جسٹس دین محمد نے فوری طور پر قائد اعظم سے ملاقات کی اور انہیں حالات سے آگاہ کر دیا۔ انہوں نے اپنی اور جسٹس منیر کی طرف سے کمیشن سے الگ ہونے کی پیشکش بھی کی مگر قائد اعظمؒ نے کسی واضح ثبوت کے بغیر ریڈ کلف پر جانبداری کا الزام عائد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ چنانچہ پاکستانی ارکان اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ حقیقت یہ تھی کہ ریڈ کلف، ماؤنٹ بیٹن کی وساطت سے پنڈت نہرو کے ساتھ یہ وعدہ کر چکے تھے کہ گورداسپور کے مسلم اکثریتی ضلع کو یا کم از کم اس کی تحصیل پٹھانکوٹ کو ہندوستان میں شامل کر دیا جائے گا کیونکہ پٹھانکوٹ ہی امرتسر اور ریاست جموں کشمیر کو ملاتا تھا۔

علاوہ ازیں دریائے راوی سے نکلنے والی نہریں بھی اس علاقے کے مادھوپور ہیڈ ورکس کی محتاج تھیں

۳ جون کے منصوبہ میں پنجاب کی عارضی تقسیم کے خاکہ کے مطابق گورداسپور کا ضلع پاکستانی پنجاب میں شامل تھا لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ایسے اشارے کئے۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ گورداسپور کو ہندوستان میں شامل کرانے پر تلے ہوئے تھے۔ آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا۔ تحصیل پٹھانکوٹ، تحصیل گورداسپور، امرتسر تحصیل اجنالہ، زیرہ اور فیروزپور کی تحصیلیں ہندوستان کی جھولی میں ڈال دی گئیں۔

قائداعظم نے اس فیصلہ کو ناقابل فہم، غیر منصفانہ اور مکروہ قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ مسلمانوں نے بہت صدمے برداشت کئے اور بہت سے مکروہ فیصلوں کو تسلیم کیا اب ایک اور گھناؤنا فیصلہ بھی تسلیم کیا جا رہا ہے۔ خدا مسلمانوں کو یہ نیا صدمہ ہمت اور حوصلہ کے ساتھ برداشت کرنے کی توفیق دے۔

ماؤنٹ بیٹن کے پبلسٹی سیکریٹری جانسن نے اپنی کتاب میں ریڈکلف ایوارڈ کے بارے میں لکھا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کو ریڈکلف کا ایوارڈ ۹ اگست ۱۹۴۷ء کو مل گیا تھا لیکن انہوں نے اسے ۸ دن تک دبائے رکھا اور ۱۷ اگست کو شائع کیا۔ یہ بات اس وقت کھلی جب ایک فائل لاہور کے گورنمنٹ ہاؤس میں خفیہ فائلوں کی الماری میں سے ملی۔ اس فائل سے پتہ چلا کہ ریڈکلف نے پہلے ایوارڈ میں فیروزپور اور زیرہ کی تحصیلیں مغربی پاکستان میں شامل کی تھیں لیکن ۷ اگست سے پہلے اس ایوارڈ کو بدل دیا گیا اور مذکورہ تحصیلوں کو بھی ہندوستان میں شامل کر دیا گیا۔ یہ خفیہ فائل مغربی پنجاب کے گورنر سر فرانسس موڈی کے ہاتھ لگی، انہوں نے اسے قائداعظم کے پاس بھیجدیا۔ فائل سے یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ ۸ اگست ۱۹۴۷ء کو مشترکہ پنجاب کے گورنر جینکنز کی بات چیت ماؤنٹ بیٹن کے سیکریٹری سر جارج ایبل کے ساتھ فون پر ہوئی۔ جینکنز یہ معلوم کرنے کے لئے بیقرار تھا کہ ریڈکلف ایوارڈ کو آخری صورت کیا دی ہے۔ ۸ اگست ہی کو سر ایبل نے گورنر جینکنز کو فون پر بتایا کہ ایوارڈ میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ گورنر فون پر گفتگو کے دوران کاغذ پر ایک خاکہ بھی بناتا رہا جو اس فائل میں موجود تھا جو سر فرانسس موڈی کے ہاتھ لگی تھی۔ اس طرح ماؤنٹ بیٹن اور ریڈکلف کی بددیانتی اور ہندو نوازی نے پاکستان کو جغرافیائی اہمیت کے کچھ علاقوں سے محروم کر دیا۔

سکھ اور قتل و غارت

آزادی کی جدوجہد کے دوران ہی ہندوؤں نے سکھوں کو سبز باغ دکھا کر مسلم لیگ کے خلاف کر دیا تھا۔ سکھوں نے قائداعظم کی اس پیشکش کو بار بار ٹھکرایا کہ اگر سکھ مسلم لیگ کا ساتھ دیں تو اُن کے حقوق و مفادات کی مکمل حفاظت کی جائے گی۔ سکھوں کا مطالبہ یہ تھا کہ جمنا سے چناب تک سکھ ریاست قائم ہونا چاہیئے۔ جب ان کا یہ خواب پورا نہ ہوا اور ہندوستان کی آزادی قریب ہو گئی تو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف متعدد جماعتوں کی تنظیم شروع کر دی۔ ان تنظیموں کو اسلحہ سپلائی کیا گیا۔ سکھ ریاستوں نے ان جماعتوں سے مکمل تعاون کیا۔ اِدھر ہندو متعصب جماعتوں نے بھی خود کو مسلح کیا ہوا تھا۔ ۲ مارچ کو جب پنجاب کی مخلوط وزارت مستعفی ہو گئی تو سکھوں نے ہنگامہ شروع کر دیا۔ گو پنجاب میں گورنر راج قائم تھا لیکن پنجاب کے متعصب انگریز گورنر جینکنز نے کسی ہندو یا سکھ کو قتل و غارت کے الزام میں اس لئے گرفتار نہ کیا کہ چند ماہ بعد جب ہندوستان آزاد ہو جائے گا تو نئی حکومت لازماً انہیں رہا کر دے گی۔ لہذا گرفتاریوں کا فائدہ ہی کیا ؟ دوسرے الفاظ میں انگریز گورنر خود چاہتا تھا کہ ہندو اور سکھ دل بھر کر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلیں۔ اسی لیئے یہ لوگ بے خوف ہو کر مسلمانوں کو قتل کرتے رہے۔ جولائی تک سکھوں کی یہ ہنگامہ آرائی اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے ۲۲ جولائی کو تقسیم کونسل کا اجلاس طلب کیا جس میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن، سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرشاد، قائداعظم محمد علی جناح، لیاقت علی خاں اور سردار بلدیو سنگھ شامل تھے۔ اجلاس کے اختتام پر یہ سرکاری بیان شائع کیا گیا۔

"خود مختار ریاستوں کے قیام کے حتمی فیصلے کے بعد تقسیم کونسل کے اراکین یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ پُرامن حالات پیدا کریں گے تاکہ تقسیم کا کام بطریقِ احسن مکمل ہو سکے کانگریس اور مسلم لیگ نے یقین دلایا ہے کہ اختیارات حاصل کرنے کے بعد وہ اقلیتوں کے ساتھ مکمل انصاف کریں گی۔ وہ کسی امتیاز کے بغیر ہر شہری کے مفادات کا تحفظ کریں گی اور اُن کی طرف سے تمام شہریوں کو آزادیٔ تقریر، آزادیٔ اجتماع، آزادیٔ عبادات اور آزادیٔ ثقافت حاصل ہو گی۔ دونوں حکومتیں یہ ذمہ داری قبول کرتی ہیں کہ گذشتہ سیاسی عداوت کی بنا پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے گی اور تشدد برداشت نہیں کریں گی۔ وہ یکم اگست سے ایک خاص فوجی کمان کے قیام پر بھی متفق ہو گئی ہیں۔ یہ کمان سیالکوٹ، گوجرانوالہ، شیخوپورہ

لائل پور، فیروز پور، منٹگمری، لاہور، امرتسر، گرداس پور، ہوشیار پور، جالندھر اور لدھیانہ میں قائم ہو گی۔ دونوں حکومتوں کی منظوری سے میجر جنرل ریس کو فوجی کمانڈر مقرر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی طرف سے بریگیڈیر ڈگمبر سنگھ اور پاکستان کی طرف سے کرنل ایوب خاں کو اُن کے مشیروں کی حیثیت سے مقرر کیا گیا ہے۔ ۱۵ اگست کے بعد جنرل ریس دونوں حکومتوں کی فوجوں پر عملی معاملات میں بااختیار ہوں گے۔ اگر حکومتوں نے مناسب سمجھا تو بنگال میں بھی اسی قسم کا انتظام کیا جائے گا۔ ان حکومتوں نے حد بندی کمیشن کے فیصلوں کو ہر حالت میں قبول کرنے کا فیصلہ کیا ہے حد بندی کمیشنوں کے اجلاس ہو رہے ہیں اور یہ ضروری ہے کہ تقریروں یا تحریروں یا دھمکیوں کی بنا پر کمیشن کے کام میں رکاوٹیں پیدا نہ ہوں، لہٰذا دونوں حکومتیں اس مقصد کے لئے ضروری اقدامات کریں گی اور فیصلوں کا اعلان ہونے ہی غیر جانبداری کے ساتھ اُن کا نفاذ کر دیں گی "۔

رسم انتقال اقتدار

۷ اگست ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم کراچی پہنچ گئے۔ یہاں لاکھوں افراد نے اُن کا خیر مقدم نہایت گرمجوشی کے ساتھ کیا۔ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ قائد اعظم نے خطاب کرتے ہوئے کہا :

" آپ مجھ سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ حکومت پر امن و انتظام قائم رکھنے کا فرض پہلے عائد ہوتا ہے تاکہ مملکت کے باشندوں کے جان و مال اور مذہبی عقائد کو مکمل تحفظ دیا جا سکے۔ آپ آزاد ہیں اس لئے اپنے مندروں میں جائیں، اپنی مسجدوں میں جائیں یا اس پاکستان میں کسی دوسری عبادت گاہ میں جائیں۔ آپکا تعلق کسی ذات، کسی مذہب یا کسی عقیدے سے ہو، اس کا تعلق حکومت کے کام سے نہیں۔

اگر آپ ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر باہمی تعاون سے کام کریں گے تو کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔ کسی کا کسی فرقے یا مذہب سے تعلق کیوں نہ ہو وہ بہر حال اسی مملکت کا شہری ہے اور رہے گا اگر سب کے لئے مساوی حقوق، مساوی آزادیاں، مساوی سہولتیں اور مساوی پابندیاں ہوں تو آپکی ترقی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو سکے گی "

۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن متحدہ ہندوستان کے گورنر جنرل اور وائسرائے کی حیثیت میں کراچی پہنچا۔ ۱۴ اگست کو جلوس کا پروگرام تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو یہ اطلاع مل چکی تھی

کہ سکھوں نے قائدِ اعظم کے جلوس پر بم پھینکنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ چنانچہ اس نے قائدِ اعظم کے ساتھ بیٹھنے پر اصرار کیا۔ زندگی بھر مسلمانوں کی مخالفت کرنے، مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ صدمہ پہنچانے اور پاکستان کے مقاصد پر کاری ضربیں لگانے کے بعد غالباً وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ بہت صاف دل اور دیانت دار شخص ہے اور اس نے قائدِ اعظم کی زندگی کی خاطر اپنی زندگی کو بھی خطرے میں ڈالنے سے گریز نہ کیا۔ جلوس بخیر و عافیت اپنی منزل کو پہنچا۔ قائدِ اعظم نے سواری سے اُتر کر ماؤنٹ بیٹن سے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے آپ میری مملکت کے مہمان تھے اور آپ کی جان کی حفاظت میرے ذمہ تھی۔ خدا کا شکر ہے میں نے اس ذمہ داری کو پورا کر دیا" یہ کہہ کر دونوں اسمبلی میں داخل ہو گئے۔

اسمبلی میں پہنچ کر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے شاہِ انگلستان کا پیغام پڑھا۔ جو پاکستان کو سلام سے شروع ہوتا تھا۔ پیغام میں پاکستان کی خوشحالی اور ترقی کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا۔

اس کے بعد قائدِ اعظم نے تقریر کی اور انہوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر کے اس جملے

"میری دُعا ہے کہ آئندہ برسوں میں ہم اکبرِ اعظم کے سکھائے ہوئے اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہیں"

کا جواب دیتے ہوئے کہا "شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس انصاف اور رواداری کا مظاہرہ کیا، وہ کوئی نئی بات نہ تھی بلکہ ۱۳ سو سال پہلے ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے زبانی نہیں بلکہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کرنے کے باوجود اس رواداری کا مظاہرہ کیا تھا اور اُن کے مذہب اور عقیدے کا مکمل احترام کیا تھا۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اسی رواداری اور انصاف سے بھری پڑی ہے"۔

۱۴ اگست کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن دلی واپس چلا گیا۔ ۱۵ اگست کو قائدِ اعظم نے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس موقع پر ۳۱ توپوں کی سلامی دی گئی۔ پولو گراؤنڈ میں پاکستان کی بحری اور بری فوج نے قائدِ اعظم کو سلامی دی۔ اس طرح انگریز کی غلامی اور ہندو استبداد کی طویل تاریک راتوں سے گذرنے کے بعد مسلمانوں نے اپنی منزل حاصل کر لی۔

خون کی ہولی

تقسیمِ ملک کے باضابطہ اعلان کے ساتھ ہی پنجاب، یوپی، سی پی اور بہار کے بے سروسامان مسلمان قافلوں کی صورت میں پاکستان میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ یہ لوگ گاڑیوں اور ٹرکوں پر

باپیدل اپنی منزل کی طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ ہندوؤں نے پاکستان سے ہندوستان کے علاقوں میں منتقل ہونا شروع کر دیا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے اس موقع پر اپنی مسلح نیم فوجی تنظیموں کو حرکت دی اور مسلمانوں کے قافلوں پر بھرپور حملے شروع کر دیئے۔ گاڑیاں روک کر مسلمانوں کو بے دریغ قتل کر دیا جاتا۔ مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر لیا جاتا۔ اس دوران ہندوستان کے لاکھوں مسلمان گھروں کو نذرِ آتش اور مسلمان عورتوں کو بے آبرو کیا گیا۔ مسلمانوں کے خلاف اس کارروائی کے بعد مغربی پاکستان میں بھی جوابی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ ہندوستان کے مختلف شہروں سے مسلمانوں کی ہجرت کا یہ سلسلہ ۱۹۴۹ء تک جاری رہا اس دوران تقریباً سوا پانچ لاکھ مسلمانوں کو شہید کیا گیا۔ اندازاً ۶۵ لاکھ مہاجر پاکستان آئے۔ ان میں ۵۲ لاکھ مشرقی پنجاب اور اس کی ریاستوں سے، ساڑھے تین لاکھ صوبہ دلّی سے اور باقی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے۔ پاکستان سے ہندوستان جانے والے ہندوؤں اور سکھوں کی مجموعی تعداد ۴۵ لاکھ سے زائد نہ تھی۔

کشمیر کا تنازعہ

حد بندی کمیشن کے فیصلے سے پہلے ہی راجہ کشمیر اور بھارت کے رہنماؤں کے درمیان خفیہ معاہدہ طے پا چکا تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد دوسری ریاستوں کی طرح ریاست جموں کشمیر بھی آزاد ہو چکی تھی۔ اسے پاکستان یا بھارت کے ساتھ الحاق کرنے یا خود مختار رہنے کا اختیار حاصل تھا۔ اس سلسلے میں ہر ریاست کو لازمی طور پر یہ دیکھنا تھا کہ جغرافیائی اعتبار سے اس کے لئے کیا اقدام ضروری ہے۔ مثلاً کشمیر کا معاملہ ایسا تھا کہ پاکستان کے ساتھ اس کی کئی سو میل سرحد مشترک ہے۔ جموں اور کشمیر کی ۸۰ فیصد آبادی مسلمان ہے۔ اس اعتبار سے ان کے تہذیب و تمدن میں کوئی فرق نہیں۔ کشمیر کے تمام دریا پاکستان میں بہتے ہیں اور پاکستان سے گیارہ راستے کشمیر کو جاتے ہیں۔ ۱۲واں راستہ پٹھان کوٹ کا تھا جو اصولاً پاکستان کا حصہ تھا، لیکن ماؤنٹ بیٹن ریڈکلف نہرو سازش نے اس راستے کو ہندوستان کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ مہاراجہ کشمیر نے اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے ساتھ یہ مکاری کی کہ ریاست اور پاکستان کے موجودہ تعلقات کو برقرار رکھنے کا معاہدہ (STANDSTILL AGREEMENT) کر لیا۔ حالانکہ مہاراجہ کے ہندو کشمیری وزیر اعظم پنڈت کاک نے بھی مہاراجہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ہر حال میں پاکستان کے ساتھ الحاق کرے۔ اس دوران ریاست کی ڈوگرہ فوج، ہندوؤں اور سکھوں نے ریاست کے مسلمانوں

پر ظلم وستم شروع کر دیئے۔ لاکھوں کشمیری مسلمانوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا۔ ان کے گھر لوٹ لئے گئے اور [illegible] تعداد [illegible] مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا۔ مہاراجہ کشمیر کو یہ تو علم تھا کہ جب یہ مہاجر پاکستان پہنچیں گے تو ردِعمل بھی ہوگا لہذا اس نے پہلے ہی یہ الزام عائد کر دیا کہ لوگوں نے پاکستانی علاقوں سے کشمیر میں داخل ہو کر حکومت کے خلاف بغاوت کی۔ پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے مہاراجہ کشمیر کو ایک تار روانہ کیا اور ان الزامات کی تردید کی۔ یہ مطالبہ بھی کیا کہ تحقیقاتی کمیٹی کے لئے فوری طور پر کشمیری نمائندے نامزد کئے جائیں۔ ۱۲ر اکتوبر کو شیخ عبداللہ نے پونچھ کے واقعات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پونچھ کے لوگوں نے ہندو راجہ کے ظلم وستم سے نجات حاصل کرنے کے لئے تحریک شروع کی تھی۔ جسے فرقہ دارانہ رنگ دینا غلط ہوگا۔ لیکن مہاراجہ کشمیر نے وہاں فوج بھیج کر خوف وہراس پیدا کر دیا۔ کیونکہ پونچھ کے بیشتر مرد ہندوستانی فوج کے سپاہی رہ چکے ہیں اور ان کے تعلقات جہلم، راولپنڈی کے لوگوں سے بھی ہیں، لہذا انہوں نے اپنے کنبوں کو ان علاقوں میں بھیج دیا اور خود ڈوگرہ فوج کے مقابلے پر اتر آئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے پورے کشمیر میں مجاہدین آزادی نے ہندو ظلم وستم کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ یہ آزاد فوج وہی تھی جو سابق فوجیوں پر مشتمل تھی۔ مہاراجہ کشمیر اور دوسرے وزراء کشمیر سے بھاگ نکلے اور دلی پہنچ کر انہوں نے نہ صرف فوجی امداد طلب کی بلکہ ہندوستان سے الحاق کی درخواست بھی کی۔ آزاد فوج نے کشمیر کے خاصے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں آزاد حکومت قائم کر دی۔ ۲۷ر اکتوبر کو دلی سے کشمیر کا الحاق منظور کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ لیکن پاکستان نے اس الحاق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا غرضیکہ حالات بگڑتے ہی چلے گئے حتیٰ کہ پاکستان نے کشمیر کے مسلمانوں پر ظلم وستم بند کرانے کے لئے اقوام متحدہ سے اپیل کر دی۔ یہ تنازعہ بدستور موجود ہے۔ نہ صرف ہندوستانی فوجیں کشمیر میں موجود ہیں بلکہ کشمیری مسلمان بھی گذشتہ ۳۷سال سے ہندوؤں کے ظلم وستم کی چکی میں پس رہے ہیں۔

اسی دوران ہندوستان نے جوناگڑھ اور حیدرآباد کی مسلمان ریاستوں پر فوج کشی کر کے ان پر جارحانہ قبضہ کر لیا۔

باب ۳۵

آخر پاکستان ہی کیوں؟

ہندو اور انگریز کی مسلسل مخالفت کے باوجود مسلمانوں کا ایک علیحدہ وطن ۔۔۔ پاکستان ۔۔۔ قائم ہو کر رہا ۔جس منزل تک پہنچنے کے لئے مسلمانانِ ہند نے طویل سفر کا آغاز کیا تھا، آخرکار وہ سفر کوندتی بجلیوں، بڑھتے ہوئے طوفانوں اور مخالفت کی تند و تیز آندھیوں کے درمیان ختم ہوا۔ منزل نے قدم چومے اور مسلمانوں کی دیرینہ آرزوئیں بر آئیں، شہیدوں کا خون رنگ لایا اور ایک نئی اسلامی مملکت دنیا کے نقشہ پر ابھری ۔۔۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت !

سوال یہ ہے کہ آخر مسلمانوں نے اتنی طویل جد و جہد اور بے شمار قربانیاں کس مقصد کے لئے دیں؟ کیا مسلمان ہندوؤں کے ساتھ رہتے ہوئے آزادی کی دولت سے مالا مال نہ ہو سکتے تھے؟ کیا مسلمان یونین جیک کے سایہ میں پُرسکون زندگی پر قناعت نہ کر سکتے تھے؟ کیا مسلمانوں کو صرف ایسی حکومت کی ضرورت تھی جہاں اقتدار کی کرسی پر ان کا تسلط ہوتا ۔؟ کیا مسلمان ہندو اور انگریز سے اپنے مذہبی عقائد کے برعکس باوجہ مخاصمت و عداوت رکھتا تھا؟

اگر یہ سب درست ہے تو ہندوستان کے مسلمان نے علیحدہ خطۂ ارضی کے حصول کی یہ بے مقصد جد و جہد کیوں کی؟ سوال صرف اتنا ہے کہ اس جد و جہد کا مقصد کیا تھا ۔۔۔ اور وہ کیا عوامل تھے جنہوں نے مسلمانوں کو اس جد و جہد پر مجبور کیا؟ یہی وہ سوال ہے جو پاکستان کی جد و جہد کے لئے حرفِ اوّل اور حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ آئندہ سطور میں ہم انہی عوامل اور اس جد و جہد کا جائزہ لے رہے ہیں۔

اس مقصد کے لئے ہمیں اوراقِ تاریخ کی ورق گردانی کرنا ہوگی، ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ میل جول اور مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے سلوک کا جائزہ لینا ہوگا۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ دیکھنا ہوگا کہ مسلمان ہندوستان میں رہتے ہوئے کس حد تک اپنی معاشرتی، ثقافتی اور مذہبی اقدار کا تحفظ کرسکتا تھا۔

آیئے سب سے پہلے تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالیں جو ہمیں یہ بتائیں گے کہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا اور اس مقصد کے لئے اتنی طویل جد و جہد کیوں کی؟

آج کے پاکستانی علاقے میں قریباً بارہ سو سال پہلے ۷۱۲ء میں عرب مسلمانوں نے قدم رکھے۔ اس کے بعد انہی مسلمانوں نے صدیوں تک اس برِ صغیر پر حکومت کی۔ ایک طویل عرصہ کے بعد اور مسلمانوں ہی کے دورِ حکومت میں انگریزوں نے تاجروں کا چولہ پہن کر برِ صغیر کے ساحلوں پہ قدم رکھا۔ مسلمانوں نے اسے زیادہ اہمیت نہ دی کیونکہ وہ نہ صرف مقتدر تھا، بلکہ تعلیمات اسلامی کا رنگ بھی اس پر غالب تھا۔ اس کے لہو میں رواداری، دیانت، انصاف اور مہمان نوازی رچی بسی ہوئی تھی لیکن رفتہ رفتہ انگریز تاجر کا چولہ تار تار ہوگیا اور وہ غاصب اور لٹیرے کے اصل روپ میں مسلمان کے سامنے ڈٹ گیا۔ ہندو ذہن نے انگریز کی آمد کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کر لیا، اس لئے کہ وہ مقتدر تو تھا ہی نہیں۔ اس کے لئے سانولے یا سفید فام آقا دونوں برابر تھے۔ ممکن ہے ہندو نے یہ محسوس کیا ہو کہ وہ مسلمان کے مقابلہ میں انگریز سے انصاف اور رواداری کی دولت حاصل نہ کر سکے گا لیکن اس کے باوجود اس نے انگریز کی دوستی کو محض اس لئے ترجیح دی کہ وہ انگریز کا وفادار ساتھی بن کر مسلمان کا خاتمہ کر سکے اور کسی نہ کسی دور میں اپنے لئے حکومت اور اقتدار کی گنجائش پیدا کر سکے۔ علاوہ ازیں ہندو کو یہ دکھ بھی تھا کہ جس فصیلِ کوہ کے سائے پر وہ اپنی اجارہ داری سمجھتا تھا وہ مسلمان نے ختم کر دی تھی۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا جس میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والا مسلمان تھا کیونکہ ہندوستان کے حاکم مسلمان کو محکوم بنایا گیا تھا لہذا قدرتی طور پر انگریز اور مسلمان کے درمیان انگریز اور ہندو کے مقابلہ میں نفرت اور بیزاری کی زیادہ وسیع خلیج حائل تھی۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کا تھا یا پاکستان کے لئے جد و جہد کا طویل دور — مسلمان کی بنیادی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنی اسلامی اقدار کو دو بدترین دشمنوں — انگریز اور ہندو کے ہاتھوں پامال ہونے سے بچا لے۔

۱۹ویں صدی کا سورج برِ صغیر پہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی قوت کا پیغام لے کر

طلوع ہُوا اور نصف صدی گزر جانے کے باوجود سلطنتِ دلّی کو بحال رکھنے کی اُمید بھی ختم ہو گئی۔ وقت کے دھارے تیزی سے بدلے اور مسلمان حالات کی چکی میں پستا رہا۔ مسلمان تاجر تھا یا سپاہی۔ تجارت سے محروم ہوا اور اس کی تلوار ٹوٹ گئی۔ ملازمت کی طرف اس کا رجحان نہ تھا، لہٰذا اس کے مسائل اور عسرت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اور حالات کے ساتھ انگریز سے اس کی نفرت بھی ہم قدم رہی۔ وُہ تعلیم میں پیچھے رہ گیا کیونکہ مغربی تعلیم کو وہ ناپسند کرتا تھا۔ ان تمام عناصر نے مسلمان کے معاشی انحطاط میں اہم کردار ادا کیا۔ ہندو موقع شناس بھی تھا اور موقع پرست بھی۔ اس نے برصغیر میں انگریزوں کے قدم جماتے ہی مسلمان آقاؤں کے ساتھ وفاداریوں کے تمام سلسلے منقطع کر دیئے۔ محبت اور پیار کے تمام رشتے ایک ہی جھٹکے میں توڑ ڈالے اور نئے سفید فام آقاؤں کے ساتھ ذہنی وابستگی قائم کر لی۔ ہندو نے مسلمانوں سے اقتدار کو ختم کرنے میں انگریز کے ساتھ مل کر بدترین اور گھناؤنا کردار ادا کیا۔ اس دوستی اور وفاداری کی بناء پر ہندو کے لئے تجارت اور ملازمت کے لاتعداد نئے دروازے کھل گئے۔ ہندو کے لئے ایک دروازہ کھلتا اور مسلمان کے لئے ایک دروازہ بند ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ وُہ دن بھی آیا جب انگریز نے کھلے بندوں سرکاری احکامات کے ذریعہ مسلمانوں کو مناصب اور اعلیٰ سرکاری ملازمتوں سے محروم کر دیا۔ جب اس نے سرزمین ہند پر مغربی طریق زمینداری تھوپا تو ہندو نے مسلمان کی جگہ لی اور اس کے مفادات کو دل بھر کر نقصان پہنچایا۔ برصغیر کا کوئی بھی علاقہ ایسا نہ تھا جسے مسلمانوں کی خوشحالی کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا۔ لہٰذا مسلمان پہ رفتہ رفتہ تاجِ برطانیہ کی غلامی اور یونین جیک کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے اور دوسری طرف سرکاری دفاتر سے زمینداری اور تجارت تک ہندو کا تسلط قائم ہوتا چلا گیا۔

انگریز کی اشیرباد سے ہندو نے مسلمانوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کا آغاز کر دیا۔ اسے سفید فام آقاؤں کی وفاداری کا زعم تھا اور انگریز بیٹھے کی پیٹھ اس لئے ٹھونکتا رہا کہ وہ مسلمانوں کی قوت اور ان کے عقیدہ کی پختگی سے ہمیشہ خائف رہا تھا۔ انگریز نے مسلمان کے خلاف جو کچھ علی الاعلان نہ کرنا چاہا، وہ ہندو کے ذریعہ کرایا۔ اس تمام مدت میں مسلمانوں کی معاشی، مذہبی، ثقافتی اور معاشرتی حیثیت کو بُری طرح کچلنے کی کوشش کی گئی، تاہم مسلمان نے اپنے لئے ایک علیحدہ اور ایسی مملکت کا مطالبہ کر دیا جہاں اسے یہ تمام آزادیاں حاصل ہوں۔ اس اعتبار سے علیحدہ مملکت کا مطالبہ نہ تو خالص جذباتی اور نہ ہی خالص مذہبی مطالبہ تھا

بلکہ اس مطالبہ کے شانہ بشانہ ایک تاریخی اور تہذیبی منطق بھی موجود تھی۔

علیحدہ مملکت کے مطالبہ کے بارے میں بالعموم یہ کہا جاتا رہا ہے کہ یہ مطالبہ "مذہبی تعصب یا عدم برداشت" کی بنا پر کیا گیا۔ یہ اعتراض مغرب کے اس معاشرہ میں جہاں مذہب کو خاص حیثیت حاصل نہیں رہی، بلاشبہ درست ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کا تعلق تھا تو ان کی بنیاد محض مذہب پر نہ تھی بلکہ ان کا دائرہ انتہائی وسیع تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قدم قدم پر اتنا تضاد تھا اور ہے کہ دونوں میں کوئی بھی قدر مشترک نہیں۔ اسلام اور ہندوازم یا بت پرستی کی بنیادیں بالکل مختلف معاشروں پر اٹھائی گئی ہیں۔ ایک طرف عالمگیر تصور ہے اور دوسری طرف یہ تصور اپنے ہی معاشرے سے اندر متصادم ہے۔ تصورِ وحدانیت اور تصورِ اصنام پرستی دو مختلف، متضاد اور متصادم تصورات ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ایک ہزار سال تک تعداد میں کئی گنا زاید ہندوؤں کے ساتھ رہنے کے باوجود مسلمان، ہندو کا لباس تک نہ اپنا سکا۔ ایک ہزار سال کی اس تمام مدت میں کئی بار ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک معاشرتی رنگ دینے کی کوشش کی گئی لیکن کبھی کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ سولھویں صدی میں شہنشاہ اکبر نے اس مقصد کے لئے دینِ الٰہی ایجاد کیا، ہندو عورتوں سے شادیاں کیں۔ لیکن اس نے نہ صرف اس عظیم اور مضبوط بنیاد کو نظر انداز کرنا چاہا جس میں خدا کی وحدانیت، مرکزیت اور اسلام کی عالم گیریت کا سیمنٹ لگا یا گیا تھا بلکہ ہندو عورتوں کو اپنے حرم میں داخل کر کے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ ہندو کا خمیر موقع پرستی، ابن الوقتی اور صنم پرستی کے خمیر سے ہوا ہے۔ وہ مطلب براری کے لئے مسلمان بادشاہ کو اپنی بیٹی تو دے سکتا تھا مگر اس کے پھیرے ایک پتی کے ساتھ نہیں بلکہ اقتدار اور قوت کے ساتھ ہوتے تھے۔

انگریز اور ہندو کی طرف سے بچھائے جانے والے کانٹوں نے مسلمانوں کو اس حد تک آبلہ پا کر دیا کہ وہ ذہنی، جسمانی، معاشی اور روحانی اعتبار سے ٹوٹنے لگے تھے۔ سرسید احمد خاں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی اس حالتِ زار کو شدت سے محسوس کیا۔ انہیں اس بات کی نزاکت کا شدید احساس تھا کہ انگریز زبردست کے ذریعہ مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے پر تُلا ہوا ہے۔ چنانچہ وہ میدانِ عمل میں اترے تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ پھر ایک باوقار اور باعزت قوم کی طرح زندگی گزار سکیں۔ انہوں نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے اور حالات کے تیزی سے بدلتے ہوئے تقاضوں کا مقابلہ

کرنے کے لئے مسلمانوں میں تعلیم کی ترویج پر زور دیا۔ علی گڑھ تحریک اور معاشرتی تنظیم و تربیت کی عکاسی کرتی تھی۔ مولانا محمد علی میدانِ عمل میں آئے، انہوں نے مسلمانوں کو صف آرا کیا۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو ایک ہی نصیحت کی ــــ یہ کہ مسلمان کانگرس سے دور دور رہیں۔ سرسید احمد خاں نے ہندو کی ذہنیت کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور بخوبی جانتے تھے کہ ہندو آزادی کے نام کی آڑ میں پہلے تو مسلمان کو اپنی جد و جہد میں اس لئے شامل کرے گا کہ اس کی قوت میں اضافہ ہو مگر منزل پہ پہنچنے کے بعد مسلمان پر مکمل غلبہ حاصل کر کے اسے ہمیشہ کے لئے اپنی مضبوط گرفت میں لے لے گا۔ سرسید احمد خاں نے برسوں قبل جس اندیشے کو محسوس کیا تھا، وہ ایک ٹھوس حقیقت بن کر اس وقت سامنے آیا جب کانگریس نے ہندوستان کے چھ صوبوں میں اپنی وزارتیں قائم کیں اور مسلمانوں کو نشانۂ ستم بنایا حالانکہ اس حکومت کی نوعیت عارضی تھی۔ ہندو کی تنگ دلی اس کا اتنا ساتھ بھی نہ دے سکی کہ وہ مستقل حکومت کے قیام تک ہی اپنے ناپاک اور ذلیل عزائم کو اٹھائے رکھتا۔ سرسید احمد خاں بلاشبہ یہ چاہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان باہمی تعاون اور دوستانہ فضا قائم رکھیں لیکن ہندوؤں کی مختلف تحریکوں، مسلمانوں کے خلاف اقدامات اور مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبہ سے خارج کرنے کی کوشش نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ کبھی اور کسی حالت میں مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا ــــ مولانا محمد علی جو ایک عرصہ کانگرس کے ساتھ منسلک رہے، انہی وجوہات کی بنا پر علیحدہ ہو گئے۔ اسی فکر کو علامہ اقبال نے اپنایا اور اسی فکر کے تحت قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت کی جدوجہد کا آغاز کیا۔ علامہ اقبال نے ۲۰ مارچ ۱۹۰۹ کو اس خیال کا اظہار کیا "کبھی میں خود اسی خیال کا حامی تھا کہ برصغیر میں مذہبی اختلافات ختم ہونا ضروری ہیں۔ میں اب بھی ذاتی زندگی میں اس اصول پر عمل پیرا ہوں، لیکن اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکا ہوں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی قومی صفات اور الگ الگ قومی تصور کا تحفظ ضروری ہے۔ ہندوستان کے لئے مشترکہ قومیت کا تصور بلاشبہ بڑا خوبصورت تصور اور شاعرانہ جمال کا حامل ہے۔ لیکن جب موجودہ حالات پر نظر ڈالی جائے تو اس تصور کا تاج محل اپنا نور کھو بیٹھتا ہے اور اس شاعرانہ جمال میں مغالطہ پیدا ہو جاتی ہے۔" غرضیکہ یہی وہ وجوہات تھیں کہ مسلمانوں نے علیحدہ سیاسی تنظیم مسلم لیگ قائم کر لی۔

معاشی اور سیاسی مسائل کے علاوہ ہندوستانی معاشرہ میں تقسیم کی ایک اور

ریڈ کلیف ایوارڈ جلائی وہ بلاشبہ مسلمان ثقافت کے خلاف ایک
سیاسی بغاوت کے مترادف تھی۔ دراصل یہ تحریک مسلمانوں پر ہر اعتبار سے سیاسی تسلط
قائم کرنے کے لئے چلائی گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمان اور اس کے عقائد کے وجود
کو ہندوستان سے نیست و نابود کر دیا جائے ۔ ہندو، مسلمانوں کو غیر شعوری طور پر ایک ایسے
تہذیبی ماحول میں دینا چاہتا تھا جہاں اس کا وقار ، اس کا عقیدہ اور اس کی انا ختم ہو کر رہ جائے ۔
اقبال نے اس کی وضاحت یوں کی تھی :

"کیا آپ اسلام کو صرف ایک اخلاقی اور سیاسی منزل کی سطح پر دیکھنا پسند کریں گے
جس کا انجام عالم اسلام میں وہی ہو جو مغرب میں عیسائیت کا ہوا ہے ؟ کیا یہ ممکن
ہے کہ اسلام کو محض ایک تصور اخلاق کے طور پر اپنایا جائے اور اسے اس
قومی سیاست کے حق میں ، جہاں مذہب کو اپنا کردار ادا کرنے کی اجازت
نہیں ہوتی ، ایک نظم حکومت کے طور پر مسترد کر دیا جائے ؟"

علامہ اقبال کی یہ بات اس ہندوستان میں خاص اہمیت کی حامل تھی جہاں مسلمان
ایک اقلیت کے طور پر رہ رہے تھے۔ اسلامی معاشرے کی بنیاد بہر حال مذہب اسلام پر ہے اور
دونوں باہم مربوط ہیں ۔ اگر ان میں کسی ایک کو مسترد کر دیا جائے تو دوسرے کا وجود خود ختم ہو جاتا ہے
لہذا قومی خطوط پر نظم حکومت کی تعمیر ــــ اور اس صورت میں کہ اسلام کے اصول سالمیت پر
زد آتی ہو ، مسلمان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتی۔

قائد اعظم نے فکر اقبال کو ایک عملی صورت دینے کے لئے جد وجہد کا آغاز کیا۔ انہوں نے
بار بار اس خیال کا اظہار کیا کہ :

"یورپ سے مقابلہ کیا جائے تو ہندوستان کی دو بڑی اقوام ــــ ہندوؤں اور
مسلمانوں کے درمیان اختلافات ہزار گنا زیادہ ہیں ۔ ہندوستان کوئی قومی ریاست
نہیں ہے ۔ ہندوستان کسی ملک کا نام نہیں بلکہ ہندوستان ایک برصغیر ہے
جس میں مختلف اقوام آباد ہیں اور ان میں دو بڑی اقوام ــــ ہندو اور مسلمان
ہیں ــــ ان کی تہذیب ، ان کی ثقافت ، ان کی زبان ، ان کا ادب ، ان کے
فنون ، ان کا طرز تعمیر ، ان کے نام ، ان کے قوانین ، ان کی معاشرتی اقدار
اور ان کے ضابطہ ہائے اخلاق ، ان کے رسم و رواج اور ان کے کیلنڈر ،

ان کی تاریخ اور ان کی روایات، ان کے نظریات حیات اور ان کے عقائد۔ آخر مشترک کیا ہے؟ ہر چیز مختلف ہے ...... وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسد واحد کی طرح ہیں — وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے — وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے؟ وہ رشتہ وہ چٹان — وہ لنگر خدا کی کتاب قرآن کریم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جُوں جُوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک امت — اور یہ ہندو کے پاس نہیں ...... پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا جس دن ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے — وطن نہیں — اور نہ ہی نسل — جب ہندوستان کا پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا۔ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی۔"

مسلمان — ہندو کی ظاہری دوستی اور باطنی عداوت کو کیسے اور کب تک نظر انداز کر سکتا تھا۔ وہ ہزار سال ہندو کے ساتھ رہا — کیا اس لئے کہ اس کے وجود کو ختم کرنے کے لئے شدھی کی مہم چلائی جائے؟ آریہ سماج قائم ہو؟ ہندو مہاسبھا مسلمانوں کی عزت، آبرو، جان و مال سے کھل کھیلے —؟ سنگھٹن جیسی نیم فوجی تنظیم قائم ہو —؟ کیا ان تمام تحریکوں کے سربراہوں نے اپنی زبان سے یہ نہیں کہا کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ کیا گاندھی نے یہ نہیں کہا کہ مسلمان یا تو وہاں لوٹ جائیں جہاں سے آئے ہیں — اور وہ جو ہندو سے مسلمان ہوئے، وہ دوبارہ اپنا مذہب کی طرف لوٹ آئیں —؟ ہندو نے تقسیم بنگال کی مخالفت کیوں کی —؟ اس لئے کہ مسلمانوں کے اکثریتی صوبے میں مسلمانوں کی خواہشات، ان کی اُمنگیں پروان نہ چڑھنے لگیں؟ اگر ہندو فراخدل تھا تو اس نے مظاہرے کیوں شروع کئے؟ کیا اسی دور میں "بندے ماترم" کا ترانہ نہیں گایا گیا اور کیا اس موقعہ پر خود کانگرس کے دم آخر تک وفادار ساتھی ابوالکلام آزاد نے یہ اعتراف نہیں کیا کہ تقسیم بنگال کے مظاہروں میں مسلمانوں کے خلاف زبردست مذہبی تعصب سے کام لیا گیا؟

مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی کون کون سی حرکت پر پردہ پوشی کی جا سکتی ہے اور تاریخ کو دو بارہ دیکھے کیا جا سکتا ہے ؟ بنگال میں بالخصوص ہندو مہاجنوں اور زمینداروں نے مسلمانوں پر کیا کیا ظلم نہیں ڈھائے ۔ مسلمان ایک ہزار سال تک ہندو کے ساتھ رہا۔ لیکن ہندو اور مسلمان ایک برتن میں نہ کھا سکے نہ پی سکے ۔ ہندو مدرسوں میں مسلمانوں کے لئے پانی پینے کے گلاسوں پر علیحدہ شناختی نشان بنا ہوتا تھا اور اسے ہندوؤں کے گلاس سے دور رکھا جاتا تھا ۔ ہندو کی رسوئی میں کتا داخل ہونے سے نہیں ۔۔۔ البتہ مسلمان کے داخل ہو جانے سے رسوئی بھرشٹ ہو جاتی تھی ، تمام برتن پھینک دیئے جاتے ۔ پوجا کے دن غریب مسلمانوں کو دیوی کی بھینٹ کرنے کے لئے بکرے لانے پر مجبور کیا جاتا ۔ ہندو زمیندار ، اپنے مسلمان مزارعوں پر بکرا پیش کرنے کا فرض عائد کرتا ۔ اگر مسلمان یہ حکم بجا لانے سے انکار کر دیتا تو اس کے لئے لاتعداد مسائل پیدا کر دیئے جاتے ۔ مسلمانوں کو بے دردی کے ساتھ محض اس لئے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا کہ وہ گائے کی قربانی کیوں دیتے ہیں ۔۔۔ یعنی جو لوگ گائے کا خون برداشت نہ کر سکتے تھے ، وہ انسان کا خون بے دریغ بہاتے ۔ ہندو ، مسلمانوں کی مساجد کے سامنے اس وقت باجے بجاتے ، جب وہ نماز میں مصروف ہوتے ۔ غرضیکہ ہندو قدم قدم پر یہ کوشش کرتے رہے کہ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کیا جائے اور ان کے وجود کو ہندوستان سے ختم کر دیا جائے ۔

اندازہ کیجئے اگر مسلمان ۔۔۔ ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ نہ کرتے تو کیا کرتے ۔ !

پہلی بار سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کو کانگرس میں شمولیت سے منع کیا اور دردمند مسلمانوں نے اپنے بھائیوں کو تقاریر اور تحریروں کے ذریعہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ ہندوان کے خلاف زبردست سازش کر رہا ہے ۔ چنانچہ ہندوستان کے ہندوؤں میں شدید اضطراب پیدا ہو گیا ۔ ہندوؤں کو تو یہ بات ناگوار گزرتی تھی کہ مسلمان ۔۔۔ اپنی روایات کو فراموش کرنے پر آمادہ کیوں نہیں اور وہ تعداد کے اعتبار سے اپنے سے زائد ہندوؤں میں اسلام کی بات کیوں کرتا ہے !

۱۹۳۷ء میں جب مسلم لیگ نے کانگرس کے ساتھ مخلوط وزارتیں بنانے کی پیشکش کی تو کانگرس نے نہ صرف اس پیشکش کو ٹھکرا دیا بلکہ یہ مطالبہ بھی کیا کہ اسمبلیوں کے مسلم لیگی نمائندے الگ قوم کے نمائندوں کی حیثیت سے فرائض انجام نہ دیں اور کانگرس کے جزو لاینفک کی حیثیت

اختیار کرلیں۔ کانگرس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کو توڑ دیا جائے اور پھر اس بورڈ کی طرف سے ضمنی انتخابات میں کسی مسلمان امیدوار کو کھڑا نہ کیا جائے ۔ قائداعظم کے الفاظ میں ان شرائط سے کانگرس کا مقصد یہ تھا کہ "اپنی پارٹی کو ختم کردو ، اپنی پالیسی کو بھول جاؤ اور اپنے پروگرام اور مسلم لیگ کو دیوالیہ کردو۔"

ظاہر ہے کہ کوئی بھی سیاسی جماعت جسے اپنے وقار کا احساس ہو، ایسی بے مقصد اور معاندانہ شرائط تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوسکتی تھی۔ دراصل کانگرس ۶ صوبوں میں عارضی وزارتیں بنانے کے بعد فتح کے نشہ میں چور ہوکر رہ گئی تھی اور اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو مسلمانوں کے وجود کو ختم کر دیا جائے۔ انہی وزارتوں کے دوران کانگرس نے مدارس میں بندے ماترم کا ترانہ ضروری قرار دیا اور ودیا مندر سکیم نافذ کی۔ اس سکیم کے تحت ہندوؤں کے رسم و رواج اور طرز زندگی کو مسلمانوں پر ٹھونسنے کی سازش کی گئی۔ مسلمان طلبہ کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرنے کا حکم دیا گیا۔ غرضیکہ اس مختصر سے دور حکومت میں کانگرس نے ایک طرف مسلمانوں کا خون بے دریغ بہایا اور دوسری طرف ان کے تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت پہ کاری ضربیں لگانے کی بھرپور کوشش کی۔ مسلمانوں اور مسلمان طلبہ کو گاندھی ٹوپیاں پہنا کر کانگرسی جھنڈے کے سامنے سرنگوں ہونے اور ہاتھ جوڑنے پر بھی مجبور کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ جب کانگرس کا یہ دو سالہ چنگیز خانی دور ۱۹۳۹ء میں اپنے انجام کو پہنچا تو مسلمانوں نے ۲۲۔ دسمبر کو ملک بھر میں "یوم نجات" منایا۔ دراصل یہی وہ دور تھا جس میں ہندوستان کے ان بچے کھچے مسلمانوں نے جو اب تک کانگرس کے ساتھ تھے، یہ محسوس کیا کہ وہ کسی صورت بھی ہندو کے ساتھ گزارہ نہ کرسکیں گے۔ دراصل ہندو یہ چاہتے تھے کہ جس مسلمان نے ان پر ۰۰ ۸سال تک حکومت کی انہیں یا تو نیست و نابود کر دیا جائے یا انتقام کے طور پر ان پر حکومت کی جائے۔ حالانکہ ان سات صدیوں میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ انصاف اور رواداری کا جو سلوک کیا، وہ محتاج بیان نہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمان کی حد سے متجاوز رواداری اور جذباتیت ہی نے نہ صرف انگریز کو برصغیر میں قدم جمانے کا حوصلہ دیا بلکہ ہندوؤں کو بھی مسلمانوں پر چھا جانے میں بہت حد تک مدد دی۔ ہندو، مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتا تھا اور مسلمان یہ جانتا تھا کہ اگر ایسا ہوگیا تو ہندوستان سے مسلمان کا وجود ہمیشہ کے لئے ختم ہوکر رہ جائے گا۔ اسی لئے مسلمانوں نے ۲۳۔ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں وہ تاریخی قرارداد منظور کی جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت یعنی پاکستان کے

قیام سے متعلق مطالبہ پر مبنی تھی اور جس مملکت میں وہ قرآن کریم اور سنّت کے اتباع میں زندگی گزار سکتے تھے۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کسی نفرت کے فلسفہ پر مبنی نہ تھا۔

پاکستان مسلم قومیت کے بنیادی اصول پر قائم کیا گیا جہاں مسلمانوں کو ہر قسم کا تحفظ اور اپنی ثقافت کو پروان چڑھانے کا حق اور آزادی حاصل ہو۔ اس اعتبار سے پاکستان کی تشکیل ایک اسلامی ریاست کی بنیاد پر کی گئی۔ پاکستان کے مسلمانوں کا مقصد اپنی ریاست کو مسلمان کی حیثیت میں مستحکم کرنا اور اس کے اندر مسلمان کی حیثیت میں زندہ رہنا تھا۔ ایسی مملکت جہاں مذہبی اخوت تمام مسلمانوں کو ایک لڑی میں تسبیح کے دانوں کی طرح پرو کر رکھتی ہے۔ پاکستان میں مذہب اور ریاست دو مختلف چیزیں نہیں لیکن اگر اکھنڈ بھارت میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ رہنا پڑتا تو یقیناً اسلام کو ریاست سے خارج کر دیا جاتا، جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ مسلمانوں کی علیحدہ قومیت ختم ہو کر رہ جاتی۔ قائداعظم نے واضح طور پر کہا تھا کہ پاکستان سے ان کی مراد وہ مملکت ہے، جہاں کے رہنے والے مسلمان اپنی زندگی قرآن کریم اور سنّت کے سانچے میں ڈھال سکیں۔

مذہب ہماری ریاست کا جزو لاینفک ہے۔ یہ کوئی عیسائی ریاست نہیں جہاں روحانی اور مذہبی معاملات اور سیاسی اور ملکی معاملات دو مختلف ہاتھوں میں منقسم ہیں۔ یہ اسلامی مملکت ہے جہاں ہر مسلمان کے ہاتھ میں قرآن بھی ہے اور تلوار بھی۔ پاکستان میں ہندو یا عیسائی فلسفہ اور طرز حکومت کے لئے کوئی گنجائش نہیں اس لئے کہ پاکستان کی بنیاد اسلامی نظریہ پر ہے اور اسلام سیاست اور مذہب کو کسی قیمت پر دو الگ چیزیں تسلیم نہیں کرتا ورنہ اس کے نظام کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔

استفادہ

1. سید حسن ریاض — پاکستان نا گزیر تھا
2. سید شریف الدین پیر زادہ — پاکستان منزل بہ منزل
3. سید نور احمد — مارشل لاء سے مارشل لاء تک
4. محمد اکرام — یادگار شبلی
5. مرزا محمد دہلوی — عہد حاضر کے بڑے لوگ
6. محمد علی چوہدری — ظہور پاکستان

7. Afzal Iqbal ... Select Writings & Speaches of Quaid-e-Azam
8. Ali K.. ... A New History of Indo-Pakistan
9. Allana, G., ... Our Freedom Fighters
10. Ambedkar, B. R. ... Pakistan or The Partition of India
11. Azad, Abul Kalam ... India Wins Freedom
12. Bolitho, Hector ... Jinnah, Creator of Pakistan
13. Campbell-Johnson ... Mission with Mountbatten
14. Coatman, John ... The Road to Self-government
15. Fazl-e-Haque ... Muslim Suffering Under Congress Rule
16. Gandhi, M.D.K.C., ... An Autobiography
17. Graham, G.F. I., (Col) The life and Works of Syed Ahmad Khan

18. Hameed ... Muslim Separatism
19. Hunter W.W. ... The Indian Muslims
20. Ikram. S.M., Dr. ... Modern Muslim India
21. Ishwari Prasad ... A Short History of Muslim Rule in India
22. Jamiluddin Ahmad ... Muslim Political Movement
23. Joshua. Fazluddin ... Separate Electorates
24. Khaliquzzaman, Ch. Pathway to Pakistan
25. Menon, V.P., ... The Transfer of Power in India
26. Mujamdar, R. C., ... Advance History of India
27. Mujamdar, R. C., ... History of Freedom Movement in India
28. Nehru. J.W., ... An Autobiography
29. Philips ... Select Documents on the History of India & Pakistan
30. Prasad, Dwarka., ... Sharimad Bhagawet Geeta
31. Qureshi, I.H., ... A Short History of Pakistan
32. Rajput A.B., ... Muslim League Yesterday and Today
33. Ram Gopal ... Indian Muslims, A Political History
34. Thompson, I.E.W., ... History of India

اسی مصنف سے

افکارِ سیاسی (مشرق و مغرب): مشرق و مغرب کے مفکرین و محققین کے سیاسی افکار پر مبنی ایک منضبط تالیف — جس میں اختصار و جامعیت دونوں موجود ہیں اور مصنف نے مفکرین کے افکار کو نہایت عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب عام قاری کے علاوہ ایم۔ اے سیاسیات کے طلبہ و طالبات کے لئے بالخصوص مفید ہے۔ زبان نہایت سادہ، انداز بیان قابل فہم، مترادفات کا خاص اہتمام، کپڑے کی جلد، آفسٹ طباعت، سفید کاغذ — ۴۲۲ صفحات، قیمت ۱۷/۵۰ روپے

تحریکِ آزادی: پس منظر، نظریہ، تحریک پاکستان کے حصول کی جدوجہد اور نظریاتی تاریخ پر یہ کتاب نہایت محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں طلوع اسلام و ظہور عرب سے ۱۹۴۷ء تک کے حالات کا فاضلانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے مصنف صلاح الدین ناسک کی یہ کتاب منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ صرف ایک بار پڑھ لینے کے بعد ہر بات ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ ایم، اے کے طلبہ و طالبات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔ مضبوط جلد مع پلاسٹک کور، آفسٹ طباعت سفید کاغذ۔ ۴۸۵ صفحات قیمت ۱۷/۵۰ روپے

جدید عالمِ اسلام: (ترکی، مصر، ایران، سعودی عرب، شام، اردن، عراق) جدید عالم اسلام پر مصنف کے گہرے مطالعہ اور محنت شاقہ کی تصویر — اس کتاب میں مصنف نے ترکی، ایران، مصر، سعودی عرب، شام، اردن اور عراق کے تاریخی پس منظر، سیاسی حالات، خارجی اثرات، جدوجہد اور ترقیات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اردو میں ان ممالک پر اتنا ٹھوس مواد شاید ہی کسی دیگر کتاب میں میسر ہو۔ عام قارئین اور بالخصوص طلبہ اور صحافیوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ سلاست اور خوبصورت انداز بیان اس کتاب کی غیر معمولی خوبیاں ہیں۔ سفید کاغذ و آفسٹ طباعت قیمت

(معیاری کتب کے باذوق ناشر)